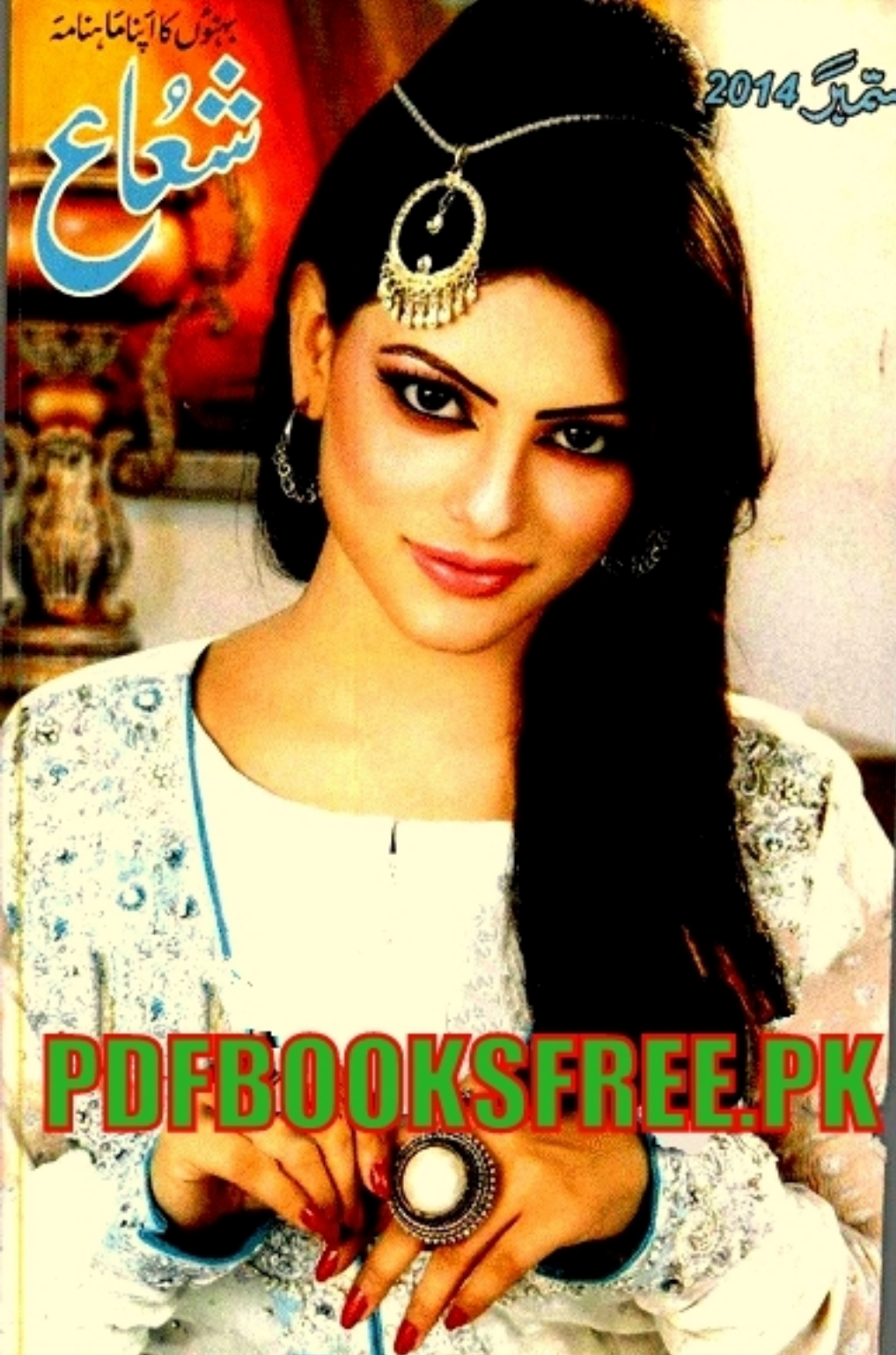


پیشوں کا آپنا مآب نامہ

شعاع

ستمبر 2014



PDFBOOKSFREE.PK

پتلے میں جلتی تھی، پھر میں نے اپنائی

# Care کریم بلیچ

جس میں شامل Aloe Vera اور Milk Protein  
نرمی سے مددگار ہیں، نہ وڈریش، نہ وہ جلد



چھوڑ دیں آپ بھی جلدنا اور اپنائیں، کیسی کریم بلیچ



کیڑے ہاٹر کیا!





بہنوں کا اپنا ماہنامہ

# سحر

خلفہ و کتابت کاپیہ

ماہنامہ سحر

37 - اردو بازار کراچی

باقی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیر — رضیہ جمیل

مدیر منظم — اذریاض

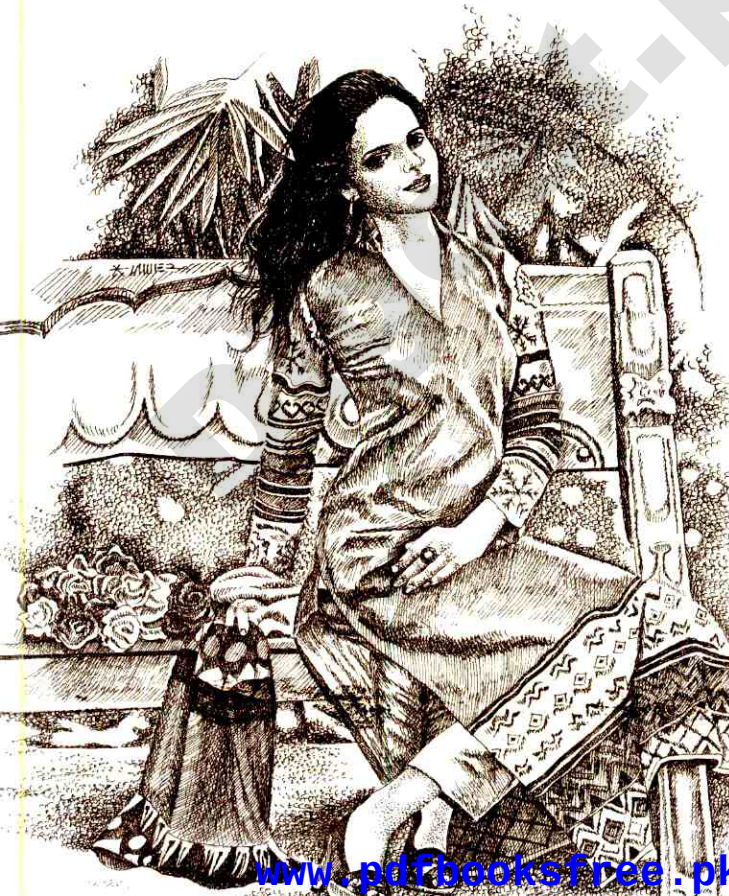
مدیر ناشری — امّت الصبور

فہرشی و فن — شاہین رشید

اشہارکت — خالدہ جمیلانی

رکن آل پاکستان نیوز جیجی رسوائی  
رکن کونسل آف پاکستان نیوز جیجی عزیز

MEMBER  
APNS  
CPNE



## ناولٹ

- شاہد طلعت 84  
وفا کے وعدے، صدقہ جان گیلانی 206

## افسانے

- نگہت سیما 58  
سیر عثمان گل 70  
صباحت یاسین 76  
مصلح علی 135  
قراۃ العین دلائل 254  
قائمہ رابعہ 258

## نظمیں غزلیں

- شعبہ مطہر 262  
سعید احمد اختر 262  
شکبہ جلالی 261  
صابر ظفر 261

### ذرا سلا لے بات کیے ریگسٹری

پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 5000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

- رضیہ جمیل 10  
الذیب، صاویب 11  
سید مظہر علی بخاری 11  
ادارہ 12

پہلی شعاع،  
حمد،  
نعت،  
نبی کی باتیں

## انٹرویو

- اشجہ فاطمہ ملاقات شاہین رشید 20  
دستک شاہین رشید 25  
شعاع کے ساتھ ادارہ 29

## ناول

- رضا نیکار عدنان 36  
نبیلہ عزیز 238

ایک تھی مشال  
قصہ سبل

## مکمل ناول

- نیمہ ناز 104  
سمیرا حمید 148

روپ سحر کی راکھانی  
یارم

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے منظر شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی وی پی سیٹ پر ڈراما کی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی مکمل میں لائی جاسکتی ہے۔





## مستقل سلسلے

|     |             |               |     |            |                  |
|-----|-------------|---------------|-----|------------|------------------|
| 269 | خالہ جیلانی | کھلتا کسی پیہ | 271 | رضیہ جمیل  | خط آپ کے         |
| 288 | خالہ جیلانی | موسم کے یگانہ | 263 | صباحہ      | مُسکراہٹیں       |
| 290 | ادار        | خوبصورت بننے  | 284 | واصفہ سہیل | ایٹنیہ خالے میں  |
|     |             |               | 266 | شگفتہ جاہ  | یا لول سے خوشنول |
|     |             |               | 280 | امت الصور  | تاریخ کے جھروکے  |

ستمبر 2014  
جلد 29 شمارہ 1  
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رخصہ جمیل فلوین حسن پریشک پریش سے چھپو کر شائع کیا - مقارنہ ۲۰۱۶ فی اری سی ایچ ایس سوانحی کرچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



شیعہ کا ستمبر کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔  
 - پچھلا شمارہ سالگرہ عمر تھا۔ قارئین نے اسے بے حد پسند کیا۔ ہمیں خط لکھ کر ہماری محنتوں کو سراہا۔ بہت سی بہنوں نے فون کے اپنی رائے سے فوازا۔ سالگرہ منبر میں جو کئی یاغی انہیں محسوس ہوئی، اس کا اظہار کیا تاہین کی اس جو صلا افزائی سے ہمیں نئی امنگ اور تقویت ملی ہے۔  
 شیعہ کو خوب سے خوب تر بنانے کی امنگ، آپ کی پسندیدگی، ہمارے لیے کس قدر قیمتی ہے، الفاظ میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم وہ تمام خط شامل نہیں کر سکے جو ہمیں موصول ہوئے۔ ہم تہہ دل سے ان قارئین کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ ہماری نذر کیا۔ اور ان تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو شعائر بارہتی ہیں، اس پر تنقید و تبصرہ کرتی ہیں، ہماری دعا ہے کہ قارئین کی یہ محبتیں اسی طرح ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین۔

### عیدِ سرورؐ

اکتوبر کا شمار عیدِ سرورؐ ہوگا۔ اسی میں عید کے حوالے سے دیگر سلسلوں کے علاوہ حسب روایت قارئین سے سرفے بھی شامل ہوگا۔ سرورؐ کے حوالے یہ ہیں۔

- 1۔ ذی الحجہ کا چاند نظر آتے ہی گلی کوچوں میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔ جانوروں کی خریداری، ان کی آمد کا شور، ان کے پیچھے جاتے بچے، ان ہی ہنگاموں میں عید الاضحیٰ کا دن طلوع ہوتا ہے تو قصائی کی آمد کے انتظار سے لے کر گوشت بیچنے، اسے تقسیم کرنے اور اسے دیکھنے تک مصروفیت کا وہ عالم ہوتا ہے کہ سر اٹھانے کی ہمت نہیں ملتی۔ آپ ان مراحل سے کیسے خبردار رہتا ہوتا ہے؟ گھر میں قربانی کے جانوروں کی آمد سے لے کر قربانی ہونے تک کا احوال لیں۔
- 2۔ گوشت سے سخی آپ کی پسندیدہ دُش کون سی ہے؟ آپ خود بناتی ہیں یا فرمائش کر کے بنواتی ہیں؟
- 3۔ ہرمو، ہرفوم، ہرفان، ہرمان کی ایک روایتی دُش ہوتی ہے جو خاص موقعوں پر ضرور بنائی جاتی ہے۔ آپ کے گھر کی روایتی دُش کون سی ہے؟
- 4۔ گوشت کی تقسیم کس طرح کرتی ہیں، گوشت تقسیم کرتے ہوئے آپ کون سی باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 15 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

### اس شمارے میں،

- ، نعیمہ ناز کا مینکل ناول۔ روپ نگر کی لام کہانی،
- ، سمیر احمد کا مینکل ناول۔ یارم،
- ، صدق رحمان کی سیلابی ناول۔ وفلکے وعدے نبھا دیے سائیں،
- ، شاہد طلعت کا ناول،
- ، رضوانہ نگار عدنان اور بیلہ عزیز کے ناول
- ، نگہت سیا، مصباح علی، سمیر عثمان گل، صباحت یاسمین قرۃ العین رائے اور فائزہ رابعہ کے افسانے،
- ، فی وی فنکارہ اور ریحہ فاطمہ سے ملاقات،
- ، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ، ہمارے نبیؐ کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ، خط آپ کے، آئینہ غلے میں، تاریخ کے چہروں سے اور دیگر مطبوعات سلسلے شامل ہیں۔
- شعائرؐ برہہ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔



روزِ ازل سے منبعِ انوار آپ ہیں  
تاریکیوں میں نور کا مینار آپ ہیں

میری مجال، بیعتِ اغیار میں کروں  
سردار آپ ہیں، مرے سردار آپ ہیں

کون و مکاں بنائے گئے آپ کے لیے  
کون و مکاں کے وارثِ حقِ دار آپ ہیں

ہے آپ کے جمال کا پھولوں میں رنگ و جن  
گلزارِ کائنات کی مہکار آپ ہیں

کوین میں نہیں کوئی آئینہ آپ سا  
خلاقِ شش جہات کا شہکار آپ ہیں

ہیں اس جہاں میں جتنے بھی انسان لے نوا  
ہر بے نوا کے مونس و غم خوار آپ ہیں

کس واسطے نظر نہ لکھے نعتِ آپ کی  
سرکارِ صرف اس کے تو حقِ دار آپ ہیں

سیدِ نظر علی شاہ بخاری

مہک میں سارے حروف دھو کر  
قلم کو عنبر میں ڈبو کر  
ثناء ربِ جلیل لکھوں  
رحیم لکھوں، کریم لکھوں  
اُسی کو اس کی دلیل لکھوں  
کہاں نہیں تھا، کہاں نہیں ہے  
مجھے بتاؤ وہ جہاں نہیں ہے  
ازل سے ہے، تا ابد رہے گا  
وہ آپ اپنی سندر ہے گا  
وہی تو ہے لا شریک و یکتا  
وہ سب کا خالق وہ سب کا آقا  
وہ سب کے اندر وہ سب کے باہر  
وہ سب سے اعلیٰ وہ سب سے برتر  
رحیم و رحمان صفات اس کی  
بڑی مکرم ہے ذات اس کی

لادیب، ماہِ ذیہ



## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دعوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دستی کا گوشت بڑھایا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گوشت پسند تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے نوح نوح کر کھانے لگے اور فرمایا۔

”میں قیامت والے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا۔ کیا تم جانتے ہو، اس سرداری کی وجہ کیا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ایک ہی میدان میں (اگلے پچھلے تمام) لوگوں کو جمع فرمائے گا۔ ایک دیکھنے والا ان سب کو دیکھے گا اور ایک پکارنے والا ان سب کو اپنی آواز سنائے گا۔ سورج ان کے قریب ہو گا۔ لوگوں کو غم اور بے چینی اس حد تک پہنچے گی کہ ان کی طاقت اور برداشت سے باہر ہوگی، لوگ کہیں گے۔

”کیا تم دیکھتے نہیں کہ تم جس تکلیف سے دوچار ہو، وہ کس حد تک پہنچ چکی ہے کیا تم ایسا شخص نہیں دیکھتے جو تمہارے لیے تمہارے رب سے سفارش کرے؟“

تو لوگ ایک دوسرے کو کہیں گے کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام ہیں۔

چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے۔

”اے آدم علیہ السلام! آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور آپ کے اندر اپنی روح پھونکی اور اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا، تو انہوں نے آپ کو سجدہ کیا اور آپ کو بہشت میں آباد

کیا۔ کیا آپ اپنے رب سے ہماری سفارش نہیں کرتے؟ کیا آپ ہماری وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں اور جس حالت کو ہم پہنچے ہوئے ہیں؟“

حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ

اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس جیسا غضب ناک ہو گا اور اس نے مجھے (بہشت میں) ایک درخت کے پاس جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن مجھ سے نافرمانی کا صدور ہو گیا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم نوح کے پاس جاؤ۔“

چنانچہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔

”اے نوح! آپ اہل زمین کی طرف سے سب سے پہلے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام شکر گزار بندہ رکھا ہے۔ کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہماری بے چینی کس حد تک پہنچی ہوئی ہے؟ کیا آپ اپنے رب سے ہماری سفارش نہیں کرتے؟“

نوح علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ کبھی آئندہ ہو گا اور مجھے ایک دعا کرنے کا حق حاصل تھا جو میں نے اپنی قوم کے خلاف کر لی تھی۔ مجھے تو اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم

گفتگو فرمائی۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کرو دیجئے کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے کسی قصور کا ذکر نہیں فرمائیں گے (اور فرمائیں گے) ”مجھے تو اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے۔ تم میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ، تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔“

ایک اور روایت میں ہے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔) ”لوگ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے۔“

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ کے رسول

اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے (تمام) گناہ بھی معاف فرمادیے ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش فرما دیجئے کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟“ چنانچہ میں چل کر عرش کے نیچے آؤں گا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنی حمد اور حسن ثنا پر مشتمل ایسے کلمات مجھ پر القا فرمائے گا کہ مجھ سے پہلے وہ کسی پر القا نہیں کیے گئے ہوں گے۔ پھر کہا جائے گا۔

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سراٹھائے، مانگیے، آپ کو دیا جائے گا۔ سفارش کیجئے سفارش قبول کی جائے گی۔“

چنانچہ میں اپنا سرا (سجدے سے) اٹھاؤں گا اور کہوں گا۔

”اے میرے رب! میری امت! اے میرے رب! میری امت! (اے بخش دے۔)“

پس کہا جائے گا۔ ”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کے ان لوگوں کو، جن پر حساب نہیں ہے، جنت کے دروازوں میں سے دائیں طرف کے دروازے سے

ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔“ چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے۔

”اے ابراہیم! آپ اللہ کے نبی اور اہل زمین میں سے اس کے خلیل ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کرو دیجئے کیا آپ وہ تکلیف دیکھ نہیں رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟“

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا غضب ناک ہے کہ اتنا غضب ناک اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا اور میں نے تو تین باتیں ایسی کی تھیں جو بظاہر واقعے کے خلاف تھیں۔ مجھے تو اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم موسیٰ

علیہ السلام کے پاس جاؤ۔“

چنانچہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔

”اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رسالت اور ہم کلامی سے نواز کر تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کرو دیجئے کیا آپ وہ تکلیف دیکھ نہیں رہے ہیں جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غضب ناک ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا اور مجھ سے ایک جان کا قتل ہو گیا تھا جس کے قتل کرنے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔“

تو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے۔

”اے عیسیٰ! آپ اللہ کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے حضرت مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی روح میں اور آپ نے کھوارے میں لوگوں سے



جنت میں لے جائیں اور وہ اس کے علاوہ دوسرے دروازوں میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہیں۔ (دوسرے دروازوں سے بھی وہ جاسکتے ہیں۔) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”قسم ہے اس ذات کی۔ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جنت کے کواڑوں میں سے دو کواڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا مکہ اور ہجر کے درمیان یا مکہ اور بصری کے درمیان ہے۔“ (بخاری و مسلم)

## فوائد و مسائل

- 1۔ آخرت میں ایک شہر ہے اور بصری دمشق کے جنوب میں واقع حوران کی ایک بستی ہے۔ یعنی جنت کا ایک دروازہ اتنا چوڑا ہو گا کہ دونوں کواڑوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہو گا۔
- 2۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

فضیلت کا بیان ہے کہ قیامت والے دن جبکہ جلیل القدر پیغمبروں کو بھی بارگاہ الہی میں سفارش کرنے کی ہمت نہیں ہوگی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے سفارش فرمائیں گے۔ ایک سفارش تو یہ فرمائیں گے کہ لوگوں کا حساب کتاب شروع کیا جائے، تاکہ میدان محشر کی ہولناکیوں سے لوگوں کو نجات ملے۔ روایت کا یہ حصہ اس حدیث میں نہیں ہے، دوسری روایات میں ہے۔

دوسری سفارش اپنی امت کے حق میں فرمائیں گے۔ یہ مختلف مرحلوں میں ہوگی۔ اس میں پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ جس میں آپ کی سفارش پر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنت میں لے جانے کی اجازت مرحمت فرمائے گا جن پر حساب نہیں ہوگا۔ دوسری مرتبہ آپ کی سفارش اس وقت ہوگی جب گناہ گار اہل ایمان جہنم میں اپنے گناہوں کی کافی سزا بھگت چکے ہوں گے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمایا جائے گا۔

3۔ اس میں انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اپنی بعض لغزشوں کے حوالے سے سفارش کرنے سے معذرت کریں گے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انبیاء ایمان و تقویٰ کے جس بلند ترین درجے پر فائز ہوتے ہیں وہاں معمولی سی لغزش بھی جو گناہ کے دائرے میں نہیں آتی، انہیں بڑی عظمیٰ محسوس ہوتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے۔ ”سفید ابلے کپڑے پر معمولی سا دھبہ بھی بڑا نمایاں محسوس ہوتا ہے۔“ یہی حال انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی اعتبار سے انہوں نے معمولی معمولی لغزشوں کی وجہ سے بارگاہ الہی میں پیش ہونے سے معذرت کی۔

4۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین واقعات، جنہیں کذبات کہا گیا ہے، حالانکہ وہ جھوٹ نہیں ہیں، بلکہ معارف ہیں، جو ظاہر ”جھوٹ معلوم ہوتے ہیں“ لیکن حقیقتاً ”جھوٹ نہیں ہوتے۔“

ان میں سے ایک ان کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں۔

دوسرا بتوں کی بابت کہنا کہ بڑے بت نے یہ کام کیا ہے اس سے پوچھو۔

تیسرا یوی کو اپنی بہن کہنا۔

پہلی بات کو کسی طرح جھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ آپ نے اپنے آپ کو بیمار کہا تو یقیناً ”آپ بیمار ہوں گے یا ان کی بستی کے لوگ جس جشن میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے اس کے لیے آپ بیمار تھے بت توڑنے کے بعد کہنا کہ بڑے بت سے پوچھو اس سے مقصود بتوں کے پیچاریوں کے سامنے بتوں کی اصل حقیقت واضح کرنا اور ان کو توحید کی حقیقت سے آشنا کرنا تھا۔ اسی طرح یادشہ کے سامنے حالت کی مجبوری کی وجہ سے یوی کو بہن کہنا بھی جھوٹ نہیں ہے، کیونکہ ہر مسلمان مرد دوسرے مسلمان مرد کا بھائی اور مسلمان عورت ہر مسلمان کی بہن ہے۔ لیکن ظاہری شکل کے اعتبار سے کیونکہ یہ واقعات کے خلاف ہیں اس لیے انہیں جھوٹ کہہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے لحاظ سے وہ جھوٹ

نہیں ہیں، تو یہی کی قسم سے ہیں جو بوقت ضرورت جائز ہے۔

## حضرت ہاجرہ کا توکل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ

”حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جبکہ وہ ان کو دودھ پلاتی تھیں، لائے حتیٰ کہ انہیں بیت اللہ کے نزدیک مسجد حرام کے بالائی حصے میں زمرہ کے اوپر واقع ایک درخت کے پاس ٹھہرا دیا۔

اس زمانے میں مکے میں کوئی انسان آباد نہیں تھا۔ نہ وہاں پانی ہی تھا۔ ان ماں، بیٹے کو وہاں بھیجا اور ان کے پاس ایک تھیلی رکھ دی۔ جس میں کچھ سبجوریں تھیں اور پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام پیٹھ پھیر کر جانے لگے تو حضرت اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے گئیں اور کہا۔

”اے ابراہیم! ہمیں اس وادی میں (تنہا) چھوڑ کر، جہاں کوئی غم خوار سا بھی ہے، نہ ضرورت کی کوئی چیز کہاں جارہے ہیں؟“

انہوں نے یہ بات ان سے متعدد مرتبہ کہی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف توجہ ہی نہ فرماتے۔ بالآخر حضرت ہاجرہ علیہ السلام نے کہا۔

”کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟“

حضرت ابراہیم نے کہا۔ ”ہاں۔۔۔“  
تو انہوں نے کہا۔ ”تب وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔“

پھر وہ واپس چلی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی راہ پر چلے، یہاں تک کہ جب فنیہ مقام پر پہنچے جہاں سے ان کے اہل و عیال انہیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ اپنا رخ بیت اللہ کی طرف کیا، پھر ان کلمات کے ساتھ دعا میں کہیں۔ اے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا۔  
”اے میرے رب! میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب و گاہہ آدمی میں آباد کیا ہے۔ تاکہ وہ شکر کریں۔“

(ادھر) اسماعیل کی والدہ، اسماعیل کو دودھ پلاتی اور اس مشکیزے کے پانی سے پانی پیتی رہیں، یہاں تک کہ جب مشکیزے کا پانی ختم ہو گیا تو خود پیاسی رہنے لگیں اور بیٹا بھی پیاس سے بلبلائے لگا اور وہ اسے زمین پر لٹوئے ہوئے دیکھنے لگیں۔

یہ منظر ان کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ وہ پانی کی تلاش میں جلیں تو صفا پہاڑ کو انہوں نے زمین میں سب سے قریب پایا۔ وہ اس پر کھڑی ہو گئیں اور وادی کی طرف منہ کر کے دیکھنے لگیں کہ کوئی انسان نظر آتا ہے لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ صفا پہاڑ سے نیچے اتریں یہاں تک کہ جب وادی (میدان) میں پہنچیں تو اپنی لمبے کلانارہ اوپر اٹھایا، پھر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی سخت مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ حتیٰ کہ ساری وادی پار کر گئیں، پھر مرہ پہاڑی پر چڑھ کر کھڑی ہو گئیں اور نظروں ڈالتی کہ کیا کوئی انسان دکھائی دیتا ہے؟ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

انہوں نے ایسا سات مرتبہ کیا۔ (سات چکر لگائے)  
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے  
ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اسی وجہ سے (حضرت ہاجرہ کی متابعت میں) لوگ صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔“

چنانچہ جب (آخر میں) مرد پر چڑھیں تو ایک آواز  
سنی۔ تو اپنے آپ کو خطاب کر کے کہا۔ ”خاموش  
رہ۔“ (کیونکہ آواز ان کے لیے ناقابل یقین چیز تھی۔)  
پھر کان لگائے تو پھر آواز سنی۔ تو حضرت ہاجرہ نے

”تیری آواز پہنچ گئی ہے۔ اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہے تو۔“ (فورا ”مدد کے لیے پہنچ“)

پس ناگہاں دیکھا کہ زمزم کی جگہ کے پاس فرشتہ

اس نے اپنی اڑی پالی اپنے پر کے ساتھ زمین کو  
 کرید لیا، یہاں تک کہ پانی نکل آیا تو حضرت ہاجرہ اس  
 کے لیے حقن بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے باڑھ  
 بناتی تھیں اور چلو سے پانی لے کر مشکیزے میں



ڈالنے لگیں۔ وہ جتنا پانی چلو میں لیتیں، وہ پانی اتنا ہی ابلتا اور ایک روایت میں ہے کہ چلو کی مقدار کے برابر پانی ابلتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل کی والدہ پر رحم فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو یوں ہی چھوڑ دیتیں۔ ”یا فرمایا۔ ”چلو سے پانی اکٹھا نہ کریں تو زمزم روئے زمین کو سیراب کرنے والا بڑا چشمہ ہوتا۔“

راوی نے بیان کیا۔ ”حضرت باجرہ نے خود بھی پانی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا۔ پس فرشتے نے حضرت باجرہ سے کہا۔

”تم اپنی جان کا خوف مت کرو۔ (کہ وہ ضائع ہو جائے گی) اس لیے کہ اس مقام پر اللہ کا گھر ہے جسے یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کریں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے لوگوں کو ضائع نہیں کرتا۔“

اور (اس وقت) بیت اللہ (کی جگہ) ٹیلے کی طرح

زمین سے بلند تھی۔ وہاں سیلاب آتے تو اس کے دائیں اور بائیں سے گزر جاتے۔ ایک عرصے تک یہی کیفیت رہی یہاں تک کہ جرہم کا قافلہ باجرہم قبیلہ کا کوئی گھرانہ مکہ کے راستے سے آتے ہوئے ان کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے مکے کے زیریں حصے میں پڑاؤ کیا تو ایک منڈلا تاہوا پر بندہ دیکھا وہ کہنے لگے۔

”یہ پرندہ یقیناً ”پانی پر گھوم رہا ہے۔ ہمیں تو اس وادی سے آتے جاتے ایک زمانہ ہو گیا ہے، اس میں تو پانی نہیں ہے۔“

چنانچہ (معلومات کے لیے) انہوں نے ایک یا دو قاصد بھیجے تو انہوں نے وہاں پانی پایا۔ انہوں نے آکر ان کو خبر دی تو وہ لوگ وہاں گئے۔ حضرت اسماعیل کی والدہ پانی کی پاس تھیں۔ انہوں نے کہا۔

”آپ ہمیں اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے پاس آکر پڑاؤ ڈال لیں؟“

انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن پانی کی ملکیت میں تمہارا حق نہیں ہوگا۔“

انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ بات حضرت اسماعیل کی والدہ کی خواہش کے مطابق ہوئی، وہ بھی انس و محبت کو پسند کرتی تھیں۔“

پس انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈال لیا اور اپنے گھر والوں کو پیغام بھیجا۔ وہ بھی وہاں آکر مقیم ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہاں رہنے والے کئی گھر ہو گئے اور اسماعیل بھی جوان ہو گئے اور ان لوگوں سے انہوں نے عربی زبان بھی سیکھ لی اور جب وہ بڑے ہو گئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ نفیس اور سب سے زیادہ دل پسند تھے۔ لہذا جب وہ بالغ ہو گئے تو انہوں نے اپنی ایک عورت سے ان کی شادی کر دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ فوت ہو گئیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، تاکہ اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں (بیوی، بچے) کو ملاحظہ کریں۔ انہوں نے

اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا تو ان کی بابت ان کی بیوی سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ”وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں، اور ایک روایت میں ہے۔ ہمارے لیے شکار کرنے باہر گئے ہیں۔“

پھر انہوں نے ان کی بیوی سے ان کی گزران اور عام حالت کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

”ہم بہت برے حال میں ہیں، بڑی تنگی اور سختی میں ہیں۔“ اور ان کی طرف شکایت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”جب تمہارے خاوند آئیں تو انہیں میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا۔ اپنے دروازے کی دہلیز بند دیں۔“

چنانچہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو گویا انہوں نے کسی چیز کو محسوس کیا۔ (کسی کی آمد کا احساس ہوا) اور پوچھا۔

”کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟“

بیوی نے کہا۔ ”ہاں۔ ایسے ایسے حلیے کے ایک



ان کے لیے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔“  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس وقت ان کے لیے کوئی غلہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام اس کی بابت بھی ان کے لیے (برکت کی) دعا فرما دیتے۔“

حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ ”مکہ کے سوا کبھی اور جگہ کوئی شخص صرف ان دو چیزوں (گوشت اور پانی) پر گزارہ کرے تو اسے موافق نہیں آئیں گے۔“  
ایک اور روایت میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (دوسری مرتبہ) آئے تو پوچھا۔

”اسماعیل کہاں ہیں؟“  
تو ان کی بیوی نے کہا۔ ”شکار کرنے گئے ہیں۔“ پھر ان کی بیوی نے کہا۔  
”کیا آپ تشریف نہیں رکھتے کہ (کچھ) کھائیں پئیں؟“

انہوں نے پوچھا۔ ”تمہارا کھانا پینا کیا ہے؟“  
اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں کھانے کو گوشت اور پینے کو پانی میسر ہے۔“ انہوں نے فرمایا۔ ”اے اللہ! ان کے کھانے اور پینے میں برکت عطا فرما۔ راوی حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ ابو القاسم نے فرمایا۔ (مکہ میں ان چیزوں کی فراوانی) حضرت ابراہیم کی دعا کا نتیجہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”جب تمہارا خاوند آئے تو انہیں سلام کنا اور یہ پیغام دینا کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھیں۔“ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا۔  
”کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں۔ ایک خوب شکل بزرگ آئے تھے۔“

بیوی نے حضرت ابراہیم کی تعریف کی۔ ”انہوں نے مجھ سے آپ کی بابت پوچھا تو میں نے انہیں بتلایا۔“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”ہماری گزراوقات کیسی ہے؟“ تو میں نے بتلایا۔ ”ہم بہت

بزرگ آئے تھے۔ انہوں نے آپ کی بابت پوچھا، تو میں نے ان کو بتلایا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ ہماری گزراوقات کیسی ہے؟ تو میں نے ان کو بتلایا۔ ہم بڑی تکلیف اور سختی میں ہیں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا۔ ”کیا انہوں نے تجھے کسی بات کی تلقین کی تھی؟“  
اس نے کہا۔ ”ہاں۔ مجھے انہوں نے حکم دیا تھا کہ میں آپ کو ان کا سلام کہوں اور آپ کے لیے یہ پیغام دے گئے تھے کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دیں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا۔ ”وہ میرے والد بزرگوار تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ سے علیحدگی اختیار کر لوں، پس تو اپنے گھر والوں (والدین) کے پاس چلی جا۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس کو طلاق دے دی اور اس قبیلہ کی کسی اور عورت سے شادی کر لی۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک اللہ نے چاہا، کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد دوبارہ ان کے پاس تشریف لائے تو پھر اسماعیل علیہ السلام کو گھر میں موجود نہ پایا۔ ان کی بیوی کے پاس آئے اور ان سے ان کی بابت پوچھا۔ تو اس نے بتلایا کہ وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں باہر گئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا حال ہے؟“ اور اس سے ان کی گزران اور عام حالت کے بارے میں پوچھا۔ تو بیوی نے کہا۔

”ہم خیریت سے ہیں اور فراخی میں ہیں“ اور اس نے اللہ کی حمد و ثنا کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔

”تمہاری خوراک کیا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”گوشت۔“

انہوں نے پوچھا۔

”میتے کیا ہو؟“

اس نے کہا۔ ”پانی؟“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے اللہ!

اس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے اور اسماعیل علیہ السلام ان کو پتھر پکڑاتے جاتے اور دونوں کی زبانوں پر یہ دعا تھی۔

”اے ہمارے رب! ہمارا یہ عمل قبول فرما یقیناً“ تو بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ایک اور روایت میں (واقعے کا ابتدائی حصہ اس طرح) ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے کر نکلے ان کے ساتھ ایک مشکیزہ تھا۔ جس میں پانی تھا۔ پس اسماعیل کی والدہ مشکیزے سے پانی پئیں تو بچے کے لیے ان کی چھاتی میں دودھ خوب اترتا، یہاں تک کہ وہ مکہ آگئے۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے ان کو ایک بڑے درخت کے نیچے بٹھایا۔ پھر ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹے تو اسماعیل علیہ السلام کی والدہ بھی ان کے پیچھے چلتی رہیں، یہاں تک کہ جب وہ کدوا جگہ پر پہنچے تو حضرت ہاجرہ نے ان کو پیچھے سے آواز دی۔

”اے ابراہیمؑ! ہمیں کس کے سپرد کر کے چھوڑ چلے ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”اللہ کے۔“  
والدہ اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔ ”میں اللہ کے سپرد کیے جانے پر راضی ہوں۔“

اور واپس چلی گئیں اور مشکیزے سے پانی پیتی رہیں اور بچے کے لیے ان کی چھاتی میں دودھ اترتا رہا۔ یہاں تک کہ جب پانی ختم ہو گیا تو (دل میں) کہا۔ ”میں (ادھر ادھر) جاؤں اور دیکھوں تو شاید کوئی آدمی نظر آجائے۔“

راوی نے بیان کیا۔ چنانچہ وہ گئیں اور صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں اور خوب نظر دوڑائی کہ کیا کوئی نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ (پھر نیچے اتریں) جب اتر گئیں تو دوڑیں اور مرہ پہاڑی پر چڑھ گئیں۔

اس طرح کئی جگہ لگائے۔ (دونوں پہاڑوں کے درمیان) پھر (دل میں) کہا۔ میں جا کر بچے کو تو دیکھوں۔ اس نے کیا کیا۔ (اس کا کیا حال ہے؟) پس گئیں اور

اچھی حالت میں ہیں۔“  
حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا۔ ”انہوں نے کسی بات کی تلقین بھی کی؟“

بیوی نے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ وہ آپ کو سلام کہتے تھے اور آپ کو حکم دیتے تھے کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھیں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا۔ ”وہ میرے والد تھے اور دہلیز سے مراد تو ہے انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے اپنے پاس ہی رکھوں۔ (اپنے سے علیحدہ نہ کروں)“

پھر جب تک اللہ نے چاہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد پھر تشریف لائے۔ اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے تیر درست کر رہے تھے۔

جب اسماعیل علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو کھڑے ہو کر ان کی طرف بڑھے، پھر وہی احترام و محبت کا معاملہ کیا۔ جس طرح باپ اولاد کے ساتھ اور اولاد باپ کے ساتھ کرتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔  
”اے اسماعیل علیہ السلام! اللہ نے مجھے ایک بات

کا حکم دیا ہے۔“

اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔ ”آپ کے رب نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے وہ کریں۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”تو میری مدد کرے گا؟“  
انہوں نے کہا۔ ”میں آپ کی مدد کروں گا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہاں ایک گھر تعمیر کروں۔“

اور ایک ٹیلے کی طرف اشارہ فرمایا جو ارد گرد کے حصوں سے بلند تھا۔ چنانچہ اسی وقت اس خاص گھر کی دیواریں اٹھائیں۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام اس سے تعمیر کرتے، یہاں تک کہ جب دیواریں اونچی ہو گئیں تو (مقام ابراہیم والا) پتھر لائے اور وہاں رکھا۔ پس ابراہیم علیہ السلام

- 2- خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی۔
- 3- ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا پسندیدہ اور اس کے برعکس طرز عمل ناپسندیدہ ہے۔
- 4- رضائے الہی سے بے اعتنائی پر اگر باپ اپنے بیٹے کو بیوی کی بابت کہے کہ اسے طلاق دے دے تو بیٹے کو باپ کی اطاعت کرتے ہوئے ناشکری بیوی کو اپنے سے جدا کر دینا چاہیے۔



پیارے بچوں کے لئے

## قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

قیمت -/300 روپے

دیکھا تو وہ اسی حال میں تھا۔ گویا کہ وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے۔ چنانچہ ان کے نفس نے قرار نہیں پکڑا۔ (اور وہ زیادہ بے چین ہو گئیں) اور سوچا۔ میں (پھر) جاؤں اور دیکھوں۔ شاید کسی کو پا لوں۔ وہ پھر گئیں اور صفا ہٹاڑی پر چڑھ گئیں اور خوب دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سات چکر پورے کر لیے، پھر سوچا کہ جاؤں اور بچے کو دیکھوں کہ اس کا کیا حال ہے۔ وہاں آئیں تو اچانک ایک آواز کان میں پڑی۔ تو انہوں نے کہا۔ ”اگر تیرے پاس کوئی بھلائی ہے تو مدد کر۔“ وہاں جبریل علیہ السلام موجود تھے۔ انہوں نے اپنی اڑتی زمین پر ماری۔ چنانچہ زمین سے پانی پھوٹ پڑا۔ جسے دیکھ کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حیرت زدہ ہو گئیں اور اپنی ہتھیلیوں سے پانی سمیٹ کر مشکبندی میں ڈالنے لگیں اور راوی نے حدیث پوری تفصیل سے بیان کی۔

یہ ساری روایات امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہیں۔

فوائد و مسائل

1- اس میں ایک تو صفا مرہ کے درمیان سعی کرنے کے تاریخی پس منظر کی وضاحت ہے کہ حج و عمرہ کا یہ رکن حضرت ہاجرہ کے اس واقعے کی یادگار کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے محض اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے حکم پر اپنے شیر خوار بچے سمیت ایسی بے آب و گیاہ سرزمین پر رہنا قبول کر لیا تھا۔ جہاں کسی انسان کا نام و نشان تھا نہ کھانے پینے کا کوئی بندوبست۔ اللہ نے اس کا حسن صلہ یہ عطا فرمایا کہ ایک تو ان کے لیے زمزم کا چشمہ جاری فرما دیا جو وقتی طور پر ان کے لیے چشمہ آب حیات ثابت ہوا اور اس کا فیض عام اب تک جاری ہے۔ دوسرے صفا اور مرہ کے درمیان ان کی بے ٹامانہ دوڑ کو حج اور عمرے کا رکن بنادیا، تاکہ ہر حاجی اور عمرہ کرنے والے اس کو دہرائے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے۔



میں کسی اہم جگہ پر جاتی ہوں اور وہاں پر کمرشلز چل رہے ہوتے ہیں تو جب میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک عجیب خوشی سی محسوس ہوتی ہے۔

”اور لوگ آپ کو بے مزہ مکر دیکھتے ہوں گے۔ کیا کہتے ہیں جب ملتے ہیں تو؟“

”بہت عزت، بہت پیار سے ملتے ہیں، اور بے ساختہ کہتے ہیں ارے آپ تو اسکرین پر بڑی نظر آتی ہیں جبکہ آپ تو بہت چھوٹی ہیں۔ تو میں کہتی ہوں کہ میں اصل میں بھی چھوٹی ہی ہوں۔ اور یہ تو واقعی حقیقت ہے کہ اسکرین آپ کو اپنی عمر سے دو چار سال بڑا ہی دکھاتی ہے۔“

”آپ بتا رہی ہیں کہ آپ عمر میں بھی چھوٹی ہیں تو کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟“

”جی میری پیدائش 2 نومبر 1989ء کی ہے تو



باصلاحیت فنکار

## ایک فاطمہ سے ملاقات

شہزادہ رشید

آپ خود سوچ لیں۔ یہ بھی بتاؤں کہ مجھے سب پیار سے ”ارتج“ اور ”بیا“ کہتے ہیں جبکہ میرا اصلی نام ”اربیہ فاطمہ جعفری“ ہے۔ اور یہ بھی بتاؤں کہ میں ”میو ایس اے“ میں پیدا ہوئی۔ اور دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اس لیے لاڈلی بھی ہوں۔“

”ہوں۔ گند۔ دونوں بھائی بڑے ہیں کیا؟ اور ”میو ایس اے“ میں پیدا ہونے والی لڑکی پاکستان میں کیوں رہ رہتی ہے؟“

(خوبصورت ہمسی کے ساتھ) ”پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک بھائی مجھ سے بڑے ہیں ایک چھوٹا۔ اور میں اپنے دونوں بھائیوں اور والدین کی لاڈلی ہوں۔۔۔

نازک، کومل اور اچھے قد کاٹھ کی فنکارہ ”ارتج فاطمہ“ کو اس فیلڈ میں آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ دو سال ہی ہوئے ہیں مگر اس فنکارہ نے بہترین پرفارمنس سے اور اپنے اخلاق و کردار سے جگہ بنائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارتج فاطمہ آپ کو ہر وقت اسکرین پر نظر آتی ہے۔ کبھی کمرشلز میں تو کبھی ڈراموں میں۔

”ہر وقت اسکرین پر رہنا کیسا لگتا ہے؟“ ہم نے دعا و سلام کے بعد یہاں سوال کیا۔

”بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ اور ج بتاؤں مجھے تو اپنے آپ کو زیادہ دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ لیکن جب



دوسری بات یہ کہ میں پاکستان میں کیا کر رہی ہوں تو الحمد للہ پاکستان میں میرے دادا دادی ہیں اور میرے کزن وغیرہ بھی ہیں تو مجھے بہت مزا آرہا ہے یہاں رہ کر اور یہاں کام کر کے۔

”آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایک ”این جی او“ چلانے کی نیت سے پاکستان آئی تھیں۔ تو کیا اب وہ کام پس پشت چلے گئے؟“

”ارے نہیں۔ ایسا کچھ نہیں۔“ ”این جی او“ چلانا میرا مشن ہے اور میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ مجھے ایک ”سینم خانہ“ کھولنا ہے اور بچوں کے لیے کام کرنا ہے۔ کیونکہ میں نے چائلڈ سائیکولوجی میں پچھل کر لیا ہے اس کام میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ میں پہلے اسٹیبلیش ہونا چاہتی ہوں، مالی طور پر ٹھوڑی اسٹراٹج ہونا چاہتی ہوں، پھر ان شاء اللہ بھرپور طریقے سے کام کروں گی۔ ایسا کچھ نہیں کہ میں پیچھے ہٹی گئی ہوں۔“

”والدین بہت خوش ہیں میری شہرت سے۔ میری رفتار تھیں سے، میرے کام سے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر والدین اور بھائیوں کا تعاون نہ ہوتا تو بھلا میں کیا کر سکتی تھی۔“ اور والدین کے بارے میں بتاؤں کہ میری امی کا حلق ”ایران“ سے ہے اور والد کا حلق پاکستان سے ہے۔ دونوں ”یو ایس اے“ میں رہتے ہیں والد جاب کرتے ہیں جبکہ امی گھر کی ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ دونوں بھائی بھی یو ایس اے میں ہی ہوتے ہیں۔ ہمارا آنا جانا لگ رہا ہے۔“

”شادی کب کرنی ہے؟“

”وہ بھی ہو جائے گی۔ متنی تو ہو چکی ہے۔ والدین کی پسند سے ان شاء اللہ شادی بھی جلدی ہو جائے گی۔ میرے منگیتر میرے کزن بھی ہیں۔“

”شوہز میں انجوائے کر رہی ہو۔ اور آمد کیسے ہوئی؟“

”بالکل جی۔ بہت مزے آرہے ہیں بہت

انجوائے کر رہی ہوں۔ جب کام اپنی مرضی کا ہو تو مزا کیوں نہیں آئے گا۔ اس فیلڈ میں اپنے چاچو کی وجہ سے آئی اور مجھے نہیں پتا تھا کہ اس فیلڈ میں کامیابیاں میری منتظر ہیں۔“

”واقعی۔ کس نے پہچان دی اور کس طرح آگے بڑھیں آپ؟“

”سب اوپر والے کی مہربانیاں۔ پہلا کمرشل کیا تھا اور یوں شوہز میں آنے کی ابتدا ہوئی تھی۔ ایک نیلی کام کمپنی کا کمرشل تھا اور صرف ایک لائن ہی بولی تھی۔ اس کے بعد ڈرامہ سیریل ”ہزار داستان“ میں کام کرنے کی آفر آئی۔ تین ہفتوں یا یوں کہہ لیں کہ تین ہفتوں کی کمائی تھی اور زیبا بختیار نے ہماری ماں کا کردار کیا تھا۔ ایک سیریل ”سبز قدم“ میں چھوٹا سار ملتا تھا جس میں میں نے نیگیٹو رول کیا تھا۔ اور پہچان مجھے ڈرامہ سیریل بلکہ سوپ ”مرجائیں ہم تو کیا“ نے دی۔ اور ”ایکسا گل سی لڑکی“ نے دی۔“

”امریکہ سے آئی ہوئی لڑکی کو اردو بولنی کیسے آئی۔“

”یکھی یا گھ کا ماحول ایسا تھا کہ اردو بولی جاتی تھی؟“

”بس دیکھ لیں۔ اصل میں گھر میں تو ہم انگریزی



کرتا اور چوڑی دارپاجامہ پہنتی ہیں، وجہ؟ یہ کردار کا حصہ ہوتا ہے کیا۔“

”جبتاؤں جو ڈرہنسز ہمیں پہننے کو ملتے ہیں، وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آتے اس لیے زیادہ تر ڈرہنسز میں اپنے ہی پہنتی ہوں۔ اور مجھے چونکہ چوڑی دار پاجامہ زیادہ پسند ہے۔ اس لیے پھر میں وہی زیادہ پہنتی ہوں۔“

”آج کل سسرسل وغیرہ کا تو رواج رہا نہیں۔ تو پھر آپ کیا کرتی ہیں۔ سیٹ پر جا کر تھوڑی سسرسل کرتی ہیں یا بس کر لیا جوڑہ میں آیا؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے کہ جوڑہن میں آیا کر لیا۔ تو باقاعدہ سسرسل کرتی ہوں۔ سیٹ پہ بھی اور اپنے گھر میں شیشے کے سامنے بھی۔ جب سے میں نے کام شروع کیا ہے، مجھے اس کام میں اتنا مزہ آ رہا ہے کہ اداکاری میرا جنون بنتی جا رہی ہے۔ اور جب تک میں خود مطمئن نہیں ہو جاتی ریکش نہیں چھوڑتی۔“

”اس فیلڈ میں اگر کیا محسوس کیا اچھی یا بری۔ لوگ کیسے ہیں؟“

”ڈیکھیں فیلڈ کوئی بھی ہو۔ اس میں اچھائی اور برائی تو ہوتی ہی ہے۔ اس لیے صرف شوہر کو الزام نہیں دے سکتے۔“

”گویا اداکاری مشکل کام ہے۔ تو ماڈلنگ؟“

”محنت دونوں میں ہے اور میں محنت سے نہیں گھبراتی۔ مگر پھر بھی ماڈلنگ میں عین شروع ہی سے اپنے آپ کو ایزی محسوس نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ماڈلنگ میں پیسہ بہت ہے مگر پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی پسند اور ناپسند بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لیکن خیر اب تو عادت ہو گئی ہے۔“

”پیسہ جمع کرتی ہیں یا آزادیتی ہیں؟“

”ہرگز نہیں اڑاتی پیسہ کمانا آسان نہیں ہے پیسہ اڑانا آسان ہے۔ مگر میں یہ آسان کام نہیں کرتی۔ میرے والدین کی تربیت ایسی ہے کہ ہمیں فضول خرچی کی عادت نہیں ہے۔ کیونکہ وقت اور حالات کا

ہی بولتے تھے، اردو تو مجھے بس ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی۔ اور جب یہاں آئی تو مجھے بہت مشکل ہوئی، مگر پھر آہستہ آہستہ آئی گئی۔ شروع شروع میں ڈانٹا لگ پونے میں مشکل ہوئی تھی۔ بہت مشکل سے بولتی تھی۔ مگر زبان ہمیشہ سیکھنے سے نہیں بولنے سے پریش کرنے سے آتی ہے۔ سو مجھے بھی آگئی۔ اور اب تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں کہ میں کتنی اچھی اردو بول رہی ہوں۔“

”ابتدا میں ہی آپ نے ایک سیریل میں نگیٹو اور ایک سیریل میں ”ینگ ٹوائلڈ“ کیا۔ ڈر نہیں لگا کہ کہیں مخصوص نہ ہو جاؤں۔“

”نہیں بالکل بھی ڈر نہیں لگا۔ کیونکہ سب میرے

بارے میں جانتے ہیں۔ یگ ٹوائلڈ تو کردار کا ایک حصہ تھا۔ ہاں اگر میں ابتدا میں ہی اولڈ کردار کرتی تو شاید مشکل ہوتی۔ ”میرے ہم نشین“ میں میں نے یہ رول کیا تھا اور فائزہ حسن نے بھی تو یگ ٹوائلڈ کیا تھا۔ ہاں نگیٹو رول میں ڈر لگتا ہے کہ اگر لوگ پسند کرنے لگیں تو کہیں ایسے ہی رول نہ ملنے لگ جائیں۔ اس لیے ذرا احتیاط کرتی ہوں۔ سبز قدم میں نگیٹو رول ابتدا میں تھا بعد میں وہ پوزیٹو ہو جاتا ہے۔“

”نگیٹو رول میں — مقبولیت کے زیادہ چانس ہوتا ہے۔ اور یہ بتاؤ کہ اپنا بڑھاپا دیکھ کر کیسا لگا؟“

”قسم۔“ اپنا بڑھاپا؟ اچھا لگا۔ اچھی لگوں گی بڑھاپے میں۔ کافی بڑیا اور گر لیں فل۔ اور جہاں تک نگیٹو رول کی بات ہے تو ایسا نہیں کہ میں نگیٹو رول بالکل نہیں کروں گی، ضرور کروں گی مگر ہمیشہ نہیں کبھی کبھی۔ اور ہاں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میری خواہش کہ مجھے ”ساس“ کا رول کرنے کو ملے۔“

”اچھا۔۔۔ ساس کا۔۔۔ کیسی ساس لڑا کا یا مظلوم؟“

”بہتے ہوئے۔“ کوئی سا بھی۔ بس ساس کا رول

”میں نے دیکھا ہے کہ آپ زیادہ تر نسلوار قیص یا





کچھ پتا نہیں ہوتا اس لیے انسان کے پاس اپنی سیونگ ضرور ہونی چاہیے۔

”لوگ تعریف کرتے ہیں یا ایمانداری کے ساتھ تھوڑی تنقید بھی کرتے ہیں؟“

”سچ بتاؤں۔ مجھے تو تعریف ہی سننے کو ملتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ڈرامہ سیریل ”میری بیٹی“ ختم ہوا ہے اس میں میرے کردار کو بہت پسند کیا گیا۔ اور یہ کردار تھا بھی بہت اچھا۔ مجھے کرنے میں مزا آیا۔ تنقید اب نہیں ہوتی، شروع شروع میں ہوتی تھی۔ اور مجھے لگتا تھا کہ واقعی یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے اداکاری کب آتی تھی۔ اب تو شکر ہے کہ اللہ نے اپنا کرم کر دیا ہے۔“

”آپ نے بتایا کہ شروع شروع میں اردو نہیں آتی تھی تو ڈائریکٹر ز اور سینئرز کا رویہ کیسا ہوتا تھا؟“

”سینئرز نے تو کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کچھ تو صاف کہہ دیتے تھے کہ یہ ایک مشکل فیلڈ ہے آپ کو کچھ کرنا نہیں آتا یا آپ کو وقت لگے گا، مگر ڈائریکٹر مجھ سے خوش تھے اور ایک ڈائریکٹر نے تو کہا کہ آپ دیکھتے گا کہ ایک دو سال میں آپ ایک بہترین اداکارہ کہلا میں گی۔“

”اور ایسا ہی ہوا۔۔۔ ہے نا۔۔۔“

”جی بالکل۔۔۔ میں تو اپنی تعریف نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اچھا لگتا ہے جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔“

”اس فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“

”صرف اور صرف محنت اور اپنے کام سے کام۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اس فیلڈ میں اپنے آپ کو منوانا پڑتا ہے۔ مگر محنت کے ساتھ۔۔۔“

”آنے والے سیریلز میں کیا کیا ہے؟“

”آنے والے سیریلز میں“ ”ٹیک پل زندگی ہے تو“ اور مزید دو اور ڈرامے بھی ہیں مگر ابھی ان کے ناموں کا انتخاب نہیں ہوا۔“

”ملک سے باہر اپنی عمر کا زیادہ حصہ گزارنے والوں میں دو خصوصیات بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک ایمان داری دوسری وقت کی پابندی۔ ہمارے ملک میں دونوں کا فقدان ہے۔ مسئلہ ہوا؟“

”بالکل ہوا۔ ایمان داری تو اتنی آڑے نہیں آتی البتہ وقت کی پابندی کے معاملے میں خاصی پریشانی ہوتی۔ کیونکہ میں تو اپنی روٹین کے مطابق وقت پر ہی جاتی تھی مگر وہاں کوئی موجود ہی نہیں ہوتا تھا تو بڑی شرمندگی سی ہوتی تھی پھر مجھے بتایا گیا کہ یہاں پر جو لوگ وقت کی پابندی کرتے ہیں وہ بے وقوف کہلاتے ہیں۔“

”تو پھر چھوڑی عادت؟“

نہیں ہے۔  
”کہاں جانے کے لیے کبھی سستی نہیں  
دکھاتیں؟“

”بازار شاپنگ کے لیے بہت انجوائے کرتی ہوں  
اور صرف ونڈو شاپنگ نہیں کرتی سچ مچ خریدتی  
ہوں۔“

”کھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“  
”کہ میک اپ اناروں اور فریش ہو کر اپنے بستر پہ  
چلی جاؤں۔“

”کھر مری نیند سے اٹھنا کیسا لگتا ہے؟“  
”بہت بُرا ————— جب کوئی گھر مری نیند سے  
اٹھادے تو بہت غصہ آتا ہے۔“

”غصے میں کیا رد عمل ہوتا ہے؟“  
”کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ رونا دھونا شروع کر دیتی  
ہوں۔“

”تہوار شوق سے مناتی ہیں؟“  
”جی۔۔۔ بہت شوق سے مناتی ہوں۔ امریکہ میں  
تھی تو تہوار منانے کا مزہ نہیں آتا تھا۔ لیکن جب سے  
پاکستان آئی ہوں، ہر تہوار مناتی ہوں۔ بلکہ جمعہ کا دن  
تجھی خاص اہتمام سے مناتی ہوں اور اس دن خاص طور  
پر تیار ہو کر نماز پڑھنے کا بہت مزہ آتا ہے۔“

”اور کچھ کتنا چاہیں گی؟“  
”نہیں آپ نے سب کچھ تو چھ لیا۔“  
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔



### سرورق کی شخصیت

ماڈل ————— علیہ  
میک اپ ————— روز بیوی پارلر  
فوٹو گرافر ————— موسیٰ رضا



”ہرگز نہیں۔ میں کہوں اپنی عادت خراب کروں۔  
میں تو اپنے حساب سے ہی چلتی ہوں۔ تو اب یہ ہے کہ  
جب کام اشارت ہوئے لگتا ہے اس سے کچھ دیر پہلے  
بجھے بلایا جاتا ہے۔“

”فیوچر پلاننگ کیا ہے؟ ڈائریکشن یا پروڈکشن؟“  
”آپ کو پتا ہی ہے میری فیوچر پلاننگ کیا ہے۔  
انشاء اللہ این جی او ہی چلائی ہے۔ نہ ڈائریکشن کی  
طرف خیال ہے اور نہ ہی پروڈکشن کی طرف۔“  
”جب اداکاری سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اس  
وقت کے ڈرامے اب دیکھتی ہو تو کیسا لگتا ہے؟“

”نہی آتی ہے۔ لگتا ہے کہ میں نے بہت بڑا کام کیا  
ہے۔ مگر پھر دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اگر میں نئی تھی تو  
کیا ہوا۔ ڈائریکٹر تو مجھے ہوئے تھے انہوں نے جیسا کہا  
ویسا کیا۔ پھر اچھا کام کیا تو مزید آفرز آئیں۔ ورنہ نہ  
آئیں۔“

”تم سے کس نے کہا کہ تھوڑی سی موٹی ہو جاؤ۔“  
”لوگ بھی کہتے ہیں اور مجھے خود بھی احساس ہے  
اور اب تو پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہوں۔ ہر چیز کھاتی  
ہوں مگر بھڑی کچھ ایسی ہے کہ اس پہ گوشت چڑھتا ہی

# دستک دستک دستک

شاہین کرشید

غزالہ بٹ

”کیسی ہیں آپ۔؟“

”اللہ کا شکر ہے“

”کیا مصروفیات ہیں؟“

”بس آپ کو تو پتا ہی ہے ہم فنکاروں کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں بس وہ ہی مصروفیات میری بھی

ہیں۔“

”لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ پھر کم کیوں آتی

ہیں؟“

”میں ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ کرتی ہوں

اس لیے کم کم نظر آتی ہوں۔ اور ایک وقت میں ایک

کام اس لیے کرتی ہوں، تاکہ بہت توجہ کے ساتھ کام

کر سکوں۔ اور لوگ پسند کرتے ہیں یہ ان کی مہربانی

ہے۔“

”جیو بند ہوا کئی پروجیکٹ بند ہو گئے۔“

”جی بالکل۔ بہت برا ہوا جیو کے ساتھ۔ ہمارا سوپ

”ستارہ جہاں کی بیٹیاں“ بھی اس کی نذر ہو گیا۔ دیکھیں

کہ کب یہ آن ایئر ہوتا ہے۔“

”جب جیو کی سزا ختم ہوگی۔ اب کام کرنے کا انداز

اور ماحول بہت بدل گیا ہے۔ آپ کو عصہ آتا ہے یا

سب چلتا ہے؟“

”جی۔ واقعی ماحول اور انداز بہت بدل گیا ہے اور یہ

بات میں ہی کیا، جتنے بھی سینئر لوگ ہیں سب محسوس

کرتے ہیں۔ پہلے وقت میں لوگ محنت بہت کرتے

تھے۔ اب ذرا محنت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اب سب کو

ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔“



”اس سے تو آپ کے نزدیک ڈرامے کے معیار پر

بھی برا اثر پڑا ہو گا۔“

”اب سڑکیں سنسان کر دینے والے ڈرامے نہیں

بن رہے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے بھی نہیں بن رہے۔

لوگ اچھا کلام کر رہے ہیں۔ ہر دور کے اپنے تقاضے

ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایک جیسا ماحول نہیں رہتا۔ لیکن

چونکہ ہم ٹھیکر کے لوگ ہیں اور ذرا پرانے دور کے ہیں

تو ہمیں محسوس ہوتا ہے۔“

”آپ نے کہا کہ سڑکیں سنسان کر دینے والے

ڈرامے نہیں بن رہے۔ مگر میں اس بات کو نہیں مانتی

کیونکہ پہلے نہ صرف ایک ہی چینل تھا بلکہ لوگ بھی



تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور مجھے کردار میں  
ورائی چاہیے ہوتی ہے۔“  
”اب تو آپ سچ سچ نانی دادی ہوں گی۔ یہ کردار کیسا  
نبھارہی ہیں۔“

”جی اب تو میں سچ سچ نانی دادی ہوں۔ اور یہ حقیقی  
رول کس طرح نبھارہی ہوں تو یہ آپ کو —  
میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہی بتا سکتے  
ہیں۔ لیکن وہ ابھی چھوٹے ہیں۔ البتہ میرے بچے  
آپ کو بتا سکتے ہیں کہ میں کیسی نانی دادی ہوں۔“  
”ماشاء اللہ سے کتنے بچے ہیں۔ اور کیا آپ سب  
مل کر رہتے ہیں۔“

”جی میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ اور تینوں کی  
شادی ہو گئی ہے بیٹے کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور  
جبکہ ایک بیٹی کے دو بیٹے ہیں اور دوسری بیٹی کی شادی کو  
ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اور بیٹیاں تو ظاہر ہے کہ  
اپنے سرسرا میں ہوتی ہیں اور ہم اپنے بیٹے کے ساتھ  
تویوں سمجھ لیں کہ ہم مل جل کر جو اسٹ فیملی میں  
رہتے ہیں۔ اور میرے بچے اس فیملی میں نہیں ہیں۔“  
”چھ! بچے نہیں ہیں اس فیملی میں؟ جبکہ  
عموماً اگر خاندان کا کوئی ایک فرد اس فیملی میں آجائے تو  
سب کے راستے کھل جاتے ہیں؟“

”ہاں جی ہوتا تو ایسا ہی ہے، مگر میرے بچوں کو اس  
فیملی میں آنے کا شوق کبھی ہوا ہی نہیں۔ بیٹیاں ویسے  
ہی بیباکی گئیں اور بیٹے کو دلچسپی ہی نہیں ہوئی۔ اور پتا  
نہیں کیوں میرا خود بھی دل نہیں چاہا کہ بچے اس فیملی  
میں آئیں۔ سورنہ میں فورس کرنی تو وہ کیوں نہ آتے۔“  
”آپ کا دل کیوں نہیں تھا۔؟“

”ایک تو میں ان کا رجحان نہیں دیکھتی تھی پھر اس  
فیملی میں محنت اور خواری بہت ہے۔ مجھے تو میرا جنون  
لے آیا اس فیملی میں۔ اگر بیٹے کا رجحان نہیں ہے تو  
میں کیوں زبردستی کرتی۔ ٹھیک ہے وہ اپنی چھوٹی سی  
فیملی اور دنیا میں بہت خوش ہے۔“  
”سب سے پہلے آپ نے کس سیڑھی پہ قدم

فارغ ہوتے تھے۔“  
”کیا مطلب لوگ فارغ ہوتے تھے۔ کیا ہمیں  
کوئی کام نہیں ہوتا تھا؟“  
”مرے نہیں یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ  
نہ موبائل فون، نہ انٹرنیٹ، نہ فیس ایک اور نہ ہی up  
Whats۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ واحد تفریح ڈرامہ ہی  
ہوتا تھا۔“

”ہاں۔ یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس لحاظ  
سے تو واقعی ہم لوگ فارغ ہی ہوتے تھے۔ مگر پھر بھی ہر  
دور میں کوئی نہ کوئی مصروفیات نکل ہی آتی ہے۔“  
”کتنے سال ہو گئے ہیں آپ کو اس دشت کی سیاحتی  
میں؟“

”یہ اچھا جملہ استعمال کیا آپ نے۔ جناب  
1995ء سے اس فیلڈ میں ہوں اور نہ صرف  
اداکاری کی بلکہ تھیر بھی کیا اور ریڈیو بھی کیا۔ ریڈیو  
کے ڈراموں میں صداکاری بھی کی۔“  
”بے شمار کردار کئے۔ کوئی ایسا جس کو کرنے کی لگن  
ہو؟“

”جوانی سے اداکاری کا آغاز کیا اب بڑھاپے میں  
قدم رکھ لیا ہے تو ماشاء اللہ سے کردار تو میں نے سب  
ہی کر لیے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں تاکہ فنکار کبھی اپنی  
اداکاری سے مطمئن نہیں ہوتا۔ تو یہی حال میرا ہے۔  
مجھے ہمیشہ ہر کردار نیا ہی لگتا ہے۔ اور میں اسی طرح  
محنت کرتی ہوں جس طرح کوئی نیا فنکار کرتا  
ہے۔“

”ہوں۔ گڈ۔ جوانی میں بھی اولڈ رول کیے  
کیوں؟“

”کیوں کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ شاید مجھ میں  
جوانی سے ہی بوڑھی روح تھی۔ ایسا نہیں کہ مجھے جوانی  
والے رول ملتے نہیں تھے بلکہ مجھے خود ہی بیک رول  
کرنا پسند نہیں تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا ماں کے اور نانی  
دادی والے کردار کرنا۔ کیونکہ ان کرداروں میں کچھ نہ  
کچھ ضرور ہوتا ہے کرنے کے لیے۔ جبکہ بیک کردار



رکھا۔ ریڈیو، ٹی وی یا تھیٹر؟  
 ”میں نے پہلا قدم ریڈیو پر رکھا اور اس سٹیج پر کامیابی کے ساتھ عبور کرنے کے بعد میں نے ٹی وی کا رخ کیا بلکہ میں نے رخ نہیں کیا مجھے ٹی وی میں کام کرنے کی آفر دی گئی۔ اور اس کے بعد تھیٹر سے آفر آگئی۔ بس پھر ان کا سفر شروع ہو گیا۔ اور آج تک جاری ہے۔“

”آج کل صرف کام ہو رہا ہے یا گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھائی جا رہی ہیں؟“

”گھریلو ذمہ داریوں سے بھلا کیسے دور ہو سکتی ہوں۔ عورت کے لیے یہ ذمہ داریاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ پہلے میں ہی کھانا پکاتی تھی مگر اب ہونے لگتی حد تک یہ ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ میرے میاں صاحب کو میرے ہاتھ کا کچا بہت پسند ہے۔ اس لیے ان کے لیے اکثر کوکنگ میں جی کرتی ہوں۔“

مڈثر خٹک FM-104

”بیلو کیسے ہیں آپ؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ جو وقت اچھا گزر جائے۔“

”اب ابو ناراض تو نہیں ہوتے کہ کیوں ریڈیو پر پروگرام کرتے ہو؟“

”نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب کچھ نہیں کہتے کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے ابو میرے سب سے بڑے فین تھے تو جب انہیں پتا چلا تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے تم کب سے کر رہے پروگرام؟ میں نے بتایا تو کہنے لگے مگر وہ تو کوئی ”ارمان“ لڑکا ہے تو میں نے کہا کہ جی میں ہی ارمان ہوں۔ نام بدل کر اس لیے پروگرام کیا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ خیر پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔“

”اب کاروگرام ٹولا ہو رہا ہے۔ اپنی آواز کیسے سنتے ہوں گے آپ؟“

”میں نے آج تک اپنی آواز نہیں سنی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی آواز سن نہیں سکتا، بلکہ جج

بتاؤں مجھے اپنی آواز بہت بری لگتی ہے اس لیے اپنے پروگرام نہیں سنتا۔“

”لوگوں کو آپ کی آواز پسند ہے۔؟“

”جی جی۔ بالکل۔ اس لیے تو آج تک پروگرام کر رہا ہوں۔ ورنہ کب کا چھوڑ چکا ہوتا۔ اور یہ میرا خود سے وعدہ ہے کہ جس دن میں نے اپنی آواز سن لی۔ میں پروگرام کرنا چھوڑ دوں گا۔“

”ارے۔ اتنی بری لگتی ہے اپنی آواز؟“

”جی اتنی ہی بری لگتی ہے مجھے اپنی آواز۔“

”اور اپنی کون کون سی عادت بری لگتی ہے؟“

”جب میں غصہ بہت تیز ہے اور یہ ایک بری بات ہے۔ ویسے عام طور پر غصہ آتا نہیں ہے۔ مگر آتا ہے تو خالص چٹھاؤں والا آتا ہے۔ مگر یہ ایک اچھی عادت ہے کہ جب غصہ آتا ہے تو وہ جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔ بالی ایسی کوئی بری عادت نہیں ہے۔“

”کھانے مئے میں خرے دکھاتے ہیں؟“

”ارے بالکل بھی نہیں۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی کبھی ناشکری نہیں کرتا۔ سب کچھ مزے سے کھا لیتا ہوں۔“

”ریڈیو کے علاوہ فوج میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“



ہے اور میں اس میں بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ گندے کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں۔۔۔ اور شہرت حاصل کرنا بھی جنون میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسا ہے؟“

”میں 2005ء میں اس فیلڈ میں آئی۔ تھوڑا عرصہ کام کیا اور پھر اسکرین سے غائب ہو گئی۔ کیوں کہ مجھے اپنی میڈیسن کی پڑھائی مکمل کرنی تھی۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو پھر واپس اس فیلڈ میں آ گئی۔ اور شہرت حاصل کرنا جنون نہیں تھا کیونکہ اگر اچھی پرفارمنس دوں گی تو شہرت تو خود بخود ہی مل جائے گی۔“

”ڈاکٹر بننا خواہشات میں شامل تھا۔ یا بس اچھے نمبر آگئے تو یہ لائن لے لی؟“

”اصل میں میری والدہ ڈاکٹر تھیں اور میرے والد انجینئر۔ ان کی خواہش تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک پروفیشن میں بھی اختیار کروں۔ چنانچہ میڈیسن میں میرے نمبر اچھے آ گئے تو میں نے اس کو رد کر دیا۔ ساتھ پڑھا اور ویسے بھی میڈیسن مجھے پسند تھی۔“

”مستی مصروفیات میں گھریلو ذمہ داریاں بخوبی نبھالیتی ہیں۔“

”الحمد للہ۔ اللہ نے بہت باہمت بتایا ہے گھر کی کوکنگ، سجاوٹ دیکھ بھال، اپنے میاں کا خیال رکھنا سب کچھ کرتی ہوں اور ابھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور میں ہی کیا میرے میاں صاحب جو کہ ڈاکٹر ہیں وہ بہت اچھے لگ بھی ہیں، ابھی کبھی سچن کو ناگم دیتے ہیں تو مزہ آ جاتا ہے۔“

”پیسہ خرچ کرتی ہیں یا بچے۔“

”بچے؟۔۔۔ جمع کرنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ بہت کھلے دل کی ہوں بہت فراخ دلی سے خرچ کرتی ہوں۔ کیونکہ انسان کماتا کس لیے ہے۔“

”اور فرصت میں کیا کرتی ہیں؟“

”تقہ۔۔۔“ فرصت ملتی ہی کب ہے۔“

”ہماری فیملی میں بزنس کا بہت رجحان ہے۔ تو اس لیے انشاء اللہ فیوچر میں میرا بھی ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اور اس کے لیے میں انشاء اللہ ایم بی اے ان مارکیٹنگ کروں گا۔“

## ڈاکٹر عائشہ گل

”کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ!“

”جی الحمد للہ۔“

”ڈاکٹر کسلوانا اچھا لگتا ہے یا فکارہ کسلوانا؟“

”دونوں۔ کیونکہ میں جنرل فزیشن ہوں یہ اور بات ہے کہ اس فیلڈ میں آکر میں اپنے پروفیشن سے دور ہو گئی ہوں۔ لیکن انشاء اللہ بہت جلد اس فیلڈ میں آکر

پریکٹس کروں گی۔ اور فکارہ کسلوانا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے، کیونکہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔“

”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

”بس وہی، آپ کو پتا ہی ہے۔ بہت زیادہ کام نہیں کر رہی کچھ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے۔ لیکن کچھ ہیں پروجیکٹ انڈر پروڈکشن، جو انشاء اللہ جلد ہی آن ایر ہوں گے۔“

”ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے شوہر میں آنے کا خیال کیسے آیا؟“

”شاید اداکاری کے لیے ہی میرے رب نے مجھے پیدا کیا تھا، اس لیے مجھے اتنی کامیابی ملی۔ آکر میں اس فیلڈ میں کامیاب نہ ہوتی تو یقیناً ”واپس اپنی فیلڈ میں آجاتی۔ مگر ناظرین نے مجھے بہت محبت دی۔“

”صرف اداکاری تک محدود رہیں آپ یا کچھ اور بھی کیا؟“

”میں نے اداکاری کی فیلڈ میں سب کام کئے، سوائے پروڈکشن اور ڈائریکشن کے۔ میں نے فلم میں بھی کام کیا۔ کمرشل ماڈلنگ اور میگزین ماڈلنگ بھی کی اور ریپ پہ بھی اور کیٹ واک بھی کی۔ اور ڈراموں میں اداکاری چل رہی ہے بلکہ سوائے کیٹ واک کے باقی تمام کام چل رہے ہیں۔ یہ فیلڈ میرا جنون



# شعاع کے ساتھ اداکہ

منہیل ملک - لاہور

جواب سے واپس آکر میں اور ماما دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں، کیونکہ میں اکلونی بیٹی ہوں پھر نماز ظہر ادا کر کے ماما تھوڑا آرام کرتی ہیں تو میں رسالہ لے کر لیٹ جاتی ہوں اور دوپہر سے سہ پہر تک میں اور میرا رسالہ ہوتے ہیں (جناب جواب ملنے کے بعد میں اپنی پاکٹ

سے رسالہ خریدتی ہوں) پھر رات کے کھانے کی تیاری، ساتھ ساتھ عصر، مغرب بھی ادا کی جاتی ہے آٹھ بجے تک ہم لوگ کھانا کھاتے ہیں، مجھے پکانے کا شوق ہے اور میں نئی نئی ڈشز بھی ٹرائی کرتی ہوں۔ جسے میرے بابا بہت سراہتے ہیں۔ اس دوران ہی سارے گھر والے گپ شپ بھی کرتے ہیں۔

3۔ جی ہاں بہت سی کمائیاں ایسی ہیں جن میں مجھے لگتا کہ یہ میرے کردار کی جھلک ہے جیسے متوسط طبقہ کی ساری کمائیاں مجھے لگتی ہیں میرے متعلق ہیں۔ زیادہ تر میں خاموش رہتی ہوں مگر قریبی لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتی ہوں۔ رات کو چھت پر لیٹی ہوں تو رب کائنات کے بارے میں سوچتی ہوں۔

تقریباً "ساری ہی تحریریں میری پسندیدہ ہیں۔ ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا ہے پیغام ہوتا ہے، ہر تحریر سوچ کے نئے دروازہ کرتی ہے۔ پیر کامل۔ متاع جاں، جنت کے تپے، سدہ المستی، آمنہ ریاض، سائہ رضا، فرحت اشتیاق، نگہت سیما، بہت ہی زبردست ہیں البتہ مجھے رخسانہ نگار، عدنان بہت، بہت پسند ہیں کیا کبھی ان کا اثر پوشاں ہو سکتا ہے؟

4۔ خامیاں بھی ہیں، خوبیاں بھی ہیں۔ خوبیاں زیادہ خامیاں کم ہیں۔ ابو کہتے ہیں تم کسی کی بات برواشت نہیں کرتیں۔ میرا چھوٹا بھائی کہتا ہے تم اگر ایک دفعہ کسی کو اچھا کہہ دو تو سب کچھ اس پر لٹا دیتی ہو چاہے وہ

1۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ان رسالوں کی دنیا میں قدم رکھے۔ اس کی وجہ ادب کی دنیا سے ناپسندیدگی ہرگز نہیں، بلکہ مہنگائی ہے، کیونکہ ہمارے ہاں کبھی کسی فرد کا مکمل سوٹ ایک مرتبہ میں نہیں آیا تو رسالے کہاں سے خریدے جاتے، 60 روپے گز کا کٹن اور 60 کا رسالہ (60 کا رسالہ 10 روپے کمیشن لانے والے کے متر اب تو دینے پڑیں گے) آتے ہیں جاب کے سلسلے میں ایک آفس میں گئی تو وہاں ریک پر رکھے رسالے نظر آئے ان میں شعاع اور خواتین بھی تھے، رسالوں کا ناؤلوں کا اخبار پڑھنے کا نشہ تو شروع سے تھا مگر فری میں مل جائے تو کیا بات انتظار کے دوران میں نے رسالہ بھی ختم کر لیا پھر تو جہاں بھی یہ ڈائجسٹ مجھے نظر آتے ہیں پڑھ لیتی۔ خیر اس میں ایسی بھی شرمندگی کی کوئی بات نہیں کیونکہ میں نے کتابیں بھی ادھار ہی لے کر پڑھا ہے۔ لی اے تک چند کتابیں لے آتی پھر ان کے نوٹس بناتی پھر دے کر اگلی لے آتی بس۔ وقت گزر گیا۔ ماما بابا مجھے آب بر فرجے کہ آپ نے ہم چاروں بہن بھائیوں کو اتنی چٹنی کے باوجود پڑھایا، لکھایا۔ اللہ پاک آپ کو عمر خضر عطا کرے، صحت و تندرستی اور سکون دے آمین۔

2۔ میں صبح سویرے اٹھ جاتی ہوں، فجر پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت پھر آٹا گوند ہتی ہوں۔ اس کے بعد ماما کے ساتھ باہر کھیتوں میں واک کرنے جاتی ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد واپس آتے ہیں تو میں جاب پر جانے کی تیاری کرتی ہوں اور ماما پر اچھے بناتی ہیں۔ میں ناشتہ کر کے بھائی اور بابا کے ساتھ ہی نکل جاتی ہوں

نماز اور اس کے بعد تلاوت! میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں تو نماز وغیرہ سے فارغ ہو کے بس اپنے لیکچر دیکھ لیے اور ممتھس کی اسائنمنٹس وغیرہ (مجھے کوئی عمر رسیدہ خاتون مت سمجھا جائے میں بیس سال کی ہوں) پورا دن ویسے ہی گزرتا ہے جسے کوئی طالب علم یا ٹیچر گزار سکتا ہے، پھر زاور بکس، شام میں ٹیوشنز، اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں گھر کا کام نہیں کر پاتی۔

(بقول بہنوں کے مہمان جو ٹھہری) ہاں رات بس میری اپنی ہوتی ہے اگر میرے پہلے تو بڑھائی کی ٹینشن ہوتی تھی اب راوی چین ہی چین لگھتا ہے۔ بس جاب اور دیگر مصروفیات اور دن، رات کی اسی کشمکش میں وقت بہت تیزی سے لرگائے اڑ رہا ہے۔

رسالوں کے لیے ٹائم میں نکال لیتی ہوں رات کو جب بہت دیر تک جاگوں یا پھر کالج میں بھی، بشرطیکہ بڑھنے کا موڈ ہو۔

3۔ خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے میری ذات، زہن پ کہتی ہے تم دل کی بہت اچھی ہو! ہاں بد لحاظ ہو جاتی ہو۔ (اب جب سانس بندہ ہی ایسا ہو تو؟؟) ہاں میری اپنی نظر میں، میں جذباتی ہوں کچھ، ٹھہراؤ نہیں ہے میرے اندر، اور میں اپنی ذات کے بارے میں لاپرواہ بہت ہوں، خوبیاں یہ کہ محنتی ہوں اور بھی ہوں گی ڈھیر ساری!۔

تعریفی جملے بہت سارے ہیں جو میرے لیے سرمایہ ہیں اسپیشلی ممتھس کے حوالے سے میری ٹیچنگ کے حوالے سے۔

ابو کہا کرتے تھے ”شبم بہت اچھی بیٹی ہے۔“

بارش مجھے نہیں پسند ہاں جب ضرورت ہو تب دل کرتا ہے بارش ہو ویسے نہیں۔ عجیب سیلن سی ہو جاتی ہے ہاں یادگار واقعہ جب میں اور زہن پ برستی بارش میں اکیڈمی سے گھر آئے تھے وہ سارے لمحے بچپن کے جو تھیں بن کے اڑ گئے ہاں ان کے رنگ آج بھی تھیلیوں پر ہیں۔

تمہیں نقصان ہی پہنچائے البتہ بھی کبھی میں غلط نہ بھی ہوں تو خاموشی سے غلطی کو اپنے کھاتے میں ڈال لیتی ہوں۔ جلدی معاف کر دیتی ہوں کیونکہ میں لڑائی جھگڑے بھول جاتی ہوں ہمیشہ منانے میں پہل کرتی ہوں۔ کام آنے والی ہوں بغیر کسی غرض کے، میری ماما میری بہترین دوست ہیں ہر چھوٹی بڑی بات ان سے کہہ کر مطمئن ہو جاتی ہوں۔

5۔ بارش ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی ہے اور بارش کو انجوائے بھی کرتی ہوں اگر جاب پر نہ ہوں تو پکڑے یا سمو سے ضروری بناتی ہوں۔ بارش میں بھیکنا ہوا کے ساتھ رقص کرنا اچھا لگتا ہے۔ جب ٹھنڈی ہوا گالوں

کو چھو کر گزرتی ہے تو اک سکون سا محسوس ہوتا ہے۔

6۔ بہت سارے شعر یاد ہیں یہ شعر میٹرک میں میری ٹیچر نے میری ڈائری پر لکھا تھا۔

رہتے ہیں جو ادوروں کے لیے پیار کا جذبہ وہ لوگ جہمی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

### شبم شمشاد۔ یرنمان

بہاولپور کے پیارے شہر یرنمان سے تعلق ہے تو اس حوالے سے شہر یرنمان بہت خوش قسمت ٹھہرا، (بھئی! میں جو ہوتی ہوں وہاں)

جمال تک شعاع سے وابستگی کا تعلق ہے تو وہ تو شاید بچپن سے ہی ہو گئی تھی تب جب لفظ پڑھنے تو آتے تھے لیکن ان میں چھپی تلخ حقیقتوں کا ادراک نہیں تھا۔ کچھ اپنی طبیعت کی وجہ سے میں باقاعدگی سے نہیں پڑھتی تھیں ”کوئی لمحہ گلاب ہو“ سے لے کر ”مصحف“ تک باخبر ضرور رہتی ہوں۔ سرویوں کی خنک راتوں میں اور گرمیوں کی گرم دھپروں میں یہی تو ہے مشغلہ اپنا!

صبح کا آغاز تو ابوجی کی آواز سے ہوتا تھا لیکن 4 مئی کو ایک خوفناک حادثہ انہیں ہم سے بہت دور لے گیا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)

اب یہ سیٹ امی نے سنبھال لی ہے وہ روایتی سی صبح،



# ماہنامہ دین

ستمبر 2014 کا شمارہ شائع ہو گیا

✽ ”فصیح باری خان“ سے شامین رشید کی ملاقات

✽ ”عروۃ الوثقی“ کئی ہیں ”میری بی بی سنیہ“

✽ اس ماہ ”صدف مظار“ کے ”مقابلہ آئینہ“

✽ ”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ ”صارم خان“ سے ملاقات

✽ خیرہ سید کا سلسلے وار ناول ”اک ساگر ہے زندگی“

✽ ”شام آرزو“ فرحانہ ناز ملک کا سلسلے وار ناول

✽ ”دل اک شہر مال“ عتیق ملک کا طویل مکمل ناول

✽ ”قبری جستجو میں“ فوزیہ یاسین کا مکمل ناول

✽ ”ملن کی ساعتیں“ مصباح نوشین کا دلچسپ ناول

✽ ”میں دل میں مسافر“ رفاقت جاوید کا ناول

اختیاری مرام میں

✽ عظیمہ مظفر سید عثمان رفیع طاہر اور صبا جاوید کے افسانے

اور مستقل سلسلے

اس شمارہ کے ساتھ کون کتاب

رموزات اور تہوار پر مشتمل کرن کتاب

”رسم و رواج اور تہوار“

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مجھ سے مفت حاصل کریں

بارش کی بنیاد میں جانے کس کے اتنے آنسو ہیں  
صدیوں پہلے شاید کوئی صدیوں بیٹھ کے رویا ہے  
5 - پسندیدہ اقتباس کافی ہیں مگر یہ بہت پسند ہے۔

”دنیا کی مثال اندھیرے کی طرح ہے اور دین کی  
مثال روشنی جیسی ہے اور ہمیں آگے اندھیرا اس لیے  
نظر آتا ہے کیونکہ ہم دنیا کو آگے رکھنے کے عادی ہیں  
اور جب دنیا ہمیں رو کرتی ہے تب دین یاد آتا ہے تو  
بات یہ ہوتی کہ ہم دنیا کے اندھیرے سے تھک کر اپنے  
اللہ کے پاس آتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ دنیا  
میں کھو جاتے ہیں، استقامت نہیں ملتی ہمیں۔ کیونکہ  
ہمارے اعمال میں اخلاص نہیں ہے۔“

ایسا کچھ خاص تو اپنا کردار نہیں محسوس ہوا کبھی کسی  
میں ہاں۔ ہر وہ لڑکی جو حساس ہو، مختفی ہو اور ہم

لڑکیوں کے خیر تو گندھتے ہی محبت سے ہیں۔ بس  
سارے کردار اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ پسندیدہ ناول  
بہت ہیں۔ مجھے مطالعے کا شوق ہے اس لیے کتابیں  
بہت پڑھتی ہیں۔

دل کی دینا بند لے والا پیر کامل ہوا پروین شاکر کی ہجر  
میں ڈوبی شاعری سب بہت پڑھا ہے۔ پسندیدہ شعر بھی  
بہت ہیں۔ بس ایک لکھ رہی ہوں میرا انتخاب کیسا  
لگا۔ ضرور بتائیے گا۔

سلیجھا ہوا سا فرد سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ  
الجھا ہوا سا مجھ میں کوئی دوسرا بھی ہے

نور سحر..... چونیاں

(1) : شعاع سے وابستہ ہوئے قریباً ایک دہائی کا  
عرصہ گزر چکا ہے اور یہ صرف وابستگی نہیں رہی  
دلپسندی بن چکی ہے اور اس حوالے سے دلچسپ  
واقعات تو بہت ہوا کرتے تھے جب زندگی دلچسپ ہوا  
کرتی تھی اب تو۔

انہیوں کا دور ہے اور ہم ہیں دوستو  
باہل کے آگن میں جب ہوا کرتے تھے تو شعاع  
پڑھنے کی، منگوانے کی اتنی جلدی ہوتی تھی کہ کئی بار



کتابوں کا مطالعہ کرتی ہوں ڈائری لکھتی ہوں بہنوں کے ساتھ باتیں ، کہانیوں پہ تبصرے کرتی ہوں بہت زیادہ اور اونچی آواز میں سنتی ہوں اور ماں کی گود میں سر رکھ کر روتی ہوں۔

میرے خالص اور سچے دوستوں میں میرا خدا میری ماں اور میرا شعلع خدا تو ہے ہی صبور اور رہنما۔ ماں آنسو پونچھ کر پیار کرتی ہیں دعا دیتی ہیں تو شعلع جینے کی نئی راہیں دکھاتا ہے نئے حوصلے بخشتا ہے اپنے اور اُن کے بکھری مثالیں پیش کرتا ہے تو اس کے گرد اپنی زندگی کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

(3) : نگہت سیما میری پسندیدہ مصنفہ ہیں ان کی تقریر ”ہر تحریر یاد رہتی ہے“ محبت کی دھیمی دھیمی آواز اچھی لگتی ہے ان کی تحریروں میں ، خوب صورت آنکھوں گندمی رنگت اور لابی انگلیوں والے آرڈسٹک ہاتھوں والی ہیروئن سب سے جدا ہے۔ نہ ہی نہایت حسینہ جملہ اور نہ ہی بہت بد صورت ہوتی ہے۔ خدیجہ علیزہ اور ارب فاطمہ کی طرح اور سب سے بڑھ کر جذبہ حب الوطنی اپیل کرتا ہے اس حوالے سے ان کی تحریر ”جس دھج سے کوئی مقل میں گیا“ بہت خوب اور یادگار تحریر تھی۔

سعدی حمید چودھری کی تحریروں میں آتش عشق میں سلگتی لڑکی سے بہت اپنا پن محسوس ہوتا ہے میں جتنا زیادہ سعدی کو پڑھتا چاہتی ہوں وہ اتنا ہی کم لکھتی ہیں ”سب مایا ہے“ بیش یاد رہے گی یہ کہانی۔ مجھے جلا کر جسم کر دینے والا عشق اڑکیٹ کرتا ہے۔ سب مایا ہے اور عشق آتش (کنیز نبوی) میں بیان کیے گئے عشق کی طرح کا۔ کیوں کہ میرے خیال بھی اس شعر کے شاعر کے جیسے ہیں۔

اگر دل بار ہی بٹھے میرے ہم دم محبت میں جزا کیسی ، سزا کیسی ، فنا کیسی ، بقا کیسی سعدیہ عزیز آفریدی بہت منفرد لکھتی ہیں ان کی زیادہ تر تحریروں حقیقی رشتوں کی محبت کی چاشنی میں

ایسا ہوا کہ اگلی قسط جانے کی بے چینی میں نیا مہینہ شروع ہونے کے پہلے ہی دن کسی کام والی یا کسی سچے کو نیا شعلع لینے بھیجنا تو نیا شمارہ نہ آیا ہونے کی صورت میں دکاندار نے پیسے پور کر پچھلے مہینے کا شمارہ ہی تھما دیا کرنا تو شعلع کے کئی شمارے ایک ہی مہینے کے ڈبل ڈبل آجایا کرتے تھے۔ اب تو تقریر ”یہ حال ہے کہ اپریل کا شمارہ جولائی میں اور جولائی کا ستمبر میں پڑھ رہے ہوتے ہیں بلکہ تازہ ترین واردات تو یہ ہے کہ شعلع پڑھنے پہ پابندی ، کتاب پکڑنا جرم شاعری لکھنا پڑھنا کسی پرانے عاشق کو یاد کرنے کی کوشش ٹھہرتی ہے سو یہ بھی دلچسپ واقعہ ہی ہوا ناں؟

(2) : صبح کا آغاز حق بندگی ادا کرنے کی کوشش سے ہوتا ہے۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں یہ علم نہیں لیکن کوشش کرنا ہی ہمارے بس میں ہے اور اس کی ہمیں ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ سورۃ بنی میں فرمان ربی ہے۔

”اور جو شخص آخرت کی بھلائی چاہتا ہو اور اسی کے لیے جیسے کوشش کرنا چاہے دے کوشش کرے اور ایماں دار ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش خدا کی بارگاہ میں قبول ہوگی۔“

نماز تلاوت ذکر اذکار کے بعد کچھ دیر باہر کی ٹھنڈی فضا میں چل قدمی کرتی ہوں۔ اس کے بعد حقیقی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجازی خدا کے احکامات کی تعمیل میں جو دوڑیں لگتی ہیں تو تب تک پہلا سپر گزر کر دوپہر ہونے کو ہوتی ہے۔ صاحب بہادر کی رخصتی عمل میں آنے کے بعد سے ان کی واپسی تک کے چند گھنٹے کسی حد تک میرے اپنے ہوتے ہیں آزادی کا ہلکا سا احساس رہتا ہے شام تک کام بھی وہ سارے نمٹاتی ہوں جو شادی شدہ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ شعلع کے لیے وقت تب نکلتا ہے جب اپنی نگمشہ جنت اپنے باہل کے دیں اپنی اماں کے آئینہ میں قدم رکھتی ہوں تب میرا سارا وقت میرا اپنا ہوتا ہے۔ گزشتہ مہینوں کے شعلع و خواتین پڑھتی ہوں

گندھی ہولی ہیں جیسا کہ اماں کا شفو بہت زبردست  
تحریر بھی گو کہ اماں کا شفو۔ جسے کردار حقیقی زندگی  
میں ہم یاب ہیں مگر تاباں نہیں کہ یہ معاشرہ ان ہی  
جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہے۔

سعدیہ عزیز اور سعدی حمید دونوں فلسفہ بہت  
زبردست لکھتی ہیں۔

مکمل طور پر اپنی جھلک کہیں بھی نہیں دکھی مگر کسی  
نہ کسی کردار میں کوئی نہ کوئی بات یا عادت اپنی ضرورت دکھ  
جاتی ہے کیوں کہ یہ کہانیاں بھی ہم ہی لوگوں کی ہوتی  
ہیں کہ۔

افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا۔

(4) : یہ سوال خاصا مشکل ہے جس کا آسان ترین  
جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہلہائی جاناں میں کون؟  
(اپنی خوبیاں خامیاں خود بتانا آسان تو نہیں ناں!)  
بہر حال کچھ نہ کچھ جواب دینے کی کوشش کرنی ہوں۔

لوگوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے وقوف بن  
جاتی ہوں اکثر، آنسو میری کمزوری ہیں۔ کسی سے لڑائی  
ہو جائے تو دل میں غصہ رکھ کر اسے بلا نہیں سکتی، دل  
میں زہر بھر جاتا ہے اس کے خلاف، پھر بولنا تو دور کی  
بات اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی کہ میرے لیے۔

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا  
بہت کمٹن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستان بہار لکھنا!

راجھی چیز یہ ہے کہ نفرت میرے دل میں زیادہ ٹھہر  
نہیں پاتی۔ غصہ ختم ہو جائے تو صلح کرنے میں پہل  
کرتی ہوں اکثر معاف کر دیتی ہوں غلطی میری ہو تو  
احساس ہو جانے پر معافی مانگ بھی لیتی ہوں پھر انا کا  
مسئلہ نہیں بناتی! بچوں سے کتابوں پھولوں خوشبوؤں  
شاعری سے فطرت کی رنگینیوں سے پیار ہے۔

انسانوں سے نہیں انسانیت سے پیار ہے۔

(انسانوں میں اگر انسانیت نہ ہو تو ان سے پیار کیا

بھی نہیں جاسکتا)

میرا المیہ یہ ہے کہ لوگ مجھ سے خوش نہیں رہتے  
یا یوں کہنا بہتر ہو گا کہ میں لوگوں کو خوش نہیں رکھ پاتی،

میرے رشتہ دار اور دوست احباب (جو کہ نہ ہونے کے  
برابر ہیں) سبھی مجھ سے ٹالنا ہیں جس کی وجہ میرے  
خیال میں تو یہ ہے کہ میں کہہ دیتی ہوں (کنے) نہ کنے  
والی ہر بات) اور آج کے دور میں کہہ دینا ناقابلِ معافی  
جرم ہے کہ تو نے سچ بولنے کی جرأت کی یہ بھی تو ہیں  
ہے عدالت کی قتل صرف جان سے مارنا ہی تو نہیں  
ہوتا۔ قتل لفظوں کے تیروں سے، لہجوں کی تلواروں  
سے رویوں کی برچھوؤں سے بھی تو ہوتا ہے سو روز  
جیتے ہیں روز مرتے ہیں۔

یہ پتھروں کا دور ہے رت ہے صلیب کی  
بن کو ہوسر عزیز وہ ہٹ جائیں راہ سے  
تعریفی جملہ؟

بہن کی نند کے میرے بارے میں یہ الفاظ (جو  
انہوں نے میری متوقع سسرال کے بارے میں سن کر  
میری بہنا سے کہے تھے)

”سچ موتی جیسی تمہاری بہن اور تمہارے ابو  
اسے کہاں پھنسا رہے ہیں وہ لوگ (موجودہ سسرال) تو  
اسے رول دیں گے۔“

یہ تعریف سن کر اچھا بھی لگا تھا اور دکھ بھی ہوا تھا  
(کہ ان کا تجزیہ درست ثابت ہوا) پر مجھے کسی سے شکوہ  
نہیں کہ یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں۔

کوئی تو فیصلہ کرنا ہے پتھر کے مقدر کا  
کے ٹھوکر پہ رکھنا ہے کسے بھگوان ہوتا ہے

(5) : ساون اور دم جھم برسات کا موسم مجھے بہت  
پسند ہے۔ برسات میں جب سیاہ گھٹاؤں کے ایک دم  
سے آکر نیلے آسمان کو ڈھک لینے کے نتیجے میں جو  
خوفناک سا اندھیرا اچھا جاتا ہے ہر طرف اس سے مجھے  
بہت ڈر لگتا ہے وہ برسات تاریکی میرے دل میں خوف  
اور بے چینی بھر دیتی ہے میں تب تک بہت مضطرب  
رہتی ہوں جب تک بارش رُک نہ جائے یا مطلع  
صاف نہ ہو جائے۔

تیز ہواؤں اور شوریدہ سر آندھیوں والی طوفانی

مارش اچھی نہیں لگتی۔ دھیمی اور خاموش بارش اچھی



ہر اک گھر پہ مسلط ہے ویرانی دل کی  
سارے شہر پہ سایہ میرے مکان کا ہے  
اب یہ آخری شعر ان لوگوں کے نام میں جن کی  
توقعات پر پورا نہیں اتر پاتی اور انہیں مجھ سے بہت  
شکوے ہیں۔

جو ہو سکے تو بھلا دینا رنجشیں دل کی  
کہ محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا  
تیرے طرزِ تعارف سے کیا گلہ ہم کو  
ہمیں آتا ہی نہیں دلوں میں گھر کرنا

پسندیدہ کتابیں بہت سی ہیں مگر سب سے زیادہ  
قرآن مجید ہے جو کہ سب سے بڑھ کر بھی ہے۔ وہ نسخہ  
کیسا جو نشانِ منزل ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات  
بھی ہے جس کو جتنا سمجھ کر اور گہرائی سے پڑھا جائے  
اس فانی دنیا سے دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا جاتا ہے اور اس  
پر ہی عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہوا جاسکتا  
ہے۔ اقتباسات بھی اسی کتاب ہدایت میں سے۔۔۔

”مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی آرائش ہیں اور  
تیرے پروگار کے نزدیک باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں  
تو اب میں اور بہتر ہیں آرزو رکھنے میں۔“ (سورۃ کہف)

”اور اگر اللہ بندوں کو ان کی نافرمانیوں پر جھٹ پکڑ  
لیا کرے تو زمین پر ایک جاندار باقی نہ چھوڑے مگر وہ ان  
کو ایک مقررہ وعدے تک مہلت دیتا ہے جب ان کا  
وقت آن پہنچتا ہے تو ایک لمحہ آگے یا پیچھے نہیں ہو  
سکتے۔“ (سورۃ فجر)

”اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ کی رحمت  
سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔۔۔“ (سورۃ  
یوسف)

”جو کوئی اللہ سے ڈرے اور صبر کرے تو اللہ نیک  
لوگوں کا حق برباد نہیں کرتا۔۔۔“ (سورۃ یوسف)



گنتی ہے جس میں بوندوں کے ٹپ ٹپ کے سوا کوئی  
آواز نہ ہو گویا محبوب کے ہجر میں کوئی آنکھ برس رہی  
ہے (ساون رت کے حوالے سے چند سال پہلے کی  
ایک خوب صورت یاد دل پر نقش ہے۔ وہ میرا جہنم دن  
تھا جب اس بات پر کہ ”آج کسی کو میری سالگرہ یاد  
نہیں“ باہر برسات اور اندر میری آنکھیں برس رہی  
تھیں دل ادا سی سے بھر رہا تھا کہ چپکے سے میرے پیچھے  
آ کر میری ہنوں نے ایک دم شور مچا دیا ”ابھی برقعہ  
ڈھے ڈیر سسٹر“ اور ساتھ ہی دونوں نے اپنا اپنا تحفہ  
مجھے پکڑ لیا۔ جب میں نے ان گفتگوں کو ٹھوٹا تو دو  
خوب صورت ناول ”باروفا اور میرے دل میرے مسافر“

ہاتھوں میں تھے۔ بہت سرباز رنگ تھا یہ سب  
میرے لیے بہت اچھا لگا تھا۔ ہنوں کا سالگرہ یاد رکھنا اور  
اتنی بہترین کتابیں تحفے میں دینا۔ جبکہ اس کے کچھ دیر  
بعد بارش میں نمنا اور اک دوجے کے پیچھے بھاگنا بھی یاد  
آ رہا ہے۔ بے انت خوشی کے انمول لمحے تھے جو بیت  
گئے بھی نہ لوٹنے کے لیے۔ وقت گزر جاتا ہے وقت  
گزر رہا ہے پر ذہن و دل پر وہ نقش یادیں سنبھال رکھی  
ہیں کہ قیمتی سرمایے کی طرح۔ نہ وہ عمر لوٹ سکتی ہے  
نہ ہی گزرے ہوئے ساون کے وہ دن پر تصویر کی  
صورت وہ یاد محفوظ ہے ذہن کے اہم میں۔ جب جی  
چاہا نکال کر دیکھ لی۔

بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی، مگر مجھ کو لوٹا دو  
بچپن کا ساون وہ کانڈ کی کشتی وہ بارش کا پانی  
(6) : پسند کے شعر تو بہت سارے ہیں لیکن ابھی  
لکھے تو نہیں جاسکتے، سو یہ چند ایک حاضر خدمت ہیں۔  
جو پسندیدہ ترین کی لسٹ میں سے ہیں۔

ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو  
نفرتیں کچھ نہیں کہتیں، وفائیں مار دیتی ہیں

کیا ضرر کیا فائدہ کچھ رکھا نہیں حساب کبھی  
عمر بھر اس دل کو لا حاصلی اچھی لگی



# دھک دھک دل سے بول ... مرحباً اسپغول



- ✽ مرحبہ اسپغول ہائی بلڈ پریشر کو کم کرتا ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول بولسیر اور اس سے متعلقہ درد کو کم کرتا ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول دل کے امراض کی اصلاح کرنے میں معاون ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول اسہال و پچیش کی بیماری میں کارگر ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول کولیسٹرول کی مقدار کم کرتا ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول قبض سے نجات دلاتا ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول بلڈ میں شوگر کی مقدار کو کنٹرول کرتا ہے۔
- ✽ مرحبہ اسپغول وزن کم کرنے میں مفید ہے۔

f Marhaba Laboratories

UAN: 111-152-152

www.marhaba.com.pk

## رخسانہ نگار عدنان

# ایک تھی تھی

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحہ بینا بہو سے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دونوں ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ذکیہ کی وادعات میں قفل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔ اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقبولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی









رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زہیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زہیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سواور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابا رشن ہو جاتا ہے۔ عدیل خرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہونو ناراض رہتی ہے اور اپنا سال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی باہم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے باہم کو پتا چلتا ہے کہ زہیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروز ہے۔ بہت کوششوں کے بعد باہم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشری کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا رچا کو ادا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چٹھیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

انسپیکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بھگا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپیکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشری کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو نوٹنے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشری کا سابقہ منگیترا حسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گریں کارڈ کے لالچ میں بشری سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور دوبارہ بشری سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشری اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوہ کرتا ہے مگر بشری قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ سیفی کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال بشری کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالا خرہ عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشری کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زہین تنگ بشری

اور عدیل کے لئے بچوں کی پیدائش کے بعد بڑا جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر سمجھا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشی ٹنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آگرا سے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چل جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش" امریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔ مثال، 'واثق' کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریہ کو اپنے بیٹوں وقار و قاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور 'واثق' بہت خوش ہوتے ہیں۔ مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

## انیسویں قسط

وہ بہت خاموشی سے گھر کے کاٹھ کباڑ سے اٹے اسٹور بنے کمرے کی صفائی میں جتی ہوئی تھی۔ اس نے سارا بھاری ہلکا کاٹھ کباڑ کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔

اسے یاد تھا۔ مرنے سے کچھ ماہ پہلے عفت نے نسیم کو اس چھوٹے سے ایک کھڑکی والے تنگ کمرے میں شفٹ کروا دیا تھا۔

"امی! آپ کا کمرہ ہمارے بیڈ روم سے کافی فاصلے پر ہے، جبکہ یہ کمرہ ہمارے بیڈ روم کے پیچھے ہے لیکن قریب ہے۔ رات میں آپ آواز سن دیتی رہتی ہیں اور مجھے پتا نہیں چلتا۔ اس کمرے سے مجھے آپ کی آواز صاف سنائی دیا کرے گی۔ میں نہ سہی عدیل تو سن ہی لیا کریں گے۔" عفت نے بہت چالاکی اور صفائی سے نسیم کا کشادہ کمرہ پری کو دیتے ہوئے عمر رسیدہ ساس کو یوں طریقے سے بھلا دیا تھا۔

یہ الگ بات کہ نسیم کی آواز رات تو کیا دن میں بھی گھر کے افراد کم ہی سن پاتے تھے۔ سن بھی لیتے تھے تو ان سنی کر دیتے تھے۔

مثال جن دنوں یہاں ہوتی، وہ نسیم کی فل ٹائم اینڈینٹ ہوتی تھی۔ نسیم کی دیکھ بھال کی وجہ سے اکثر عفت اس سے بہت سے کام نہیں کہہ پاتی تھی۔ نسیم کو پرانی باتیں دہرانے اور دہراتے چلے جانے کی عادت تھی۔ جن میں مثال کی ماں کی باغی طبیعت اور فسادِ فطرت جیسے بھولے بسرے سارے فسانے ہوتے تھے جنہیں مثال کے لیے منہا مشکل ہوتا۔ مگر وہ کان لپیٹے کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی رہتی۔

اسے آج رات بھر سوچ سوچ کر اپنے باپ کے گھر میں رہنے کے قابل ہی کرانگا تھا۔

جب وہ چندہ دنوں کے لیے آتی تھی تو عفت اسے کبھی برآمدے میں سلا دیتی کبھی اوپر والے اسٹور میں۔ کبھی عدیل کے سامنے دکھاوا کرنا ہوتا تو پری کی منت کر کے اسے پری کے کمرے میں میٹرس لگا کر سونے کی اجازت مل جاتی۔

اور انبال تو مثال سے عداوت کے معاملے میں بہن سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں سب گھر والوں سے الگ مزاج کا تھا۔

انتہائی غصیلًا خود غرض ہندی اور جھگڑالو بنس سے پنگالینے کی ہمت عفت میں بھی نہیں ہوتی تھی۔  
عذیل کے سامنے وہ کچھ دبا رہتا۔ کم گو اور لا تعلق۔

اس کے کمرے میں جانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ پری اور ماں کو بھی اس جرات پر گید کر رکھ دیتا تھا  
چودہ پندرہ سال کا لڑکا اس پورے گھر میں دہشت کی علامت تھا۔ صرف یہی ایک کمرہ تھا جو ٹپلے پورشن کے بالکل  
اختتام پر تھا اور گھر میں فاتو تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ کیوں آتے ہی گھر میں اٹھا بیٹھ لگا دی ہے تم نے۔ کیا ان کے گھر سے کوئی ڈراؤنا  
خواب دیکھ کر آئی ہو۔“ اور تن وہی سے دیواریں جھاتے مثال کے ہاتھ وہیں ٹھک کر رک گئے۔  
عفت نے کتنا درست اندازہ لگایا تھا۔

ڈراؤنا خواب ہی تو تھا وہ سب جسے وہ بھلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔ شاید کبھی نہیں۔  
”ٹھیک کہا آپ نے ہمت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں نے۔“ وہ پھر سے اطمینان کے ساتھ دیواریں جھاڑنے  
لگی۔

”کیا مطلب؟“ عفت اس کے لہجے پر ٹھٹکی۔

”دادو آئی تھیں میرے خواب میں۔“ وہ اب دروازہ اور کمرے کی اکلوتی کھڑکی کو پوری طاقت کے ساتھ جھاڑ  
رہی تھی۔

ایک تو اس کے ساتھ بڑے بڑے تین سیاہ بیگ دیکھ کر ہی وہ خوف زدہ ہو گئی تھی ”اوپر سے اس لڑکی کے انداز!  
”کہہ رہی تھیں۔ تم لوگوں نے میرے کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں اس کمرے میں تھوڑی بہت  
جتنی بھی ہو سکتی تھی اللہ کی عبادت کیا کرتی تھی۔ اس کباڑ کی وجہ سے وہ بھی مجھ تک نہیں پہنچ پڑی۔“ مثال  
پوری بنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

عفت کی آنکھوں میں الجھن بڑھ گئی۔

”کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔“ وہ جھلا کر اس کے دروازے کے پاس پڑے ہوئے خوب پھولے بیگوں کو پاؤں کی  
ٹھوک سے چیک کرتے ہوئے کوفت سے بولی۔

”دادو کی عبادت اس کمرے میں چھن کر رہ گئی ہے۔ اسے باہر نکلنے کا رستہ نہیں مل رہا۔ دادو نے خواب میں  
آکر میری منت کی ہے کہ جب تک یہ کمرہ خوب صاف نہیں ہو جاتا، اس میں کوئی بسیرا نہ آئی میں۔ کوئی رہنے  
نہیں لگ جاتا۔ ان کی عبادت میں چھٹی رہے گی اور اس کا ثواب بھی انہیں نہیں مل سکے گا اور وہ ہماری اس  
سستی کی وجہ سے ہو سکتا ہے عذاب میں ہوں۔“

عفت کا جی چاہا اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالے۔

”کھمبہ نے کیسی کہانی گھڑی ہے عذیل تو اس بکواس پر فوراً ہی ایمان لے آئے گا۔“

ابھی تک وہ ماں کو یوں یاد کرتا تھا جسے وہ ابھی بھی موجود ہوں۔

”یہ تھیلے بھر بھر کر سامان کیوں لے کر آئی ہو؟ کیا ماں نے دھکے دے کر نکال دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔“ عفت  
بہت دیر تک اپنے تجسس کو چھپانہ سکی۔

”ایسا ہی ہوا ہے اس بار۔“ مثال نے گہرا سانس لے کر تنقیدی نظروں سے صاف دیواروں، دروازے اور  
کھڑکی کو دیکھا۔ فرش پر اب صرف دھلائی کا کام رہ گیا تھا۔ پھر یہ کمرہ مکمل طور پر اس کو اپنانے کے لیے تیار تھا۔  
”آپ اتنی اچھی ہیں، اتنی مہربان اور خیال رکھنے والی۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں۔ آپ کی نیک طبیعت کا



چرا کرنے سے خود کو روک نہیں پاتی۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔  
عفت کو اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ مگر ابھی وہ برواشت کرنا چاہتی تھی۔  
”تم یہ سب کیوں لے کر آئی ہو؟“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”ممانے مجھے اپنے شوہر کے گھر سے نکال دیا ہے۔“ وہ چہرے پر زمانے بھری مظلومیت سجا کر بولی۔  
”کیونکہ میں نے ان کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آپ سے اچھی تو میری عفت ماماں، جو میرا بہت خیال رکھتی ہیں اور وہ مجھے اپنی پری سے بڑھ کر چاہتی ہیں اور اہمیت دیتی ہیں تو میری سکی ماں کو جیسے آگ لگ گئی۔  
میرا سامان اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا اور صاف کہہ دیا کہ جاؤ اپنی عفت ماماں کے ساتھ ہی رہو، ہمیشہ کے لیے سو میں آگئی فی الحال تو یہ سب لے کر۔“ وہ دونوں بازو جھٹکتے ہوئے خود کو مطمئن ظاہر کرتے ہوئے بولی۔  
عفت تو یوں ششدر سی کھڑی رہ گئی، جیسے اس نے کسی بہت قریبی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔  
”تو۔۔۔ تم۔۔۔ اب واپس۔۔۔ پندرہ دن بعد بھی۔۔۔ واپس نہیں جاؤ گی۔“ وہ اڑی رنگت کے ساتھ بمشکل بولی۔  
مثال نفی میں سر ہلا کر شب میں موجود پانی اور سرف فرش پر بہا کر بڑی تندہی سے جھاڑو لگانے لگی۔  
وہ عفت کے سر پر ہچھوڑ چکی تھی۔ عفت کی حالت اب کیا ہو گی۔ اسے اس میں دلچسپی نہیں تھی۔  
اسے صرف پیپا کا رد عمل جاننا تھا۔ وہ جانے اس بات کو کیسے لیں گے۔



”تم۔۔۔ یہاں۔۔۔ آپ۔۔۔“ عدیل اتنے برسوں بعد بشریٰ کو اپنے سامنے دیکھ کر لمحہ بھر کو تو کچھ بول ہی نہیں سکا

تھا۔

اور پھر ہوا تو یہ تین بے ربط سے الفاظ۔  
بشریٰ کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔  
اس کے چہرے پر اتنی گہری جپ اور ایسی وحشت تھی جیسے وہ کچھ بولے گی تو شاید رویہ بڑے گی۔  
اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ بالوں چہرے کے ارد گرد اڑ رہے تھے جیسے انہیں کئی دنوں سے سلجھایا نہ گیا ہو۔ کہیں براؤن، کہیں سیاہ اور کہیں بھلکتی سفیدی۔ خشک۔ بے رونق بال بشریٰ کی بے توجہی کا اعلان کر رہے تھے۔

عدیل نے بشریٰ کو کبھی خود سے بول لاہوا نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔  
اس نے دونوں ہاتھ آپس میں جکڑ رکھے تھے۔ بڑھتی عمر کا اعلان کرتی ہاتھوں میں نیلی سبز رنگیں ابھری ہوئی تھیں۔

اس کی گردن کی ہڈی بہت نمایاں تھی اور جبڑے رخساروں میں یوں نمایاں تھے جیسے کئی دنوں سے اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ وہ عدیل کو بہت کمزور، مرنے والی ہوئی اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آنے والی عورت لگ رہی تھی۔  
اس کے چہرے پر چھٹکن تھی۔ جیسے وہ اپنے گھر سے عدیل کے آفس تک پیدل چل کر آئی ہو۔  
”تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا۔“ اس کی اتنی لمبی چپ نے عدیل کو ڈرا دیا۔  
وہ کوشش کے باوجود خود کو اسے تم کہنے سے نہ روک سکا۔

”ایک گلاس پانی۔۔۔ مل جائے گا۔“ وہ اسی طرح دونوں ہاتھ آپس میں جوڑے، چہرہ جھکائے کھردری آواز میں

بولی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”یقیناً کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر سوچنے لگا۔  
”کہیں احسن کمال نے اسے چھوڑ تو نہیں دیا۔“ برسوں پہلے کی دہلی سی خواہش کسی حد سے کی طرح سراٹھا کر اس کے دل میں آئی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب نہیں۔۔۔ اس کے ساتھ کچھ ایسا برا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس باریہ ٹوٹی تو پھر شاید کبھی جڑ نہیں سکے گی۔“ اس نے کانپتے دل کے ساتھ اس کے آگے پانی کا گلاس رکھ کر سوچا۔  
بشریٰ ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئی اور اس سارے درانیے میں اس نے پہلے بار عدیل کی آنکھوں میں دیکھا۔

جن میں اسے اپنے لیے وہی فکر اور پریشانی نظر آئی جو کبھی بشریٰ کو موسم بدلنے پر نزلہ زکام بخار ہونے پر عدیل کی آنکھوں میں ہوتی تھی۔  
دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریٰ چراگئے۔ دونوں کی صدا میں تھیں یا بہت سی آوازیں جو دونوں کے ویران دلوں میں گونجی تھیں۔

”جھجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ بشریٰ بے بسی سے بڑبڑا کر رہ گئی۔  
”سب ٹھیک تو ہے نا بشریٰ۔۔۔ تم۔۔۔ تمہارا شوہر۔۔۔ مثال!“ عدیل اس کے پھر خاموشی میں ڈوب جانے پر کچھ بے چین ہو کر بولا۔  
وہ ساکت سی بیٹھی تھی۔

”میں آج آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں عدیل!“ بہت رک رک کر بہت سوچ کر جیسے پوری ہمت جمع کر کے وہ بولی۔

”کسی درخواست۔۔۔ میرے پاس کیا ہے اب تمہیں دینے کے لیے۔“ وہ پھیکے سے لہجے میں بولا۔ جس میں بہت کچھ ٹھوہر دینے کا چچھتاوا تھا۔ بشریٰ نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔  
عدیل نظروں چرا کر ملانڈاز سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی شکایتی نظروں کی تلافی اب ممکن نہیں تھی۔  
”میں احسن کمال۔۔۔ بچوں۔۔۔ اس کے دونوں بچوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے آسٹریلیا شفٹ ہو رہی ہوں۔“  
ایک لمبی چپ کے بعد وہ پھر سے ہارے لہجے میں بولی اور عدیل کو یوں لگا جیسے اس کے آس پاس کوئی ہم پھوٹا ہو۔  
”اس کے دونوں بچوں۔۔۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”احسن کمال کے بیٹے سیفی اور امینہ۔“ بشریٰ نے اس کی استعجاب بھری سرگوشی سن کر شرمندہ سے لہجے میں وضاحت کی۔

”اور مثال۔۔۔“ وہ ایسا کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن جانے کیسے اس کے منہ سے پھسل گیا۔  
بشریٰ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

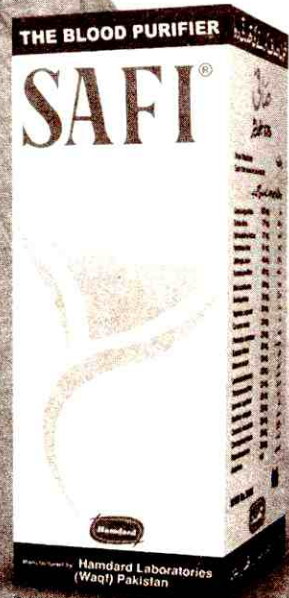
مثال کے نام پر اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ جتنی ہمت سے اتنا بڑا فیصلہ دل میں کر کے آئی تھی۔ اسے لگا وہ یہ فیصلہ جو عدیل کو سنائے گی تو اس کے بعد شاید وہ خود بھی زندہ نہیں رہ پائے گی۔  
”وہ۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ ہمارے ساتھ۔۔۔ نہیں جائے گی۔ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔“ لمحہ بھر میں اس نے جملوں میں ردوبدل کیا اور دفائی پوزیشن پر آ گئی۔  
”میں نے اس سے بہت کہا، سمجھایا۔ کہ میں چاہتی ہوں وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اسے چلنا چاہیے۔ وہاں اس

خوبصورتی جو صرف  
ظاہری ہی نہیں  
بلکہ اندرونی بھی

اکسپڈرٹی اجزاء جو خون کو کربیر صاف بنیادی طور پر۔  
بوسوں کی آمودہ ہمدرد صافی، جلد کے سبب ہی امراض کو  
دُست کرنے کے لئے بہ کافی۔

✗ فیتنس کریم ✗ مڈ ماسک ✗ سلیسک ایسڈ؛  
آپ جلد کی شگفتگی کے لئے کچھ اور نہیں۔

*Safi Kafi Hai*



ہمدرد



کے لیے ایک برائٹ سیکورٹو فریوچر ہو گا۔ برٹس وہ تم سے۔ اپنے باپ سے اتنی دور نہیں جانا چاہتی۔ وہ بے ربطگی سے جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔

حالانکہ وہ گھر سے یہی سوچ کر نکلی تھی کہ وہ عدیل کو سارا اماجر ایسی کی ذیل حرکت کا قصہ اور اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور اپنی بے بسی۔ سب کچھ سچ بتا دے گی۔

لیکن جانے کیوں اتنے سالوں بعد اگرچہ دل مکمل طور پر عدیل پر بھروسہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک دم سے اپنے بھرم کی خاطر اس نے خود کو یہ سب کہنے سے روک دیا۔

”اب تم کیا چاہتی ہو کہ میں مثال کو سمجھاؤں کہ وہ تمہارے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو جائے؟“ عدیل نے سکون بھرے لہجے میں جواب دیتے ہوئے جیسے بشری کی بساط ہی الٹ دی۔ وہ پریشان سی اسے دیکھنے لگی اور بے ساختہ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

عدیل نے اسے الجھ کر دیکھا۔

”تو۔۔۔ تم میرے پاس اور کون سی درخواست لے کر آئی ہو۔“ اسے بشری کے آنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ ”اتنے برس گزر گئے۔ یوں سمجھیں میں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر بتادی اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ عورت واقعی بہت کمزور بہت بے بس ہے۔ وہ لاکھ خود مختار ہونے کا دعوہ کرے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بے بسی سے اپنی بے چارگی کا اظہار کر گئی۔

”میں ابھی بھی نہیں سمجھا بشری!“ عدیل واقعی سمجھ نہیں پایا تھا، وہ کیا کتنا چاہتی ہے۔ بشری پھر خاموش ہو گئی۔

جسے وہ بولنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی ہو۔

”میں یہ جان چکی ہوں عدیل! کہ میں لاکھ مثال سے محبت اور ممتا کے دعوے کروں، میں اس کی حفاظت نہیں

کر سکتی۔“

کچھ دیر پہلے جو اس نے کچھ نہ بتانے کا دل میں عہد کیا تھا۔ اس چھوٹے سے جملے میں کہہ گئی۔

عدیل کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ بہت دیر بعد پوچھ رہا تھا۔ ”کیا ہوا ہے مثال کو۔۔۔ بتاؤ مجھے۔ کسی نے اس کے ساتھ کچھ غلط

کیا ہے؟“ وہ ایک دم سے وحشت زدہ سا ہو گیا تھا۔

بشری آنکھوں میں پانی لیے زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”اسے کچھ نہیں ہوا۔ لیکن میری خواہش۔۔۔ اور یہ ضروری ہے عدیل! کہ مثال اپنے باپ کی محفوظ چھت تلے

رہے۔ میں جارہی ہوں۔ میں اس کا وہ خیال نہیں رکھ سکوں گی جو شاید ایک سال باپ رکھ سکتا ہے۔ میں اس سے

رابطے میں رہوں گی۔ اس کی ضرورت کا خیال رکھنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن میری درخواست ہے پلیز! اسے

اپنے پاس رکھ لیں اور اس کا بہت خیال رکھیں۔ وہ میرے بغیر تو رہ سکتی ہے، مگر وہ تمہاری جدائی نہیں سہے سکے گی۔

میں اسے اپنی خوشی اور رضا سے تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔“ کہتے کہتے وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

عدیل شاید ساساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

”میں اس کی جدائی نہ لوں گی۔ جیسے بھی ہو گا اس کے بغیر جی لوں گی۔ مجھے یہ اطمینان ہو گا کہ وہ تمہارے

پاس۔۔۔ اپنے باپ کے پاس بحفاظت ہے۔ تم اس کا خیال مجھ سے بہت بہتر رکھ سکتے ہو، رکھ لو گے۔“

کہہ کر خود کو ہچکتے ہوئے وہ مردہ قدموں سے عدیل کا جواب نے بغیر دروازہ کھول کر جیسے آئی تھی اسی طرح چلی

گئی۔  
عدیل نوگنگ تھا۔ نہ جانے بیچ میں کیا ہوا ہے۔ کیا احسن کمال۔ نے مثال کے ساتھ کچھ برا کیا؟  
کسی سانپ کی طرح اس خدشے نے سر اٹھایا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر آفس کے باہر تک بھڑکی کے پیچھے گیا۔ مگر  
اس کی گاڑی بدھول اڑائی دور جا رہی تھی۔  
شاید وہ ٹھیک کہہ گئی ہے۔ جوان بیٹی کی جیسی حفاظت ایک باپ کر سکتا ہے کہ ایک لاجپاں نہیں کر سکتی مگر  
مثال کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ستون گے ساتھ ٹکا۔ مضطرب سا ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔



سارا گھر ایک دم سے خالی ہو گیا تھا۔  
اسے تو بھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ بیٹیوں نے گھر کو کس طرح سے بھر رکھا ہے۔ گھر کی ساری آبادی جیسے  
ان کے دم سے گئی۔  
سب طرف ایک گھبر خاموشی گھری چپ سی تھی۔  
وردہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ بہت سارے دنوں کی تھکن جمع ہو گئی تھی۔ آرام کے لیے تو وہ بھی لیٹی  
تھی۔ ذرا سی در کو اس کی آنکھ لگی مگر پھر وہ اٹھ کر باہر آگئی۔  
واثق جاب کی تلاش میں نکلا تھا۔ پچھلے دنوں اسے جو عارضی نوکری چھ ماہ کے کنٹریکٹ پر ملی تھی وہ پچھلے ہفتے  
ختم ہو چکی تھی۔  
عاصمہ کی اکیڈمی میں بچے اب بہت کم رہ گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا تھا۔ کوئی ڈھنگ کی نیچر چند ہفتوں سے  
زیادہ لکھی ہی نہیں تھی۔ حالانکہ عاصمہ نے اپنی جیب سے ان کی تنخواہیں بھی بہت بڑھائی تھیں مگر انہیں کسی اور  
اکیڈمی سے اچھا کچھ مل جاتا تو وہ چپکے سے بغیر پتائے ہی چلی جاتیں۔

بار بار نیچر زید لئے سے اسٹوڈنٹس اور ان کے والدین بہت ڈسٹرب ہوتے۔ یوں بھی اس کا اپنا دھیان بھی  
اکیڈمی کی طرف سے خاصا کم ہو گیا تھا۔ واثق کو جاب مل جاتی تو وہ اکیڈمی بند کرنے کا ہی سوچ رہی تھی مگر ابھی تو  
آمدنی کا یہی ایک ذریعہ تھا۔  
”مما! آپ سوئی نہیں؟“ وردہ جمائیاں لیتی اٹھ کر باہر آگئی۔  
عاصمہ اسے دیکھ کر ذرا سا چونکتے ہوئے مسکرائی۔

اسے یہ کی طرح وہ بھی قد کاٹھ میں دن بدن بڑھتی جا رہی تھی یا شاید وردہ ان دونوں کی موجودگی میں عاصمہ کو نظر  
ہی نہیں آتی تھی اور اب ایک دم اسے لگا۔ وردہ فرسٹ ایریاں کرتے ہی ایک دم سے بہت بڑی ہو گئی ہے۔  
عاصمہ نے کوئی جواب دے بغیر اس کی طرف بانہیں پھیلائی۔ ”وہ فوراً ماں کی بانہوں میں ساگئی۔“  
”مما! آپوں کے جانے کے بعد کتنی خاموشی ہو گئی ہے گھر میں۔ وہ دونوں اتنا شور مچاتی تھیں کیا؟“ وہ ماں کے  
سینے میں منہ گھیر کر شرر لہجے میں بولی۔

عاصمہ نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ دونوں پھر خاموش ہو گئیں۔  
”مگر ممما! ماموں تو کہہ رہے تھے وہ پاکستان آجائیں گے کچھ مہینوں میں سب کو لے کر۔“ وردہ کو کچھ دیر بعد  
خیال آیا تو سر اٹھا کر پوچھنے لگی۔  
”مشکل ہے وردہ! تمہارے ماموں تو کئی سالوں سے یہی کہہ رہے ہیں۔ اب تو دونوں بیٹیوں کی جاب بھی وہیں

ہے۔ گھر بھی لے چکے ہیں ادھر اور سوئیں تو مل ہی کیں۔“ آخر میں وہ خود ہی مسکرائے گئی۔

”تو وہ اب کبھی نہیں آئیں گے یہاں؟“ وردہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

”اللہ نہ کرے۔“ آنا تو ہے انہیں جلد یا بدیر، بلکہ ابھی تو میں سوچ رہی ہوں واثق کی جاب لگ جائے تو تمہارے فرض سے ایک دو سالوں میں بسکدوش ہو کر گرج کے لیے جاؤں گی۔“

”خبردار ممّا! آپ نے ابھی میرے متعلق ایسی ویسی کوئی بات سوچی بھی تو۔ مجھے دھنا ہے ابھی اور بہت دھنا ہے شادی۔ بالکل بھی نہیں۔ کم از کم پانچ چھ سال تو سوچے بھی نہیں۔“ وہ خطرناک تیوروں کے ساتھ ماں کو دھمکانے والے انداز میں بولی تو عاصمہ یوں ہی مسکرا کر سر ہلانے لگی۔

اسی وقت دروازہ کھول کر واثق آگیا۔

اس کے چہرے پر تھکن کے بجائے مسکراہٹ اور چمک سی تھی۔

”اللہ تبارک ہے۔“ عاصمہ زیر لب کہتے ہوئے سر اٹھا کر بولی تو دونوں ماں کو دیکھنے لگے۔

واثق سلام کر کے ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

”مجھے لگتا ہے کوئی اچھی خبر ہے۔“ عاصمہ یقین بھرے لہجے میں بولی۔

”اچھی سی چائے پلاؤ آئیں پہلے پھر بتاتا ہوں۔“ واثق جوتے اتارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے وہ خبر میرے سامنے نہیں سنائی جائے والی جو مجھے چائے بنانے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔“

وردہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

”بہت تیز ہو گئی ہے ممّا۔“ واثق ہنس کر بولا۔

”بھائی! بتائیں نا کیا بنا آپ کی جاب کا؟“ وہ بے صبرے پن سے بولی۔

”بہناجی! تجھیں مل بھی گئی ہے اور نہیں بھی۔“ وہ ٹانگیں سامنے پھیلا کر پرسکون انداز میں بولا۔

عاصمہ اور وردہ نے ابجھ کر اسے دیکھا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔“ ملی ہے یا نہیں، ٹھیک بتائیں نا۔“ وردہ کچھ منہ بنا کر بولی۔

”ممّا! میرا ایک کالج فیلو تھا۔ کالج کے دور میں تو اتنی دوستی نہیں تھی ہمارے درمیان، لیکن آج ملا تو بہت اچھا

لگا۔ بہت ٹالس ہے وہ، میرے بارے میں پوچھنے لگا کہ کیا کر رہا ہوں آج کل، میرے بتانے پر کچھ دیر تو خاموش رہا،

پھر اس نے مجھے جاب کی آفر کردی۔“

”جاب کی آفر؟“ آس ہے اس کا یا کوئی کمپنی۔ امیر دوست ہے کیا آپ کا؟“ وردہ اسی بے صبری سے پھر بولی۔

”ہاں ہے تو۔“ فیکٹری ہے اس کی کافی بڑی۔ اسے فی الحال میری ضرورت ہے۔ کل جاؤں گا، دیکھوں گا کہ

جاب کیا ہے، پھر فیصلہ کروں گا کہ کرنی ہے یا نہیں۔ اب چائے مل سکتی ہے یا نہیں۔“

وہ اٹھ کر جاتے ہوئے وردہ کے سر پر چپٹ لگا کر کہہ گیا۔

”یہ کیا پھسپھسی جاب ہوئی بھلا۔“ ملنے پہ بھی ففٹی ففٹی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

عاصمہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔



”کیا مطلب ممّا۔ یہ مثال آپ کی۔ اب کیا مستقل ہمارے سر پر پڑی رہیں گی۔ اب کبھی بھی اپنی ماں کے گھر

نہیں جائیں گی۔ کیا مصیبت ہے یا ر! پری بہت جھنجھالی ہوئی تھی۔ خواہ مخواہ کمرے کی چیزیں اٹھا کر رہی تھی۔



اور یہ تو اب طے تھا کہ مثال اب ان لوگوں کے ساتھ ہی جائے گی۔ جس پر پاپا کی محبت کی اکیلی حصے دار پریشہ پریشانی ہوتی تھی۔ عفت بالکل خاموش تھی۔

وہ پری کی شرٹ پر دھاگے سے بیل بنارہی تھی۔  
 ”آپ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہیں۔ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ آپ پاپا کو فون کر کے بلائیں، انہیں کہیں فوراً اس سے آکر بات کریں۔“ عفت کی خاموشی اسے اور مشتعل کر گئی۔  
 ”پری! تمہارے پاپا آنے والے ہیں۔ وہ راستے میں ہوں گے۔ تم اس طرح ری ایکٹ کرو گی تو شاید انہیں برا لگ جائے۔ بہر حال مثال بھی ان کی بیٹی ہے اور تم سے پہلے وہ اس کے بارے میں سوچیں گے، یہ ذہن میں رکھو۔“

عفت خلاف توقع بہت ٹھہر ٹھہر کر نظا ہر سلجھ ہوئے صلح جو لیے میں کہہ رہی تھی۔ پری ششدر سی رہ گئی۔  
 ”آپ۔ آپ اسے ہمیشہ کے لیے قبول کر لیں گی اس گھر میں۔ وہ اب یہیں رہے گی۔ کبھی نہیں جائے گی کیا؟“ وہاں کے سربراہ آکر چلائے ہوئے بولی۔ عفت اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گئی۔

”ہر چیز کا نتیجہ فوراً“ سامنے نہیں آتا۔ اپنے اندر تھوڑا ضبط پیدا کرو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی عفت اسے نصیحت کر گئی، جبکہ جانتی بھی تھی کہ یہ موقع بہر حال نصیحت کا نہیں ہے۔  
 ”میں اسے اور اس کے سامان کو اٹھا کر باہر بھی پھینک سکتی ہوں تو آپ اپنی یہ نیک نصیحتیں سنبھال کر رکھیں اس وقت مجھے نیچے گا۔“ وہ عفت کی توقع سے زیادہ غصے میں آکر بولی۔  
 ”پری۔ پری۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ عفت بوکھلا کر قیص ایک طرف پھینک کر غصے میں جاتی پری کے پیچھے لپکی۔

”حد ہے۔ اس لڑکی کی ذرا جو صبر برداشت ہو اس میں خواہ مخواہ میں کیوں نیا تماشا کھڑا کر لے گی۔ رکھو۔ پری بات سنو میری بیٹا!“ وہ اس کے پیچھے تک چلی گئی۔ مگر وہ ان سنی کرتی جا چکی تھی۔



مثال نے سخت تھکے ہوئے پیروں کو دونوں ہاتھوں سے سہلا کر انہیں کرسی پر رکھا۔ جبکہ اس کے ہاتھوں میں

بھی درد تھا۔

درد اپنی جگہ، مگر یہ چھوٹا سا کاٹھ کباڑ سے سجا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ اب باقی کے جتنے بھی دن خدا نے اس کے اس گھر میں رکھے تھے یا آسانی گزار سکتی تھی۔ اگر اسے گزارنے دیے گئے تو۔  
 وادی کا پلنگ بھاڑ پونچھ کر جس قدر اسے صاف کر کے جھکایا جاسکتا تھا۔ مثال اسے چکا کر کھڑکی کے ساتھ دیوار سے ذرا فاصلے پر لگا چکی تھی۔ پرانے پرنٹ کی کھسی ہوئی، مگر صاف چادر تکیہ پرانے میز پر اس کی کتابوں کا ڈھیر اور پلنگ کے نیچے اس کے تینوں سامان سے بھرے بیک لگ چکے تھے۔

کمرے میں ایک ہی ٹولی پھولی الماری تھی۔ جس کے پٹ نہیں تھے۔  
 ”پاپا کا موڈ اچھا ہو۔ کسی دن تو انہیں کہوں گی۔ اس الماری کے پٹ لگا دیں۔ میں اس میں اپنے کپڑے جو تھے وغیرہ رکھ لوں گی۔“

وہ اب دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں سلارہی تھی۔  
 وہ صبح سے کام میں لگی تھی اور اب نہ صرف بہت تھک چکی تھی۔ بلکہ اسے ہموک بھی لگی تھی۔

اور کسی نے اس سے جھوٹے منہ کھانا تو کیا چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا تھا۔  
 اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب جا کر اسے یجن میں بھی سارا کام کرنا پڑے گا تو ہی کھانے کو کچھ ملے گا۔ لیکن  
 اب اس میں اتھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ یوں ہی کسلندی سے بیٹھی رہی۔  
 ”تم یہاں مستقل آگئی ہو کیا مثال۔؟“ بری اس کے پیچھے دروازے کی جو کھٹ میں کھڑی تھی۔  
 کچھ دیر کھڑی کرے گا جائزہ لیتی رہی۔ جس کا چند گھنٹوں میں نقشہ بدل چکا تھا۔ پھر ہمت کر کے کھیلے لہجے  
 میں چبا کر بولی۔

مثال نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔  
 ”کیوں تھک گئی تمہاری ماں تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر یا اس کے دوسرے شوہر نے تمہیں دھکے دے کر نکال  
 دیا۔ ایسا ہی ہوا مثال آپنی تمہارے ساتھ وہاں؟“ طنزاً ”اس سے جب سخت ناگوار لہجے میں بات کرتی تھی تو آپنی  
 اور مثال کو بہت حقارت سے چبا چا کر الگ سے ادا کرتی تھی۔  
 مثال خون میں اٹھتے اہال کو ضبط کرنی خاموش رہی۔

”سنائے تمہاری ماں کے دوسرے شوہر کا جوان بیٹا بھی ہے۔ کہیں اس کے ساتھ تو رنگ رلیاں مناتی رنگے  
 باتھوں نہیں پکڑی گئیں تم۔“ وہ کس قدر کھینی تھی۔ اس کا انداز مثال کو بھی نہیں ہوا تھا۔  
 وہ تو ابھی اس جملے کے بولنے سے پہلے تک پری کو ایک معصوم چھوٹی باربی ڈول جیسی بہن سمجھتی تھی۔ جس کو  
 مثال نے گو دوں کھلایا تھا اور عفت سے چھپ چھپ کر اسے بہت پیار کیا تھا۔ اپنی محدود سی پاکٹ منی سے اس  
 کے لیے چاکلیٹس اور کنڈیز لایا کرتی تھی۔

وہ پری اس سے اتنی گندی گری ہوئی بات بھی کر سکتی ہے۔ مثال کبھی سوچ نہیں سکتی تھی۔  
 اگرچہ وہ بات تقریباً کچھ اسی طرح وقوع پذیر ہوئی تھی جیسے پری نے حقارت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ لیکن  
 مثال کو یوں لگا جیسے کسی نے کچھ دوسے بھرا جو تانے لگا کر اس کے منہ پر مار دیا ہو۔ اسے چاہئے کہ باوجود غصہ بھی نہیں  
 آیا۔ بس جیسے ڈھیر سارا نمک اس کے حلق میں کھل سا گیا۔

وہ پری کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ وہ تو کسی کے بھی سامنے نہیں رونا چاہتی تھی۔  
 لیکن ہر بار اسے اس نہج پر پختہ پایا جاتا تھا کہ وہ سب کے سامنے روئی پڑے۔  
 ”میں چائے بنانے جا رہی ہوں تم پیو گی۔“ پیروں سے اٹھتی ٹیسوں کو دیا کر بدقت اٹھتے ہوئے بظاہر سپاٹ لہجے

میں آنکھوں میں آنی نمی کو چھپا کر وہ رخ پھیرے جاتے ہوئے بولی۔ اس کی اس بے نیکی آفرنے پری کو اور چڑا دیا۔  
 وہ تیزی سے بچوں پر گھومی تھی۔

”کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔؟ یوں بے پروا ظاہر کر کے ہم سب کو بے وقوف بنالو۔ گی بتاؤ وہاں ایسا کیا کر کے آئی ہو  
 کہ انہوں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں پھینک دیا ہے ہمارے سروں پر کسی مصیبت کی طرح۔“ پری عفت  
 نہیں تھی کہ بہت پلاننگ کے ساتھ اپنے بغض کو نرم لفظوں اور مبہم رویے کے پیچھے چھپا سکتی۔ وہ پری بھی جو ماں  
 اور باپ کے لاڈ سے سرچڑھی تھی۔

”بتاؤ مجھے گھو گئی ہو کر آئی ہو کیا وہاں سے؟“ وہ مثال کی ہنوز چپ پر اور بھی برا فروخت ہو کر چلائی۔  
 ”پری ایہ گھر جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے یہ مت بھولو تم اگر عدیل احمد کی چھوٹی بیٹی ہو تو میں ان کی بڑی بیٹی  
 ہوں۔ ان کی محبت ان کے گھر ان کی ہر چیز کی پہلی حصے دار پہلی حق دار۔۔۔ اوکے۔“  
 پتا نہیں کس طرح اس نے اپنے دل کو سنبھالا تھا جو زور زور سے رونے پر آمادہ تھا اور وہ اسے سنبھال کر راتنے

روکھے لمبے میں بولی تھی کہ لمحہ بھر کو پری بھی اس کے دنگ لہجے پر کچھ خائف سی ہو گئی۔

”بلکہ میل کر رہی ہو مجھے، میری ماں کو۔“ پری اس کے جواب میں صرف یہی کہہ سکی۔

”تمہیں صرف بتا رہی ہوں کہ میں جب جیسے میری مرضی، میری خواہش ہوگی، میں اپنی ماں کے گھر رہوں گی یا اپنے باپ کے گھر۔ تم اس پر اعتراض نہیں کر سکتیں اور جب ہمیں ایک ہی گھر میں رہنا ہے تو بہتر ہے نہ تم مجھ سے بے وجہ الجھو اور نہ میں تم سے الجھوں۔ امن سے رہو، امن سے رہو، مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے۔

اور یہ مت سمجھنا کہ مجھے ماں کے گھر سے کسی نے نکالا ہے یا مجھے وہاں کوئی مسئلہ تھا۔ اصل میں مجھے پیانے زبردستی بلایا ہے۔ وہ اب یہ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ آکر رہوں۔ اور کبھی کبھار اپنی ماں سے ملنے چلی جایا کروں اور اب اس طرح کے جو بھی قصے، کہانیاں تمہارے دماغ میں آ رہی ہیں، وہ تمہارے اپنے دماغ سے شیز کر لیا کہ مجھے وہاں سے کیوں ادھر بھیجا گیا۔ وہ یقیناً تمہیں کوئی سلی بخش جواب دے سکیں گے، اوکے۔“

وہ بہت ٹھنڈے ٹھار لہجے میں سکون سے کہتے ہوئے اسے پلکیں چھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

اور پری جتنی بھی نادان یا سمجھ سہی اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح کی بات پیانے سے کرنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی کہ ایسے گھٹیا سوال کر کے خود کو پیانے کی نظروں سے گرا دیتی۔

”چلو، میں بھی دیکھتی ہوں، کتنے دنوں تک تمہارے گڈ بک میں رہتی ہو۔ آپنی مثال! وہ پیچھے سے چیلنج کرنے والے انداز میں بولی تو مثال ان ہی قدموں پر ٹھٹھکی۔

اس نے گردن موڑ کر پری کی نفرت بھری نظروں کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔



”نہیں۔۔۔ پیانے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ کوئی جھگڑا، نہ کوئی ایسی بات۔“

وہ رات کے اندھیرے میں باپ کے سامنے سر جھکائے اپنی انگلیاں مسلکی مضطرب سی بیٹھی تھی۔

عدیل کی نظریں مثال کے چہرے پر جمی تھیں۔

اسے مثال کی بات سے اتفاق تھا نہ اس کی سلی ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے سے چھلکتا اضطراب اور آنکھوں میں جھانکتا خوف اس ان کسی کہانی کی تائید کر رہا تھا جو وہ شام میں بشری کے لہجے سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

عدیل اس کی بات کے جواب میں بہت دیر سے چپ تھا۔

مثال نے آہستگی سے پلکیں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ کسی اور ہی سمت میں دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

”پیانے۔۔۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا میرا یہاں آنا تو۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ کچھ دیر بعد غم لہجے میں ادھر اور اس جملہ بول کر خود کو لمبوز کرنے لگی۔

”تو کیا کرو گی، کوئی تیسرا ٹھکانہ بھی ہے تمہارا؟“ عدیل کے تلخ لہجے نے مثال کو گنگ سا کر دیا۔ اسے عدیل سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔

مگر عدیل بھی کیا کرتا۔ شام سے آفس سے آنے کے بعد اب رات کے کھانے تک اس نے جتنی بکواس عفت اور پری کی نہ ماننے والی ناراضی کو برداشت کیا تھا۔ اسے بخوبی آنے والے دنوں کی سختی کا انداز ہو رہا تھا۔ عفت تبھی بھی مثال کو ہمیشہ کے لیے اس گھر میں برداشت نہیں کرے گی۔



اور پری، عفت ہی کی بیٹی ہے جسے اپنے اکلوتے ہونے کا اور ماں باپ کے لاڈلے ہونے کا بہت زعم ہے۔  
بھری محفل میں وہ اور عفت علی الاعلان کہتی تھیں کہ پریشہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ایک بیٹا دانیال اور ایک بیٹی پریشہ۔

اب یہ مثال کہاں سے ٹپک پڑی ان کے گھر میں بٹوارہ ڈالنے کے لیے۔  
”اس کی ماں اور باپ کو کچھ عرصے کے لیے مجبوراً ملک سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ کوشش کے باوجود مثال کا ویزا نہیں لگ سکا۔ چھ آٹھ ماہ میں وہ واپس آجائیں گے تو یہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں آئی۔“ بہت سوچنے کے بعد عدیل کو یہی ایک مضبوط بہانہ سوجھا تھا عفت کے غصے کو کم کرنے کا۔ اس نے عدیل کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔

مگر فی الوقت یقین کرنے کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔  
”میں چھ آٹھ ماہ میں مثال کا کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کروں گا، تو یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔“

عدیل اس بات کو سوچ کر دل میں بہت مطمئن تھا اور آج ہی سے اس نے اپنے ارد گرد دو روز دیکھ خاندان میں اور باہر کوئی ایسا موزوں رشتہ مثال کے لیے سوچنا شروع کر دیا تھا جلد از جلد اس کی بیٹی کو بخوشی بیاہ کر لے جاسکے۔  
”اگرچہ وہ ابھی کم عمر ہے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔“ وہ خود کو سمجھا چکا تھا۔

”اور تم پریشان نہیں ہو، تیسرا ایسا کوئی بھی آپشن میں سوچ چکا ہوں۔ تم عفت اور پری سے یہی کہنا کہ بشری تمہیں یہاں صرف چند ماہ کے لیے چھوڑ کر گئی ہے، اوکے۔“ چند لمحوں بعد معلوم نہیں اسے اپنے جملے کی بخشنی کا احساس ہوا تھا یا مثال کی تشفی کے لیے اس نے یہ بات کہی تھی۔ مگر مثال اسی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

پاپا تو اسے دنیا سے زیادہ بھروسا اور مان تھا۔ وہ اسے کبھی بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اندھا یقین تھا۔

اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر دو آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گرے۔  
”اور کوشش کرنا کہ عفت اور پری کے ساتھ تو تم کسی قسم کا کوئی ایشو کھڑا نہ کرو۔ وہ دونوں جو بات کہیں سخت یا نرم، اسے خاموشی سے سن لیا کرنا۔ چند ماہ کی بات ہے، پھر ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“  
مثال نے چونک کر باپ کو دیکھا۔

”چند ماہ بعد۔ کیا ہونے والا ہے، کیا بشری اسے واپس لے جائے گی، بیبا کا یہ خیال ہے تو ان کی بھول ہے احسن کمال اب کبھی بھی مجھے اپنے گھر میں قبول نہیں کرے گا۔“ اسے اور بھی رونا آنے لگا۔

اسے لگا وہ اپنے باپ پر کوئی بہت بڑی مصیبت بن کر نازل ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے باپ کے کندھے چند گھنٹوں میں جھک سگئے ہیں۔

”کاش میں یہاں نہ آئی۔“ وہ چپکے سے عدیل کے گہری سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھ کر خود سے بولی۔  
”تو پھر میں اور کہاں جاتی؟“ وہ تخت رنجیدہ تھی۔

”اب جا کر سو جاؤ تم اور سنو مثال، تمہارا یہ فائل سپیسٹو ہے ناکالچ میں؟“ وہ بہت دیر کچھ یاد کر کے بولا تھا۔  
”جی بیبا!“ وہ گھٹی ہوئی آوازیں آہستگی سے بولی۔

”اچھی بات ہے۔ تم اپنا نوکسر صرف اپنی اسٹڈیز پر کرنا۔ عفت کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہیلپ کر دیا کرنا

# FaceFresh™

CLEANSER CREAM

جو فیس فریش  
وہی بیوٹی فل

لگائی رکھیں پوری رات  
چھائیاں، جھریاں، داغ، دھبے، جلتے سب کو کس کڈ ڈاؤن



اور اپنے کام سے کام رکھنا اور کوشش کرنا پری سے بالکل نہیں الجھو، تم جتنا میری باتوں کو یاد رکھو گی اور ان پر عمل کرو گی میرے لیے زندگی کچھ باسولت ہو جائے گی۔ تم سمجھ رہی ہو تا میں تم سے کیا چاہ رہا ہوں۔“ اسے ایک بار پھر اپنے باپ کی بے بسی پر شدت سے رونا آ رہا تھا۔ وہ چہرہ جھکائے یوں ہی زور سے گردن اثبات میں ہلا گئی۔

”بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ گھر کا ماحول خراب ہو، خواہ مخواہ کوئی بد مہنگی، کوئی رنجش ہو۔ عفت دل کی بری نہیں ہے اگر تم محل سے اسے اپنی ماں کی جگہ رکھ کر اس کے ساتھ رہو گی تو تمہیں اس کا برتاؤ بہت ناگوار نہیں گزرے گا۔“ وہ رک رک کر اسے آنے والے دنوں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ”پھر بری اور دانی تو تمہاری چھوٹے بہن اور بھائی ہیں، جن سے تمہیں بھی بہت محبت ہے۔“

مثال اسی طرح سب جھکائے اثبات میں گردن ہلا گئی۔

”آپ بڑی بہن ہو ان کی۔ ان کا خیال کرو گی تو وہ بھی آپ کا خیال کریں گے۔ آپ سے محبت کریں گے۔ اسی طرح گھر کی فضا اچھی رہے گی اور میں سکون سے آنے والے دنوں میں تمہارے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں گا۔“ عدیل کی آخری بات پر مثال نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیسا فیصلہ پایا؟“ وہ پوچھے بغیر نہ سکی۔

”میں چاہتا ہوں میری مثال بہت خوش رہے، اس کے اخلاق، اس کا رویہ دوسروں سے سلوک سب اتنا اچھا ہو، مہربان محبت کرنے والا کہ میری بیٹی ایک مثال بن سکے۔ تم سمجھ رہی ہو تا۔“

وہ اس کے سوال کو ٹال کر اس کے اوپر رکھی ذمہ داری اور بردباری کی کٹھڑی میں کچھ اور بوجھ بڑھاتا چلا گیا۔

کہ اس گھر کے ماحول کو ٹھیک رکھنے کی تمام تر ذمہ داری مثال کی تھی۔ اس کا رویہ اس کا سلوک سب اتنا مثالی ہونا چاہیے کہ عفت کو اور اس کے بچوں کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ کم از کم عدیل تک ایسی کوئی شکایت نہیں پہنچے۔

”بیٹا! میں اگر فرشتہ بھی بن کر رہوں گی اس گھر میں تو بھی آپ کی سینکڑاؤں نف اور آپ کے بچوں کو خوش نہیں کر سکوں گی۔“ وہ باپ کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے دل میں سوچنے لگی۔

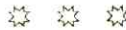
”اب تم جاؤ۔ کافی رات ہو گئی ہے کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی ضرورت ہو۔ تم صرف مجھ سے بات کرو گی۔ اوکے۔“

وہ اسے برسوں پہلے والی نصیحت یاد دلاتے ہوئے بولا۔ جس پر عمل کرنے کی نوبت آج تک نہیں آ سکی تھی۔ اتنے سالوں میں جب بھی مثال اپنے مسئلے اور ضرورتیں لے کر عدیل کے پاس آئی تھی اس کے پاس ان کو سننے کے لیے ان کو حل کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔

سن بھی لے جاتے وہ مسئلے تو ان کو حل کبھی نہیں کیا گیا تھا اور اب پھر وہی ایک باپ کے فرض سے سبک دوش ہونے والی کوشش!

مثال کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر نکل گئی۔

عدیل اسے جاتا دیکھتے ہوئے ابھی بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا۔



جواب واثق کی توقع سے بہت بڑھ کر تھی۔



کیمیکل بنانے کی اس فیکٹری میں شہزاد نے اسے بہت اچھی سیٹ آفر کی تھی۔ بلکہ سیکری بھیج بھی بہت اچھا تھا۔

پھر کام کا اسکوپ بہت تھا اور واقعہ جو یہ سوچ کر گیا تھا کہ اگر جاب اس کے جی کو نہیں لگی تو وہ مروت اور لحاظ میں آئے بغیر شہزاد کو صاف انکار کر آئے گا۔

”یہ سیکری بھیج اس ماہ کے لیے ہے کہ اس پیریڈ میں ہمیں بہت سے آرڈر پورے کرنے ہیں اگر ہم اس گول کو کامیابی سے اچھو کر لیں گے تو تمہارا بھیج اس سے تقریباً ڈبل کر دیا جائے گا۔“ شہزاد کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

”نہیں یار! مجھے لالچی نہیں بناؤ میں اپنے کام کو پوری دیانت داری سے کرنا چاہتا ہوں کہ میری ماں نے مجھے ہمیشہ رزق کو حلال کر کے کھانے کا سبق پڑھایا ہے، ابھی مجھے صرف اپنے کام میں دلچسپی ہے آگے ملنے والے بھیج میں نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”ڈیل اینڈ گڈ اور یار ہماری فیکٹری کے کیا بلکہ ہر جگہ موجود کام کرنے والا ایسی سوچ رکھ کر اپنا کام خوب لگن سے کرے تو میرے خیال میں کہیں بھی کوئی کمی نہ رہے اور کرپشن تو جڑوں سے ہل جائے۔“ شہزاد بھی اس کی سوچ سے متاثر ہوا تھا۔

”بالکل کیا، ہم آج ہی اپنے پروجیکٹس ڈسکس کر لیں جو ہمیں اگلے تین ماہ کے دوران مکمل کرنے ہیں۔“ ڈاٹن کام کرنے کے لیے بے چین تھا۔ فوراً ہی بولا۔

”کیوں نہیں۔ لیکن پہلے کافی یا چائے۔ بناؤ کیا چلے گا؟“

”کافی ہی منگوا لو۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”ایک سال پہلے تک پیپا ہی سب کچھ دیکھا کرتے تھے۔ میں تو کبھی کبھار جب دل چاہا آفس آجا یا کرتا تھا۔ کچھ ایسی پابندی نہیں تھی مجھ پر۔ لیکن چھ سات ماہ پہلے پیپا کی طبیعت خراب ہوئی تو پھر وہ ٹھیک ہی نہیں ہو سکے تو مجبوراً سب کچھ مجھے سنبھالنا پڑا۔ لیکن کرو شروع میں تو جب سارا کچھ میرے سر پر ڈال دیا تو ایک بیک میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ کافی وقت لگا مجھے سب کچھ سمجھنے میں۔“ شہزاد اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھول کر پروجیکٹس کی فائل نکالتے ہوئے بتاتے لگا۔

”وہ کیا ہوا ہے تمہارے فادر کو؟“

”پیرا لائز ہیں پچھلے تین ماہ سے۔“

”اوہ ویری سیڈس! اللہ انہیں صحت دے۔ میں کسی وقت جاؤں گا تمہارے ساتھ انہیں دیکھنے۔“

”ہاں ضرور۔ اچھا یہ دیکھو یہ پہلا پروجیکٹ جو ہمیں صرف چالیس دن میں مکمل کرنا ہے۔“

اس نے لیپ ٹاپ ڈاٹن کے آگے گھسکایا اور دونوں ڈسکشن کرنے لگے۔



”نہیں پیپا! مجھے نہیں جانا۔“ پری نے قطعیت سے کہا۔

عفت کے ساتھ عدیل نے بھی کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”لیکن مجھے تو جانا ہے یہ بات صرف تمہاری طرف سے نہیں ہو سکتی پیپا! مجھے چلنا ہے سیر کے لیے۔“ دانی

بھی حتمی لہجے میں بولا۔

مثال سب کے لیے گرم چائے لے کر آ رہی تھی۔

وہ چائے میز پر رکھ کر خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

عدیل نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا۔

”تم ناشتا نہیں کر رہی ہمارے ساتھ؟“ وہ پیچھے سے مثال کو پکارنا چاہتا تھا مگر عفت کی تیز نظروں سے خائف ہو کر اس نے اپنی پکار کو وہیں خاموش کرادیا۔

”تو تھک ہے تم جاؤ گئیں نہیں جا رہی۔“ پری اسی تمکنت بھرے لہجے میں بولی۔

”دیکھ کیوں پری۔۔۔ جان لیا نے یہ پروگرام صرف تمہاری وجہ سے تو بنایا تھا۔“ عفت اسے چھوٹے بچوں کی طرح چپکار کر بولی۔

”تو کیا اس گھر میں سارے پلان صرف پری بیگم کو خوش کرنے کے لیے بنتے ہیں۔۔۔ میری مرضی، میری خوشی کچھ بھی نہیں۔“

دانی پری کے انداز پر بھڑک اٹھا اور زور سے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس میز پر پٹخ کر بولا۔

عدیل اور عفت اس کے انداز پر لمحہ بھر کو گنگ سے رہ گئے۔

”دانی۔۔۔ یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟“ عفت نے اسے گھر کا۔

”ایک بات آج آپ مجھے کلیئر کر دیں۔ میری اس گھر میں کیا پوزیشن ہے۔ سینڈ سٹیزن ہوں میں کیا اس گھر کا؟“

وہ جیسے غصے میں بھرا ہوا تھا۔

”دانیال!“ عدیل کچھ شکند سا رہ گیا۔

”ہر بات میں صرف پری کی رائے پوچھی جاتی ہے۔ اس کا مشورہ جانا جاتا ہے۔ اس کی پسند ناپسند کو فوری طور پر

جاتی ہے۔ تو پھر میری کیا حیثیت ہے یہاں پہلے پری کی وجہ سے سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ مجھ سے کسی نے نہیں

پوچھا کہ میں جانا بھی چاہتا ہوں یا نہیں، جب میں میٹنگلی تیار ہو گیا تو اب آپ کی لاڈلی کے کہنے پر اس پروگرام کو

کینسل کر دیا جائے گا۔ آئی تو ایسا ہی ہوگا شٹ۔ میں کون ہوں پھر۔“ وہ ساڑھے پندرہ سال کا ساڑھے پانچ فٹ

نکلتا قد، بھرے جسم اور میچور چہرے کے ساتھ ماں باپ کے سامنے کھڑا انہیں آنے والے سخت ترین دنوں کی

بھٹک دکھا رہا تھا۔

”مائی فٹ تو میں بھی اب کبھی کہیں بھی۔ کہیں بھی نہیں جاؤں گا وکے۔“ اس نے زور سے میز پر مکا مارنا شتے

کے لوازمات اور برتن بری طرح سے کھٹکنا کر رہ گئے۔

کری کو ٹھوکر مار کر لڑھکاتا ہوا دروازے کو لات رسید کر تا وہ کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی باہر جا چکا تھا۔ اور

وہ چاروں بالکل گنگ تھے۔

جیسے کسی بڑے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔

”دیکھا تم نے اس کی حرکت کو۔ اسے یہ تمیز ہے بہنوں سے بات کرنے کی۔ کیا پڑھنے جاتا ہے یہ اتنے مہنگے

اسکول میں یہ لڑکا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا عفت! تم اس کی ایسی تربیت کر رہی ہو۔ یہ تو بالکل ہاتھوں سے

نکل چکا ہے اور تم ایسی بے خبر ہیں اس سے۔“ عدیل بری طرح سے صدمے میں تھا اور عفت سے تو جواب میں

کچھ بولا نہیں گیا۔ پریشے کے لیے بھی یہ سب خلاف امید تھا وہ بھی جیسے ڈر کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

عدیل کچھ بھی کھائے بغیر بڑھال سا ڈانٹنگ ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا اور عفت چاہنے کے باوجود اسے روک

نہیں سکی۔  
دانی کے ری ایکشن نے اسے بھی سخت خوف زدہ کر دیا تھا۔ ایسا تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ پھر اسے ہوا کیا۔  
وہ بس یہی سوچ رہی تھی۔



وہ پبلک لائبریری کے باہر بیڑھیوں پر دونوں گھٹنوں کے گرد بازو کا گھیرا کیے بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔  
وہ اندر کی طرف آتے ہوئے اسے دیکھ کر بے اختیار ٹھنکا تھا۔  
اس کے ارد گرد لوگ آ جا رہے تھے۔ مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔  
پرندے شور مچاتے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے وہ ان کے شور کو بھی سن نہیں رہی تھی۔  
واثق آہستگی سے اس کے دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔  
وہ اسی طرح کسی اچھوکی مانند ساکت تھی۔  
”تو جواب ملی پھر ہمیں؟“ بہت دیر بعد واثق نے اس گہرے سکوت کو آہستگی سے توڑا۔  
”نہیں۔“ اس نے حرکت کیے بغیر آہستگی سے جواب دیا۔  
تو وہ اتنی بھی غافل نہیں بیٹھی تھی جتنا اسے واثق سمجھا تھا۔  
”تو کوشش ترک کر دی؟“ وہ اسے بولنے پر اس کے لیے بولا۔  
”نہیں۔“ جواب پھر مختصر تھا۔

”اگر میں کچھ ہلچل کر سکوں تو؟“ وہ لمبے میں کچھ اور بھی نرمی اور اپنائیت سمو کر بولا۔  
”نہیں۔“ وہ اسی طرح کسی ناویدہ نقطہ پر نگاہیں جمائے اسی لمبے میں بولی۔  
”نہیں کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے تمہارے پاس۔“ وہ اس کی ٹکرا پر جھنجھلا کر بولا۔  
”نہیں۔“ وہ پھر اس ٹون میں اسے چڑانے کو بولی۔  
اور اگلے لمبے اس کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اٹھ کر جانے لگی اور واثق کو پتا بھی نہیں چلا بالکل غیر ارادی طور پر  
اس نے مثال کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا۔  
مثال کو جیسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا۔  
وہ تڑپ کر مڑی۔

وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اپنائیت بھری مسکراہٹ سے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ روز اسی طرح ملا کرتے  
ہیں۔  
”مشر۔“ وہ پورا زور لگا کر ہاتھ کھینچ رہی تھی۔  
”واثق۔“ واثق احمد نام سے میرا اور آپ کا مثال۔ ہے نا۔“ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیے  
اس کے سرخ ہوتے چہرے پر نظریں جمائے بولا۔

مثال کی آنکھیں کچھ حیرت سے پھیل سی گئیں۔  
”بھئی اب اتنے مبینوں بلکہ شاید سالوں سے تو ہم مل رہے ہیں، میرا مطلب ہے آتے جاتے رستوں پر ٹکرا  
رہے ہیں تو اتنا حق تو ہے ایک دوسرے کے نام جان سکیں اور ایک دوسرے کے مسائل شیئر کر سکیں۔ ایم آئی  
رائٹ؟“ وہ اس کے برابر ٹھٹھاہو کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔



”پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں فوراً۔“ وہ غصے میں غرا کر بولی۔

”ورنہ آپ پھنچ سکتی ہیں۔“

”میں یہ کر سکتی ہوں جانتے ہیں آپ چھوڑیں مجھے۔“ وہ اسے پرے دھکیل کر زور سے بولی تو اس نے ایک دم سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”آپ کہیں بھی چلی جائیں۔ آپ کا ہر راستہ مجھ تک آئے گا۔ اور یہ ہر بار اتفاقاً نہیں ہوتا۔ بہتر ہے، ہم کہیں بیٹھ کر بات کر لیں میں صرف یہ چاہتا ہوں۔“

وہ بولتا ہوا اب اس کے برابر چل رہا تھا۔

”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی؟“ وہ اس سے آگے نکلنے کی کوشش میں اب تقریباً ”دوڑ رہی تھی۔“

”پلیز آہستہ چلیں ٹوگ تجھیں گے شاید ہم دونوں کسی میراٹھن میں حصہ لینے جا رہے ہیں۔ سب ہماری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔“ اس نے ڈرایا اور وہ ڈر گئی۔

بے اختیار دایا میں بائیں دیکھنے لگی۔ لوگ گزرتے تھے مگر ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔

”مثلاً! میں آپ کو جواب دلا سکتا ہوں بہت اچھی نہیں لیکن ایک مناسب جاب۔ ایک اچھی ایڈیٹی کو جو نیئر نیچرز کی ضرورت ہے اگر آپ کا موڈ ہو تو اس ایڈریٹس پر چلی جائیے گا۔ آئی ہو آپ کا کام بن جائے گا۔ ظاہر ہے اسٹڈیز کے دوران آپ ناٹن ٹوفا سیو والی جاب تو نہیں کر سکیں گی۔ فی الحال یہ ایڈیٹی جاب آپ کو سوٹ کرے گی۔“ کہہ کر وہ وزٹنگ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا کہ آگے بڑھ گیا مثال وہیں۔ کھڑی اس کو جاتے دیکھتی رہی۔

دوسری نظر اس نے وزٹنگ کارڈ ڈالی۔

”اس کو میرے بارے میں سب کچھ کیسے معلوم ہے۔ میرا نام چلو جاب ڈھونڈنے کا پتا تو اسے میرے بک ایڈو کروانے پر ہو گیا۔ میں پڑھ رہی ہوں اسے یہ بھی معلوم ہے اور پتا نہیں کیوں میں اس سے بہت سختی سے پیش نہیں آتی۔“

اور یہ ٹھیک کہتا ہے کہ ہم دونوں اتنی بار ٹکرائے ہیں کہ اب تو واقعی مجھے بھی اس کی عادت ہی ہونے لگی ہے۔ پایا کہ گھر جب بھی آئی تھی میں انجانے پن میں اس کے کہیں نہ کہیں ملنے کی کیوں منتظر رہتی تھی۔“ وہ اب ست روی سے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یہ پبلک لائبریری عدیل کے گھر سے پیدل کے راستے پر تھی اور کوئی نہ کوئی کتاب ایڈو کروانے کے لیے وہ اکثر شام کو ادھر آ جایا کرتی تھی اور آج تو سارا دن سارے گھر میں موت کا سناٹا رہا تھا۔ اس نے عفت کو لائبریری آنے کا بتایا تو اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔

کل شام میں میں اس ایڈیٹی جاؤں گی۔ مجھے اس کا نام بھی مجھ دیکھا دیکھا لگ رہا ہے۔“

وہ کارڈ کو سرسری نظر سے دیکھ کر کمرے میں دباتی شام گری ہونے کے احساس پر تیز قدموں کے ساتھ گھر کی طرف چل پڑی۔



سارا اگھر بیک ہو چکا تھا۔

بھاری فرنیچر اور دوسرے سامان کو دو تین کمروں میں اکٹھا کر کے بحفاظت رکھ دیا گیا تھا۔ بہت سا سامان احسن کمال کے کہنے پر ضرورت مندوں میں یونہی دے دیا گیا تھا۔

اپنی آئینہ کی اور احسن کی پینٹنگ وہ مکمل کر چکی تھی۔ اور وہ یہ سارے کام کسی روبوٹ کی طرح بناتی رہی تھی۔ اس کی دلچسپی اب کسی بھی کام میں نہیں رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا۔ اب وہ جس سفر پر جانے والی ہے اس سے کبھی واپسی نہیں ہوگی۔ اس نے تھکی ہوئی نظر سارے گھر پر ڈالی کچھ بھی ٹھیکنے کو نہیں رہ گیا تھا۔ رات گیارہ بجے کی فلاٹ تھی ان کی سٹڈی کے لیے سیفی دو دن پہلے جا چکا تھا۔ وہ چھ سات ماہ بعد ہمیشہ کے لیے ان کے پاس آسٹریلیا آجاتا۔ آئینہ اور احسن کمال کچھ ضروری چیزوں کی شاپنگ کے لیے مارکیٹ گئے تھے۔ جہاں انہیں تین چار گھنٹے لگ سکتے تھے۔

ابھی ساڑھے چار ہوئے تھے اس کے پاس ٹائم تھا۔ وہ اس خیال کے آتے ہی بے چین سی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔



وہ کل کی ایڈیٹنگ کر دینی ہوئی کتابیں لے کر چھت پر آگئی۔ بہت سوچنے کے باوجود بھی وہ اکیڈمی نہیں جاسکی تھی۔ پہلے پیپا سے بات کروں لیکن آج کل ان کا موڈ بہت آف ہے۔ اگر انہیں بعد میں پتا چلا تو ناراض ہو جائیں گے۔ وہ یہی سوچ کر نہیں گئی۔ اور گھر کا ماحول تو ابھی بھی بہت خراب تھا۔

دانی نے عفت کے لاکھ سمجھانے سمجھانے کے باوجود عدیل سے معذرت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ عفت کو پہلی بار عدیل سے بہت شرمندگی ہوئی تھی۔ وہ رات بہت دیر سے گھر آیا اور کچھ بھی کھائے بغیر خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اور صبح بھی خاموشی سے خالی چائے پی کر آفس چلا گیا تھا۔ پری بھی بالکل خاموش تھی۔

اور مثال سے تو کسی کو کوئی غرض نہیں تھی۔ ان دو دنوں میں اس نے کچن کا گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا کہ کہیں کو تانی ہو جانے پر بیٹے کا غصہ عفت اس پر نہ نکال دے۔ مگر عفت بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

”ماما نے اتنے دنوں سے مجھے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ مجھ سے بات نہیں کی جیسے انہیں ایسے کسی بہانے کی تلاش تھی کہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا لیتیں۔ وہ انہیں سیفی نے دے دیا تھا۔“ ایک دم سے اسے بشری کی بے اعتنائی کا خیال آیا آنکھیں بھر آئیں۔ نیچے سڑک پر گاڑی کے رکنے اور گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر وہ بونہی بے دھیان سی بیٹھی رہی۔ ”وہ کہیں مجھے لینے تو نہیں آئیں؟“ بہت دیر بعد اسے اچانک جیسے خیال آیا تو وہ تیزی سے نیچے بھاگ گئی۔



عفت سامنے کھڑی اس خوب صورت پروقار اور احسن والی ادھیڑ عمر عورت کو دیکھ کر کچھ چوکی تھی۔

”میں بشری!۔ مثال ہے گھر پر؟“ وہ بہت رک کر بولی تھی عفت شکند سی کھڑی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

# اور وہ سچ نکلی

میں ان دونوں سے محبت کرتا تھا اور وہ دونوں مجھ سے۔

زویا اور ماریہ۔ ایک میری پھوپھی زاد بھی اور ایک چچا زاد۔

ہم تینوں کا بچپن اکٹھے کھیلتے کودتے گزرتا تھا۔ اس لیے کہ ہم تینوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ پھوپھی شادی کے دو سال بعد ایک سالہ زویا کو گود میں اٹھائے بیوگی کی سفید چادر اوڑھے میکے لوٹ آئی تھیں۔ دادا دادی چاہتے تھے کہ پھوپھی کی شادی کر دیں۔ مگر پھوپھی نے کہا۔

”آج کے بعد دوبارہ یہ بات مت کیجئے گا۔ میرے پاس میری زویا ہے۔ میں اپنی ساری عمر اس کے سہارے گزار سکتی ہوں۔“

اس وقت سب خاموش ہو گئے تھے کہ ابھی نیا نیا زخم ہے بھرنے میں وقت لگے گا لیکن کچھ زخم بھی نہیں بھرتے پھوپھی نے بھی نصر پھوپھا کے ساتھ جو عہد کیا تھا، اسے آہستہ بھایا۔ سو میں نے ہوش سنبھالنے پر پھوپھو کو اپنے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ اس وقت میری عمر چار سال تھی۔ میں اپنے دو بھائیوں سے چھوٹا تھا اور میری کوئی بہن نہیں تھی۔ دونوں بڑے بھائی طاہر اور منیب ایک دوسرے کے ساتھ مگن رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنے کھیل یا سرگرمیوں میں شامل نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی مجھے اپنی چیزوں میں سے حصہ ضرور دیتے تھے۔

چچا کے دو ہی بچے تھے۔ دو سالہ ماریہ اور مجھ سے دو سال بڑا خرم۔ تو جب پھوپھو اس گھر میں آئیں تو ہم تینوں کے درمیان دوستی کا ایک بڑا مضبوط رشتہ بن گیا

تھا۔

میں اس وقت تک ناشتہ کھانا نہیں کھاتا تھا جب تک زویا اور ماریہ نہیں آجاتی تھیں۔ ایک بار زویا کو خسرہ نکل آئی تو پھوپھو اسے ناشتے پر نہیں لائیں۔ اس کے باوجود جب تک وہ اسے گود میں لے کر نہیں بیٹھیں میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اس طرح ایک بار میں میز میزوں سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ میرے سر پہ

ٹانکے لگے تھے۔ اور میں اسپتال سے جب تک آ نہیں گیا تھا ماریہ نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

میری اماں، چچی اور پھوپھو کے درمیان کوئی روایتی چپقلش نہ تھی۔ تینوں کے درمیان بہت اچھی اندر اسٹینڈنگ تھی۔

ہم تینوں بچپن سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہوئے پھر لڑکپن سے جوانی میں، لیکن ہماری یہ مثلث ایسی طرح قائم تھی۔ حالانکہ خرم نے کئی بار کوشش کی تھی اسے مزاح بنانے کی، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

ہم تینوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ ہم تینوں ہی ایک دوسرے کا بے تحاشا خیال رکھتے تھے۔ میں اگر زویا کے لیے کچھ خریدتا تو ماریہ کے لیے بھی ضرور لے کر آتا۔ وہ دونوں بھی میری سالگرہ اور میری چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو بے حد اہتمام سے مناتیں اور میں بھی ہر چھوٹے بڑے موقع پر انہیں چھوٹے چھوٹے تحائف دیتا۔

ہم سمجھتے تھے شاید زندگی ایسے ہی گزر جائے گی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زندگی بتا دیں گے لیکن پہلی بار ہماری اس مثلث کے





میں نے بیٹے ہوئے ان کے گلے میں بائیس ڈال کر ان کی پیشانی چومی اور آفس جانے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا۔

اس روز آفس میں کام کرتے ہوئے میرے دل میں گدگدائی ہوتی رہی کہ صبح میں جلدی نکل آیا تھا اور میں نے زویا اور مایا سے یہ بات ڈسکس نہیں کی۔ خیر شام کو ضرور بتاؤں گا کہ اماں کیا سوچ رہی ہیں اور یہ کہ وہ مطمئن رہیں، میری بیوی کے آجانے سے ہماری دوستی ہرگز متاثر نہیں ہوگی اور ہماری نرائی اہمکل کے خط ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔

اماں نے میری پسند پوچھی تھی۔ اس لیے اس روز میں نے اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی تدریس دھیان سے دیکھا تھا۔ دو تو میری ڈھکیں، جب کہ ایک کا چنچا چلاتا میک اپ میری طبیعت پر انتہائی گراں گزرتا تھا اور ایک اگرچہ غیر شادی شدہ تھی لیکن ادھیڑ عمر تھی۔

مجھے بڑی ہنسی آئی کہ اب زین العابدین صاحب لڑکیوں کو پسند کریں گے۔

”نہیں بھئی یہ اماں کا شعبہ ہے۔ انہی کے پاس رہنے دیا جائے۔“

اس روز گھر آکر شام کے وقت لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے میں نے ان دونوں کو اماں کا خیال بتایا تو وہ دونوں ہی جیسے یکدم پرجوش ہو گئیں۔

اس روز وہ دونوں کتنی ہی دیر تک بیٹھی مختلف لڑکیوں کو ڈسکس کرنی اور ریجھکے کرتی رہیں۔

دوسری طرف اماں بڑی بھابھی چھوٹی بھابھی اور دونوں بھائیوں کے ساتھ کانفرنس کر رہی تھیں۔

”مجھے تو خیر دونوں ہی پیاری ہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے لیے جھوٹی پھیلاؤں۔“

”اماں! یہ بات آپ زین سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔ ویسے میرے خیال میں ماما بڑی ہے، سو پہلا حق تو اسی کا بنتا ہے۔“ چھوٹی بھابھی نے کہا تھا۔

”یوں بھی یہ اچھا فیصلہ ہو گا۔“ بڑے بھائی بولے

خط اس وقت کمزور پڑے جب کھر میں میری شادی کی بات چلی۔



میں نے اسی سال ایم بی اے کیا تھا۔ ماریہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ زویا اس سے ایک سال پیچھے۔

مجھے ایم بی اے کرتے ہی فوراً ”جواب مل گئی تھی۔ اماں اباجر پر جانے سے پہلے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔“

”لیکن اماں! شادی کس سے کریں گی۔ وہ تو دونوں کا دیوانہ ہے اور دونوں اس کی۔“ میری بڑی بھابھی بہت شرمیلی اور خجالی تھیں۔

”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔“

اور اماں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

”زین! ہم تمہاری شادی کے لیے سوچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا۔“

”ضرور سوچے اماں! میں نے کب منع کیا ہے۔“

میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنی ٹالی درست کر رہا تھا۔ یہ ٹالی اور ایک پرفوم مجھے ماریہ نے جاب ملنے پر گفٹ کیا تھا۔

”تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے زین!“

”میں لڑکیوں پر نظر رکھتا ہوں، آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے۔“ میں نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے مصنوعی غصے سے انہیں دیکھا۔

”میرا مطلب ہے یونیورسٹی کالج میں کبھی کوئی لڑکی پسند آئی۔“

”نہیں۔۔۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے کبھی لڑکیوں سے دوستی نہیں رکھی۔“

”تو پھر کیا ہم اپنی مرضی سے تمہارا رشتہ طے کر دیں، تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟“

”نہیں پیاری اماں! بالکل بھی نہیں۔“



تھے۔

وہ دونوں اس وقت یکن میں تھیں اور میں فرخ سے اپنی کی بوتل لینے آتا تھا۔

”کیوں تمہیں الہام ہوا تھا۔“ بڑی بھابھی نے ذرا تیکھے انداز میں پوچھا تھا۔

”مایا دراصل گھوری جی پی ہے اور زویا سانولی سی۔“

چھوٹی بھابھی نے اپنے تئیں بڑی ٹھوس دلیل دی۔ دراصل انہیں گورے رنگ کا کمپلیکس تھا، لیکن مجھے نہیں، میں نے تو کبھی اس بات پر دھیان بھی نہیں دیا تھا کہ زویا سانولی ہے اور مایا گوری۔ دونوں ہی پُرکشش تھیں۔

”اور میں زین کی جگہ ہوتی تا تو دونوں سے ہی شادی کر لیتی۔“ بڑی بھابھی نے شوخی سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ چکی تھیں۔

”تمہیں فیصلہ کرنا تو بہت ہی مشکل ہوا ہو گا زین!“ بڑی بھابھی بغور مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”نہیں تو۔“ میں فرخ سے بوتل نکال کر مڑا۔ ”مجھے اماں اور بھائی صاحب کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ بڑے ہیں بہتر سمجھتے ہیں۔“

”زویا کا خرم کے ساتھ اور مایا کا زین کے ساتھ رشتہ ہو جائے تو دونوں لڑکیاں گھر میں رہ جائیں گی۔“ ”یہ بات تو تم نے بہت اچھی کہی ہے طاہر۔“ اماں خوش ہو گئی تھیں۔

”لیکن زین سے ضرور پوچھ لیجئے گا اماں!“ چھوٹے بھائی نے اب بھی اماں کو تاکید کی تھی اور اماں نے مجھ سے پوچھ لیا۔ کچھ دیر تک تو میں ہکا بکا سالماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ گھر کی بچیاں ہیں دیکھی بھائی۔ انہیں رہنے بسنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا اور ہمیں انہیں قبول کرنے میں اور پھر بچپن سے تمہارا ساتھ ہے۔ ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تمہیں سمجھتی ہیں۔ ہم سب کا خیال تو مایا کے لیے ہے لیکن اگر تمہارا رجحان زویا کی طرف زیادہ ہو تو۔۔۔“

”میرا رجحان؟“ میں نے خود کو ٹھٹھا۔ میرے لیے تو دونوں ہی برابر تھیں۔

”مایا یا زویا۔“

میرے لیے زویا اور مایا دونوں ایک جیسی تھیں۔ میں دونوں کو یکساں عزیز رکھتا تھا اور آج سے پہلے میں نے دونوں کے متعلق اس طرح کی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ اور شاید انہوں نے بھی اس طرح کبھی نہ سوچا ہو میری خاموشی پر اماں نے بڑے بھائی والی بات کہہ سنائی کہ اگر میں مایا کے حق میں فیصلہ دوں تو زویا کو جچی خرم کے لیے لے لیں گی۔ اس طرح دونوں لڑکیاں گھر میں ہی رہ جائیں گی۔ مجھے اپنی مثلث کا خیال آیا۔ پھر میں نے واقعی مایا کے حق میں ہاں کر دی۔ دوسری صورت میں مایا کو اس گھر سے رخصت ہونا پڑتا۔

اماں خوش ہو گئیں اور فوراً ہی پورے گھر میں بات پھیل گئی۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا زین مایا کو پسند کرے گا۔“ چھوٹی بھابھی بڑی بھابھی سے کہہ رہی تھیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے  
ہمیں کے لیے جو نعمتیں نازل

کے لیے لکھی ہیں

میرے خوشی کی



قیمت - 350 روپے

منگوانے کا نام

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، اردو بازار، کراچی



”کیا تمہیں زویا کا خیال نہیں آیا زین؟“ مجھے  
بھابھی کا لہجہ عجیب سے لگا۔

”کیسا خیال؟“

”یہی کہ تم نے مایا کو منتخب کیا تو وہ ہرٹ ہوگی؟“  
”کمال کرتی ہیں بھابھی آپ۔ وہ دونوں تو خود کئی  
دنوں سے زور و شور سے میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی  
ہیں۔“

”عجیب ہو تم تینوں بھی۔“

بھابھی سر جھٹک کر پھر اپنے کام میں مصروف  
ہو گئیں اور میں پانی کی بوتل لے کر اپنے کمرے میں  
آ گیا۔

اس رات باہر لان میں ٹپکتے ہوئے مجھے مایا کچھ  
اداس اور خاموش سی لگی تھی اور زویا نارمل۔۔۔  
میں نے دو تین بار مایا سے پوچھا۔ اور اس نے  
چونک کر کہا تھا۔ ”ماں تھیک ہوں۔“  
”زویا! یہ چیکنگ ہے نا۔ سراسر چیکنگ کہ مایا کے  
دل میں کوئی بات ہے اور یہ ہم سے شیئر نہیں  
کر رہی۔“

”تو کیا تم نے چیکنگ نہیں کی کہ ہمیں بتایا تک  
نہیں اور ہم خواہ مخواہ تمہارے لیے لڑکیاں تلاش کرتے  
رہے بلکہ میں نے تو ایک لڑکی فائنل بھی کر دی تھی۔ وہ  
تو زویا کو اچھی نہیں لگی تھی ورنہ۔“

وہ قدرے اندھیرے میں تھی جبکہ برآمدے میں  
لگے بلب کی مدھم روشنی زویا کے چہرے پر پڑ رہی  
تھی۔

”مجھے تو خود آج ہی چار گھنٹے دس منٹ پہلے بتایا تھا  
جب میں اپنے کمرے میں تھا اور اماں نے آکر بتایا تھا  
کہ ان لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“

”تو تمہیں اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں  
ہوا؟“ مجھے مایا کی آواز بھیگی بھیگی سی لگی۔

”اف یہ لڑکیاں۔۔۔ ویسے شادی کے لیے مری جاتی  
ہیں اور جب شادی ہونے لگتی ہے تو رونا دھونا شروع  
کر دیتی ہیں۔“

ایک بار نہ جانے کس بات پر چھوٹے بھائی نے کہا

تو اماں نے کہا تھا۔

”باہل کا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔“

لیکن مایا سے تو باہل کا آنگن نہیں چھینا جا رہا تھا۔ وہ  
تو اسی آنگن میں رہتی۔ بس کمرہ بدل جانا تھا۔ اپنے  
کمرے سے اٹھ کر میرے کمرے میں آجاتی۔ پھر کیوں  
اس کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

”نہیں! بھلا مجھے کیوں اعتراض ہوتا۔

اماں! ابابھائی جو بھی فیصلہ کرتے۔ چاہے وہ تم ہو میں  
”زویا یا کوئی اور۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔  
”کیا تمہیں اعتراض ہے؟“

”نہیں! دراصل۔۔۔ میں نے اس سے پہلے اس  
طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔“

”سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا، لیکن کیا یہ زیادہ اچھا  
نہیں ہے کہ کسی اجنبی سے ہونے کے بجائے کسی  
ایسے سے شادی ہو جو آپ کو اچھی طرح جانتا ہو۔  
آپ کی پسند ناپسند ہر چیز کا پتا ہو اسے۔“

”کیا تمہیں میری پسند ناپسند کا پتا ہے زین!“

”مجھے نہیں تو کس کو پتا ہو گا۔“ میں ہنس پڑا۔

”اصولاً“ تو تمہیں مجھ سے شرمنا چاہیے تھا، لیکن  
تم ہو کہ پٹر پٹراتیں کیے جا رہی ہو۔ کیوں زویا؟“

”ہاں۔“ زویا مسکرائی ”بلکہ اسے تو اب تم سے پرہ  
کرنا چاہیے۔“

مدھم روشنی میں، میں نے اس کی طرف دیکھا۔  
مجھے اس کی مسکراہٹ پھپکی پھپکی سی لگی۔ یہ اس  
مسکراہٹ سے مختلف تھی جو پہلے اس کی بے حد  
دلکش آنکھوں میں دمکتی تھی پھر ہونٹوں پر چلتی تھی۔  
مایا چلی گئی تھی۔

”اے۔۔۔ شرارہی ہو؟“

میں نے اسے آواز دی تھی لیکن اس نے مڑ کر  
نہیں دیکھا تھا۔ پھر بہت دیر تک میں اور زویا ٹپکتے  
رہے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ میں نے زویا کو بتایا  
کہ اماں کہہ رہی ہیں کہ وہ اور خرم۔۔۔

خرم جو کبھی ہماری مثلث توڑ کر مربع نہیں بناسکا تھا

دن پہلے آیا۔ میں زویا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو میں نے بھا بھی سے پوچھ ہی لیا۔  
 ”ارے وہ تو مایا کے ساتھ پار کر گئی ہے۔“  
 ”ہیں۔ لیکن میری شادی تو پرسوں ہے۔“  
 ”تو پرسوں ہی ہوگی نا۔“ بڑی بھا بھی نہیں۔

اور میری ملاقات زویا سے پھر اگلی صبح ہی ہو سکی تھی کیونکہ میں بے حد تھکا ہوا تھا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔  
 صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں کمرے سے نکل کر کچن میں آیا کہ اگر وہاں کوئی ہو تو اسے چائے کے لیے کہوں۔ زویا کھڑی چائے بنا رہی تھی۔  
 ”کہاں غائب ہو بھی۔ میں کل سے آیا ہوں اور تم نظر نہیں آرہیں۔“  
 ”ہم جب آئے تو تم سو چکے تھے۔“

اس نے بس ایک نظر ہی مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور پھر پیالیوں میں قہوہ ڈالنے لگی۔  
 ”میرے لیے بھی ایک کپ بنا دو۔“  
 ”تمہارے لیے ہی بنا رہی ہوں۔“ اس نے مڑ کر مجھے نہیں دیکھا۔  
 ”دوسری محترمہ کا کیا حال ہے۔ کیا اب ان کا دیدار شادی کے بعد ہی ہو گا؟“  
 ”یقیناً۔“

اس نے چائے بنا کر کپ مجھے پکڑا دیا اور دوسرا کپ اٹھا کر یہ کہتے ہوئے نکل گئی۔  
 میں چائے کا کپ لیے اپنے کمرے میں آیا تو وہاں چھوٹے بھائی بیٹھے تھے۔  
 ”میں نے تمہاری بھا بھی سے کہا ہے، ہم دونوں کا ناشتا ادھر ہی لے آئیں پھر کہیں جانا ہے۔“  
 ”کہاں؟“

”یار اور زبی سے تمہارے کپڑے اٹھانے ہیں۔“  
 ”اچھا ناشتا کر کے شیوہ بنالوں۔ پھر چلتے ہیں۔ میں جوتے نہیں لے سکا۔ ناٹم نہیں ملا تھا۔“  
 ”ایک کام کہا تھا۔ وہ بھی نہیں ہو سکا۔ خیر جارہے ہیں تو لے لیں گے۔ لیکن شیوہ وغیرہ مت کرو

آب بنانے والا تھا۔  
 زویا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاید اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خرم انجینئر تھا اور ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔



گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ گھر میں میری شادی اور زویا کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زویا کی بڑھائی ختم ہونے میں ابھی پورا سال تھا اور خرم کو اس کی کمپنی دو سال کے لیے سعودیہ بھیج رہی تھی۔ فی الحال زویا کی منگنی ہو رہی تھی۔

بھابھیوں کے بازار کے پتھر لگ رہے تھے۔ زویا مایا بھی ان کے ساتھ ہی جاتی تھیں اور اب کم ہی نظر آتی تھیں اور ابھی شادی کی تاریخ طے ہی کی گئی تھی کہ میرا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ جس روز میں جاب رہا تھا اس روز بھی مجھے وہ دونوں ہی نظر نہیں آئی تھیں۔  
 ”بھئی شادی میں ایک ماہ سے اس لیے مایا کا تو تم سے پردہ ہے اور رہی زویا کی بات تو وہ غالباً مایا کے کمرے میں ہے۔ اس کے دوپٹوں پر گونا گونا رنگ رہے ہیں۔ اس لیے تم ادھر نہیں جا سکتے۔“  
 ”اچھا۔ زویا کو تو بلا دین پھر ناراض ہوگی کہ مجھ سے مل کر نہیں گیا؟“

اور بھا بھی کے بلانے پر وہ افرا تفری میں آئی اور پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔  
 میں نے حساب لگایا۔ آج سے ٹھیک آٹھ دن پہلے لان میں ان کے ساتھ ٹہل رہا تھا اور یہ وہی دن تھا جب اماں نے مجھے مایا کے متعلق اپنا فیصلہ بتایا اور میں نے اوکے کر دیا تھا۔

”ان آٹھ دنوں میں میں بہت بڑی ہو گیا تھا۔ اکثر گھر پر بھی لیپ ٹاپ پر کام میں مصروف رہتا تھا، لیکن ایسا تو پہلے بھی ہو تا تھا اور تب وہ دونوں ہی میرے کمرے میں آ جاتی تھیں، لیکن اب ان آٹھ دنوں میں شاید دو یا تین بار ہی میں نے مایا اور زویا کو دیکھا تھا۔  
 خیر میں کراچی چلا گیا اور اپنی شادی سے صرف دو

فورا "بعد اٹھ گئی تھی۔ مایا میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ دکتی گلابی رنگت والی سب ہی دلہن کی تعریف کر رہے تھے۔

اور پھر ولیمہ والے دن بھی وہ مجھے سب سے الگ اور منفرد لگی۔ اس کی سائو پی رنگت میں ہلا کی ملاحات تھی جو میک اپ سے دمک اٹھتی تھی۔



ناران میں دریائے کنہار کے کنارے بیٹھ کر اس میں پتھر پھینکتے ہوئے، جھیل سیف الملک کی طرف جاتے ہوئے، میرا ہاتھ پکڑ کر گلیڈیٹر پر چلتے اور تنگ بگنڈی پر آگے پیچھے چلتے ہوئے لالہ زار کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے مجھے ایک بار بھی وہ اتنی خوش نہیں لگی تھی جتنا کہ اسے لگنا چاہیے تھا۔

"مایا! کیا تم یہاں آکر خوش نہیں ہو۔ کیا تم کہیں اور جانا چاہتی تھیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے یاد تھا جب پہلے ہم یہاں آئے تھے۔ تو تم نے کہا تھا۔ کاش میں پھر بھی یہاں آسکوں۔ میں نے تب ہی یہاں کارپورگم بنایا تھا، حالانکہ چھوٹے بھائی کہہ رہے تھے کہ یہاں چلے جاؤ لیکن اب مجھے لگ رہا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو میں یہاں آکر۔ ہیں نا۔"

"میں خوش ہوں لیکن پہلی بار جو ایکساٹمنٹ ہوتی ہے وہ دوسری بار تو نہیں ہو سکتی نا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" مجھے اس کی بات صحیح لگی۔

سو میں نے مزید کسی بات پر غور نہیں کیا۔ مایا کے متعلق کوئی بھی شخص پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بہت اچھی بیوی ہے۔ وہ میری بیوی تھی، میری دوست اور نمکسار تھی۔ ہماری زندگی بہت پرسکون تھی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ مجھے ہر چیز تیار ملتی، میرے کپڑے، جوتے، میرے آفس کے کاغذات فائلیں سب۔

وہ کھانا بہت عمدہ پکاتی تھی۔

مجھے ذرا سا زکام بھی ہوتا تو وہ ساری رات جاگتی

اب کل ہی کرنا دو لہا بننے سے پہلے۔" وہ مسکرائے۔ "تم خوش ہو نا؟"

میں چائے پی رہا تھا جب انہوں نے اچانک پوچھا تو میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں نے اماں سے کہا تھا، تم سے ضرور پوچھ لیں۔"

"ہاں پوچھا تو تھا انہوں نے۔"

"اچھا۔۔۔ میرا خیال تھا شاید تم زویا سے؟ میرا مطلب ہے تم زویا کو پسند کرتے ہو؟"



اس وقت تو مجھے چھوٹے بھائی کی بات صحیح نہیں لگی تھی لیکن ٹھیک ایک سال، ایک ماہ دس دن بعد میں سوچ رہا تھا چھوٹے بھائی نے کتنا صحیح کہا تھا۔ یعنی میں نے اتنا عرصہ اس غلط فہمی میں گزار دیا کہ میں مایا کے ساتھ بہت خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں۔ ویسے تو اس میں کچھ اتنا جھوٹ بھی نہیں تھا۔ میری زندگی بہت خوش گوار تھی۔

مایا دلہن بن کے بے حد حسین لگ رہی تھی، جب اسے اسٹیج پر لایا گیا تھا تو میں ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر وہ مجھے اداس ہی لگی تھی حالانکہ اسے بہت دور نہیں جانا تھا۔ مگر شاید لڑکیاں اتنی نازک دل ہوتی ہیں کہ اس موقع پر دل بھری آتا ہے۔

کچھ دیر بعد زویا کو بھی اسٹیج پر لایا گیا تھا وہ بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی بے حد خوب صورت آنکھیں بیویشن نے اور بھی قابل بنادی تھیں۔

اسے مصنوعی پلکوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی اپنی پلکیں ہی اتنی خوب صورت تھیں۔ لمبی، گھنی، مڑی ہوئی جیسے خوب صورت جھیلوں کے گرد سیاہ جنگل۔

وہ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ میرا نکاح ہو چکا تھا اور اب زویا کو انکو بھی پہنائی جانی تھی۔ انکو بھی چچی نے پہنائی۔ کیونکہ خرم سعودیہ میں تھا۔ زویا زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی، منگنی کی تقریب کے



تھی۔ اور جب اسے کوئی تکلیف ہوتی تو میں بھی سونہ پاتا۔ مثالی زندگی تھی ہماری لیکن پھر بھی کبھی کبھی بہت خالی پن لگتا تھا۔ ایک بار میں نے مایا سے کہا۔  
 ”یار! تم کیسی پیوی ہو کبھی لڑتی شوقی نہیں ہو۔ نہ کوئی فرمائش نہ کوئی ضد۔“  
 ”ہم بچپن سے اکٹھے رہتے آ رہے ہیں۔ کیا پہلے کبھی بے سلاوں میں ہماری لڑائی ہوئی؟“  
 ”لیکن اب تو تم پیوی ہو۔ پیویوں کا تو حق بنتا ہے لڑنا۔“

میں شاید اس خاموشی اس سکون کو توڑنا چاہتا تھا جو کبھی کبھی مجھے بے طرح محسوس ہوتی تھی۔  
 ”لیکن میں تم سے لڑ نہیں سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔“ مایا اس لمحے مجھے بڑی اداس لگی۔  
 ”اچھا۔ میں اگر دوسری شادی کر لوں تب بھی نہیں؟“ میں نے سرو کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔  
 ”تو تب بھی نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے تم دوسری شادی کبھی نہیں کرو گے۔“  
 ”دو! اگر مجھے کسی سے محبت ہو جائے تو؟“

وہ ہنس پڑی۔  
 ”تمہیں کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔“ اس کے یقین پر میں مسکرا دیا۔  
 ”تم صحیح کہتی ہو مجھے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے علاوہ اگر کسی سے محبت ہوتی تو وہ صرف تم اور زویا ہو۔ لیکن جب تک تم سے شادی نہیں ہوئی تھی اس محبت کی نوعیت مختلف تھی، لیکن اب تم میری زندگی میں شامل ہو گئی ہو، زویا ہمارے درمیان سے نکل کر اپنا الگ زاویہ بنالے گی خرم کے ساتھ، لیکن ہمارے درمیان وہ ابتدائی محبت کبھی ختم نہیں ہوگی جس کی جڑیں ہمارے اندر ہیں۔“

”بچپن کی محبتوں کی ڈیمانڈ اور ہوتی ہے اور جوانی کی محبتوں کی اور۔“ پتا نہیں اس نے کیوں کہا تھا۔  
 میں اس کی بات نہیں سمجھا تھا، لیکن میں نے اس کی تائید ضرور کی تھی۔

آج ہمارے درمیان روزمرے معمولات سے ہٹ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شادی سے پہلے مایا اتنی کم گو نہیں تھی، جتنی اب ہو گئی تھی۔ میں کبھی کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں بھی پہلے بہت بولتا تھا۔ ہماری باتیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ جب تک ہم تینوں ایک دوسرے کو دن بھر کی روداد سنانے لیتے، ہمیں چپن نہ آتا تھا۔ لیکن اب میں گھر آتا تو کھانا کھاتے ہی دی دیکھتے کبھی مجھے اسے دفتر میں گزرے دن کا احوال سنانے کا خیال نہ آتا تھا اور نہ ہی مایا نے مجھے کبھی بتایا تھا کہ دن بھر اس نے کیا کیا۔ فارغ وقت میں کیا کرتی ہے۔



کراچی میں تقریباً ایک سال رہنے کے بعد مجھے واپس لاہور بلوایا گیا۔ لاہور واپس جانے کا سن کر مایا بے حد خوش ہوئی تھی۔ ہم جب گھر پہنچے تو زویا یونیورسٹی میں تھی۔ ایک ماہ بعد اس کے فاسٹل پیپرز ہونے والے تھے۔

ہم سب لاؤج میں بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے چچی کھانے کا انتظام کرنے کے لیے پکن جانے لگیں تو مایا بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ دونوں بھابھیاں پہلے ہی پکن میں تھیں۔ میں کچھ دیر اماں ابا اور چچا سے باتیں کرتا رہا اس دوران بڑی بھابھی اور چھوٹی بھابھی نے دوبار چائے بھجوائی تھی۔

”ارے بھو! لچ بھی کرنا ہے اس نے۔“ چھوٹے چچا نے بڑی بھابھی سے کہا جب وہ دوسری بار چائے لائیں تو۔

”چچا جان! یہ چائے ان کی نصف بہتر بھجوا رہی ہیں۔“

اس لمحے مجھے مایا پر بہت پیار آیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کراچی آنے کے بعد چائے زیادہ پینے لگا تھا۔ اپنی اماں سے باتیں کرتے ہوئے بھی اسے میرا خیال تھا۔  
 ”مینا تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر کھانے پر ملاقات ہوتی ہے۔“ چچا اٹھتے تو میں بھی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا لاؤج سے باہر آیا تو تھکی تھکی سی زویا اندر آ رہی تھی۔

کشانہ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔

”زونی۔“

میں بے اختیار اس کی طرف بڑھتا تھا۔

”زین۔ کیسے ہو۔“

اس نے اپنی لمبی گھنی پلکیں اٹھائیں، وہ گھنی لائینی پلکیں جنہیں دیکھ کر مجھے سیاہ گھیرے جنگلوں کا خیال آتا تھا۔

مجھے اس کی آنکھیں سیاہ بادلوں کی طرح لگیں، بنو بانیوں سے بھرے ہوتے ہیں یا پھر منجمد جھیلیں جن کے نیچے بہت سارا پانی ہوا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف۔۔۔ اور پھر جیسے کائنات کی گردش ختم ہو گئی تھی۔ کائنات میں صرف ہم دونوں تھے۔ اس پاس کے سب مناظر۔۔۔ دھند میں گم ہو گئے تھے۔ میرا دل کسی انوکھی تال پر رقص کر رہا تھا۔

میں حرمزہ سا سے دیکھ رہا تھا اور وہ میری آنکھوں کے حرم میں گرفتار ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے گلے لگا لوں۔ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں اور اس طرح ملوں جیسے برسوں سے بچھڑے ملے ہیں۔ لیکن میں ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی پھر شاید کسی کی ہنسی کی آواز آئی تھی۔ شاید بڑی بڑھاپی کی۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت ہنسی آتی تھی۔ اس نے چونک کر نظریں جھکا لیں اور طلسم ٹوٹ گیا۔

”تم کیسی ہو زویا!“

مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی تھی جیسے اس میں ہزاروں آنسو ہوں۔ کسی بہت اپنے کے پچھڑ جانے، کھو جانے کے غم میں بننے والے آنسو۔

”ٹھیک ہوں۔“

”کمزور لگ رہی ہو۔“

”ہاں نہیں تو۔۔۔ ٹھیک ہوں۔“

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور میں نڈھال سا اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر گر گیا۔

گیا ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں

تھی۔ ایک سال بعد ملنے کے باوجود ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی؟

وہ کی کیوں نہیں؟

اس نے مایا کا بھی نہیں پوچھا۔

”مجھے میرا خیال تھا شاید۔ تم زویا کو پسند کرتے ہو۔“

چھوٹے بھائی جان کی آواز میرے کانوں میں گونجی

اپنی شادی کے ٹھیک ایک سال نو دن بعد مجھے احساس ہوا کہ دراصل میں زویا کی محبت میں مبتلا ہو گیا اور۔۔۔ محبت بھی ایسی جو عشق جیسی ہو۔ جسم و جان کو جلائی تڑپاتی۔ میرے اندر خاموشیاں اتر آئی تھیں۔

\*\*\*

میرے اور مایا کے درمیان جو تھوری بات چیت ہوتی تھی وہ بھی برائے نام ہو گئی تھی۔ اور یہاں اس گھر میں بطور خاص مجھے اسے مخاطب کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ ناشتا کھانا سب کے ساتھ نیبل پر بیٹھ کر کھایا جاتا۔

رات کو جب تک وہ فارغ ہو کر کمرے میں آتی تو میں سوچکا ہوتا۔ یا کسی کام میں مصروف ہوتا اور زویا۔۔۔ اس سے بھی بہت کم نہ ہونے کے برابر بات ہوتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہ کر بڑھتی رہتی تھی۔ کبھی کھانے کی نیبل پر وہ نظر آتی تو میری نظریں اسے اپنے حصار میں لے لیتی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتا رہوں۔ مایا کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔

میں تو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے صرف زویا کو ہی دیکھتا تھا۔ وہ میرے سامنے نہیں ہوتی تو بھی میرے تصور میں رہتی تھی۔ ہر آن ہر لمحہ۔

میں ہر روز خود سے عہد کرنا کہ کل سے مایا پر زیادہ توجہ دوں گا اور زویا کو سوچوں گا بھی نہیں، لیکن زویا کو نہ سوچتا میرے اختیار میں نہیں تھا اور مایا۔۔۔ میں زبردستی

”کیا کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے برادر۔“  
 چھوٹے بھائی کی نظریں بہت تیز تھیں۔  
 ”نہیں تو۔“ میں نے نظریں چرا میں۔  
 ”تم دونوں۔ میرا مطلب ہے تم اور مایا خوش تو ہوتا  
 ایک دوسرے کے ساتھ۔“

”ناخوش ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے بھائی!“  
 تب ہی میں نے زویا کو اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی  
 طرف جاتے دیکھا اور میری نظروں نے دور تک اس کا  
 تعاقب کیا۔

چھوٹے بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”کوئی ایسی غلطی مت کرنا زین! جس سے پورے  
 خاندان کی بنیادیں ہل جائیں۔“

اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں تھے اور میں سُن ہو گیا  
 تھا۔ یہ چھوٹے بھائی نے کیا کہا تھا۔  
 چھوٹے بھائی کی نظر بہت گہری تھیں۔ وہ اس وقت

بھی جانتے تھے جب میں نہیں جانتا تھا۔ اور اب بھی وہ  
 جانتے تھے جو میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

چھوٹے بھائی کی تنبیہ کے بعد میں نے زویا کی  
 طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ کھانے کی بڑی سی ٹیبل پر بھی  
 میں اس طرح بیٹھا کہ زویا پر براہ راست میری نظر نہ  
 پڑے، لیکن کیا دریاؤں پر بند باندھے جاسکتے ہیں؟

لیکن میں بند باندھ رہا تھا اور ہر بار پانی کا کوئی زور آور  
 ریلہ آکر اس بند کو توڑ دیتا تھا۔



اس روز زویا تیار ہو کر پورچ میں کھڑی تھی۔ اسے  
 یونیورسٹی جانا تھا۔ اس کے پیچڑ شروع ہو چکے تھے۔  
 میں آفس جانے کے لیے نکل رہا تھا۔

”کھڑی کیوں ہو زویا؟“

”بڑے بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”بڑے بھائی تو ابھی اٹھے ہیں ناشتا کر رہے ہیں

تمہیں دیر ہو جائے گی۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

وہ تھوڑا سا جھجکی لیکن پھر خاموشی سے گاڑی میں  
 بیٹھ گئی۔ میں ہمارے درمیان عجب سی جھجک اُٹتی

دوبار اس کے ساتھ باہر بھی گیا کھانا کھانے، لیکن  
 ہمارے درمیان خاموشی نہ ٹوٹی۔  
 ”کیا بات ہے مایا! یہاں آکر تم کچھ زیادہ ہی خاموش  
 نہیں ہو گئی ہو۔ میں تو ترس گیا ہوں تمہاری آواز سننے  
 کو۔“

میں نے کوشش کی تھی کہ ہمارے درمیان جو  
 فاصلے پیدا ہوتے جا رہے ہیں، ختم ہو جائیں۔ اس نے  
 بس ایک نظر مجھے دیکھا۔

”تم خود ہی بہت مصروف رہتے ہو زین!“  
 میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو گیا لیکن اپنی شرمندگی  
 چھپانے کے لیے ہنسا تھا۔

”نہیں یار! اتم بھی تو بہت مصروف رہنے لگی ہو۔“  
 میں اس کا خیال ذہن سے جھٹکنے کے لیے مایا کے زیادہ  
 قریب ہونے کی کوشش کرتا تو وہ عجیب نظروں سے  
 مجھے دیکھتی۔

میں نے شاید کبھی بھی صحیح فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مجھے  
 یاد ہے کہ میں بازار سے کوئی چیز پسند کر کے لے آتا مگر  
 گھر آکر مجھے وہ ناپسند ہو جاتی تھی اور پھر شور ڈالتا کہ یہ  
 واپس کر سں مجھے کچھ اور لینا تھا۔ لیکن مایا اور زویا کوئی  
 چیز نہیں تھیں کہ میں کہتا مجھے مایا نہیں چاہیے۔ زویا  
 دے دو۔

یہ کیا ہو گیا تھا کہ میں خود سے ہی نظریں چُرائے  
 پھرتا۔ آفس سے اٹھتا تو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا  
 پھرتا۔

”کہاں ہوتے ہو یار۔“ ایک روز چھوٹے بھائی نے  
 مجھے پکڑ لیا۔ ”تمہارا آفس کیا رات کو بھی کھلا رہتا  
 ہے۔“

اس روز میں رات دیر سے گھر میں داخل ہوا تھا۔  
 ”نہیں، بس یونہی ایک دوست کے پاس چلا  
 گیا تھا۔!“

حالانکہ میرے کوئی دوست نہیں تھے۔ جیسے زویا  
 اور مایا کی کوئی خاص سہیلیاں نہیں تھیں۔ ہم نے  
 کبھی کسی اور کو دوست بنانے کی ضرورت ہی محسوس  
 نہیں کی۔



تھا۔ میں مبہوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر۔

یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ میں نے کیا کھو دیا تھا۔ میرا دل بالکل خالی تھا اوندھے پیالے کی طرح۔ کھوئی ہوئی چیزیں کبھی کبھی مل بھی تو جاتی ہیں۔ میرے سامنے پڑی آکس کریم پھل رہی تھی اور میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔

کیا مجھے بھی میری کھوئی ہوئی چیز مل جائے گی۔

میری محبت۔ میری زوئی۔

زوئی نے آکس کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ میرا ارٹکاڑ ایک لمحے کے لیے ٹوٹا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں پھر اسے دیکھ رہا تھا۔

”زوئی۔“

میں میز پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔ ”مجھے بتائیے۔ کیوں نہیں چلا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ محبت نہیں عشق۔“

”تم شروع سے ہی ایسے تھے۔ تمہیں ہمیشہ بعد میں پتا چلتا تھا کہ کیا ہونا چاہیے۔“

اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائی تھیں۔

”لیکن اب ان سب کا کیا فائدہ۔“

”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ نہ بتاتا تو میرا دل پھٹ جاتا۔“

”مجھے پتا تھا۔ پہلے سے پتا تھا۔“

اس نے آکس کریم کی ٹیبل بر رکھ دیا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں زوئی۔ تم نے بھی اور مایا نے بھی۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔“

”فیصلہ کا اختیار تمہارے ہاتھ میں تھا زین! اور اب اسے نبھانا بھی تم نے ہے۔“

وہ یک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

”تم نے جو فیصلہ کیا، مایا اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ کوئی نہ ہم نے کبھی تمہاری کسی بات کو دس اون نہیں کیا تھا۔ حالانکہ مایا تو۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا زوئی! میں نے تو سب

تھی۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ہمارے درمیان اس طرح کی اجنبیت در آئے گی۔

”تمہاری تیاری کیسی ہے زوئی!“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”واپسی پر کبھی میں تمہیں پک کر لوں گا۔ کتنے بچے پیپر ختم ہو گا۔“

”بارہ بجے۔ لیکن میں چلی جاؤں گی۔“

”نہیں میں پنج کے لیے انھوں گا تو تمہیں گھر چھوڑ دوں گا اور صبح بھی تمہیں ڈراپ کر دیا کروں گا۔“

”خوامخوہ پوائنٹ کے لیے خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور مجھے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں ہر روز صبح اسے لے جانے لگا تھا۔ ہمارے درمیان دو تین مختصر جملوں کے

اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

اس روز اس کا آخری پیپر تھا۔

”تھینک گاڈ۔ آج جا کر خوب سوؤں گی۔“

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”یعنی آج فارغ ہو گئی ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“

”تو چلو آکس کریم کھلاتا ہوں تمہیں۔“

اس سے پہلے بھی بہت دفعہ ہم آکس کریم کھانے لگتے تھے، لیکن آج اس نے فوراً ”نفی“ میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں۔ نہیں زین گھر ہی چلو۔“

لیکن میں نے گاڑی کا رخ اپنے پسندیدہ آکس کریم پارکر کی طرف کر دیا تھا۔ ہم زیادہ تر شام یا رات کو آتے تھے۔ اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجے وہاں بالکل

بھی رش نہیں تھا۔

میں نے بیٹھتے ہی اس کے اور اپنے پسندیدہ فلیور کا آرڈر دیا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی اس کی نظریں جھٹی ہوئی تھیں۔

اس کی لابی پکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر پڑ رہا

ڈانٹ لگ بولتا۔ اسے گھمایا، کھانا کھلانے لے جاتا۔ آفس کی ادھر ادھر کی سینکڑوں باتیں کرتا۔ لیکن مایا کبھی پورے بظہر پر خوش نظر نہیں آتی تھی۔  
”عورت کبھی ادھرے ادھرے مرد کے ساتھ خوش نہیں رہتی۔“

ایک بار چھوٹے بھائی نے کہا تھا اور میں زویا کے بغیر ادھر رہتا تھا۔ محبت کا اور اک تو مجھے بعد میں ہوا تھا۔ لیکن میں پہلے دن سے ہی اسے پورا نہ ملا تھا۔ ہماری مثلث کے تینوں خط الگ الگ ہو گئے تھے۔ بچپن کی معصومیت میں کبھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ہم نے دعا مانگی تھی کہ ہم تینوں ہمیشہ اکٹھے رہیں اسی گھر میں اور وہ واقعی لمحہ قبولیت تھا۔ ہم تینوں اسی گھر میں تھے، لیکن ہماری مثلث ٹوٹ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود ہم میں کوئی رابطہ نہ تھا۔

میں ہر وقت ٹرانسفر کی کوشش میں لگا رہتا۔ میں اکثر بے وقت کھانا کھاتا۔ دیر سے میبل پر آتا جب زویا جاچکی ہوتی، لیکن مجھے پتا تھا وہ خرم کو خط لکھتی ہے اور فون کرتی ہے کہ وہ اسے جلد سعودیہ بلا لے۔ میں کبھی کبھی مایا کے ہاتھوں میں منہ چسپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

”مایا میرے لیے دعا کر۔ میں۔۔۔ میں پورا سموچا تمہارا ہونا چاہتا ہوں۔ میں اس سحر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ جس میں شادی کے ایک سال ایک ماہ نو دن بعد میں گرفتار ہو گیا تھا۔“ مایا پورے ضبط سے میری بات سنتی۔

اور زویا فون پر فون کیے جاتی کہ خرم جلد آکر اسے لے جائے۔ تاکہ میں اور مایا خوش رہ سکیں۔

میں فیصلہ نہیں کیا تاکہ میں نے زویا کی محبت میں مبتلا ہو کر غلطی کی یا مایا کو دل سے قبول نہ کر کے۔ مگر اس اعتراف میں کوئی شبہ نہیں کہ میری زندگی میں آنے والی دونوں عورتیں اعلا ظرف ہیں۔ ان دونوں عورتوں کے دل۔۔۔ میں مجھنے سے قاصر ہوں۔

یہ عورت کاہل  
اور یہ عورت کاہل

کے فیصلے کو تسلیم کیا تھا۔“  
”ہاں، لیکن تمہیں اختیار دیا تھا کہ تم اس فیصلے کو تسلیم نہ کرتے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

”زویا! ایک بات بس ایک بات اور تبادو۔“ میں تیز تیز چلتا اس کے ہم قدم ہوا۔  
”کیا تم بھی۔۔۔ تم بھی ایسا ہی چاہتی تھیں کہ تم اور میں۔۔۔“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا، لیکن اس کی لرزتی پلکوں اور آنکھوں میں پھیلی نمی سے مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”مایا بہت ادا اس رہتی ہے۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ”اسے خوش رکھنے کی کوشش کیا کرو۔“

یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ۔۔۔  
اس نے اس رشتے کے حوالے سے مجھے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کے دل نے حسان کو پسند کیا تھا جو اس کی کسی کلاس فیلو کا بھائی تھا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا کہ مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں خود حسان سے ملتا اور چچا چچی سے بات کرتا۔

”میں نے سوچا اگر میں نے انکار کر دیا تو تم ہرٹ ہو گے۔ شاید تمہیں بہت دھچکا لگے تو اور میں حسان سے کوئی ایسی شدید محبت نہیں کرتی تھی وہ بس اچھا لگتا تھا مجھے۔“ اور میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”تم نے یہ اچھا نہیں کیا مایا؟“  
”تم نے یہی تو اچھا نہیں کیا زین! اپنے ساتھ زویا کے ساتھ۔“

اور ہمارے پاس بات کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔

\*\*\*

زویا کی شادی ہو گئی۔ چچا کی طبیعت خراب تھی سو خرم ایک ماہ کی چھٹی پر آیا اور ایک ماہ بعد چلا گیا۔  
میں مایا کو خوب شاپنگ کرا تا۔ محبت کے لیے لمبے

# ادبی تصویر

سے کچھ ٹوٹ گیا اتنے سالوں کی دوری بھی اس کی ضد نہیں توڑ سکی تھی وہ آج بھی اس سے ویسا ہی بے نیاز اور لالعلق تھا۔

جیسا اس کی رخصتی کے لمحے میں، جب اس کی بہن اسے رخصت کر رہی تھی تب پیچھے سے کسی نے کہا تھا کہ بھائی کو رخصت کرنا چاہیے وہ کچھ ہی فاصلے پہ کھڑا تھا۔ دلمن بنی مریم رک گئی تھی۔

اس نے امید بھری نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا تھا۔

مگر وہ بونہی پتھر کے بت کی مانند سپاٹ سے تاثرات لیے اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا تھا۔

”مریم چلو گھر آگیا ہے۔“ غصہ کی آواز نے اسے چونکایا وہ اس کی گود سے ازان کو اٹھا رہا تھا وہ دوسری جانب سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

سسرال میں اس کا خوب والہانہ استقبال ہوا تھا سب نے ہال میں ہی ڈراما لیا اس کی تینوں نندیں شوخ و شنگ طبیعت کی مالک تھیں بے تحاشا ہنسنے والی مگر اسے ان ساری خوش گپوں، لطیفیوں باتوں چٹکوں سے شدید کوفت ہو رہی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا مسکرا۔ کہ اس کے جڑے دھننے لگے تھے۔

بس نہیں چل رہا تھا کہ سب لوگوں کو منظر سے غائب کرنے کے بعد اڑ کر سڑک کنارے موجود نیلے ٹائلز والے گھر کی تختی بجادے۔ ایک ایک نوالہ اس نے گن گن کر کھایا اس کے بعد کالی کا دور چل نکلا تھا اور پھر گفتگو کی باری آئی۔

”اب سو کو دو گھڑی آرام بھی کرنے دو۔“ اماں نے

تین سال بعد اس کے قدموں نے اپنے ملک کی سرزمین کو چھوا تو دل کو جیسے پتکھ لگ گئے ہاتھ پہلے اپنے گھر جا سکتی مگر یہ سسرال کے جھنجھٹ، خاص آرڈر تھا کہ پہلے وہاں قیام کیا جائے۔

ایرپورٹ سے باہر نکل کر وہ ڈرائیور کے انتظار میں کھڑے تھے جو انہیں دیکھ کر خود ہی قریب آچکا تھا غصہ نے گاڑی میں سامان رکھوایا اور خود کھوم کر بیک سیٹ پر آن بیٹھا جہاں وہ ازان کو اٹھائے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی اور پھر گاڑی لاہور کی شاہراہ پر فرارے بھرنے لگی تھی

ایک کے بعد دوسرا منظر گزر رہا تھا مسافت سمٹ رہی تھی اور اس کی بے چینیاں میں اضافہ ہو رہا تھا اور اسی اضطراب میں گھری وہ دونوں تھیلیوں کو پار پار آپس میں گر ر رہی تھی۔ بھی — غصہ کی آواز آئی۔

”کچھ کھانا ہے؟“ گردن گھما کر اس نے ساتھ بیٹھے اپنے ہم سفر کو دیکھا جو کھڑکی سے سر باہر نکالے مختلف ریستورانز کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔ جس سے وہ گھنٹوں باتیں کرنے کے لیے ترسا کرتی تھی آج وہ بول رہا تھا اور وہ محض ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔

ابھی بھی بے دلی سے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا اس کا موؤنہ دیکھ کر وہ بھی اب خاموش ہو چکا تھا۔

بھی یک دم گاڑی نے یوٹرن لیا اور مریم کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا سامنے سائیکل پر ارحم تھا۔

وہ اسے دیکھ کر بے اختیار کھڑکی پہ جھکی تھی مگر وہ زن سے بایک کو اڑالے گیا تھا اس نے اسے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ مریم کے دل میں جیسے چھن



سال بعد وہ اماں سے مہو سے ملنے والی تھی گیٹ کے  
قریب پہنچ کر مکمل استحقاق کے ساتھ اس نے ڈور تیل  
پہا تھ رکھ دیا۔

مگر یہ کیا دروازہ نہیں کھلا تھا وہ کچھ بالوس سی ہوئی  
اس سے قبل کہ پلٹ جانی عنایہ کی آواز گیٹ کے اس  
پار سے آئی تھی۔

”کون ہے۔“  
”میں ہوں۔“ وہ محض اتنا ہی کہہ پائی تھی جب

اپنی بیٹیوں کو گھورا مگر انہیں اپنے گفتگوں دیکھے بغیر  
کہاں چین تھا بچے الگ اودھم مچا رہے تھے مریم کو  
مزید ان کے تبصروں تک وہاں رکنا پڑا۔

اذان راستے میں ہی سوچا تھا جب سب اپنے  
کمروں میں جا چکے تو اس نے اپنا ہینڈ ٹیک اٹھایا اور  
غصہ کو بتا کر گھر سے باہر نکل آئی۔

اب اس کے قدم ٹاٹروالے گھر کی سمت اٹھ رہے  
تھے دل کی عجیب کیفیت سی ہو رہی تھی آج تین



دروازہ کھل گیا۔

”آپ کون؟“ عنایہ نے اس سے سپاٹ سے انداز میں پوچھا تھا۔

”میں مریم ہوں تمہاری خالہ۔“ وہ اسے پیار کرنے کو آگے بڑھی تو عنایہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسے حلقی بھری اجنبی نظروں سے دیکھا۔

”نانو اور ماما بازار گئی ہیں جاتے ہوئے دروازہ بند کر جائیے گا۔“ کہہ کر وہ اوپر پھٹت پر بھاگ گئی تھی۔

مریم کچھ دیر وہیں سن سی کھڑی رہی پھر اندر برآمدیے میں چلی آئی سامنے ہی اماں کی سلائی مشین رکھی تھی۔ خالی کمرے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی اسے گھر میں تھارہنے کا کتنا شوق ہوا کرتا تھا وہ دعا میں مانگا کرتی تھی کہ اماں آج تو کسی بھائی بہن کی طرف چکر لگا لیں اور وہ گھر میں اکہلی رہے تب اسے عصر سے خوب ڈھیر ساری باتیں جو کرنا ہوتی تھیں سہیلیوں کو اکٹھا کر کے وی سی آر پی فلمیں دیکھنے کا بھی الگ ہی مزہ ہوتا تھا پکن میں جو ہر بونک چمکتی وہ الگ۔

حلتے ہوئے وہ ارجم کے کمرے میں آئی تو وہ کمرہ آج بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ اس میں اماں کی بیٹیوں کے علاوہ تین الماریاں اور ایک انکٹھی تھی ایک الماری میں ان سب کے کپڑے تہہ لگا کر رکھے ہوئے تھے۔

دوسری میں کالج کے برتن اور تیسری میں اماں کی سلائی کا سامان بکرم، ٹکھیاں، موٹریں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ سلائی سے چار سینسز یاں دو گلدان ایک ٹائم پیس اور دو تصویریں تھیں ایک تصویر اس کے اور ارجم کے بچپن کی تھی جس میں اس نے سفید اسکرٹ پہن رکھا تھا اور ارجم نے نیلی پیٹشہ سفید شرٹ اس کا ایک ہاتھ کمرے تھا اور دوسرا ارجم کے شانے پر ارجم زبان باہر نکال کر اسے چڑا رہا تھا اور اس کی صورت کچھ روٹی سی پنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود یہ تصویر بہت کیوٹ تھی۔

دامیں دیوار کے ساتھ کمپیوٹر ٹیبل تھی اور دو چار پائیاں وہ کپڑوں والی الماری کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی کبھی اس میں ان تینوں بہن بھائیوں کے کپڑے

ہوا کرتے تھے آج اس میں بس اماں اور ارجم کے کپڑے رہ گئے تھے۔

وہ مڑی تو نظر کمپیوٹر ٹیبل کے اوپر لگی انگلی سے ٹکرائی اس پر ارجم کی ڈریس پیٹشہ لٹک رہی تھی۔

”اماں یہ جان کر پیٹشہ کی کرین ٹھیک سے نہیں بناتی۔“ اسے اسکول سے دیر ہو رہی ہوتی تھی اور وہ کبھی اس کا ٹیکہ کبھی کتا میں تو کبھی نوٹس چھپا دیتا تھا۔

”جب تک کرین ٹھیک سے نہیں لگاؤ گی میں جانے نہیں دوں گا۔“ اسے لگا جیسے وہ ابھی برآمدے میں کھڑے لڑ رہے تھے۔

اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا وہاں ایک چارپائی، سنگل بیڈ، فرنیچر اور ایک بڑی سی دیوار گیر الماری تھی دیوار گیر الماری کے آگے اب فریم شدہ شیشے لگ چکے تھے ورنہ جب بھی اس کا اور مہو کا دھواں دھار قسم کا بھگڑا ہوتا تو وہ ساری الماری کے برتن نکال کر دھوئے بیٹھ جاتی تھی مگر درپردہ وہ اسے چرانے کے لیے ایسا کرتی تھی کیونکہ اماں زبردستی اسے مہو کے ساتھ لگا دیتی تھیں اور پھر گھر میں جو طوفان بد تمیزی پھا ہوتا، کشن، تکیے، گلدان وہ تابو توڑ ایک دوسرے پر برساتے اور زبان سے ساری عمر ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کی قسمیں کھاتی جاتی تھیں۔

مریم اسے تانے کی خاطر ڈرائنگ روم کے صوفوں پر چڑھ کر رسالے پڑھا کرتی تھی مھو نے اس نے اپنی کینٹی کے پیروں سے بوائے تھے وہ اور ارجم جو گھڑی دو گھڑی کے لیے ان پر لیٹ جاتے تو اس کی جان پر بن آتی تھی۔

”جاہلوں کو بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں ہے ڈرائنگ روم مہمانوں کے لیے ہوتا ہے۔“ اس کی آواز ماضی کے کسی اوجھ کھلے درتچے سے آئی تھی۔ مریم نے صوفے پر بیٹھ کر وہ کھا مگر آج اس روز جیسا مزہ ہمیں تھا۔ لمحے جیسے ریت کی مانند ہاتھ سے پھسل گئے تھے وقت اتنی جلدی بیت چکا تھا وہ جو خوش گمانیوں بے فکر یوں کا دور تھا کیسے اس نے بن باس کی مانند کاٹا تھا۔ ”کب اس نقش سے رہائی ملے گی۔“ ملاقات نہ



”اس کے جو ایک درشتے آئے ہیں ان میں سے کوئی فاسل کر کے دفع کرو اسے، ورنہ یہ ہماری عزت واؤبر لگا کر رہے گی۔“ اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا جو ڈائریکٹ نشانے لگا۔

”میں شادی کروں گی تو غصہ سے۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا ارحم نے ایک زور کا تھپڑ اسے مارا۔ اماں حق دہی کھڑی سب دیکھ رہی تھیں۔ ”غصہ، ملکوں کا لڑکا۔“ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئیں مگر ان دونوں کے درمیان جاری تھی۔

گھر کی فضا عجیب بو جھل سی ہو گئی مہو بھی آچکی تھی اسے سمجھانے، مگر رزلٹ زیرو، وہ اپنی بات پر مصر تھی۔

اکیڈمی جانا چھوڑ دیا، کھانا پینا چھوڑ دیا رشتے کے لیے آئے مہمانوں سے بد تمیزی کی، رو رو کر آنکھیں سجالیں۔

اس سے قبل کہ چرچا زبان زد عام ہوتا اماں نے ملکوں کو رشتہ دے دیا۔ ارحم کا ایک ہی فیصلہ تھا۔ ”جائے گی تو ہمیشہ کے لیے۔“ وقتی طور پر اس نے حامی بھری تھی۔

”اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر اس نے بے نیازی سے سر جھٹک دیا غصہ کی محبت اس کی رفاقت اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب ہی اس قدر مسرت آمیز تھا کہ وہ ان روایتی دھمکیوں پر کڑھنے کے بجائے آنے والے خوب صورت لہجوں کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ اماں اور مہو کا دل جانتا تھا کہ ان پر کیا بیت رہی تھی ان ماں، بیٹی کی آنکھیں بھیگی اور غمی تھیں اور وہ عنایہ کو گود میں اٹھا کر گول گول چکر لگا کر جھومتی۔

”عنایہ تمہاری خالہ کی شادی ہو رہی ہے۔“ سب کچھ بغیر کسی ہنگامے کے ہو رہا تھا وہ اتنے میں ہی بے حد خوش تھی ولیمہ پر ارحم نہیں آیا تھا بس اماں، مہو اور چند دوست احباب وغیرہ اس کا ملکہ ڈان بھی نہیں گیا تھا مگر اسے ان ساری چیزوں کے نہ ہونے سے کچھ

ہونے پر وہ تمللا کر سوچا کرتی تھی غمون سننے کے لیے کبھی واٹس روم تو کبھی چھت پہ جانا ہر لگا رہا تھا۔ اور جو کبھی کوئی پیچھے آجائے تو اسے اور غصہ آتا اور وہ پیچھے آنے والا ہمیشہ ارحم ہی ہوتا تھا۔

”تم چھت پر ہو چلو اوک کرتے ہیں۔“ ”نہیں میری ٹانگوں میں درد ہے۔“ وہ خاصی بے مروتی سے جواب دیتی اور وہ ڈھنڈالی سے کھڑا اپنے کالج کے دوستوں، پروفیسروں کی باتیں سناتے جاتا اور وہ منہ پر بیزاری سجائے آکٹاہٹ بھرے انداز میں سنتی اس کا دھیان اپنے تیل پر آنے والے مسیحو کی سمت اٹکا ہوا تھا۔ اسے ملتے نہ دیکھ کر وہ تنگ آ کر نیچے آجاتی تھی اور پھر وہ بدلہ لینے کی خاطر صبح اسے لحاف سے باہر نکال کر اپنی بانیگ صاف کروایا کرتا تھا وہ ایک اینڈ پر وہ اسے پارک میں کھما کر لاتا تھا دونوں آنسو کویم کھانے کے دوران نیو کیل پر کمشنس پاس کر کے خوب ہنستے تھے۔

اماں کو اس کا ماتھے سے بال کنواٹا سخت ناپسند تھا وہ ارحم سے اس کی شکایت لگاتیں تو وہ اسے خوب گھورتے ہوئے کہتا۔

”میں نے کہا تھا کترینہ کی طرح سامنے سے ہیر کٹ کروانا تم نے سائیڈ پف کنواٹا۔“ اور وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی تھی۔ اور پھر ایک روز وہ تن فرن کرتا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا وہ بیٹھی ٹوٹس بنارہی تھی۔ ”غصہ ہمارے گھر کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا۔“ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے، کبوتر سب اڑ گئے وہ منہ کھولے ہوئی پن سے اسے دیکھنے لگی جو ماتھے پہ سلوٹیں لیے اسے گھور رہا تھا۔ ”مم مجھے کیا پتا۔“ وہ بھلائی۔

”آج سے تمہارا اکیڈمی جانا بند گھر سے پاؤں باہر نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔“ وہ خوب غصے میں تھا مریم کا میٹر گھوم گیا وہ اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ”تم ہوتے کون ہو مجھ سے باندیاں لگائے والے؟“ ”ہوا کیا ہے تم دونوں کو۔“ اماں ابھی اندر آئی تھیں۔



ذکر کیا بلکہ وہ تو لگ رہا تھا جیسے اسے دیکھ کر پریشان ہو چکی تھیں۔

”ارے مریم تم یہاں کیوں چلی آئیں ارحم نے دیکھا تو بنگامہ مجا دے گا۔“ مہو کے انداز میں اس قدر غلٹ تھی جیسے اسے بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر نکل دینا چاہتی ہو، مریم سکتے کے عالم میں جہاں کی تماں کی جرم کر رہ گئی۔

”تم ابھی نکلو یہاں سے ارحم کے سرال والے بھی آرہے ہیں انہیں ارحم نے ہی کہہ رکھا ہے کہ اس کی بس ایک ہی بہن ہے میں نہیں چاہتی کہ کوئی سین کری ایٹ ہو۔“

”ہاں ہاں مریم جلدی جاؤ۔“ اماں نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے اسے باہر کا راستہ دکھایا اور وہ کچھے دل اور شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے نیلے ٹائلز والے گھر سے دور نکل آئی اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اماں اور مہو تو کب کا اسے رو چکی تھیں مگر اسے لگ رہا تھا جیسے آج ہی اس کی رخصتی ہوئی ہو جیسے وہ ابھی ابھی سب کے لیے مرجچی ہو جیسے ابھی اس گھر کے دروازے اس پر بند ہوئے ہوں جیسے آج وہ اپنوں سے بچھڑی ہو۔

دو روز بعد اس نے نیلے ٹائلز والے گھر کو برقی قلمقموں سے بچے ہوئے دیکھا تھا وہ ملک ہاؤس کی چھت پر کھڑی تھی۔

”اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔“ اس کی سماعتوں میں وہ جھکے ہوئے سیسے جیسے لفظ چٹکھاڑے مگر وہ ساٹ سے تاثرات کے ساتھ وہاں کھڑی رہی اس کے ساتھ عنصر اور اذان بھی تھے مگر اماں، مہو اور ارحم تو نہیں تھے رشتے کی اس مکمل تصویر کو اس نے خود ہی دو حصوں میں بانٹا تھا اور اب اسے اس ادھورے حصے کے ساتھ ہی زندگی گزارنی تھی اور یہ کتنا مشکل تھا اسے لگ رہا تھا جیسے سب ہوتے ہوئے بھی وہ خالی ہے بالکل خالی۔

خاص فرق نہیں پڑتا تھا اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا تھا کہ ابھی نئی نئی بات ہے بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

عنصر سعودیہ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے گیا اور اس کے بعد وہ اب لونی تھی۔

اماں اور مہو سے رابطہ بس ٹیلی فونک گفتگو تک ہی محدود رہا تھا عنایہ اس سے بات نہیں کرتی تھی اس کا کہنا تھا خالہ مجھے اچھی نہیں لگتی اور یہ ضرور ارحم کا کھانا ہوا تھا۔

آنگن میں لگے سفید پھولوں کی پتیاں نوچتے ہوئے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ پورا ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اس گھر میں اس کی فیورٹ جگہ میڑھیال تھیں۔ اس وقت بھی وہ الماس کے نیچے خاموش بیٹھی وہ سہانے دن تلاش کر رہی تھی وہ الزہراؑ وہ بے نیازی وہ کنوار عین کا زمانہ شادی تو ایک دن ہو ہی جانی تھی پھر کیوں اس کی فکر سوار کر کے وہ ان خوبصورت دنوں سے بے زار رہا کرتی تھی۔ کل تک وہ جن کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی آج انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا اماں کی گود میں سر رکھ کر خوب گہری نیند سوئے، مہو سے خوب باتیں کرے۔

اپنے اس گھر میں بہت سارے دن رہے اور ارحم ہمیشہ کی طرح اسے ستائے اسے تنگ کرے مگر گرم لحاف سے نکل کر اپنی بایک صاف کروائے وہ اب کی بار اس کی پیٹ کی گریز بالکل ٹھیک بنائے گی اور اس کے ساتھ چھت پر واک بھی کرے گی۔

ڈور بیل بجی تھی عنایہ جو اوپر کرائے داروں کے پاس بھی بھاتے ہوئے نیچے آئی۔

”مما آگئیں۔“ اس نے شور مچا دیا تھا۔ مریم میڑھیوں سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھی۔

”شکر ہے دلہن کی شاپنگ تو مکمل ہوئی۔“ مہو بولتے ہوئے آ رہی تھی۔ مریم نے والمانہ انداز میں اسے دیکھا لیکن یہ کیا، مہو اور اماں نے نہ تو اسے گلے سے لگایا تھا نہ اس کی خیریت پوچھی نہ اس کے لوٹنے کا



5 منٹ میں جوڑوں اور لیکھوں سے مکمل نجات

# انگلش اینٹی لائس شیمپو



- جوڑوں اور لیکھوں سے بالوں کو پیچھے والے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے
- بچوں اور بڑوں کے لئے یکساں مفید
- اس میں شال کنڈیشنر بالوں کو نرم و ملائم اور خوبصورت بناتا ہے



# گرہستان

آ رہی تھی۔  
”کیا کر رہی تھیں تم؟“  
”کچھ نہیں فارغ ہی تھی، آپ بتائیں۔ منہ چلی گئی  
آپ کی؟“  
”ہاں، میری منہ تو چلی گئی تمہاری منہ قمنے والی  
ہے!“  
”سچ بانی!“ وہ بے حد خوش ہوئی۔  
”ہاں سچہ اچھا سنو۔ فاطمہ کو بلاؤ ذرا ایک ضروری

بات یاد آئی ہے کہیں ذہن سے نکل نہ جائے۔“  
”جی اچھا، ہولڈر رکھیں۔“  
”فاطمہ! باجی کی کال ہے۔“ اس نے جھانک کر  
بتایا تو بیڈ پہ نیم دراز ڈا بجسٹ بڑھتی فاطمہ کیسل مندی  
سے اٹھی۔ شمشہ اب ابو بکر کے لیے فری تھی۔ اسے  
اٹھا کر ساتھ لگایا کمر سہلائی، وہ شکوہ کنال انداز میں  
رونے لگا۔

”ایم سو ری بیٹا! سو سو ری۔“  
کچھ ہی دیر میں وہ چپ ہو گیا اور ماں کی گود میں  
سکون سے فیڈر پینے لگا۔ ہولے ہولے چلتی فاطمہ اب  
فون تک پہنچی تھی۔

”جی بانی۔“ فون اٹھا کر وہ سستی سے بولی، ”جواہر“  
باجی نے شاید فون پہ دیر سے آنے کا کہا کیونکہ بعد میں  
وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

”کپڑے پر لیس کر رہی تھی ابھی تو بچوں کو کھانا بھی  
دینا ہے۔“  
ابو بکر کو جھولے میں لٹا کر وہ سیدھی ہوئی تو حارث

تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے سلیب  
صاف کی۔ ناشتا فاطمہ نے بنانا ہوتا تھا اور اسے سلیب  
صاف چاہیے ہوتی، لہذا وہ لازماً ہی سلیب صاف  
کرتی، سلیب صاف ہو چکی تو اس نے صانی دھو کر  
پھیلائی، تو اچولے سے ہٹایا، ابو بکر کے لیے دودھ کے  
برتن کو ہاتھ لگا کے چیک کیا کہ ٹھنڈا ہو یا نہیں۔ دودھ  
ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ لہذا اس نے دودھ کی دیکھی پانی سے  
بھری پرات سے نکال کر سائیڈ پر رکھی اور گرم پانی گرا کر  
ٹوٹی سے ٹھنڈا پانی بھرا تاکہ چائے کے لیے گرم کیا گیا  
دودھ ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھا جاسکے۔ پسینے کے  
قطرے اس کی کمر پہ رنگ رہے تھے اور حلق خشک  
ہو چکا تھا۔ ابو بکر کے مسلسل رونے بلکہ چیخنے کی آواز  
پورے گھر میں گونج رہی تھی، جب ہی اس نے روٹیاں  
بنانے کے دوران ہی جیسے تیسے کر کے تمام برتن  
دھوئے پانی کا گلاس لینے کے لیے وہ برتنوں کی نوکری کی  
طرف بڑھی، ہی بھی کہ فون بجنے لگا۔ اس نے گلاس  
وہیں چھوڑا، قنافت ابو بکر کے فیڈر میں دودھ ڈالا۔  
چائے والے دودھ کو پرات میں رکھ کر ہات پات سائیڈ  
پہ رکھا اور فون کی طرف بھاگی۔

”السلام علیکم باجی!“  
”وعلیکم السلام امیسی ہو شمشہ؟“  
”شکر ہے اللہ کا، ٹھیک ٹھاک ہوں۔“  
”ابو بکر کیسے؟ ضد تو نہیں کرتا روتا تو نہیں؟“  
”نہیں باجی ٹھیک ہے۔“ اس نے کہنے کے ساتھ  
ہی اپنے کمرے کے اوپر کھلے دروازے کو دیکھا۔ رورو  
کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ لہذا اب رونے کی آواز کم





نے پوچھا۔

”کیسا ہے تمہارے شانوں کا درد؟“

”ٹھیک ہے، آج تو بہتر ہے، بہت، کیونکہ باجی اور باجی کے بچوں نے اسے بہت دیر اٹھائے رکھا۔“

”چلو اچھا ہے تمہاری بھی پیلپ ہو گئی۔“ اخبار کا ورق پلٹتے ہوئے اس نے کہا۔ اسے صبح وقت نہ ملتا تھا۔ اس لیے اس نے شام کا اخبار لگا رکھا تھا جسے وہ رات گئے پڑھتا۔

”پتا ہے فاطمہ بہت اچھی ہے۔“ وہ صوفے پر اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

”اچھا۔ اب بنی اچھائی کیا کر دی اس نے؟“ حارث نے اخبار اور نظر کاچشمہ دونوں بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیے۔

”جب کوئی آیا ہو تو وہ مجھے میرے حصے کے کام بھی نہیں کرنے دیتی حالانکہ اسے تو کمزور رہتا ہے اور عام روین میں اس نے کبھی اتنے کام نہیں کئے، لیکن اسے بہت احساس ہوتا ہے کہ کام بڑھ گئے ہیں اور وہ

ایک آدھ دن کے لیے تمام گھری ذمہ داری مکمل طور پر سنبھال لیتی ہے تاکہ میں ابوبکر کو دیکھ لوں۔“

”ہوں۔ ہم سے بھی زیادہ اچھی ہے کیا؟“ وہ قریب ہوتے ہوئے شرارتی ہوا۔

”جی بالکل کیونکہ جب میں فرش صاف کرنے کے لیے ٹاول دھو کر لائی تو اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا اور تمام کمروں میں بھی لگایا اور لاؤنج میں بھی۔ آپ نے کبھی کیا ایسا؟“ شمسہ پر جوش تھی، مسکرا رہی تھی حارث سوچ میں پڑ گیا کہ اتنی زیادہ بھلائی کی بھلا اسے کیا ضرورت تھی؟

”ارے ارے نیچے مت لیٹے گا۔“ وہ دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے لاؤنج میں داخل ہو رہی تھی کہ اس نے حارث کو فرش پر تکیہ رکھتے دیکھا۔

”کیوں بھئی؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا، روزی تو وہ آفس سے آکر کچھ دیر فرش پہ لیٹا تھا پھر آج بھلا اس نے کیوں روکا۔

”بتاتی ہوں آکر۔“ اس نے کپڑوں کے ڈھیر کو صوفے پر رکھا، اپنے حارث اور ابوبکر کے کپڑے اس میں سے نکالے۔

”وہ آج کام بہت زیادہ تھے تو میں نے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کی۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بتایا۔

”چلو خیر ہے۔ اتنا فیل نہیں ہو رہا اینڈ ایم بھی کہ تم نے تھوڑی بہت ڈنڈی مار کر خود کو ذرا ریلیکس کیا۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر بیڈ پر واپس رکھ لیا تھا۔

”اچھا۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ کپڑے نوکری میں رکھ کر وہ جانے کے لیے مڑی تھی۔

”آپ کے کام ختم ہو گئے ہوں تو ضرور!“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ چائے لے آئی۔ آلو کے سادہ پکوڑے چائے اور پانی۔

”کچھ نہیں ہے؟“ حارث کو فوراً ہی کمی محسوس ہوئی۔

”جی وہ ختم ہو گیا۔“

”اتنی جلدی ختم کیسے ہو سکتا ہے؟“ حارث نے برا سامنے بنایا۔

”نہیں ہے جب ہی نہیں لائی تا، فریق میں کاؤنٹر پر ٹیبل پر ہر جگہ دیکھا۔“ وہ نوکری سے کپڑے اٹھا کر تے کرنے لگی۔

”کل بھی تم نے ہی کہہ کر نہیں دیا اور شام میں شا فائزہ رول کے ساتھ کھا رہی تھیں۔“ وہ بچوں کی طرح نروٹھے بن سے بولا۔

”ہو سکتا ہے انہوں نے نیا منگوایا ہو۔“ وہی پرانا والا پیکٹ تھا۔

”اچھا پھر کیا سزا ہے میری؟“

”یہ کہ تمہیں چھٹنے کو بھی پکڑا نہیں ملے گا۔“

”ہائے اللہ آپ نے سب ختم کر دیے!“ وہ یکایک افسردہ ہو گئی۔



نہیں تھی تبھی حادث کے کپڑے استری کرنے ہوتے  
کبھی برتن دھونے ہوتے کبھی آٹا گوندنا ہوتا۔  
”تمہیں سمجھ داری سے رہنا ہے شمسہ!“ حادث  
نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمسہ نے دھیرے سے سر ہلایا  
اس کے اندر تنک ادا سی اتر آئی تھی۔

”اور سنو تم نے گھر میں کسی کی کوئی بات ٹالی ہے؟  
ابو بکر کے متعلق کوئی مشورہ یا کوئی اور بات؟“

”نہیں تو۔ میں تو خود فاطمہ سے پوچھ لیتی ہوں اگر  
کوئی مسئلہ ہو تو۔ اماں کے ٹوٹنے بھی آزماتی ہوں،  
لیکن حادث اگرچہ میں تجربہ نہیں رکھتی میں نے پہلے  
بچے نہیں سنبھالے، لیکن میں اس کی ماں ہوں تجربہ نہ  
ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھار مجھے یہ لگتا ہے کہ میں

اس کا مسئلہ بہتر طریقے سے سمجھ جاتی ہوں، ایسے میں  
کبھی کبھار میں اپنی مرضی بھی کرتی ہوں۔“ وہ رکی اور  
پھر اچانک کچھ یاد آنے پر دوبارہ بولی۔ ”یوں بھی ہوتا

ہے کہ اماں مجھے ایک بہت الگ بات بتاتی ہیں اور  
فاطمہ بہت الگ، ایسے میں، میں کسی ایک کی بات ہی  
مان سکتی ہوں بعد میں یا اماں فاطمہ کو قائل کر لیں گی یا

فاطمہ اماں کو۔ تو حتیٰ پھر بھی میری ہی آتی ہے کہ اپنی  
من مانی کی۔“

”اچھا چھوٹو۔ میں نے پہلے ہی انہیں کہہ دیا تھا  
کہ ایسی کوئی بات نہیں اور یہ بھی کہا کہ تین چار ہفتوں

سے ہی تو موسم کھلا ہے ورنہ صبح شام اتنی ٹھنڈی ہوا  
چلتی تھی کہ دروازہ کیا کھڑکیاں بھی ہم بند رکھتے تھے۔“

”ٹھیک یو حادث۔“ وہ بے پناہ ممنون ہوئی اور  
مزید گویا ہوئی۔

”اور ہاں میں ڈانٹہر چیخ کر تے ہوئے بھی دروازہ  
بند کر لیتی ہوں تاکہ کسی کو کراہیت نہ ہو۔“

حادث دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلانے لگا  
تھا۔ ”موتو شمسہ سکے بسن بھائیوں میں بھی باتیں ہوتی

ہیں مگر کسی تیسرے کو شکایت کرنا تب زیب دیتا ہے کہ  
اگر قصور وار نہ سننے نہ مانے قصور وار بے خبر ہو اور

جہاں بھرا خبر تو شکایتیں رفغ نہیں ہوتیں بلکہ نا ایشوز  
نہیں تھی تبھی حادث کے کپڑے استری کرنے ہوتے  
کبھی برتن دھونے ہوتے کبھی آٹا گوندنا ہوتا۔  
”تمہیں سمجھ داری سے رہنا ہے شمسہ!“ حادث  
نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمسہ نے دھیرے سے سر ہلایا  
اس کے اندر تنک ادا سی اتر آئی تھی۔  
”اور سنو تم نے گھر میں کسی کی کوئی بات ٹالی ہے؟  
ابو بکر کے متعلق کوئی مشورہ یا کوئی اور بات؟“  
”نہیں تو۔ میں تو خود فاطمہ سے پوچھ لیتی ہوں اگر  
کوئی مسئلہ ہو تو۔ اماں کے ٹوٹنے بھی آزماتی ہوں،  
لیکن حادث اگرچہ میں تجربہ نہیں رکھتی میں نے پہلے  
بچے نہیں سنبھالے، لیکن میں اس کی ماں ہوں تجربہ نہ  
ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھار مجھے یہ لگتا ہے کہ میں  
اس کا مسئلہ بہتر طریقے سے سمجھ جاتی ہوں، ایسے میں  
کبھی کبھار میں اپنی مرضی بھی کرتی ہوں۔“ وہ رکی اور  
پھر اچانک کچھ یاد آنے پر دوبارہ بولی۔ ”یوں بھی ہوتا  
ہے کہ اماں مجھے ایک بہت الگ بات بتاتی ہیں اور  
فاطمہ بہت الگ، ایسے میں، میں کسی ایک کی بات ہی  
مان سکتی ہوں بعد میں یا اماں فاطمہ کو قائل کر لیں گی یا  
فاطمہ اماں کو۔ تو حتیٰ پھر بھی میری ہی آتی ہے کہ اپنی  
من مانی کی۔“  
”اچھا چھوٹو۔ میں نے پہلے ہی انہیں کہہ دیا تھا  
کہ ایسی کوئی بات نہیں اور یہ بھی کہا کہ تین چار ہفتوں  
سے ہی تو موسم کھلا ہے ورنہ صبح شام اتنی ٹھنڈی ہوا  
چلتی تھی کہ دروازہ کیا کھڑکیاں بھی ہم بند رکھتے تھے۔“  
”ٹھیک یو حادث۔“ وہ بے پناہ ممنون ہوئی اور  
مزید گویا ہوئی۔  
”اور ہاں میں ڈانٹہر چیخ کر تے ہوئے بھی دروازہ  
بند کر لیتی ہوں تاکہ کسی کو کراہیت نہ ہو۔“  
حادث دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلانے لگا  
تھا۔ ”موتو شمسہ سکے بسن بھائیوں میں بھی باتیں ہوتی  
ہیں مگر کسی تیسرے کو شکایت کرنا تب زیب دیتا ہے کہ  
اگر قصور وار نہ سننے نہ مانے قصور وار بے خبر ہو اور  
جہاں بھرا خبر تو شکایتیں رفغ نہیں ہوتیں بلکہ نا ایشوز

”ہاں وہ پانچ سات ہی تو تھے اور کچھ میری اسپید بھی  
تیز ہے تو پتا ہی نہیں چلا۔ اچھا شمسہ! سنو۔“

”کمرے کا دروازہ بند تو نہیں رکھتیں تم دن بھر؟“  
”دن بھر تو نہیں، لیکن رکھتی ہوں۔“

”کیوں؟ کیوں رکھتی ہو؟ کھلا رکھا کرنا!“  
”ابو بکر سو رہا ہو اور فائرہ یا شالوارچ میں کھیل رہی  
ہوں تب تو دروازہ بند کیے بنا چارہ ہی نہیں۔“ وہ اس

کے پاس آن بیٹھی۔  
”بہر حال تم زیادہ سے زیادہ دیر دروازہ کھلا رکھا  
کر۔“

”آپ اتنی تاکید سے یہ بات کیوں کر رہے ہیں؟“  
وہ حیران ہوئی۔

”بڑی بھابھی سے بات ہوئی تھی آج اس کا کپڑا۔“  
وہ دھیمے سے بولا۔

”اچھا؟ کیسی ہیں وہ؟ اوھر سب کیسے ہیں؟“  
”ٹھیک ہیں۔“

”اور کیا کیا بات ہوئی؟“  
”کہہ رہی تھیں کہ تمہیں سمجھاؤں۔“ حادث

کچھ کچھ پریشانی سے بول رہا تھا۔  
”بھلا کیا؟“ وہ متحسّس ہوئی۔

”یہ کہ کمرہ بند کر کے ہر وقت سوئے رہنا اور کام  
چوری ضد وغیرہ اچھی بات نہیں سب سے مل جل کر  
رہو گھر کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹاؤ۔“

شمسہ سن کر رنگ رہ گئی اور بغور اس کی آنکھوں  
میں دیکھنے لگی کہ آیا وہ واقعی وہی سب کہہ رہا ہے یا

اسے سننے میں غلطی ہوئی۔  
حادث نے اس کی آنکھوں کے نیچے موجود حلقوں

سے نظر چرائی۔ رات میں ابو بکر کئی بار جگانا اور اکثر  
بہت دیر تک جگائے رکھتا، دن میں اسے سونے کی

فرصت یوں نہ ملتی کہ پہلی بار جب وہ سوتا تو شمسہ  
بشکل صفائی ستھرائی کرتی اور وہ اٹھ جاتا، دوبارہ سوتا تو

اس کے کپڑے دھوتی نہاتی۔ نماز پڑھتی۔ کالم لکھنا  
شروع کر دیا اور وہ پھر اٹھ جاتا۔ اسے سلا کبھی وہ سوتی



بھی ایٹو بن جاتے ہیں۔ خیر یواٹ میں نماز کو جا رہا ہوں۔“

اچانک ہی اس کی گھڑی پر نظر پڑی تو وہ بات سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شمسہ بچن میں برتن رکھنے چلی گئی۔ اماں اپنے لیے کٹکٹس فرانی کر رہی تھیں۔ شمسہ برتن دھونے لگی۔

”فاطمہ کیجیجی ہے؟“ اماں نے آواز لگائی۔

”جی اماں ہے میں خود پتی ہوں آکر۔“

اس نے فوراً ”بواب دیا اور چند ٹائیوں بعد بچن میں آگئی۔

”کوئی کیجیجی رہنے ہی نہیں دیتا تو۔۔۔ بچیوں کے لیے نگوئی ہوں سوسائیز پر رکھ دیتی ہوں۔“

اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر سنک میں گرا، آنکھیں یک دم نم ہوئیں۔

”آہستہ بھئی آہستہ آرام سے۔۔۔“ اماں نے برتنوں کی فکر میں ہانک لگائی تھی۔ اس نے سر کے اندر کچھ یوں بٹنے لگا جیسے اندر اپنے شیل میں چھلک رہا ہوتا ہے۔



”پانی زیادہ ٹھنڈا ہے تھوڑا سا تازہ پانی مکس کر لاؤ اس میں۔“ وہ بچن سے نمک لے کر آئی تو حارث نے

کہا۔ پانی کی بوتل اٹھا کر وہ اٹے قدموں بچن کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بوتل کے ساتھ سالن کی پلیٹ بھی تھی۔ حارث کے ساتھ بیٹھ کر اس نے بھی کھانا شروع کیا۔

”بھئی۔۔۔ چکن سے کیا چڑھے تمہیں؟ کبھی تو کھالیا کرو!“ حارث اس کی پلیٹ میں کل کا آلو قیمہ دیکھ کر بولا۔

”کھاتی تو خیر میں یہ بھی نہیں مگر اب اس میں قیمہ برائے نام ہی بچا ہے تو سوچا جیسے تیبے کر کے ہی کھاؤں آخر یہ تو بھرتا ہے۔“

”تیا نہیں تمہاری کیا خوراک ہے۔ گوشت کسی قسم کا نم کھاتی نہیں، دودھ سے تمہیں رعشہ ہو جانا

ہے۔“ حارث چڑ کر بولا تھا۔

”پھر بھی تمام آس پڑوس والے پرانے محلہ دار اور سب رشتہ دار یہی جانتے ہیں۔ میں بہت پیڑو ہوں، ہر وقت کھاتی رہتی ہوں۔“

حارث نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی میل جول کا ہر بندہ اس سے کوئی بات کرے نہ کرے یہ ضرور کرتا تھا کہ سنا ہے تم تین چار کلو دودھ پی جاتی ہو بہت اچھا کھاتی پتی ہو وغیرہ وغیرہ شروع سے ہی حد درجہ حساس تھی اس لیے سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی تھی کہ اگر برہگنسی میں اس کی بھوک ڈبل ہو گئی تھی تو کیا یہ ضروری تھا کہ ہر ملنے جلنے والے کو بتایا جائے؟

”شمسہ تم نے پرہگنسی میں پسند ہی وہ چیزیں کیں جن سے وزن بڑھتا ہے جیسے چاول، چپس، فرانز۔۔۔ اس لیے ورنہ کوئی بات نہیں۔“ اپنے مخصوص ملے پھیلے لہجے میں اس نے غیر محسوس انداز میں اس کی شکوہ کنال سوچ کو بدلنا چاہا۔

”حارث! میں خود بہت پیچھتا رہی ہوں، مگر کیا کرتی میرا دل ایسی ہی چیزیں کھانے کو کرتا تھا۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ اب ڈے بائے ڈے تمہارا وزن کم ہو تو رہا ہے ان شاء اللہ جلد ہی پہلے جیسی ہو جاؤ گی۔“

”فریج میں سالن رکھا تھا آلو قیمہ کا۔“ فاطمہ اچانک سامنے آکر بولی۔

”وہ تو میں کھا چکی۔ بس یہ لاسٹ بائٹ ہے۔“ شمسہ نے ہاتھ میں موجود نوالے کی بابت کہا باقی پلیٹ خالی تھی۔

”یہ تو میرا تھا۔ میں نے خاص اپنے لیے رکھا تھا۔“ فاطمہ عجیب ہی طرح سے بولی، جانتے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ شمسہ جس نے باتوں باتوں میں فوراً ”ہی اپنی روٹی تم کھلی تھی“ آخری نوالہ حلق سے اتارنے ہوئے اسے بہت وقت لگا۔

”شمسہ یار ریلیکس۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔“ حسب

معمول حارث نے فوراً اس کا وہیان بنایا۔

اٹھ بیٹھا۔

”یا تھا“ نیند آئی بھی مگر پھر میں سخت ڈر گئی۔“ وہ تنہی تنہی غڑھال اور چھ ڈری ہوئی تھی۔  
”ایسے کیسے جلے گا اتنے دنوں سے تمہاری نیند بھی ڈسٹرب ہے اور بھوک بھی۔ تم زبردستی آنکھیں بند کر کے لیٹو پلینے۔“

”دلیں رہی ہوں حارث، میں نے تو سکون کی دوا بھی لی تھی گمنم۔“

”سکون کی دوا؟“ اسے سن کر دھچکا لگا۔

”کب سے لے رہی ہو اور کس کے مشورے سے؟“ حارث نے اسے بے طرح جھوٹا دیا۔  
”خود ہی لی ہے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے۔“ وہ

بے طرح گھبراتے ہوئے بولی۔

”مائی گاڈ شمسہ! تم مجھ سے تو مشورہ کرتیں، اتنی سی عمر میں تم مصنوعی نیند اور مصنوعی سکون کا عادی کرنے والی ہو خود کو!“ اسے جیسے بے یقینی سی تھی۔

”تو میں کیا کروں پھر؟“ بہت بے بسی سے اس نے پوچھا۔

”تمام باتیں دماغ سے نکال دیا کرو۔ ریلیکس رکھا کرو خود کو بس۔“ اب کے وہ نرمی سے بولا۔

”ہوں۔۔۔ اچھا!“ غائب دماغی سے وہ کہہ رہی تھی۔  
”اچھا تم آکر لیٹو اور جتنی بھی دیر گزر جائے

آنکھیں بند ہی رکھنا اور سونے کی کوشش کرتی رہنا۔ ضرور نیند آئے گی۔“

اس کی بات پر شمسہ نے عمل تو فوراً کیا، مگر پھر بھی وہ بہت مضطرب لگ رہی تھی۔

کھانے کی میز پر سب جمع تھے اور رغبت کے ساتھ چکن منچورین سے انصاف کر رہے تھے۔ کھانے کی کوشش تو شمسہ بھی کر رہی تھی، مگر حارث نے نوٹ کیا کہ اس نے ابھی تک برائے نام ہی کھایا ہے نوالہ لیتے ہوئے اس کا چہرہ ایسے زاویے دکھانا کہ جیسے وہ کوئی بہت اذیت ناک کام کر رہی ہو۔ کچھ دیر مارے باندھے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ گئی۔

حارث کا دل اچانک ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ دو چار

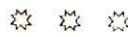
”کچھ ہوا تو ہے حارث، میری وجہ سے سب کو اپنے کھانے پینے کی چیزیں سنبھال کر رکھنی پڑتی ہیں اس بات کا تو مجھے اندازہ تھا، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ انجانے میں اگر ان کی کوئی شے کھالوں گی تو منہ پہ آکر بات کی جائے گی، پوچھا جائے گا وہ بھی اس طرح ہے۔۔۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں یہ بات کی تھی۔“

”لیٹ اٹ گو (Let it go) شمسہ، میں نے شادی سے پہلے ہی تمہیں کئی بار بتایا کہ ہمارے گھر میں کوئی بھی زیادہ حساس نہیں ہے، ایسا نہیں ہے جیسی تم ہوا۔“

”لیکن تم نے ان سب کو جیسا بتایا یہ ویسے بھی تو نہیں ہیں۔“ اس کے لہجے میں آنکھوں میں باتوں میں شدید اداسی اور آئی تھی۔

”اچھا تم یہ برتن سمیٹو اور چائے بنا دو مجھے ورنہ ابوبکر اٹھ جائے گا اور تم مجھ بھی نہیں کر پاؤ گی۔“

ایک دفعہ پھر حارث نے اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنا چاہی تاکہ وہ پہلوں کڑھتی نہ رہے اور اس دفعہ وہ کامیاب بھی رہا۔ شمسہ جی اچھا کہہ کر برتن سمیٹنے لگی۔



”شمسہ“

کروٹ بدلتے ہوئے ذرا کی ذرا اس کی آنکھ کھلی تو اس نے شمسہ کو کمرے کے پتوں پر سنبھلتے پایا، اس کی آواز یہ وہی کہہ کر رکھی۔

”جھنڈہ ہو گیا ہے تمہیں کبھی یہاں کبھی وہاں نیند نہیں آ رہی کیا؟“

”جھنڈہ نہیں حارث چار گھنٹے۔“ وہ بیڈ پہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

”چار گھنٹے؟“ حارث نے حیرت سے وال کھا کر دیکھا۔ اس کی چمکتی سونیاں تین بیس کا نام دکھا رہی تھیں اور وہ لوگ گیارہ بجے لیٹے تھے۔

”تم دودھ پی لیٹیں تھوڑا سا۔“ وہ ساتھ پریشانی کے

پیشانی لگ رہا تھا۔  
 ”تو کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں کہیں اور ہوتی تو کچھ نہ  
 سہتا؟“ یہ سب نہ ہوتا تو کسی اور طرح کے مسائل  
 ہوتے مگر آئیڈیل ماحول تو کبھی بھی کسی کو نہیں ملا۔  
 ”جب تم یہ سب جانتی ہو، سمجھتی ہو، خاموشی سے  
 سستی ہو تو پھر تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟ مسکراتا  
 کیوں بھول رہی ہو؟“ وہ رہا ہنسنا ہو رہا تھا۔

”کیونکہ میں یہ سب ہوش سے نہیں جانتی تھی اور  
 نہ ہی اس کے لیے تیار تھی، مگر ہر گزرتے دن کے  
 ساتھ میں ان حقائق کو بہتر طریقے سے سمجھنے لگی ہوں  
 اور خاموشی کی وجہ یہ نہیں کہ میں بہت عظیم ہوں، بلکہ  
 ہر ایک کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں، میری بھی ہیں،  
 میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کا نام بدنام ہو  
 کیونکہ آپ مجھے ہر طرح کا آرام مہیا کرتے ہیں، ایک  
 بندے کے بولنے سے شور نہیں ہوتا، مگر آواز اس دو  
 ہو جائیں تو دواؤں سے پار ہو جاتی ہیں، پھر کوئی یہ  
 نہیں دیکھتا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط؟ ہاں ایسا ضرور  
 ہو سکتا ہے کہ چہ گوئیاں ہونے لگیں کہ حادثہ کی  
 بیوی نے بدگامی کی۔“

”لیکن تم کام کی باتیں تو کیا کرو یا راجتایا کرو کہ تم  
 فارغ نہیں رہتیں اور تمہیں کوئی ضد نہیں سب کی  
 باتیں ٹالنے کی ہیں کبھی کبھار کوئی بات ماننا ممکن نہیں  
 بھی ہوتا۔“

”پتا ہے حادثہ ایجو ہمیں سمجھ سکتا ہے نا اسے  
 ہماری وضاحتوں کی ہمارے بات کرنے کی ضرورت  
 نہیں ہوتی اور جس نے سمجھنا ہی نہیں، کبھی آپ کی  
 بات کو درست اور صحیح تسلیم ہی نہیں کرنا اسے آپ  
 کتنی ہی بار بتائیں کسی بھی طریقے سے بتائیں، بے سود  
 رہے گا میں یہ کر کے دیکھ چکی ہوں۔“

”جو بھی ہو یا راجت، تمہاری یہ خاموشی برداشت  
 نہیں ہوتی اب تو تم عام حالات میں بھی چپ چپ سی  
 رہتی ہو۔“ حادثہ کی سولی وہیں اٹکی تھی۔

”پتا ہے حادثہ میں سمجھتی تھی کہ خاموشی سب  
 مسائل کا حل ہے، پھر مجھے لگا کہ یہ خاموشی ہی کافی

نوالے مزید زہر مار کر کہ وہ بھی اٹھ گیا اور ٹیس یہ جانکر  
 ٹھلنے لگا۔ ابو بکر کے رونے کی آواز آنے لگی اور ساتھ  
 میں شمسہ کی با آواز بلند لوریاں سنائی دے رہی تھیں۔  
 وہ چپ ہوا تو شمسہ غالباً برتن صاف کرنے لگی۔ اسے  
 کافی انتظار کرنا پڑا اور جب وہ آئی تو ابو بکر کو کندھے کے  
 ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا اور  
 ایسے میں اسے ماں کی گود میں رہنا بہت پسند تھا۔ اس کی  
 کمر مسلسل تھکتے ہوئے وہ چپ چاپ حادثہ کے  
 ساتھ ٹھلنے لگی۔

”مجھے ان سب سے چڑھونے لگی ہے۔“ بہت دیر  
 بعد حادثہ بولا۔

”حادثہ پلینے۔“ اس نے فوراً ہی احتجاج کیا۔  
 ”آپ کیا چاہتے ہیں کہ اب مجھے یہ بھی سننے کو ملے  
 کہ میں آپ کو سب سے دور کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”نہیں یا سہ، مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں، کوئی تم  
 سے نفرت کرے تو میں کیسے برداشت کروں؟“ بہت  
 پریشانی سے بولا۔  
 ”آپ کو کس نے کہا کہ کسی نے مجھ سے نفرت کی  
 ہے؟“

”دیکھتا نہیں ہوں کیا؟“  
 ”ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو آپ نفرت پہ محمول  
 کر رہے ہیں؟“

”باتیں چھوٹی ہوتیں تو ان کے اثرات اتنے گہرے  
 نہ ہوتے۔“ حادثہ کے ذہن میں اس کا بھجا بھجا چہرہ  
 حلقے اور افسردگی تھی۔

”کوئی ایک فریق کبھی بھی مکمل قصور وار نہیں ہوتا  
 حادثہ۔ دوسرے کی غلطی کم ہو، برائے نام ہو مگر  
 ہوتی ضرور ہے۔“

”اچھا؟ تمہاری کیا غلطی ہے جو کبھی دکھائی نہ سنائی  
 دی۔“

”میری غلطی حد سے بڑھی حساسیت ہے۔“  
 ”لیکن تمہیں کبھی بھی کسی بھی کوئی رعایت نہیں  
 دی جاتی۔ میں بہت کٹھنی ٹیل کرتا ہوں کہ میری وجہ  
 سے تم کتنا برداشت کرتی ہو۔“ وہ لہجے سے ہی بے حد



نہیں اس کے ساتھ مسکراہٹ اور خوش دلی بھی ہوئی چاہے میں نے اسے بھی آزمایا تھا، مگر تب بھی ترش تہی سننے کو ملیں تو میرا دل اچلت ہو گیا اب تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جاتا۔“ وہ گلو گھر لے کے ساتھ بولی، من تو تھا کہ پھوٹ، پھوٹ کہ روئے، مگر آل ریڈی حارث اتنا پریشان تھا کہ وہ مزید نہ کر سکتی تھی۔

دور ہو جاؤں۔

”نہیں نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔“ میرا ضمیر کر لایا، دل رویا ”پیشک“ کچھ مسائل ہیں، مگر چاؤ ارمان بھی تو ہمت کیے گئے تھے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تم بھی عورت ہی بنو؟ ناک یہ غصہ رکھنے والی ہمہ وقت ناراضی کے لیے تیار رہنے والی؟“

کوئی میرے اندر سے بولا۔ ”کیوں نہ تم گر ہمت بنو، ہر وقت مصروف رہنے کے باوجود مسلسل مسکرانے والی کیونکہ خار تو تم سے کوئی نہیں کھاتا، نفرت بھی نہیں عجز بھی نہیں، بس ذرا ذرا سی باتیں ہی تو ہیں۔“

آئیڈیا اچھا تھا۔۔۔ دل کو لگا، دقت ضرور ہوئی کیونکہ گلاس کے خالی حصے کو نظر انداز کر کے بھرے ہوئے حصے کو دیکھتے رہنا مشکل ہی نہیں مشکل ترین تھا، مگر بہر حال ناممکن نہیں تھا۔ دودھ سے دھلا ہوا تو میں نے خود کو بھی کہا نہ سمجھا ہاں مگر گر ہمت بننے کی عقل مندی ضرور کی اور اس پہ مجھے فخر ہے۔

ارے یہ کیا۔۔۔ شاید باندی لگ گئی ہے اور شاید کوئی تیز تیز۔۔۔ بڑبڑا بھی رہا ہے، میں کچن کو چلی۔ مگر اس بڑبڑاہٹ کو سر پر سوار کر کے میں اپنی پلکیں نم نہ ہونے دوں گی۔

جی ہاں اختلاف رائے اب بھی ہو جاتا ہے، ایک دوسرے کی باتوں کو کبھی کھلے عام اور کبھی ڈھکے چھپے ناپسند بھی کیا جاتا ہے، مگر اب میں سر پہ سوار نہیں کرتی، دل یہ نہیں لیتی۔ اس سب کی عادی جو ہو گئی ہوں اچھی گر ہمت بننے کے لیے میں نے ہر مطلبہ طریقہ اپنایا ہر عادت اپنائی اور کامیاب ہو گئی، مجھے سراہیے گا ضرور آفر آل ایک گر ہمت کو سب سے زیادہ چاہ پزیرائی کی ہی تو ہوتی ہے۔

”تو کیا میں تمہیں کبھی پہلے جیسا ہنستا ہوتا نہیں دیکھ سکوں گا؟“ بہت ڈر کر اس نے پوچھا تھا۔

”دیکھیں گے۔۔۔ ضرور دیکھیں گے وقت کے ساتھ ساتھ میں سب کے مزاج کو مزید بہتر طریقے سے سمجھنے لگوں گی مجھے سارے کام میں بیچ کرنے اور سب معاملات ہنڈل کرنے آتے جائیں گا، میری حساسیت کم ہوگی، جو کوتاہیاں کیاں مجھ میں آج ہیں وہ نہ ہوں گی اور ہو سکتا ہے تب سب لوگ میری چیز بھی سمجھنے لگیں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا، ایڈٹ ہو جائے گا۔“ ”ہو پ سو کہ ایسا ہی ہو۔“ حارث نے اس کے لیے صدق دل سے دعا کی۔

”ان شاء اللہ ضرور ہو گا اور بہت جلد ہو گا۔“ شمسہ جھٹ سے بولی تھی۔

تالی تو اب بھی بھتی ہے، مگر اس کی نوعیت بدل چکی۔ شیشے کے سامنے کھڑی شمسہ نے چٹیا کو بل دیتے ہوئے تکرار ہو کر سوچا۔

اب ہم ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کسی بات پہ ہنس رہے ہوتے ہیں، کسی چیز کو انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔ نوکری میں نیا برتن آئے تو ٹکرائے کی آوازیں پہلے سے زیادہ ہوجاتی ہیں، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو توڑنے پھوڑنے کے اور ایک دوسرے کی جگہ لینے کے درپے ہو جائیں، کچھ کچھ تنگی ہر ایک کے حصے میں آتی ہے مگر پھر سب ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں، اس قدر کہ کوئی موجود نہ ہو تو ادھورا لگنے لگتا ہے۔ کسی محسوس ہونے لگتی ہے۔

سننے میں عجیب لگے گا، مگر ہوا ایسی تھی۔ گھر گرہستی میں مصروف رہنے والی عورت ہوں نا تو مجھے زندگی کا گڑ



”کو بر خور دار۔ کیا کہنا چاہتے ہو، اگل دو ماہ سکون ملے کچھ تمہیں بھی، ہمیں بھی۔“  
احسن نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ جیسے اسی انتظار میں ہو۔  
”پاپا! مجھے شامکہ سے شادی نہیں کرنی۔ کسی صورت بھی نہیں۔“

رمیز حسن کامنہ کھل گیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ احسن کے دل میں یہ کھجری پک رہی ہے۔  
”پاگل ہو گئے ہو تم؟ اگر یہ مذاق ہے تو نہایت بھونڈا ہے۔“ انہوں نے حقاً سے کہا۔

”یہ مذاق نہیں ہے پاپا۔ میں سیریس ہوں۔ اور اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔“

”مگر کیوں؟“ رمیز نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شامکہ کو دیکھا تھا۔ پسند کیا تھا۔ باتیں کیں۔ ملنے جلتے رہے۔ یہ منگنی تمہاری پسند اور مرضی سے ہوئی اور۔“

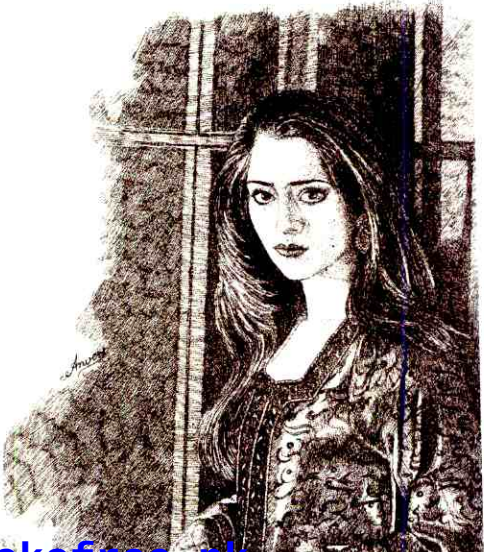
”اور اب میں اپنی مرضی سے ہی یہ منگنی توڑ رہا ہوں پاپا! اس کا اور میرا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ میں مشرق کو چلوں تو وہ مغرب کو چلتی ہے۔ میں دن کہوں تو وہ رات۔ پاپا! ایسی لڑکی کے ساتھ دو قدم چلنا بھی مشکل ہے نہ کہ ساری زندگی۔“ اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

”تو پہلے تم کیا سوئے ہوئے تھے؟“ رمیز حسن نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”چھ ماہ ہو گئے تمہاری منگنی کو اور

رمیز حسن بظاہر تو چائے پی رہے تھے مگر گاہے گاہے احسن پر بھی نظر ڈال لیتے، جو کسی البصن میں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات، اضطراب، بے چینی کچھ بھی ان کی نظروں سے چھپا نہ تھا۔ کوئی چیز اسے پریشان کر رہی تھی مگر کیا۔ وہ یہ سمجھنے سے فی الحال قاصر تھے۔

چائے ختم کر کے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے پھر احسن کو دیکھا۔ اس کی پرسوج نگاہیں چائے کے کپ پر تھیں اور وہ اضطرابی کیفیت میں سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرے جا رہا تھا۔ رمیز حسن ہلکا سا کھٹکھارے۔

## ناولٹ









سے لال بھسکا ہو گیا۔ ”سارے فیصلے خود ہی کر لیے اور ہمیں خبر تک نہیں۔“  
 ”سوری بیٹا! اتنا اختیار تو مجھے اپنی زندگی پر ہونا چاہیے۔“

احسن نے مدھم لہجے میں کہا اور میز سے گاڑی کی چابی اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہر چلا گیا۔  
 انہوں نے رمیز حسن کی طرف دیکھا جو کمرے کا طول و عرض ناپ رہے تھے۔

”دیکھا تم نے اپنے لاڈلے سپوت کو۔“ وہ چکر لگاتے لگاتے ان کے سامنے رکے۔ ”کیا بے ہوشہ حرکت کی ہے۔ انکار تک کما بھیجا۔ خود مختار ہو گیا ہے تمہارا ہونما۔“  
 افسوس تو انہیں بھی ہوا تھا مگر طنز کیے بنانہ رہ سکیں۔

”آپ کا بیٹا ہے۔ آپ رہی جائے گا۔“  
 ”بیٹا ہمارا ہے مگر ہم جیسا ہے کہاں۔ ہم والدہ کے انتہائی فرماں بردار تابع دار تھے۔ امی جان مرحومہ نے کہا۔ چڑھ جاؤ بیٹا سولی۔ چڑھ گئے چپ چاپ بغیر اعتراض و جھجک کے۔“ رمیز حسن غصے میں اسی طرح بلا سوچے سمجھے بولتے تھے۔

”خیر! اتنا مبالغے سے بھی کام نہ لیں۔“ انہوں نے قہقہے سے کہا۔

”یاد نہیں جو اودھم مچائے تھے آپ نے۔ میرے والدین کو کیسے کیسے پیغام بھیجے، کیا کیا ناکام رچائے تھے؟“

”وہ تو بس یوں ہی ضد میں۔۔۔ ورنہ امی جان آگ میں چھلانگ لگانے کو کہتیں تو کو جاتے چپ چاپ بیٹا سوال کیے اور تمہارے صاحب زادے۔۔۔ بد لحاظ، گستاخ، بد تمیز۔۔۔ اور تم اس کی حمایت کر رہی ہو۔ اس نالائق کی؟“ فرحین کی بات پر وہ تھوڑا جھجکے تھے مگر پھر اپنی ٹون میں واپس آگئے۔

”میں حمایت نہیں کر رہی۔ اس نے برا کیا، بہت برا، مگر کہا اس نے درست یہ ہمارا زمانہ نہیں کہ والدین

اب تمہیں پتا چلا ہے کہ تمہارے مزاج نہیں ملتے؟“  
 ”اگر شادی کے بعد پتا چلتا تو اور برا ہو تا بیٹا! احسن نے جھٹکا کر کہا۔ ”ہمارے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہی نہیں ہو سکی جو عمر بھر ساتھ نبھانے کے لیے ضروری ہے۔“

”یہ کوئی جواز نہیں ہے احسن!“ رمیز حسن تھوڑا نرم پڑے۔ ”تمہاری ماما کے ساتھ میری انڈر اسٹینڈنگ شادی کے بعد ہوئی اور ہماری خوش گوار زندگی تمہارے سامنے ہے۔“

”وہ اور زیادہ تھپا بیٹا۔۔۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ ماما آپ کی ہم مزاج تھیں۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی۔۔۔ نہ ہوتیں تو روتے سر پکڑ کر۔۔۔ شامکے کی الٹی کھوپڑی ہے۔ میرا اس کا گڑا ناممکن نہیں۔ لوگ تو سبزی بھی خریدتے ہیں تو ٹھوک جھا کر۔ یہ تو عمر بھر کا معاملہ ہے۔“

”بند کرو یہ بکواس۔“ رمیز حسن غصے سے کھڑے ہو گئے۔ ”اقتی مدت ملتے رہے۔ تب نہ جانچا۔ نہ پرکھا۔ اب خیال آیا تمہیں۔ یہ سب تمہیں مفتی سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ ان کا انداز قطعی تھا۔

”تو کیا اب اس بھول کا خمیازہ ساری عمر بھگتوں؟ زندگی ایک بار ملتی ہے اور مجھے اپنی زندگی عذاب نہیں بنانی۔“

”مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی بھی نہیں۔“ رمیز نے کمال ضبط کیا۔

”یہ تو ہو گا بیٹا۔ اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو۔۔۔ احسن کا انداز حتمی تھا۔ وہ جو دم، خود بیٹھی باپ بیٹی کی تکرار سن رہی تھیں۔ ایک دم بول پڑیں۔

”احسن بیٹا! فضول ضد مت کرو۔ ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ اپنے بیٹا کی بات مان لو۔“

”یہ ضد نہیں ماما! میرا فیصلہ ہے اور یا سوری۔۔۔ میں نے شامکے کو بھی بتا دیا ہے اور اس کے گھر والوں کو بھی۔“

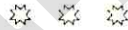
”حق، نالائق، گدھا۔۔۔“ رمیز حسن کا چہرہ غصے

نے جس کھوٹے سے باندھا، بندھ گئے۔  
”ہمارا زمانہ۔۔۔“ انہوں نے پر خیال نظروں سے  
بیگم کو دیکھا۔

اور ان کی آنکھوں کے سامنے کھلتے گلابوں جیسا وہ  
دلربا چہرہ آگیا۔ جو پل بھر میں ان کے حواسوں پر چھا گیا  
تھا۔ ان کے اعصابی تناؤ سے پہنچے کپڑے۔۔۔ نقوش  
ڈھیلے پڑنے لگے۔

اور وقت جیسے تیس سال پیچھے چلا گیا۔ جب انہوں  
نے پہلی بار ان کو دیکھا تھا۔

وہ بھی شاید ماضی میں پہنچ گئی تھیں۔ ان کی کھوٹی  
کھوٹی آنکھیں جیسے کوئی خواب دیکھنے لگی تھیں۔  
گزرا وقت ہاتھ باندھے ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔  
اور وہ اس کے ایک ایک پل کو اپنے سامنے گزرتے  
دیکھنے لگے۔



بات کچھ زیادہ بڑی نہ تھی مگر گھر میں طوفان آگیا  
تھا۔ بابا جان گرج رہے تھے۔ امی جان بھی غصے میں  
تھیں۔ بھابھی اور بھائی جان دم بخود تھے۔ ضیا جو رمزی  
کا پیغام لایا تھا، سر جھکا کر کھڑا تھا اور فرحین کھڑکی سے  
لگی گھر گھر کانپ رہی تھی۔

”اسے جرات کیسے ہوئی ایسی بات کہنے کی۔“ بابا  
جان مارے طیش کے منہ سے کف اڑا رہے تھے۔  
”کہہ دو جا کر اس سے شریف گھرانوں میں ایسا نہیں  
ہوتا۔ نکال دے یہ خیال ذہن سے اور خبردار جو آئندہ  
کوئی ایسا ویسا پیغام بھیجا۔“

”اے اس کی اماں نے دسیوں بار ٹھوک بجا کر  
دیکھا۔ چوکھٹ گھسا ڈالی، تب جا کر ہم نے ہاں کی۔“  
امی جان نے تنک کر کہا۔ ”ہمیں کوئی لڑکی بھاری نہیں  
پڑی تھی۔ اب بھلا یہ رمزی میاں کو سوجھی کیا؟“

”پتا نہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ ایک نظر دیکھنے کا تو  
شرع نے بھی حق دیا ہے۔“ ضیا نے دلی زبان میں کہا۔  
”شرع۔؟“ بابا جان آگ بگولہ ہو گئے۔ ”شرع  
نے حق دیا تھا تو یہ حق پہلے مانتے۔ اب جبکہ باقاعدہ

منتفی ہو چکی ہے۔ اب انہیں اس حق کا خیال آیا ہے۔  
یوں بھی ہمارے گھرانے میں ایسا کوئی رواج نہیں۔ اگر  
انہیں ماں، بہنوں پر اعتماد نہیں ہے تو کوئی اور گھر  
دیکھیں۔“

”ہائے میری بد نصیب بچی۔“ امی جان واویلا کرنے  
لگیں۔

”جب رشتہ ہوا تھا تو کیسے دشمنوں کے سینے پر تیر  
چل گئے تھے۔ ایسا اچھا، اعلا، تعلیم یافتہ، مقبول لڑکا،  
ضرور دشمنوں نے کچھ کر دیا ہے، ہائے میری بچی کے  
نصیب۔“

”تم چپ رہو۔“ بابا جان نے امی جان کو ڈانٹ دیا۔  
”یہ آہوں کا کس لیے۔۔۔“

”کہہ دو میاں! جا کر کہہ یہ ناممکن ہے، سمجھے؟“ وہ  
دوبارہ ضیا سے مخاطب ہوئے۔

”جی۔۔۔ اچھا۔۔۔ ضیا کاندھے اچکا تا کرے سے  
نکل گیا۔

فرحین لڑکھڑاتی ہوئی کھڑکی سے ہٹی اور بستر پر  
اوندھے منہ گر پڑی۔ ”یہ کیا ہو گیا میرے خدا!“  
اس کا سر چکر رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے  
ترمرے سے ناچ رہے تھے۔

”اگر رمزی ضد پر اتر آئے تو۔۔۔ بابا جان تو کسی  
صورت ان کی بات نہ مانیں گے۔ پھر کیا ہو گا آخر؟“

اس کا دل انجائے خدشات سے لرز رہا تھا۔  
”خدا انخواستہ۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو۔۔۔ وہ

کانپ اٹھی۔ رمزی جیسے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔  
”فولوس۔ جی پاد کی میرے ہاتھ۔ رہ لوگی میرے بغیر؟“

”نہیں۔۔۔ تمہیں۔“ وہ چہرہ بازوؤں میں چھپا کر  
سک اٹھی۔ میں میرا دل کی۔ خدا یا۔۔۔ یہ کیا ہو گیا؟“

بات صرف یہ تھی کہ رمزی، فرحین کو ایک نظر  
دیکھنا چاہ رہا تھا۔ جس وقت ان کی منتفی ہوئی وہ لندن  
میں ایف آر سی ایس کرنے کے بعد وہیں ایک اسپتال

میں جاب کر رہا تھا۔ گھر سے خط پر خط آرہے تھے۔  
”جلدی واپس آؤ تاکہ تمہاری شادی کے فرض

سے سبکدوش ہو سکیں۔“

منقطع ہو گیا۔

وہ واپس آنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اسی جان کی بیماری کا سن کر وہ درحقیقت پریشان ہو گیا تھا۔ اور ہر صورت ان کی خوشی پوری کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سال کی تمام تعطیلات وہ ختم کرچکا تھا۔ اور اب جولائی سے پہلے اسے کوئی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ کچھ اور بھی چھوٹے موٹے مسائل تھے۔ واپس آتے آتے اسے چھ ماہ لگ گئے۔ اس اثنا میں اس کی منگنی کر دی گئی۔ ندا نے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔

”فرحین جیسی لڑکیاں بیٹھی نہیں رہتیں۔ اس کے رشتے آ رہے تھے۔ اور گھر والے منگنی کرنے کو تقریباً تیار تھے۔ چنانچہ انہیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ کیونکہ فرحین جیسی لڑکی کو کھودینا بڑی بد قسمتی ہوتی۔“

رمزی بہت جھنجھیلیا۔ غصہ ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ان سب کو وہ اتنی پسند تھی کہ وہ اسے کھودینے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ رمزی چپ ہو رہا کہ جو ہوا سو ہوا۔ دل میں طے کر لیا کہ شادی مگر اس وقت تک نہیں کرے گا۔ جب تک فرحین سے مل نہ لے گا۔ کیونکہ وہ سمجھوتے کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا جون ساتھی چاہتا تھا جو اس کا ہم مزاج ہو۔ اسے سمجھ سکے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خیالات کا تضاد مگراؤ کا سبب بنتا ہے۔ وہ گھر میں اور زندگی میں جھگڑا نہیں سکون اور پیار و خلوص کی فضا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ندا کو بتا دیا کہ وہ فرحین کو دیکھ کر ناشری نہیں کرے گا اور ندا اپنا وعدہ پورا کرے۔

ندا نے اسے بتایا کہ اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں پرانی اقدار و روایات کی پاسداری جان سے بڑھ کر کی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی سے پہلے لڑکی کا سرال عزیزوں کے سامنے جانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگتیرے چارہ تو اس کی جھلک تک نہیں دیکھ سکتا۔ فرحین کو صرف اسی جان اور ندا نے دیکھا۔

”یہ کیا جہالت ہے؟“ رمزی ہنسیا۔ ”اتنا چھپا چھپا کر کیوں رکھ رہے ہیں؟ کیا عیب ہے اس میں؟“

مگر رمزی مثال منول کر رہا تھا کہ ایسی کیا جلدی ہے؟ وہ پلاسٹک سرچری میں امپیشنل ٹرینیشن کرنے کے بعد ہی واپس آنا چاہتا تھا۔ مگر ندا نے لکھا کہ ان کو فرحین پسند آئی ہے اور وہ ان کی منگنی کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ ابھی امپیشنل ٹرینیشن کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور آکر شادی کریں، پھر چاہے جو کرتے رہیں۔

رمزی حیران ہوا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ باشعور تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ پھر وہ بغیر دیکھے بغیر رکھے کیسے ایک اجنبی لڑکی کے لیے ہاں کر دے۔ اس نے فوراً ”کال کی اور بہن سے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی انجان“ ان دیکھی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ ندا نے کہا۔

”اسی بیمار ہیں اور اگر انہیں ان کی زندگی عزیز ہے تو تاخیر نہ کریں اور فوراً واپسی کا قصد کریں۔ اسی جان اپنی آنکھوں سے انہیں ہنسنا دیکھنا چاہتی ہیں اور وہ سہرا بند ہوا کر ان کی آرزو پوری کر سن اور یہ کہ فرحین اچھی لڑکی ہے۔ اس سے شادی کر کے وہ بچھتا میں گئے نہیں۔“

رمزی جھنجھلا رہا تھا۔ مگر ماں کی بیماری کا سن کر نرم پڑ گیا۔

”ٹھیک ہے، اگر اسی جان کی خوشی یہی ہے تو آ جاتا ہوں۔“ اس نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر میرے آنے سے پہلے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ میں پہلے اسے ایک نظر دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ”مگر“ ندا کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ ”اچھا نہیں۔ آپ آجائیں۔ اس کی بھی کوئی نہ کوئی سنبھل نکل آئے گی۔ میں ملوا دوں گی۔“

”ندا۔ تم ان کو بتا دینا۔ میری بس یہی ایک شرط ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ کہیں بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ شادی عمر بھر کا معاملہ ہے۔ مجھے انتخاب کا حق تو ہونا چاہیے نا۔“ ندا کچھ ہچکچائی۔

اسے یوں ہی کچھ احساس سا ہوا کہ جیسے ندا کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ وہ اس سے پوچھنا چاہ ہی رہا تھا۔ مگر رابطہ



”کوئی عیب نہیں۔“ ندانے اطمینان سے کہا۔  
 ”میں نے بتایا نہ کہ ان کے ہاں روایات کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے۔ پھر بھی میں کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گی۔ آپ کچھ صبر کریں۔“

”یاد رکھنا ندانے۔ جب تک میں اس سے مل نہیں لوں گا۔ شادی نہیں کروں گا۔“ اس نے وارننگ دی۔  
 ”ٹھیک ہے۔ ایک دو دن تک موقع نکال کر ادھر جاؤں گی اور کسی نہ کسی ہمارے آپ کو ملوا دوں گی۔“

رمزی مطمئن ہو گیا۔ نگرند اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی۔ اسرار احمد کو گردے کی تکلیف تھی۔ ”ندا“ امی کی بیماری کا نرک پرستان آئی تھی۔ پھر امی کی خاطر رمزی کے لیے لڑکیاں دیکھنے لگی۔ اور پھر رمزی کی منگنی کے بعد بھی نہ جاسکی۔ اس کا ارادہ بھائی کی شادی کے بعد جانے کا تھا۔ کینڈا سے آئے اسے سال بھر ہونے کو تھا۔ اس دوران اسرار احمد کی تکلیف بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے فون کر کے ندا کو بلوایا۔ بے چاری ندا کو

افرا تفری کے عالم میں کینڈا جانا پڑا۔ اس کے اس طرح جانے کا افسوس سب کو ہی تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ سب سے زیادہ اثر رمزی پر ہوا۔ سالوں بعد وہ بہن سے ملا تھا۔ دوسرا اس کا کام نہ ہو پایا تھا۔

رمزی اپنی ضد پر قائم تھا کہ جب تک فرحین کو دیکھے گا نہیں شادی نہیں کرے گا۔  
 ان ہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ ضیا فرحین کا کزن ہے۔ اس نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔ ضیا نے اس کی مدد کا وعدہ تو کر لیا، مگر اسے بھی کوئی تدبیر نہیں سوچ رہی تھی۔

”کیوں نہ ماموں جان سے براہ راست بات کروں۔ کیا تیا مان جائیں۔“ ضیا نے رمزی سے کہا۔  
 ”یاسے کچھ بھی کرے۔ اس سے ایک بار ملو ضرور۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر میں ان ہی سے بات کرتا ہوں۔ انہیں قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آگے تمہاری قسمت۔“

مگر جب ضیا نے بات کی تو اعجاز حسن ہتھ سے اکھڑ

گئے اور رمزی کے ساتھ ساتھ ضیا کو بھی بے نقط بنا ڈالیں۔ ضیا نے جا کر رمزی کو تیا کیا بات بگڑ گئی ہے اور اب تو وہ کسی صورت فرحین کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا۔ کچا کہ بات کرنا۔

ضیا کو افسوس ہو رہا تھا۔ ”مجھے عذرا بھابھی یا ارسلان بھائی سے کتنا چاہیے تھا۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے۔“

”نگراس میں اتنا طیش میں آنے کی کیا بات تھی؟“ رمزی کو سخت برا لگا۔ ”منگیتیر ہے میری۔ مجھے اس سے ملنے کا حق ہے۔ میں کوئی ان کی لڑکی کو اغوا نہیں کرنے جا رہا۔ نہ میں کوئی آوارہ ہوں اور ایسا ہی انہیں میری شرافت پر شک ہے تو بٹھائیں لڑکی کو اپنے گھر میں۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ ہمیں لڑکی کوئی بھاری نہیں ہے۔“ اعجاز حسین غصے سے ضیا پر برس پڑے۔ ”ہم کسی صورت اس کی بات ماننے کو تیار نہیں، خبردار! جو ہماری لڑکی کا نام لیا یا جسے ہمارے گھر جانا بھی کہہ دے وہیں لندن جا کر بیاہ رچالے، دیکھ سن کر۔ ہمارے ہاں نمائش نہیں لگتی۔“ ضیا نے پیغام پہنچا دیا۔

”لندن میں جا کر بیاہ کیوں رچاؤں۔“ رمزی نے پیغام بھیجا۔ ”جس سے منگنی کی ہے اسی سے بیاہ رچاؤں گا۔“

”ہم شریف لوگ ہیں۔ آن پر جان دینے والے۔ ایسی ذلت آمیز شرط پر شادی کے لیے تیار نہیں۔ کوئی اور گھر دیکھو۔ ہماری طرف سے جواب ہے۔“ اعجاز حسن نے اکلا بھیجا۔

”بد معاش، ہم بھی نہیں۔“ رمزی نے تملاکر جواب بھجوایا۔ ”فرحین ہماری مانگ ہے۔ دیکھتے ہیں کوئی اور کیسے لے جاتا ہے۔“

”خبردار۔ جو فرحین کا نام لیا۔“ اعجاز حسن نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے پیغام بھیجا۔ ”زبان کاٹ ڈالوں گا کم بخت کی۔ سمجھا لو اپنے اس جیتے کو۔ ورنہ جج جان سے جائے گا۔“

”نام کیوں نہ لیں فرحین کا۔ نام بھی لیں گے۔“

ہو؟

وہ سر جھکائے روتی رہی۔

”بولو۔۔۔ ملوگی رمزی سے؟“ ضیا بھائی نے اصرار سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر رونے دھونے کا فائدہ۔۔۔ بزدل۔۔۔ جو ہوتا ہے ہونے دھونے روئے جاتی ہیں بس۔۔۔ ذرا سی ہمت نہیں کر سکتیں۔“ ضیا بھائی خفا ہو کر چل دیے۔

اس کے آتسو اور بھی روانی سے بننے لگے۔ وہ کیا کرے؟ کس قدر بے بس ہو گئی تھی وہ۔۔۔ تو وہ بابا جان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے دل پر کوئی اختیار تھا جو رمزی کے نام پر دھڑکے چلا جاتا۔

منتفی کے بعد جب اسے رمزی کی تصویر دکھائی گئی تو وہ دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا۔ خوش رو، جاذب نظر، ہنسی ہوئی روشن آنکھوں والا رمزی مل بھر میں اس کے دل میں اتر گیا۔ چپکے چپکے اس کی آنکھوں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے اور وہ جیسے اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑنے لگا۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی، کیسے وہ ایک بالکل اجنبی، ان دیکھے، انجان شخص کی محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے۔ حالانکہ اسے اس شخص کی عادات، مزاج، کسی چیز کا پتا نہ تھا۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا چیز پسند ہے اور کیا پسند۔ اس کے باوجود وہ اس کے دل کی گراں سوں میں بڑے ٹھانڈے سے براجمان تھا۔ اس کے نام کی انگوٹھی پہن لینے کے بعد وہ اسے کتنا اپنا اپنا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگی تھی مگر اب یہ اعزاز جھٹنے والا تھا۔ وہ امی جان سے بابا جان سے، ارسلان بھائی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ کیوں اس سے پوچھتے ہیں اس کی زندگی کا فیصلہ کیا جا رہا ہے؟

وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اسے رمزی ہر حال میں پسند ہے۔ چاہے اس میں ہزار عیب ہوں۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی زبان پر حیا

ملیں گے بھی، بیاہ بھی رہ جائیں گے اور جو کسی نے روکا تو اٹھالے جائیں گے۔ تم بھی کسمہ دو جا کر۔“

ضیا ادھر سے ادھر پیغام لانے، لے جانے میں گھن جکرتا ہوا تھا۔ معاملہ سلجھانے کی کوشش میں اور زیادہ بگڑا جا رہا تھا اور وہ جس کے بارے میں یہ سارے فیصلے ہو رہے تھے۔ اس سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔

☆☆☆

اسے غش پر غش آرہے تھے۔ آنکھیں سوچ کر انگارہ ہو رہی تھیں اور آتسو تھکے کہ خشک ہونے میں نہ آتے تھے۔ عذرا بھائی بار بار بے چین ہو کر اس کے پاس آتیں۔ اسے گلے لگاتیں، تسلی دیتیں، مگر وہ روئے چلی جاتی۔ کتنی بار ان کا جی چاہا کہ بابا جان سے جا کر کہہ دیں۔

”بابا جان! اتنی معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ اگر رمزی اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔“ مگر حوصلہ نہ پڑا۔

بابا جان اندر خیال پر گرجتے پرستے رہے۔ وہ اپنے کمرے میں رو رو کر بے حال ہوتی رہی۔ ضیا بابا جان کے کمرے سے باہر نکلا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ جاتے جاتے وہ ڈر اور کوفریں کے پاس آیا۔ ”کیا ہوا فرحین رو کیوں رہی ہو؟“

فرحین اور زور، زور سے رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ گھبرا کر ضیا بانی لانے دوڑا۔ بمشکل اس کے آتسو تھکے۔

”ہاں اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“ اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں مرنے والی ضیا بھائی۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”میں۔۔۔ وہ کیوں؟ اچھا۔۔۔ سمجھا۔۔۔ مگر مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود ہی کیوں نہیں مل لیتیں اس سے؟ اکڑا ہوا ہے۔ دونوں طرف سخت کشیدگی ہے۔ معاملہ سیریس ہے۔ اب جانے کیا ہو۔۔۔ کمو کیا کتنی

کے تالے تھے۔ وہ تو انہیں یہ بھی نہ جانتا کہ یہ منگنی اس نے اپنی مرضی سے نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کا سا بھی انہوں نے چٹا تھا اور اس نے اسے قبول کر لیا تھا۔ ذہنِ دل اور روح کی پوری گہرائیوں کے ساتھ۔

مدھ بھری آنکھیں۔ سانچے میں ڈھلا جسم اور تیکھے تیکھے دل میں اتر جانے والے نقش و نگار جو دیکھنے والے کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتے۔ اسے اپنی قوتِ تسخیر سے اچھی طرح آگاہی تھی۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ اس کی سیاہ زلفوں کے گھنے جنگلوں میں سے واپس جانے کا راستہ بھول جائے اور اس کی جادو نگاہ آنکھوں کے طلسم میں گرفتار ہو جائے۔ جبکہ بابا جان کا فیصلہ اسے یکسر اس کی دنیائے جد اکر رہا تھا۔



”ضیاء رمزی کے پاس آیا تو رمزی بیڈ پر لیٹا ریلوے کا انجن بنام نہ اور تانک سے دھواں اڑا رہا تھا۔ ضیاء سخت جھنجھایا۔“

”یارِ رمزی۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ پیغام رسانی کا واپس کام۔ ادھر سے تم ہٹ لگتے ہو۔ ادھر سے ماموں جان ٹھوکر مارتے ہیں۔ میں غریب تو مارا گیا خواجوا۔ اور ایک وہ صاحبہ ہیں کہ رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ جان دے رہی ہیں۔“

رمزی، جو ضیاء کا غیر دلچسپ بیان بے نیازی سے سن رہا تھا، اٹھ بیٹھا۔

”کون۔ کون صاحبہ؟“

”فرحین اور کون۔ جان دینے پر تلی ہیں۔ وہ تو میں نے سمجھایا کہ ٹھہرو ابھی۔ کیا پتا حالات سدھر جائیں۔“ ضیاء نے مبالغے سے کہا۔

”اچھا۔ فرحین۔“ رمزی سیدھے ہو بیٹھا آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ ”کیا کہتی ہیں وہ محترمہ؟“

”کہتی ہیں۔ زہر بھانک لوں گی مگر رمزی کے علاوہ کسی اور سے۔ ارے وہ تو سنگھیا منگوائے بیٹھی ہیں کہ ادھر منگنی کے جوڑے واپس ہوئے اور ادھر انہوں نے اس دنیا سے ناپا توڑا۔ تجھ سے بانگڑو، ضدی، ہٹ دھرم کے لیے جان دے رہی ہے۔ زیادتی ہے نہیں؟“

”اچھا۔ واقعی؟“ رمزی کو اچنبھا سا ہوا۔ شاید مشرقی وفا کی کانام ہے۔

اور اب اس کے دلی احساسات سے بے خبر بابا جان اس بندھن کو توڑنا چاہ رہے تھے۔ گویا اس کے جسم سے روح نکال لیتا چاہتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ مگر منہ سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ وہ چپکے چپکے روئی اور رو دھو کر خود ہی چپ ہو جاتی۔ کسی کام سے کمرے سے باہر نکلتا پڑتا تو اپنی روئی روئی آنکھوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگتی۔ بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔

عذرا بھائی کو تو اس کی دلی کیفیتوں کا کچھ کچھ اندازہ تھا۔ البتہ ضیاء بھائی کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑنے پر وہ شرمندہ تھی۔

مل بھر کے لیے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ رمزی کو خط لکھ کر اس سے التجا کرے کہ وہ فی الحال بابا جان کی بات مان لیں۔ بعد میں اگر وہ ان کی پسند پر پوری نہ اُترتی تو خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل جائے گی۔ مگر وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

کیا پتا رمزی کا مزاج کیسا ہو؟ اگر وہ اس کے لفظوں کی خوشبو کو محفوظ نہ رکھ سکا تو۔ وہ کسے بابا جان سے نظریں چار کر سکے گی؟ کیا پتا وہ ضدی شخص اس کا خط جا کر سیدھا بابا جان کے سامنے رکھ دے کہ حضرت! صاحبِ زادی تو یہ کہتی ہیں اور آپ ہیں کہ خواجوا اکرے جارہے ہیں۔

نہیں۔ وہ بابا جان کو شرمندہ نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی اس میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ تھا۔

پھر بھی بار بار اسے یہ خیال آتا رہا کہ کسی بھی طرح منتِ ساجت کر کے ہاتھ جوڑے اور ضرورت پڑے تو پاؤں بڑکے رمزی کو روک لے۔ اس طرح ام جان تھا کہ شاید رمزی اسے پسند کر لے۔ آخر اس میں کی کیا تھی۔ گھٹاؤں جیسے سیاہ گھنے، لمبے بال، خوب صورت



”مطلب یہ کہ کیا اتنے براؤ مائنڈ ہیں کہ ہمارا ساتھ دیں۔“

”براؤ مائنڈ تو ہیں۔۔۔“ ضیاء نے ہچکچا کر کہا۔ ”اور ماموں جان کی ضد پر تھوڑا برہم بھی۔ مگر معاملہ ان کی بسن کا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ارادہ کیا ہے تمہارا؟“ ضیاء نے تجسس سے اسے گھورا۔

”یاس۔ یہ فرحین تمہاری ماموں زاد بے تہ۔“ رمزی نے اچانک پوچھا۔ ”کیا یہ تمہارے گھر نہیں آئی جاتی؟“

”ہاں مینیہ میں ایک آدھ بار آ جاتی تھی۔ ممانی یا عذرا ابھابھی کے ساتھ۔“ ضیاء نے خفگی سے کہا۔

”اور میں نے کہا بھی تھا کہ تھوڑا صبر کرو۔ مگر تم تو ہتیلی پر سروس جمانے کو تیار تھے۔ میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے کہ دوڑا ماموں جان کے پاس۔ انتظار کرتے تو میں کسی دن اپنے گھر ہی دکھا دیتا۔ مگر اب تو جب سے یہ سلسلہ چلا ہے۔ اس نے کہیں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔“

”تم نہیں لاسکتے کسی طرح؟“

”نہیں۔۔۔ کیونکہ میں ہی اس معاملے میں پڑا ہوں۔ اصرار کیا تو انہیں شک ہو جائے گا اور میں ماموں جان کے ہاتھوں جاں بحق ہونا نہیں چاہتا۔“ غلطی ہوئی جو تم سے مدد مانگی۔“

”اے کہتے ہیں نیکی کر دینا میں ڈال۔“ ضیاء نے تلملا کر کہا۔

”چھانچھو۔ تم اب اس معاملے سے نکل جاؤ۔ میں خود ہی کچھ سوچ لوں گا۔“

ضیاء منہ بنا تاٹھ کھابوا۔

رمزی کی والدہ کو کوئی خبر نہ تھی کہ صاحب زادے کیا گل کھلا رہے ہیں۔ ندا کے جانے کے بعد کچھ تو پریشانی کی وجہ سے وہ کہیں آ جانہ سکیں۔ پھر ان کی طبیعت بھی نرم گرم رہی۔ فرحین کے گھر سے بھی کوئی نہ آیا تھا جو انہیں حالات کی خبر ہوتی۔ خدا خدا کر کے ان کی طبیعت سنبھلی تو انہوں نے سوچا کہ اب شادی کی تاریخ طے کر لی جائے۔ ندا تقریباً تمام تیاری

”جان کیوں دیتی ہیں؟“ رمزی زیر لب بوڑھلایا۔ ”اپنے ابا کو کیوں نہیں سمجھائیں جو ظالم سماج بنے بیٹھے ہیں۔“

”ماموں جان کو؟“ ضیاء نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ ”وہ تو زندہ گاؤں میں ہے۔“

”ضدی تو میں بھی کچھ کم نہیں۔“ رمزی کے ہونٹ بھینچ گئے۔ ”دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتے۔“

ضیاء جو مبالغہ آمیزی سے رمزی کے جذبہ ہمدردی کو ابھارتا چاہ رہا تھا۔ سر پٹ کر رہ گیا۔

”یاس۔ تم دونوں ہی ظالم ہو۔ ایک ہی مٹی سے بنے۔ ایک معصوم کی جان سے کھیل رہے ہو۔ اب کیا اپنی ضد میں اسے جان سے مار دو گے؟“

”نہیں۔“ رمزی نرم پڑ گیا۔ ”تم ایسا کرو کسی طرح انہیں متفنی توڑنے سے روکے رکھو اور اگر معاملہ حد سے بڑھ جائے تو بے شک کہہ دینا کہ رمزی شرمندہ ہے۔ معافی مانگنے کو تیار ہے۔ میں اتنے میں کچھ سوچتا ہوں۔“

”کیا سوچو گے اب؟“ ضیاء نے پوچھا۔

”بہتر یہ ہے کہ اپنی ضد چھوڑ دو۔ فرحین بہترین لڑکی ہے۔ تم بچتاؤ گے نہیں اور جب وہ مجھ جیسے احسن کو بن دیکھے قبول کر رہی ہے تو تم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟“

”چاہتا تو میں بھی نہیں کہ متفنی ٹوٹے۔ کیونکہ امی جان کو وہ بہت پسند ہے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ بہت اثر لیں گی۔“

ضیاء نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

”تم فکر مت کرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے اس تک سیدھے راستے سے پہنچنا چاہا۔ اب میں کوئی اور طریقہ سوچتا ہوں۔“

”یار! کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔“ ضیاء نے ہاتھ جوڑے۔

رمزی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”چھایا بتاؤ۔ یہ ارسلان حسن کیسے شخص ہیں؟“ ”مطلب؟“ ضیاء نے اسے گھورا۔

ہائی ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔  
 ”ای جان! کیا طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ڈاکٹر کو  
 بلاؤں؟“ وہ — چپ رہیں۔  
 ”کیا بات ہے ای جان! صبح تو آپ کافی بہتر نظر  
 آ رہی تھیں۔“

”مجھے تم سے یہ امید نہ تھی رمزی!“ وہ بمشکل کہہ  
 سکیں۔ رمزی انجان بن گیا۔  
 ”تم نے مجھے ساری دنیا کے سامنے شرمسار  
 کر دیا۔“

یہ کہہ کر وہ اس بری طرح روئیں کہ رمزی کے لیے  
 انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔  
 ”اگر میری کوئی بات بری لگی ہے تو مجھے جو چاہے  
 سزا دیں، الٹا لٹا دیں یا پھاسی چڑھا دیں، جو چاہیں  
 سلوک کریں میرے ساتھ۔ اچھا۔ اسی میں خوش  
 ہیں تو کھڑے کھڑے شادی کر ادیں میری۔“  
 ”تم نے ایسا کیوں کیا رمزی! میں کسی سے آنکھیں  
 چار کرنے کے قابل نہیں رہی۔“

”اف ای جان۔۔۔ آپ نے زرا سی بات کو مسئلہ بنا  
 دیا۔ میں فرحین کو دیکھنا چاہتا تھا اور بس۔ آپ نہیں  
 چاہتیں تو نہ سہی۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے۔  
 ”وہ لوگ رشتہ توڑنا چاہ رہے ہیں۔“

”کیا ان کی طرف سے کوئی پیغام آیا؟“ رمزی  
 چونک رہا۔

”نہیں۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رشتہ توڑنے کی  
 سوچ رہے ہیں۔“  
 ”ایسا نہیں ہو گا ای جان!“ رمزی نے یقین دلایا۔  
 ”اگر انہوں نے رشتہ توڑنا ہوتا تو اب تک توڑ چکے  
 ہوتے۔“

”شاید وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پیا رہے۔ مگر جلد یا  
 بدیر۔۔۔ اگر بھائی صاحب نے کوئی فیصلہ کر لیا تو پھر کچھ  
 نہیں ہو سکے گا۔ تم نے آخر ایسی بچکانہ حرکت کی  
 کیوں؟“

”عطلی ہو گئی۔“ اس نے معصوم سی صورت بنا کر  
 کہا۔ ”آپ جو چاہیں کریں۔ اب میں آپ کے

کر چکی تھی۔ بری کے تمام جوڑے، زیور تیار تھے۔  
 صرف کپڑے سلوانے رہ گئے تھے، تو اس میں کون سا  
 وقت لگتا تھا۔ تاریخ طے ہوتے ہی وہ کپڑے سلنے کو  
 بے دیتیں۔ چنانچہ اپنے طور پر وہ مطمئن تھیں۔

اس دن ان کی طبیعت بہتر تھی۔ سوانہوں نے  
 فرحین کے گھر جانے کا سوچا۔ ابھی وہ تیار ہو رہی تھیں  
 کہ ان کی ایک ملنے والی بیگم وقار آگئیں۔ بیگم وقار کا  
 فرحین کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ اس لیے انہیں حالات  
 کی تھوڑی بہت خبر تھی۔

”کہاں کے ارادے ہیں؟“ انہوں نے انہیں تیار  
 ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ ”فرحین کے لیے دل تڑپ رہا  
 ہے۔ بہت دن ہو گئے بچی کو دیکھے۔ پھر شادی کی تاریخ  
 بھی طے کرنی ہے۔ رمزی کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔  
 پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو گیا۔“ انہوں نے بیگم وقار  
 کے پاس بیٹھے ہوئے کہا۔

”وہ لوگ تو رشتہ توڑنے کو تیار بیٹھے ہیں اور آپ  
 ہیں کہ شادی کی تاریخ لینے جا رہی ہیں۔ حد ہو گئی بے  
 خبری کی۔“ بیگم وقار کالج طنز بہ تھا۔  
 ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ ان کے پاس تلے سے  
 زمین نکل گئی۔

”کچھ غلط نہیں۔ یقین نہ آئے تو خود پوچھ لیں  
 جا کر۔“

”مگر کیوں؟ وہ لوگ تو اتنے خوش۔ اتنی عزت  
 کرتے تھے۔ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہوئی جو رشتہ  
 ٹوٹنے کی نوبت آئی۔“ انہوں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔  
 ”بات تو آپ اپنے صاحب زادے سے پوچھیں۔  
 ویسے یہ میں جانتی ہوں کہ وہ رشتہ توڑنے والے  
 نہیں۔“

”تو کیا رمزی نے کچھ کہا؟“ انہوں نے چونک کر  
 پوچھا۔

جواب میں بیگم وقار نے تمام قصہ ان کے گوش  
 گزار کر دیا۔ وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ  
 گئیں۔ انہیں رمزی سے یہ امید نہ تھی۔  
 رمزی آیا تو وہ منہ سر پینے پڑی تھیں اور ان کا پی

اعجاز حسن بھی نرم پڑ گئے۔ جانتے تھے رمزی اچھا لڑکا ہے۔ ضدی تو ضرور ہے۔ مگر اب خود جھک رہا ہے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ اب آپ آئی ہیں تو۔۔۔ مگر سمجھا دیجئے اس نالائق کو۔۔۔ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے اور جہاں تک تاریخ کی بات ہے تو اگلے ماہ کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ آج انہیں رجب ہے۔ شعبان کی پندرہ تاریخ کیسی رہے گی؟“

”بچے، پہلے منہ میٹھا کریں۔ مبارک ہو، تاریخ طے ہونے کی۔“ بلقیس خاتون نے ان کی طرف گلاب جامن بڑھائے۔

”آپ کو بھی۔۔۔“ نازنین بیگم نے گلاب جامن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر آپ لوگوں کے دل میں کوئی ملال ہے بھی تو نکال دیں۔ میں ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں بہن۔۔۔ شرمندہ نہ کریں۔“ بلقیس خاتون نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”بچہ ہے۔ غیر ملک میں پلا بڑھا ہے۔ اسے یہاں کی روایات کا کیا پتا۔ اور یہ جو آپ اتنے ٹوکرے مٹھائی کے لے آئی ہیں۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟“

”یہ بھی تو ہماری روایات میں ہے۔“ نازنین بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور بہن۔۔۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ ساری رسمیں، دستور کروں گی، مندی، مایوں۔ تیار رہے گا اور اب اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیٹی سے مل لوں۔“

”ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ کیوں نہیں آئیں۔“ بلقیس خاتون انہیں فرحین کے پاس لے گئیں۔ فرحین سے ملتے ہوئے انہوں نے اپنے دس تولے کے ننگن فرحین کی کلائی میں پہنا دیے۔

”ارے۔۔۔ یہ کیا۔ ابھی اس کی کیا ضرورت۔۔۔“

شادی پر آپ جو چاہیں مگر ابھی تو۔۔۔“ بلقیس خاتون نے منع کرنا چاہا۔ مگر نازنین بیگم نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

”یہ بھی ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ ایک قسم کا

معاملات میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔“

”مجھے حوصلہ نہیں پڑ رہا ان سے بات کرنے کا۔“ اسی جان بچکی میں۔

”آپ بات کر کے دیکھیں۔ زیادہ سے زیادہ انکار کر دیں گے، تو ٹھیک ہے، دنیا میں صرف فرحین ہی نہیں۔“

”تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے معاملہ بگڑا ہے۔ اگر بات بن گئی تو میں اسی ماہ کی کوئی تاریخ شادی کی رکھ دوں گی۔“

”جو مرضی آئے کریں۔ میں نے کہا، میں آپ کے معاملات میں کوئی دخل نہ دوں گا۔“

رمزی نے سر جھکا کر کہا۔ اسی جان نے رمزی کی پیشانی چوم لی۔

”بتا! کہ مجھے فرحین کا ساتھ منظور ہے کہ نہیں؟“

”سو بار منظور ہے۔ ہزار بار منظور ہے۔ بس آپ ناراض نہ ہوں اور یوں ہی خوش خوش رہا کریں، اچھا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر میں بات کرتی ہوں فرحین کی اسی سے۔ دیکھتی ہوں، کیا کہتے ہیں وہ۔“ اسی جان نے کچھ سوچ کر کہا۔ رمزی سر جھکا کر رہ گیا۔



نازنین بیگم اب اس معاملے کو زیادہ التوا میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ وہ اسی شام بیگم وقار کے ساتھ فرحین کے گھر پہنچ گئیں۔

گلے، شکوے ہوئے، ناراضی، غصہ، بے اعتنائی۔ اعجاز حسن پہلے تو جھٹے سے اکھڑنے لگے۔ مگر نازنین بیگم نے سارا قصور رمزی کا مان کا معاملہ سنبھال لیا۔ نرمی سے کہا۔

”بے شک ساری غلطی رمزی کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی خواہش کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ ہر ایک کو اپنی منسوبہ کو دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ مگر اب اپنی فرمائش شرمندہ ہے۔ بے شک آپ اسے دو جوتے لگائیں۔ میں انہیں بھی نہیں کروں گی۔“



لے چار پیسے نہ خرچ کر سکو۔ مگر یا۔۔۔ وقت کم ہے۔  
بتاؤ کیا کیا جائے؟“

”بہتر تو یہ ہے کہ اپنی ضد چھوڑو اور چپ چاپ سہرا  
باندھ لو۔ شریف بچوں کی طرح۔“

”تو گویا اب تم کوئی مدد نہیں کرو گے؟“ رمزی نے  
کہا۔

”نہیں۔“ ضیاء نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ہو نہ۔“ رمزی نے منہ دوسری طرف کر لیا۔



رمزی گھر آکر بھی اسی سوچ میں ڈوبا رہا کہ ایسا کیا  
کرے کہ فرحین کو بھی دیکھ سکے اور بات بھی نہ  
بگڑے۔ دو دن اسی سوچ میں غطال رہا۔ مگر کچھ سمجھ  
میں نہ آیا۔ ناچار تنگ آکر ضیا کو فون کیا۔

”یا۔۔۔ میں اتنی مشکل میں پڑا ہوں اور تم ہو کہ نہ  
فون کیا نہ خود آئے اور وقت ہے کہ بھاگا جا رہا ہے۔“

”اپنی ضد چھوڑ دو۔ ساری مشکلیں آسان  
ہو جائیں گی۔ اور جہاں تک میرے آنے کا تعلق

ہے تو یا۔۔۔ میں ڈیڑ بزی ہوں۔ ارسلان کو حیدر آباد  
جانا پڑ گیا ہے اور ماموں جان نے ان کے حصے کا سارا کام

میرے ذمے لگا دیا ہے۔ ابھی ماموں جان کے ساتھ  
میں ہال بیک کروا لے گیا تھا اس کے بعد فرنیچر والے

کے پاس۔۔۔ تم جانتے تو ہو شادی والے گھر میں کتنے کام  
ہوتے ہیں۔“

”ہال۔۔۔ ہاں پتا ہے سب۔۔۔ مگر یہ ارسلان  
حیدر آباد کیوں گئے؟ خیریت تو ہے۔“ کسی فوری خیال

کے تحت رمزی نے پوچھا۔  
”کمپنی کے کام سے گئے ہیں۔ چھ سات دنوں کے

لیے۔ پھر آگے بھی پھٹیاں لینی تھیں شادی کے لیے۔  
اس لیے ضروری تھا۔“

”سو طے ہوا۔۔۔ تم میرے کسی کام کے نہیں۔ کیا  
نائدہ ایسی دوستی کا۔“ رمزی نے جل کر فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ کیا ہو، اگر وہ ارسلان کا  
دوست بن کر فرحین کے گھر پہنچ جائے تو؟

شکں۔۔۔ تاریخ طے ہونے پر بہو کو خاندانی نکلن  
پہنانا۔ اور فرحین اسے اب شادی تک ہاتھ سے نہ  
انارنا۔ اچھا۔۔۔“

انہوں نے فرحین کو پیار کیا اور خوش خوش تاریخ  
طے کر کے گھر آ گئیں۔ رمزی کو ساری بات مناسب

لفظوں میں بتا کر سمجھا کہ اب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت  
نہ کرے۔ رمزی کی یقین دہانی پر وہ مطمئن ہو کر شادی

کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔



رمزی نے ماں کو تو مطمئن کر دیا مگر دل میں ٹھان لیا  
کہ اپنی ضد پوری کر کے رہے گا۔ مگر جب اس مسئلے کا

کوئی حل سمجھ میں نہ آیا تو پریشان ساضیا کی طرف چل  
دیا۔

”یا ر رمزی! وہ سالگرہ والی اسکیم تو ناکام ہو گئی۔“  
”اس۔۔۔ وہ کیوں۔۔۔ ابھی تو سالگرہ آئی نہیں۔ اور

اسکیم پہلے ہی ناکام۔“ رمزی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔  
”ہاں۔۔۔ وہ ماموں جان سے باتوں باتوں میں بیلو کی

سالگرہ کا ذکر کیا کہ میرے بیلو کی پہلی خوشی ہے۔ سب  
کو آنا ہو گا۔ مع فرحین کے۔ ماموں جان چونک پڑے

کہ آج تک تو سالگرہ منائی نہیں۔ پھر اچانک یہ خیال  
کیسے؟ میں نے کہا۔ ماموں جان۔۔۔ کیا کروں فضا کی ضد

ہے۔ بیلو تین سال کا ہو رہا ہے۔ تھوڑا ہلکا ہو جائے  
تو کیا حرج ہے؟ کہا۔ ”حرج تو کوئی نہیں۔ پر میاں۔۔۔ یہ

خاص طور پر فرحین کیوں؟ وہ شادی تک اب گھر سے  
نہیں نکل سکتی۔۔۔ سمجھے۔ ہاں۔۔۔ ہمیں آنے میں

کوئی اعتراض نہیں۔“ ضیاء نے منہ لٹکا کر ساری بات  
کہہ سنائی۔

”خوب۔“ رمزی نے قہقہہ لگایا۔ ”لگتا ہے  
تمہارے ماموں جان کو شک ہو گیا۔ جانتے ہیں کہ تم

میرے دوست ہو۔ اسی لیے منع کر دیا۔“  
”تو اور کیا۔“ ضیاء نے منہ بنایا۔ ”اب خوا مخواہ کا

خرچ آ رہا مجھ غریب پر۔“  
”خیر۔۔۔ اتنے غریب بھی نہیں ہو کہ اپنے بیٹے کے

پردہ گرفتہ سے ملنے تو اعجاز حسن پر نظر پڑی۔ جو چل قدمی کے سے انداز میں گیٹ کی طرف آ رہے تھے۔  
بریف کیس دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے رمزی ست قدموں سے آگے بڑھا اور بہت مودب ہو کر سلام کیا۔

”میاں۔۔۔ کس سے ملنا ہے۔۔۔ کہاں سے آئے ہو؟“ چھڑی کو گھماتے ہوئے وہ رک گئے اور بغور سر سے پاؤں تک انہیں دیکھا۔

”گلیا بتائیں صاحب۔ یہاں اپنا جگہ یا رہتا ہے ارسلان۔۔۔ اس سے ملنے آئے تھے بہاول پور سے۔۔۔ سر پر انزدین کے چکر میں بغیر اطلاع کے آگئے۔ مگر وہ یہاں نہیں ہے۔“

”اور اب کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے چھڑی زمین پر بارے ہوئے پوچھا۔

”ہو مل جانے کے سوا اور کہاں جاسکتے ہیں محترم! وہاں ٹھہر کر ارسلان کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اب ملے بغیر تو ہم جانے والے نہیں۔“ رمزی نے قدرے بے زاری سے کہا۔

”میاں! ارسلان یہاں نہیں ہے۔ مگر اس کا گھر تو یہیں ہے۔ اب آہی گئے ہو تو بیٹھو۔ چائے پلے پی کر کھانا کھا کر جانا۔“

”مگر آپ۔۔۔“ رمزی نے الجھے ہوئے انداز میں انہیں دیکھا۔

”میں ارسلان کا والد ہوں۔“

”خافہ۔ تو آپ ہیں ارسلان کے والد۔۔۔“ رمزی نے نہایت تباہی سے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔  
”کس قدر اشتیاق تھا مجھے آپ سے ملنے کا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ارسلان آپ کی اتنی تعریفیں کرتا تھا کہ حد نہیں۔ بہت عظیم ہیں آپ انکل۔ بہت گریٹ۔“

رمزی نے لپک کر ان کے ہاتھ چوم لیے۔

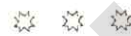
”اچھا۔۔۔“ انہوں نے قدرے تعجب سے رمزی کے عقیدت بھرے انداز کو دیکھا۔

”جی ہاں۔۔۔ آپ کی محبت و شفقت کا ذکر سن کر

جب کوئی بہتر ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو ناچار رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔

نازنین بیگم کو جا کر بتایا کہ اسے کسی دوست سے ملنے بہاول پور جانا ہے۔ دو دن کے لیے ہوا ضروری۔۔۔ نازنین بیگم نے بادل خواستہ جانے کی اجازت دے دی۔

رمزی نے بریف کیس میں ضروری سامان رکھا۔ اہی جان کو خدا حافظ کہا اور ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں جا کر کمر ایک کر لیا۔



رمزی نے کوئی لمبا چوڑا اہتمام نہ کیا۔ صرف ایک چھوٹی سی فریج کت واٹھی لگائی۔ سیاہ شیشوں والا چشمہ لگایا اور فرحین کے دروازے پر جا بیٹھے۔

ایک بل کے لیے رک کر دروازے پر نظر ڈالی پھر تیل کے بین پر انگلی رکھ دی۔

”جی فرمائیے۔۔۔ کس سے ملنا ہے؟“ تھوڑا سا دروازہ کھول کر پوچھا گیا۔

رمزی کے تمام حواس بیدار ہو گئے۔ بے حد چونکا ہو کر آٹھویں پوری کھول کر نظریں دروازے پر جما دیں۔ مگر جو کوئی بھی تھا دروازے کی اوٹ میں تھا۔

”ہم جی۔۔۔ دلدار حسین ہیں۔۔۔ بہاول پور سے آئے ہیں۔ ارسلان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”وہ تو یہاں نہیں ہیں۔“ اجڈ، تنوار، روکھا لہجہ۔  
فرحین تو نہیں ہو سکتی۔ شاید کوئی ملازم۔۔۔ رمزی نے اندازہ لگایا۔

”کہاں گئے۔۔۔ ہم تو اتنی دور سے آئے ہیں ملنے۔ کیا پتا تھا کہ۔۔۔“

”وہ تو حیدر آباد گئے ہیں۔ دو دن بعد لوٹیں گے۔“ غلٹ بھرا انداز۔۔۔ جیسے بات سننے کی بھی فرصت نہ ہو اور دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

رمزی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ خواہ مخواہ ہی اتنا تردد کیا۔ لہجہ بھر حسرت سے بند دروازے کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی ناکامی

میں نادیدہ آپ کا مشتاق ہوا گیا۔ سوچتا تھا جب بھی اس طرف سے گزرا آپ سے ضرور ملوں گا۔ سو آج یہ سعادت نصیب ہوئی۔ ”رمزی نے بے حد نیاز مندی سے کہا۔

”جھامیاں۔ اندر تو چلو۔“ وہ کچھ متاثر سے ہونے لگے۔

تیل پر دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ ”برکت۔ بی بی سے کو، ارسلان کے دوست آئے ہیں۔ اچھی سی چائے بھجوا دیں اور ہاں کھانے کا انتظام بھی کر لیں، یہ کھانا کھا کر جائیں گے۔“ انہوں نے ملازمہ سے کہا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ کھانے کا تکلف رہنے دیں۔ چائے البتہ ہم پی لیں گے۔“ رمزی نے جلدی سے کہا۔

”تکلف تو میاں تم کر رہے ہو۔ اتنی دور سے آئے ہو۔ کھانے کے بغیر تو جانے نہ دیں گے۔“ اعجاز حسن نے اقرار کیا۔

”دراسن! ہمیں ایک اور دوست سے بھی ملنے جانا ہے۔ اس لیے پلیر آپ۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ کھانے کے بعد چلے جانا۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔

رمزی جب ہو گیا۔ کیا پتا اس اثنا میں فرحین کو دیکھنے کی کوئی حقیقت نکل آئے۔

تھوڑی دیر بعد پُر تکلف سی چائے آئی۔ چائے کے دوران رمزی کچھ سچ، کچھ جھوٹ ملا کر باتیں کرتا رہا۔

تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اعجاز حسن نے معذرت کر کے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔ چائے پیتے ہوئے رمزی کا سارا دھیان ادھر ہو گیا۔ اعجاز حسن غم رہے تھے۔

”تم پہنچو تو کھانا اکٹھے کھاتے ہیں اور سنو! تمہارا ایک دوست بھی یہاں تمہارا منتظر ہے۔ ولد ار حین۔“ رمزی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کون ولد ار؟ اوے بھی، یہ خود بات کرلو۔“ انہوں نے ریسیور رمزی کی طرف برسیایا۔

”یہ لو بھی۔ فون ہے ارسلان کا۔ پہنچ رہا ہے۔“ چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے رمزی کو بڑے زور کا اچھو لگا۔

ادھر اعجاز حسن کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اٹھاتے اٹھاتے کال کٹ چکی تھی۔

”اوہ لائن کٹ گئی۔ مگر پہنچ رہا ہے ابھی تھوڑی دیر میں۔ یہیں سے فون کیا تھا۔ آفس سے ہو کر آنا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”جی۔ جی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ رمزی نے قدرے ہکھلاتے ہوئے کہا۔

”برا ہوا۔ اب تو گئے جان سے۔ یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت، کوئی طریقہ۔ کیسے جان چھڑائیں؟“ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ آن کیا تو چمکتی اسکرین پر ضیا کا نام جگمگا رہا تھا۔

”وہ پیلو۔ ہاں سہیل۔ پہنچ رہا ہوں، ابھی گھنٹہ ڈیڑھ میں۔“ رمزی نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

”اس۔ کیا بک رہے ہو۔ میں ضیا ہوں۔ سہیل نہیں۔“ ضیائے اچھے سے کہا۔

”کیا؟ تمہارے والد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا؟ اسپتال میں ہو۔ کون سے اسپتال؟“ رمزی اپنی ہی بانگ رہا تھا۔

”کون ہو تم؟ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ اور یہ رمزی کہاں ہے؟“ ضیائے اب کے بدلی ہوئی آواز پر غور کیا۔

”فکر نہ کرو سہیل۔ ابھی پہنچ رہا ہوں، منٹوں میں۔“ اس نے چھٹ کر بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ارے کھانا تو کھا کر جاؤ۔ اعجاز حسن نے روکا۔

”نہیں۔ نہیں۔ سہیل بہت پریشان ہے۔ اس کے والد کا ایکسیڈنٹ۔ پھر آؤں گا۔ ارسلان کو میرا سلام۔“

اعجاز حسن ارے ارے کرتے رہ گئے اور وہ آدمی ادھوری بات کرتے ہوا کے گھوڑے پر سوار باہر نکل



”آپ سے مطلب؟“ رمزی نے ناراضی سے کہا۔  
”یار تھا نہ ہو۔ میرے بس میں ہو تا تو ضرور کچھ کرتا۔“

رمزی جانتا تھا کہ ضیا کے اختیار میں کچھ نہیں۔  
پھر بھی تھوڑے خرے، غصے، ناراضی دکھائی۔ فون بند  
کیا تو ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وقت تھا کہ اڑا  
جا رہا تھا۔ اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تھی۔  
جب کچھ نہ سوجھا تو غصہ غالب آنے لگا۔ موبائل  
ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔ بے اختیار فرحین کے گھر کا نمبر  
ملا دیا۔ ہاسوچے سمجھے۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف کسی لڑکی کی آواز تھی۔  
”کون فرحین؟“ رمزی نے باریک لڑکیوں والی آواز  
میں پوچھا۔

”جی۔ میں فرحین۔ مگر آپ کون؟“ نرم۔ ملائم  
آواز۔ شائستہ لہجہ۔

”مم۔ رمیز حسن۔ کدے دیتے ہیں۔ جب تک  
دیکھ نہ لیں گے۔ شادی نہ کریں گے۔ عین نکاح  
کے وقت انکار کر دیں گے۔ ہاں۔ اپنی ہٹ سے ہٹنے  
والے نہیں۔“ آپ کے رمزی نے اپنی اصل آواز میں  
کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

فرحین ہکا بکا۔ بھوکھا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ منہ  
سے آواز تک نہ نکلی۔

”یہ کیا۔ کیا واقعی یہ رمیز تھے۔ اور اگر وہی تھے  
تو۔ کیا ابھرے بالک کی طرح ضد کے جارہے ہیں۔“  
اسے ہنسی آئی۔ ساتھ ہی منتظر ہو گئی۔ اگر سچ  
انہوں نے۔ مگر شرفا میں کب ایسا ہوتا ہے؟ پھر ان کی

امی کی یقین دہانی، شرافت اور رکھ رکھاؤ۔ ایسے  
گھرانے بات پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ وہ کیا  
اپنے بیٹے کو ایسا کرنے دیں گی؟  
خدا شات، واسے پریشانی۔ مگر آخر فیصلہ کیا۔ کچھ  
بھی ہو۔ کسی کوتاہی کی نہیں۔ آگے میری قسمت  
جو ہو سو ہو۔

رمزی فون کر کے مطمئن ہو گیا، اچھا ہے، ذرا وہ بھی  
تو تڑپے، جلے۔ اکیلا میں ہی کیوں؟

گیا۔ دروازے کے پاس پاؤں رکھا۔ گرتے گرتے پھا۔  
مگر بیل بھر رکنے کی زحمت نہ کی۔ فوراً رکشا کیا اور  
ہوٹل پہنچ کر ہی دم لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ضیا کا دوبارہ فون آگیا۔  
”کمال ہو بھی؟ اور یہ تمہارا سیل کس کے پاس  
تھا۔ عجیب اونگٹی بوٹی مار رہا تھا حق۔“  
”ہاں وہ۔ ہے ایک جاننے والا، مخوف ہے بالکل۔  
مذاق کر رہا ہو گا۔“ رمزی نے بات بتائی۔ وہ ابھی اسے  
بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”عجیب بے تکا انسان تھا۔ خیر کمال تک پہنچیں  
شادی کی تیاریاں۔ مجھے تو ماموں جان نے کچھ اس  
طرح مصروف کر دیا ہے کہ حد نہیں۔ ارسلان آئے  
تو کچھ فرصت ملے۔“

”ارسلان تو۔“ رمزی نے بمشکل بات دہائی۔

”اور ہاں۔ یہ کون سا دوست ہے تمہارا بہاول پور  
میں جسے میں نہیں جانتا۔ آئی تیار رہی تھیں کہ تم  
بہاول پور۔“

”ہاں ادھر ہی ہوں۔ اور ضروری نہیں کہ تمہیں  
ساری خبریں ہوں۔ کو لیگ تھا میرا لندن میں۔ ان  
دنوں ہالینڈ میں ہے۔ شادی کے لیے آیا ہے تو جانا  
ضروری تھا۔“ رمزی نے فی الحال ضیا کو اپنی ناکامی کی  
داستان سنانی مناسب نہ سمجھی کہ جب ملاقات ہوگی تو  
دیکھا جائے گا۔

”شکر ہے تم نے فرحین کو دیکھنے کی ضد چھوڑی۔  
بلاوجہ کی منشن۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے  
بھی۔“ ضیا کو خیال آیا۔

”اوں ہوں۔ ضد چھوڑنے والے نہیں ہم۔ مرد  
بچے ہیں۔ فرحین کو دیکھ کر رہیں گے۔“ رمزی نے  
ڈینگ ماری۔ خود بھی جانتا تھا۔ کہ ممکن نہیں۔ بری  
طرح مایوس تھا۔ ناامید۔ بے آس۔ مگر دعویٰ  
کرنے میں کیا حرج تھا۔

”اب تو ہفتہ دس دن رہ گئے ماموں مہندی کی رسم  
میں۔ پھر نکاح اور رخصتی۔ کیا کر لو گے اتنے دنوں  
میں۔“

بل بھر کے لیے خیال نہ آیا کہ اگر انکار ہو گیا تو کیا ہو گا۔ کسے مال کو سنبھالے گا۔

اپنے کئے پہ خوش خوش رمزی گھر آیا تو نازنین بیگم منتظر بیٹھی تھیں۔ کتنی ہی کام رکے پڑے تھے۔

بے دلی سے سوچ منہ کے ساتھ سارے کام نپٹاتا رہا۔ مگر دل میں گانٹھ سی پڑی تھی۔ ایک کسک سی کہ جو کہا تھا پورا نہ کر سکا۔ جذبات میں اگر جو حرکت کر بیٹھا تھا۔ اس پر بچھتاؤا بھی تھا۔ سوچتا کیا حماقت کی۔ اگر فرحین نے گھر میں بتا دیا تو سمجھو شادی کی ساری تیا ریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ صاف انکار۔ اور ایسا تو وہ قطعاً نہ چاہتا تھا۔ اسی جان بے انتہا خوش تھیں۔ اور ان کی خوشیوں کو آگ لگانا اسے کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا تھا۔ مگر جب دوسری طرف خاموشی رہی تو سکون سا ہوا۔ یقین ہو گیا کہ فرحین نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ شاید مذاق سمجھا ہو۔ بڑولان۔ یاد دلاوے کا خواب۔

پھر ضیا آگیا تو تھوڑا سا دل بہل گیا۔ مگر ضیا نے رمزی کی بے زاری۔ آکٹا ہٹ۔ بے دلی صاف محسوس کی۔ چہرے پر وہ رونق نہ تھی جو ہمیشہ نظر آتی تھی۔

”کیوں۔۔۔ دولہا میاں اتنے اکھڑے اکھڑے سے کیوں ہو؟“ ضیا نے بغور اسے دیکھا۔

”تو کیا بھگتڑے ڈالوں۔۔۔ ملی چڑھا رہے ہیں۔ قربانی کا بکرا۔۔۔ کولہو کا تیل۔۔۔ آنکھوں۔۔۔ ٹوٹ چڑھا دیا ہے۔ کہ لوگ گھومتے رہو آنکھیں بند کر گئے۔ اور میں احقر بے وقوف گدھا۔۔۔ بھاگا چلا آیا وہاں سے۔۔۔ مال کی آرزو۔ شادی کی خواہش۔۔۔“ رمزی بھرا بیٹھا تھا۔ ضیا نے ذرا سا چھیزا تو پھٹ پڑا۔

”وہیں شادی رچا لیتا۔ اپنی مرضی سے تو اچھا تھا۔ اس طرح آنکھیں باندھ کر تو کنوس میں نہ پھینکتے۔ اور جو کنواں پھاندنا ہی پڑتا۔ تو کم از کم اپنی مرضی سے آنکھیں کھول کر چھلانگ لگاتے۔ کسی سے گلہ تو نہ ہوتا۔“ ضیا منہ کھولے حق دق دیکھتا رہ گیا۔

”اتنی بے زاری۔ خفگی۔ غصہ۔ اور اپنے

پارے میں ایسی گل افشانی۔ یہ تیل منڈھے چڑھ بھی گئی تو کیا ہو گا اس کا انجام۔“

اندر سے بے حد منتظر۔ مگر نظا ہر ہلکے پھلکے انداز میں اس نے سمجھایا۔

”چھوڑو پار۔۔۔ اب ان باتوں کو۔۔۔ کل مہندی ہے اور وہ تمہاری فرحین جائے گی۔ بیوی پار لرتیا رہوئے۔ تو تم کیا یوں ہی چل پڑو گے؟ جانے دوساری ناراضی۔ اور چلو ذرا میرے ساتھ۔“

”ہیں۔۔۔ بیوی پار لے۔“ رمزی نے چونک کر کہا۔

”ویسے تو بڑے روایت پسند بنتے ہیں۔ پھر تھوپ لیتے میک اپ خود ہی۔ اور کون سے بیوی پار لے؟ کیا تمہارے ساتھ۔“

”نہیں۔۔۔ ارسلان آگیا ہے تو اسی کے ساتھ۔۔۔ دھنک بیوی پار لے۔ اور تم کوئی الٹی پٹی مت سوچو۔ شادی بالکل تیار ہے۔ اب راضی برضا ہو جاؤ۔ ویسے بھی ارسلان تمہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ جا کر بیوی پار لے کے دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔“

ضیا جیسے اس کے دل کی بات سمجھ رہا تھا۔

رمزی سوچ میں ڈوب گئے۔

”من بھی رہے ہو یا نہیں؟ اب سب بے کار ہے رمزی میاں۔“ ضیا نے جیسے تھک کر کہا۔

”ہاں جانتا ہوں۔ سب کچھ۔ اور میں ایسے ہی جاؤں گا نکاح میں بھی۔ اور بات میں بھی۔ بغیر تیار ہوئے اور کوئی مجھے مجبور کر کے تو نہ کہے۔“

رمزی مایوس بھی تھا، ناراض بھی اور مشتعل بھی۔ کسی ضدی بچے کا سالانہ۔ ہٹ دھرمی۔ ضیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے پار۔ تم تو اچھے بھلے سمجھ دار ہو۔“ وہ دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔



اگلے دن پہلے تو دھنک بیوی پار لفون کر کے معلوم کیا کہ فرحین کب تک فارغ ہوئی۔ پار لفون والی نے ٹائم بتا دیا۔ رمزی وقت سے کچھ پہلے گیا اور بیوی پار لے کے





دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

وہ ہی پرانا گیٹ اپ، فریج کٹ داڑھی، سیاہ گاگنز، کرتا پاجاما اور بے نیاز ساندانس۔ کچھ در بعد ارسلان کی گاڑی آکر رکی تو وہ ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ارسلان بھائی گاڑی سے باہر نکلے۔ وہ موبائل کانوں سے لگائے بات کر رہے تھے۔ رمزی آہستہ آہستہ پارلر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”ہاں۔۔۔ میں پہنچ گیا ہوں۔۔۔ کتنی دیر ہے؟“ ارسلان کہہ رہے تھے۔

”اچھا۔۔۔ گیٹ کے پاس ہو۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ میں یہیں ہوں۔“ وہ غالباً ”فرحین سے بات کر رہے تھے۔ رمزی نے ارسلان کی بات سنی تو گیٹ پر نظریں جمادیں۔

لڑکیوں کے ہنسنے، کھلکھلانے اور باتوں کی آواز کے ساتھ گیٹ بڑی تیزی سے کھلا۔ سرخ جوڑے میں بلبوس ہنسرے میک اپ اور بھرے نقوش والی چھلاوا سی لڑکی بڑی غلٹ میں باہر نکلی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر بے تحفے بیل کی طرح رمزی سے ٹکرائی۔ ارسلان کپاس جا کھڑی ہوئی۔

رمزی جو ہونفوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ گرتے گرتے پچالے گاگنز زمین پر گر گئے۔ اٹھانے کے لیے جھکا تو کانوں میں ارسلان کی آواز آئی۔

”دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔۔۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔۔۔ اس طرف۔۔۔“ رمزی جھکا کا جھکا رہ گیا۔

”اے۔۔۔ تو یہ تھی وہ چپا کلی جو امی نے پسند کی۔۔۔ اپنے اتنے ہونہار، خوب صورت، شہزادوں جیسے بیٹے کے لیے۔“ وہ سخت شاک میں آ گیا۔

بمشکل گاگنز اٹھا کر سیدھا ہوا تو محسوس ہوا کہ جیسے داڑھی اپنی جگہ سے اکھڑ رہی ہے۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو واقعی داڑھی ایک طرف سے اکھڑ گئی تھی۔ گھبرا کر چپکانا چاہی۔ ساتھ ہی ارسلان کو دیکھا کہ وہ تو متوجہ نہیں۔

وہ سیل کانوں سے لگائے بڑے مصروف سے انداز میں کسی سے بات کر رہے تھے۔

اس کے پاس اس چھلاوا لڑکی کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جس نے سر سے پاؤں تک آف وائٹ چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چادر ٹھیک کرنے کے لیے لڑکی نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کی کلائی میں سنہری کنکین چمکے۔

”اے۔۔۔ یہ تو ہمارے خاندانی کنکین ہیں، جو امی جان ہمیشہ پہنے رکھتی تھیں۔۔۔ تو کیا یہ۔۔۔؟“

وہ آنکھیں پھاڑے آف وائٹ چادر والی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا چہرہ مکمل طور پر چادر سے ڈھکا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

”تو گویا ساری تنگ و دو لا حاصل۔“ رمزی نے مایوسی سے سوچا۔ تب ہی چادر ٹھیک کرتے کرتے لڑکی کی نظر رمزی پر پڑی۔

رمزی کو اپنی حالت کا احساس ہوا۔ سٹپا کر اس نے اپنی اکھڑی داڑھی پر ہاتھ رکھ لیا مگر نظریں لڑکی پر ہی جمی رہیں۔

لڑکی کی آنکھوں کا تاثر۔۔۔ کچھ ناقابل فہم سا۔۔۔ حیرت۔۔۔ بے یقینی۔۔۔ ششاسانی۔

چادر ٹھیک کرتے کرتے اس کے ہاتھوں سے چادر کا پلو گر گیا۔ اور چہرے پر نقاب ہو گیا۔ رمزی کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندھی۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سنہری دمکتی رنگت، مسکراتے لب، سحر آگیں آنکھیں یعنی کہ۔۔۔ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا نہ چلا میں کی مکمل تفسیر۔

پل بھر کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے پلو چہرے کے گرد لپیٹ لیا۔ کنکین ایک بار پھر چمکے۔ زور سے چمکے۔ لڑکی نے کچھ کہتی، بولتی، مسکراتی، عہدیدہی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اور مڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلی گئی تو تب بتا رمزی جیسے کسی حیرت اثر سے باہر آیا۔

یہ تو جیج چپا کلی تھی۔ مڑی ہوئی گھنی پلکوں والی خوب صورت سیاہ آنکھیں، سیدھی اس کے دل میں ترازو ہو گئی تھیں۔



رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ دنوں سے مضطرب دل میں سکون سا اتر آیا۔ بے حد مطمئن اور خوش خوش وہ واپس لوٹا۔



ہندی اور نکاح کا فنکشن ایک دن تھا۔ ضیا کو ڈر تھا کہ یوں ہی سر جھانٹتا ہوا چلا آتا۔

مگر رمزی کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ رمزی تک سک سے درست پوری آن بان کے ساتھ نکاح کے لیے آیا۔ یہ ہی نہیں نکاح کے بعد دوستوں کے ساتھ مل کر بھنگو بھی ڈالنے، ضیا ششدر اسے دیکھتا رہا۔ دل میں کھد کھد سی لگی تھی۔ کہاں تو منہ پھلے پھرتا تھا۔ اور کہاں بھنگو ڈالے جا رہے ہیں اور دانت ہیں کہ اندر ہی نہیں جارہے۔ موقع نہ ملا اور رمزی بھی منہ سے کچھ نہ بھولا۔

بارت والے دن کام دار کالر اور کف والی سیاہ شیر والی اور آف وائٹ کلاہ پہنے شہزادوں کی سی شان سے چھ گھوڑوں والی کبھی سے اترے۔

دودھ پلائی اور سلائی کے وقت رمزی کی شگفتگی، برجستگی اور بذلہ سنجی عروج پر تھی۔

ہر کوئی فرحین کے مقدر پر رشک کر رہا تھا۔ ایسا خوبو املا تعلیم یافتہ اور اتنا خوش مزاج دولہا۔

جبکہ فرحین کو دیکھ کر رمزی کو اپنی خوش بختی پر کوئی شک نہ رہا تھا۔ گلاب کی پتیوں اور دودھ سے گندھی خوشبوؤں سے مہکتی، سحر انگیز آنکھوں پر پلکوں کی چلن کرائے وہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے رخصتی بھی جلدی ہو گئی۔

رات گئے رمزی اپنے کمرے میں آیا تو گلاب اور موتیا کی ملی جلی خوشبو کے ساتھ کسی انتہائی سی مدہوش کن ممک نے استقبال کیا۔ پھولوں کی لڑیوں کو ہٹا کر اس کے قریب بیٹھا تو اس کے بے داغ حسن کو دیکھ کر مبسوت رہ گیا۔ آنکھیں تو جیسے پھپھکتا بھول گئیں۔ حالانکہ اسٹیج پر رسومات کے دوران اور فوٹو گرافی کے وقت بھی چوری چوری دیکھتا رہا تھا۔ مگر یوں اپنے خوبو

اتنے نزدیک سے دیکھنا۔ اور پھر تاب لانا، کاردار رہا۔ وہ رمزی کی محویت پر ذرا سا کسمسالی۔ کنگن ہلکے سے بچے تو رمزی جیسے ہوش میں آیا۔ کلائی میں پڑے کنگنوں کو دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خوب صورت، نازک، ملائم، ہندی سے سجے ہاتھ کو بڑی نرمی سے تھام کر ہیرے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ پھر متبسم نگاہوں سے فرحین کو دیکھا۔

”اور اگر ہم نکاح کے وقت انکار کر دیتے تو؟“ رمزی کے لہجے میں شرارت تھی۔ فرحین کے لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں۔

”اور اگر ہم چرے سے پلو نہ گراتے تو؟“ مدھ بھری سحر آئیں آنکھیں رمزی کی خمار آلود نگاہوں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ اسے نہ دیکھ پاتے تو کیا سچ انکار کر دیتے؟

وہ جتنا جانتی تھی کہ اس نے تو ان کے چرے کے

علامہ عثمان ڈاکٹر کی طرف سے لکھی گئی کہ

شیریں کے لیے

نور محمد عثمان



منگوانے کا ہفتہ

قیمت - 550 روپے

فون نمبر:  
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی

ہے۔ یہ آج کے بچے ہیں۔ اڑ جانے والے، ڈٹ جانے والے، اپنی منوانے والے اور نہ ماننے کی صورت میں جان سے گزر جانے والے۔ ان کی مانی پڑتی ہے رمیز حسن صاحب ”فرحین نے بھرپور طریقے سے بیٹے کی وکالت کی۔

رمیز حسن نے قائل ہو جانے والے انداز میں اپنی رفیقہ حیات کو دیکھا۔ جو حسین ہی نہیں معاملہ قسم اور ذہن بھی تھیں۔

”اور اگر ہم بھی اڑ جاتے، ڈٹ جاتے، انکار کر دیتے تو۔۔۔“ نرم نرم سی مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ شاید وہ ابھی پوری طرح ماضی کے اثر سے باہر نہ نکلے تھے۔

”تو۔۔۔“

فرحین نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا اور ایک گہری طمانیت کا احساس انہیں سرشار کر گیا۔

”تو ہم بھی مرجاتے، مٹ جاتے، فنا ہو جاتے۔“ وہ کہنا چاہتی تھیں مگر کوئی بھولی بھری یاد ان کے ذہن سے نکلانی۔ مدتوں پہلے کا کہا ہوا جملہ۔

”اگر آپ ہمارے مقدر میں تھے تو آپ انکار کیسے کرتے؟“

گزرے ہوئے کسی خوب صورت لمحے نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ رمیز حسن نے تہنیت لگایا۔

”ہم نے تو آپ کی بات رکھی تھی۔ سوچا تھا احسان کر دیں جناب پر۔“

”بہت شکریہ۔ احسان مند تو ہم آج تک ہیں آپ کے۔“ رمیز حسن نے تھوڑا جھک کر کہا۔

دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونجے۔

ماضی کی خوش گوار یادوں نے ان کے چہروں کو ہی نہیں سارے ماحول کو روشن کر دیا تھا اور گزری حقائق پر بیٹے مسکراتے وہ بھول گئے کہ کچھ دیر پہلے ماحول میں کتنا تاؤ تھا۔

ایک نقش کو اذیر کر لیا تھا۔ ان کی تصویر ساری ساری رات اس کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ تب ہی تو ان پر نظر پڑتے ہی اس نے ان کی روشن چراخوں جیسی فروزاں آنکھوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ رمزی جیسی فروزاں آنکھیں بھلا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں؟ بل بھر کے لیے اس نے تخیل سے سوچا۔ مگر اگلے ہی لمحے رمزی کو سٹپٹاتے اور اکھڑی ہوئی داڑھی پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر سب سمجھ گئی۔ سارا تخیل جاتا رہا۔

سوچا۔ رمزی پر احسان کر دے اس کی ضد پوری کر کے۔ سوچو چرے سے گرا دیا۔

”ہیں۔۔۔؟“ رمزی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”جی۔۔۔“ ناز واداسے کہا کیا ایک مختصر ساجی۔

”جب آپ ہمارے مقدر میں تھیں۔ تو ہم کیسے انکار کرتے۔“

بے پناہ حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے رمزی نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر جذلوں میں ڈوبا مسکور کن لہجہ، نگاہوں کا والہانہ پن، بے تابی اور محبت۔۔۔

فرحین کے سارے شکوے جاتے رہے۔ اور نظریں بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔

رمیز حسن ماضی کے سفر سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر ملائمت اور نرمی تھی۔ انہوں نے فرحین کی طرف دیکھا۔ اتنے سالوں بعد بھی ان کا چہرہ اتنا ہی روشن، اتنا ہی شاداب تھا۔ فرحین کی کھوئی کھوئی آنکھیں ان کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔

”فرحین حسن! اگر تم اتنی حسین، اتنی دلربا نہ ہوتیں۔ تب بھی ہم یوں ہی بھلتے عمر بھر۔ بخدا ہم اپنی والدہ کے کسے سے کبھی باہر نہ تھے۔“ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ فرحین بھی جیسے حال میں آ گئیں۔

”نافرمان آپ کا بیٹا بھی نہیں۔ آپ کا غصہ، ملامت، ڈانٹ، پھٹکار سب سر جھکا کے سنتا ہے۔ ہر بات مانتا ہے۔ ہاں مگر یہ اس کی زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ وہ کمپروماز نہیں کرے گا۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا



لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

# MEDICAM

## SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



3 Plus SHAMPOO

SHIKAKAI

ANTI  
DANDRUFF

AMLA

HERBAL

ANTI-LICE

EGG

KALONJI



نعیمہ

# دوستی کی لاکھڑائی

”ابھی تک کام ختم نہیں ہوا تمہارا؟“  
 ”نہیں، ابھی کچھ دیر اور لگے گی، تم سو جاؤ۔“ احمد  
 نے لگے ہاتھوں جواب کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا۔  
 یہ مشورہ بھی اب ایک معمول بننا جا رہا تھا۔  
 ”ڈھائی بج رہے ہیں۔“ شانزے نے گویا اطلاع  
 دی۔

”ہاں، میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹائم دیکھا ہے، مگر  
 مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے۔“ احمد کی سنجیدگی اور انہماک  
 میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔  
 ”بچوں کے اسکول میں کل پیر تیس میٹنگ ہے۔“  
 شانزے نے چند لمحوں بعد ایک اور اطلاع دی۔  
 ”اچھا!“

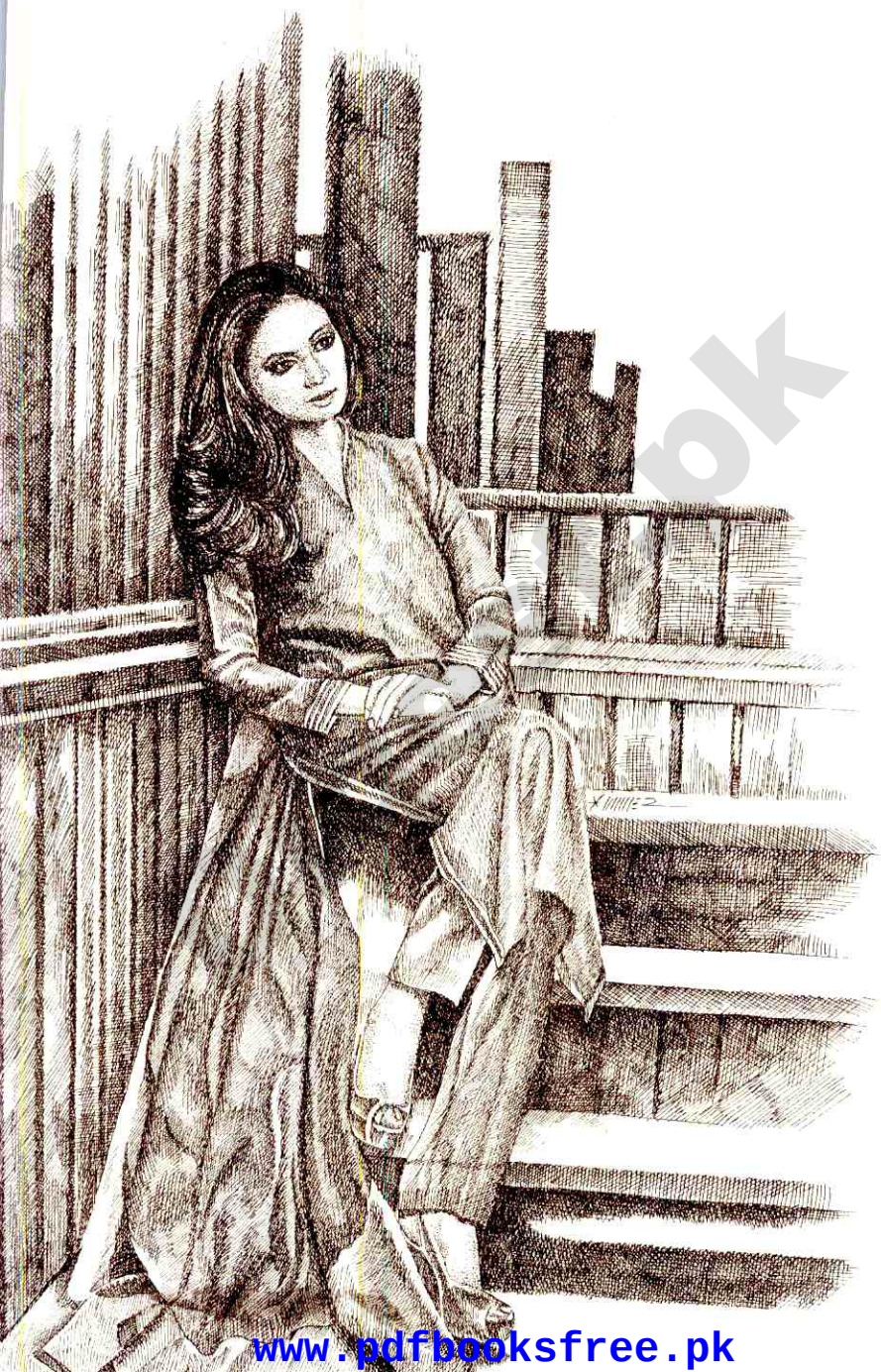
”کچھ کہا ہے میں نے۔“ شانزے سے اس کی مختصر  
 سی اچھا ہضم نہیں ہوئی۔ تو کچھ دیر بعد دوبارہ بولی۔  
 ”سن لیا ہے میں نے کیا کوں؟“  
 اس کی یہ لاروائی اور بے نیازی دیکھ کر شانزے کی  
 جان بری طرح چل گئی۔  
 ”تمہیں نہیں پتا، کیا کرتا ہے؟“ اپنے غصے اور  
 کھولن پر قابو پاتے ہوئے شانزے نے اس سے الٹا  
 سوال کیا۔

”مجھے اپنے فرائض بہت اچھی طرح یاد ہیں اور  
 انہیں میں بخوبی نبھا رہا ہوں، البتہ تمہیں ضرورت ہے  
 اپنے فرائض یاد رکھنے کی۔“ احمد لیپ ٹاپ آف کر  
 کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”کیا کوئی تہی ہو رہی ہے مجھ سے، اپنی تمام تر

وہ دو گھنٹے سے لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ وجہ  
 چہرے پر سنجیدگی اب ایک معمول بن چکی تھی۔  
 شانزے آہستہ سے اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ  
 گئی۔

مکمل ناول







ہو؟“  
”اس لیے کہ تم پہلے ایک بیوی اور ایک ماں ہو“  
اس کے بعد کچھ اور۔“ احمد نے سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں ایک عورت ہوں“  
دوسرے تیسرے درجے کی مخلوق اسی لیے میں اپنے

کیریر کی قربانی دے کر گھر میں پابندی چولہا کروں۔ تم کیوں نہیں دے دیتے یہ قربانی، تم چھوڑو نا اپنی جاب، اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی، اپنا کیریر۔“ شانزے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

”یہ میرا فرض ہے، اپنی فیملی کے لیے کماتا اور اسے سپورٹ کرنا میں۔“

”یہ سب میں بھی کر سکتی ہوں، اس کے لیے تمہیں بلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شانزے نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”بس۔۔۔ اسی بات کا زعم ہے تمہیں۔“ احمد نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی کشادہ پیشانی پر نمودار ہونے والا بل غماز تھا کہ اندر ہی اندر وہ اشتعال میں آ چکا ہے۔

”زعم نہیں ہے، حقیقت کا اور اک ہے۔ مرد کی محتاجی اور غلامی ہی عورت کو اس کا محکوم بناتی ہے۔ میں نے اپنے پیروں میں یہ زنجیریں نہیں ڈالی ہیں۔“ شانزے پھر بڑبڑا۔

”زنجیریں تو آل ریڈی تمہارے پیروں میں ہیں۔ ایک گھر، شوہر اور بچے۔“ احمد نے کانتی ہوئی ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ جو کبھی بے حد محبوب تھی، اب کتنی اجنبی سی لگنے لگی تھی۔

”میرے قدم کسی بھی زنجیر کی مجبوری میں نہیں بندھے۔ اپنی مرضی سے اپنے قدم روکے ہوئے ہیں میں نے، لیکن اگر اپنی سرپرستے گزرنے لگا تو ضرور مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔“ شانزے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

احمد اپنے لب بھینچے چند ٹانگیہ تک اسے دیکھتا رہا پھر

مصروفیات میں سے تمہارے بچوں کے لیے ٹائم نکالتی ہوں، ہر ممکن توجہ دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ گھر کو، بچوں کو، خود کو سب کو ہی مین مین رکھا ہوا ہے۔ اتنی فلفل روٹین میں مزید اور کیا کروں؟“ شانزے نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا، وہ جب دور تھا تو

دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب تھا اور اب قریب آکر جیسے اس سے میلوں دور ہو رہا تھا۔

”جب تم ماشاء اللہ سے اچھی طرح ہر چیز مینج کر رہی ہو تو کل پیرٹس مینٹنگ میں بھی چلی جانا۔ مجھے بتانے کی یا فورس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”میرا مارننگ شو لائو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے، میں کیسے پیرٹس مینٹنگ میں جا سکتی ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کیا، انجان بننے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“ شانزے بڑبڑا۔

”تمہارے مارننگ شو؟“ احمد کے لہجے میں تلخی اور طنز کی آمیزش برابر تھی۔

”تم اپنے گھر اور کیریر میں سے ایک چیز کو چھوڑ نہیں کر سکتیں؟“ احمد نے آج وہ بات کھلے لفظوں میں کہہ دی، جو وہ کئی مہینوں سے دہے لفظوں میں کہہ رہا تھا۔

”ایک چیز کا انتخاب؟“ شانزے بیک وقت صدمے اور حیرانی سے دو چار اسے دیکھنے لگی۔

”یہ نام، یہ عزت، یہ شہرت اور یہ صلاحیت ہزاروں لاکھوں میں سے کسی ایک کا نصیب ہوتی ہے۔ میں تمہارے فضول اعتراضات کے پیچھے اپنے جگمگاتے فیوچر کو ٹھوکر مار دوں؟“

”جب تک بچے کچھ بڑے نہیں ہو جاتے، انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہے شانزے!“ احمد کے لب و لہجے میں بہت عرصے بعد وہی ملاصحت در آئی تھی جو کبھی اس کا خاصا تھی۔

”بچے اور گھر صرف میرے نہیں تمہارے بھی ہیں۔ ہم دونوں ہی اس گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اسے چلانے کی آگے بڑھانے کی ذمہ داری ہم دونوں کی ہے۔ تم سارا وزن میرے پلڑے میں ہی کیوں ڈال دیتے



”نہیں تو اب لگتا ہے صبح ہی آئے گی، جب اٹھنے کے لیے الارم بجے گا۔“ شانزے نے جھنجھلا کر گروٹ لی تھی۔



صبح شانزے کا موڈ خراب تھا۔ احمد کا منہ اس سے زیادہ پھولا ہوا تھا وہ بغیر ناشتائے ہی تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔

”ہونہ! ناشتاکا، لچ اور ڈنر بھی چھوڑ دے، مجھے کیا۔“ شانزے کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا۔ احمد تیار ناشتا ٹیبل پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ملازمہ کی مدد سے اس نے جلدی جلدی بچوں کا لچ بنایا، بچوں کو اسکول بھیج کر اس نے سکون کا سانس لیا، مگر سکون کا یہ سانس محض لمحائی اور وقتی تھا۔ اسے اپنی تیاری کرنی تھی۔ وقت کم تھا، جلدی جلدی شاور لے کر اس نے ناشتے کے نام پر سلاش کا ایک کونا کترا، جوس کا گلاس یا اور بھیگھاگھا اسٹوڈیو جا پہنچی۔

میک اپ کروا کر وہ کیمرے کے سامنے آئی تو ایک بدلی ہوئی شانزے تھی۔ ہنسی مسکراتی، تروتازہ چہرے کے ساتھ، ایک تروتازہ صبح کا آغاز کرنے والی۔ ڈراموں میں اس کی اداکاری بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مگر مارٹنک شو میں وہ خوش باش نظر آنے کی اتنی اچھی ایکٹنگ ضرور کر لیتی کہ اسے دیکھنے اور سننے والا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے دل اور گھر کے حالات کیسے ہیں۔

شو ختم ہونے بعد وہ کچھ دیر یاسیت اور بے زاری کے عالم میں بیٹھی تھی جب فواد حسن اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ماؤل بھی تھا ایکٹر بھی اور آج کل اس کا مارٹنک شو پروڈیوس کر رہا تھا۔

”کیا ہوا عطیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔“

”پریشان لگ رہی ہو؟“

”پریشانیوں تو زندگی کا حصہ ہیں۔ دنیا کا ہر شخص ہی کسی نہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔“ شانزے نے گول

یوں سر جھٹکا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”سم میں جاؤ۔“ شانزے اس کے انداز اور مزاج کے ایک ایک رنگ سے واقف تھی، اپنے اندر اچلتے غصے اور اشتعال کے دیال کو بمشکل دبانے وہاں سے چلی آئی۔

تین بجنے والے تھے اسے علی الصبح ہی اٹھنا ہوتا تھا۔ بچوں کے اسکول جانے کی تیاری، احمد کے آفس جانے کی تیاری، سب کو نمنا کر پھر اس کی اپنی تیاری۔

کبھی کبھی تو وہ بغیر ناشتے کے ہی بھاگ بھاگ اسٹوڈیو پہنچتی۔ اگر کبھی دس پندرہ منٹ ہوتے اس کے پاس تو ہلکا ہلکا سا کوئی اسنیک، جوس، دودھ چائے یا کافی اپنے موڈ کے مطابق لے کر وہ مقررہ وقت پر اپنا شو اشارت کر دیتی۔

وہ ایک مشہور و معروف مارٹنک ہو سٹ تھی۔ ابتدا میں اس نے ایک دو ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور چند ایک کمرشلز میں بھی کام کیا مگر اصل شہرت اسے اپنے مارٹنک شو کی بدولت ملی۔ اس کی خوب صورت ٹھنکتی آواز، پراعتماد لب و لہجہ، مقناطیسی شخصیت اور مقابل کو اپنے سحر میں گرفتار کرتی گفتگو۔ سب نے مل کر اسے شہرت کی بلندیوں پر کھڑا کر دیا تھا اور بلندی شہرت کی ہو یا عزت کی، دولت کی ہو یا کامیابیوں کی۔ کسی بھی بلندی پر اپنے قدم جما کر مضبوطی سے ساتھ کھڑے رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ معمولی سی ہوا سے بھی توازن بگڑ جاتا ہے، قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔

شانزے کے قدم بھی اب لڑکھڑانے لگے تھے۔ حالانکہ اس نے اپنی۔ پوری کوشش کی تھی اب تک اپنے قدم جما کر مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہونے کی، مگر سارا قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ جو اس کی محبت تھا، اس کا شریک سفر، ہم دم و ہم ساز، اس کی آنکھوں میں جلتی محبت کی لو کم ہوتی جا رہی تھی۔ شانزے کیسے اپنا راستہ دیکھتی۔ احمد کے ہاتھوں کی گرفت اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ وہ بھلا کیسے اپنا توازن قائم رکھتی۔

مول جواب دیا۔

میں تمہیں اچھا سا بچ کر آتا ہوں۔

”اونہوں!“ شانزے نے موبائل میں ٹائم دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”دیر ہو جائے گی مجھے، بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو جائے گا۔“

”بچوں کو ڈرائیور لے کر آتا ہے اسکول سے اور گھر پر میڈ ہوتی ہے، میرا خیال ہے اتنا تو وہ سنبھال ہی لے گی، فون کر کے انسٹرکشن دے دو کہ بچوں کو چینیج کروا کے کھانا کھلا دے۔ تم دیر سے آؤ گی، اس سے پہلے بھی تو دو چار بار جب تم لیٹ ہو میں تو ایسے ہی

سینج کیا تھا تم نے۔“

”ہاں، کیا تو تھا۔“ شانزے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کا ذہن منتشر تھا اور طبیعت بے زار ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

احمد کو فون کرنے کے لیے اس نے موبائل اٹھایا کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر موبائل پیچھا۔

”ہونہ مائی فٹ! اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ٹینس ہو رہی ہوں گی۔ وہ خود بھی تو فون کر کے بتا سکتا تھا مگر کیوں کرے، اکڑو تو وہ شروع سے ہی ہے۔ میں ہی ہمیشہ جھکتی آئی ہوں، کب تک جھکوں، جتنا میں نرم ہوتی ہوں، وہ اتنا ہی سخت ہو جاتا ہے، جتنا میں کمپروماز کرتی ہوں وہ اتنا ہی اکڑ جاتا ہے۔“

”چلیں؟“ فواد تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا، واپس آ کر دوبارہ پوچھنے لگا۔

”ایک منٹ! پہلے میں گھر فون کر لوں، میڈ کو بتا دوں کہ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔ وہ بچوں کو دیکھ لے۔“ شانزے نے پھر موبائل اٹھالیا۔



فواد اسے ساحل سمندر پر بنے ایک ریٹورنٹ میں لے آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ریٹورنٹ میں لوگ آ جا رہے تھے۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟“ شانزے نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

”فلسفہ مت بگھاو۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو میری بات کا۔“ فواد حسن نے اسے بڑے استحقاق کے ساتھ ڈپٹا۔ پچھلے آٹھ ماہ میں دونوں کے درمیان اتنی اچھی انڈراسٹینڈنگ اور فرینڈشپ ہو چکی تھی کہ وہ شانزے کو ڈپٹ بھی لیتا تھا۔ دھونس بھی جمالیتا تھا اور اس کی بہت سی مشکلات اور پریشانیوں کو شیر بھی کر لیتا تھا۔

”بچوں کے اسکول میں پیرنس میٹنگ تھی، احمد سے کہا تھا مگر بتا نہیں وہ گیا کہ نہیں۔ اس کے آفس سے وائنگ ڈسٹینس ہے اسکول، اور ایک آرہے گھنٹہ کا نانا اس کے لیے کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ پچھلی دو میٹنگز میں بھی ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جاسکا۔“ شانزے کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ احمد کو فون کر کے پوچھ لو کہ وہ گیا یا نہیں۔“ فواد نے اسے مشورہ دیا۔

”اس نے انکار کیا کہ وہ نہیں گیا تو میری ٹینشن اور بڑھ جائے گی۔“

”ایک تو تمہیں ٹینشن پالنے کا بہت شوق ہے، بات بات پر ٹینس ہو جاتی ہو، ایسے لائف گزارو گی تو بس گزار چکیں۔“

”کبھی ہم لائف کو گزارتے ہیں، کبھی لائف ہمیں گزارتی ہے، بس اس گزارا گزاری میں زندگی اور ہم دونوں ہی گزر جاتے ہیں۔“

”تم نے کیس فلاسفی میں تو ماسٹرز نہیں کیا؟“ فواد نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

”نہیں۔“ شانزے نے بھی سنجیدگی سے نفی میں سر ہلایا۔

”صبح ناشتا ٹھیک سے کیا تھا؟“ اگلا سوال ہوا۔

”جس پیتا تھا ایک گلاس۔“ شانزے نے سچ جج بتایا۔

”تب ہی۔“ فواد نے سر ہلایا۔

”خالی پیٹ اسی قسم کی باتیں سوچتی ہیں۔ چلو آؤ

شانزے خاموشی سے فرائی فش کا ٹکڑا پلٹ میں رکھ کر کھانے لگی۔

گھر پہنچی تو بچے کھانا کھا کر سو چکے تھے۔ ملازمہ اپنے کوارٹر میں تھی۔ بس چوکیدار گیٹ پر اونگھ رہا تھا۔ شانزے بھی صبحی سی لاؤنج میں صوفے پر آن گری۔ پورے گھر میں سائلے کا راج تھا۔ ایرنڈیشن کی مخصوص گھول گھول کے سوا کہیں اور کوئی آواز نہ تھی کچھ دیر وہ وہیں آڑی ترچھی بڑی رہی، پھر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی کا ایک طویل شاور لے کر وہ باہر آئی تو اس کی ساری ٹھکن، ٹنشن سب غائب تھی۔ فقط ایک نازکی کا احساس باقی رہ گیا تھا۔

کل رات سے اس کے کشیدہ اعصاب اب خاصے یسکون تھے اپنے تراشیدہ بالوں کو ڈرائر سے خشک کر

”اس لیے کہ تمہیں سی فوڈ پسند ہے جو یہاں بہت اچھا ہوتا ہے اور یہاں کی ہوائ لگے گی تو تمہارا موڈ بھی فریش ہو جائے گا۔“

”کچھ زیادہ ہی نہیں جان گئے میرے بارے میں؟“ شانزے مسکرا دی۔

”آفٹر آل میری پیاری سی دوست ہو۔ دوست کی معمولی پسند ناپسند بھی معلوم نہ ہو تو فرینڈ شپ کا فائدہ؟“

”فرینڈ شپ فائدے کے لیے کی جاتی ہے؟“ شانزے نے اس کا جملہ پکڑ لیا۔

”اوہ، منہ سے کچھ غلط نکل گیا۔“ فواد حسن نے سر کھچایا۔ ”آئی مین کہ ایسی فرینڈ شپ بھلا کس کام کہ آپ کو اپنے دوست کی پسند ناپسند بھی معلوم نہ ہو۔“ فواد نے تصحیح کی۔

”اچھا، اب کچھ منگوا لو۔ بھوک لگ رہی ہے بہت زبردست قسم کی۔“

”بالکل بالکل۔ بھوک تو مجھے بھی زبردست قسم کی لگ رہی ہے۔ آج میں نے بھی ناشتا ڈھنگ سے نہیں کیا۔ آنکھ ہی دیر سے کھلی۔ اتنا ٹائم بھی نہ ملا کہ اپنے لیے ایک کپ چائے ہی بنالیتا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر بھاگ نکلا۔ اسٹوڈیو آکر بھی کچھ نہیں کھایا۔ سوچا لچنگ ٹنگڑا قسم کا کر لوں گا۔“ فواد ہلکے پھلکے لہجے میں معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔

”اکیلے رہو گے تو یہی ہو گا۔ مینے میں مشکل سے پانچ دن ہی اپنے گھر سے ناشتا کر کے آتے ہو۔ کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر شادی کر لو، کم سے کم تمہارے کھانے پینے کا خیال تو رکھ لے گی۔“

”جب کوئی اچھی لڑکی ملے گی تو سوچیں گے۔ ابھی تو ایک ہی اچھی لڑکی سے بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔“ فواد حسن مسکرایا۔ پچھلے سال اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہوئی تھی۔ دو سالہ ازدواجی زندگی بڑے بھونڈے طریقے سے گزری اور بڑے برے طریقے سے انجام سے دو چار ہوئی۔

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

# دستِ کوہنگر

فوزیہ یاسمین



قیمت - /750 روپے

منگوا لے گا:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021



کے خشک اور معطر فضا میں آرام سے لیٹ گئی۔



مارکیٹ میں یہ سب تو عوام پہلے ہی اسکرین پر دیکھ چکے ہیں۔

ان کے اعتراض پر احمد سلگ کر رہ گیا۔ وہ گھسی پٹی لکیروں سے جلنے کا قائل نہیں تھا۔ اب تک اس نے جتنے بھی کمرشل بنائے تھے۔ وہ اپنی انفرادیت اور تفہیم کی وجہ سے کافی پسند کیے گئے تھے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کام کتنا ہی اچھوتا اور خوب صورت کیوں نہ ہو، وہ کسی کسی کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ کلائنٹ بھی ان ہی میں سے ایک تھے، احمد نے انہیں اگلے ہفتے آنے کا کہہ کر رخصت کر دیا تھا۔

اس وقت وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے سر دکا کر بیٹھا تھا۔

آج وہ اتنا مصروف رہا کہ لچ کے نام پر فقط دو بسکٹ اور ایک چائے کا کپ لیا تھا اور اب شام کے چھ بجے محاوراً ”نہیں حقیقتاً“ اس کے پیٹ میں بھوک کے مارے چوبے دوڑ رہے تھے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کر کے آیا تھا۔ نہ ہی آفس آکر کچھ کھایا تھا۔

”گھر جاؤں یا کسی ریستورنٹ؟“ وہ بیٹھایا سوچ رہا تھا۔

جس دن شانزے کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ ہوتی، اس کا گھر جانے کا موڈ مشکل سے ہی بنتا تھا۔ شانزے ٹھیک کہتی تھی اس کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ واقعی تھوڑی اکثر بھی، جو شانزے کے ساتھ بھگڑنے کے بعد کچھ زیادہ ہی عود کر آجاتی۔ موبائل پر میسج آیا۔

کومل نیچے بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی تھی، اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اسے لفٹ چاہیے تھی۔ ”میں آ رہا ہوں۔“ جوابی میسج کر کے وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

نیچے پہنچا تو کومل اس کی بلیک کرولا کے پاس ہی کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی سفید سوٹ میں ملبوس سفید موتیوں کی بالیاں، بہت لائٹ میک اپ بال سمیٹ کر

احمد نے بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد اپنی انڈور ٹائزنگ ایجنسی کا آغاز کیا تھا۔ اس کی ٹیم کو مختصر بھی مگر منفی اور باصلاحیت افراد تھے۔ ان کے بنائے ہوئے بہت سے کمرشلز ہٹ ہوئے تھے اور انہی کمرشلز کے ذریعے کچھ نئے چہرے بھی شہرت پا رہے تھے۔ انہی میں ایک نام کومل خان کا تھا۔ کومل اسم باکمی تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بہت ہی نازک مگر بے حد خوب صورت کھلے ہوئے پھول کا خیال دل میں آتا تھا۔ وہ طرح دار تھی۔ باصلاحیت تھی مگر ابھی شو بڑی دنیا میں اپنا نام و مقام بنانے کے لیے جدوجہد کے مراحل سے گزر رہی تھی ایک مل کلاس فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود بہت ماڈرن اور آزاد خیال، بلکہ کسی حد تک بے باک تھی۔ احمد ویسے تو عام طور پر ایک سنجیدہ مزاج اور لیے دیے رہنے والا شخص تھا مگر کومل کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی دوستی اب بے تکلفی میں ڈھل گئی تھی۔

خوش شکل اور خوش ادا کومل بتدریج اس کے قریب آ رہی تھی۔

”اف!“

دو گھنٹے کی بحث کے بعد کلائنٹ رخصت ہوا تو احمد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس فیلڈ میں اس کے پاس انواع و اقسام کے لوگ آتے تھے۔ یہ کلائنٹ موصوف بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ رنگ گورا کرنے والی کریم کا کمرشل بنوانا چاہتے تھے۔

اشتراک میں انہیں زیادہ منٹ اور زیادہ لوگ چاہیے تھے، معاوضہ کم سے کم ہو اور پھر ان کا مزاج اور معیار اتنی کی پناہ۔ بحیثیت کونسٹیٹیو رائٹر احمد انہیں تقریباً پچیس سے تیس آئیڈیاز بتا چکا تھا مگر ان کو اب تک کوئی آئیڈیا پسند نہیں آیا تھا۔

”احمد صاحب! کوئی نئی چیز، کوئی نئی سوچ لائیں نا

کا کمال تھا یا کوئل کی سنگت کا۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو چلا تھا۔

پوش ایریا کی رہائشی بلڈنگ کے بیس منٹ میں احمد نے گاڑی روکی تو کوئل نیچے اترنے کے بجائے اس سے مخاطب ہوئی۔

”آئی ایم سوری احمد! میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، میری گاڑی ٹھیک ہے، میں کھڑی ہے۔“ کوئل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ احمد نے حیرانی سے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس کیوں کا جواب اوپر ہے۔ آپ میرے فلیٹ میں چلیں گے؟“

”شیور۔“ احمد نے کندھے اچکائے، ”آج وہ پہلی بار اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر جا رہا تھا۔

تھوڑا فوری پر تین کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ بہت خوب صورتی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ احمد دیکھ کر متاثر ہوا تھا۔

”آپ ایریز ہو کر بیٹھیں، میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔“

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو لوازمات سے لدی پھندی ٹرائی کے ہمراہ تھی، جس میں سب سے نمایاں کیک تھا، اس پر لگی شمعیں روشن تھیں۔

”اُدھ۔۔۔!“ احمد آنکھیں بند کر کے بے اختیار مسکرایا۔

کوئل ایک بار پھر کمرے سے باہر گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں گٹار تھا۔

احمد کو کیک کاٹنے کا اشارہ کر کے وہ گٹار کے تار چھیڑنے لگی۔

ابھی برتھ ڈے ٹوپو۔ کی دھن گٹار کے تاروں سے نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔

”اف۔۔۔!“ احمد نے بے حد حیرانی اور سرخوشی کے عالم میں گردن ہلاتے ہوئے کچھ دیر اسے یوں دیکھا جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو پھر ایک مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ کیک کاٹنے لگا۔

ایک طرف کے ہوئے تھے۔ وہ بہت فریش اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”ہیلو!“ وہ احمد کو دیکھ کر مسکرائی۔

”ہائے!“ احمد نے ڈرائیونگ سیٹ سے نکال کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ”تمہارا شوٹ ختم ہو گیا؟“

”ہاں، کل لاسٹ ڈے تھا۔“

”کیسا اسپرٹس رہا؟“

”بہت اچھا، بلکہ بہت زبردست۔ اتنا مزا آیا کہ کیا بتاؤں۔“ وہ بچوں کی طرح آنکھیں میچ کر پرجوش سی کہہ رہی تھی۔

”بس ذرا۔۔۔“ بولتے بولتے وہ ایک لمحے کو رکی۔

”بس ذرا ٹھکن ہو گئی۔“ کوئل کے لہجے میں بے ساختگی کے ساتھ معصومیت بھی تھی۔

”ظاہر ہے، جس کام میں محنت ہوتی ہے اس میں ٹھکن بھی ہوتی ہے۔“ احمد مسکرایا۔ ”اسکرین پر ایک آدھ منٹ کا کرشل دیکھ کر کون سوچتا ہو گا کہ اس کے پیچھے کتنے لوگوں کی لگنی محنت ہے۔ اپنی دیر ابھی تو تمہارا اشارہ ہے، جتنی محنت کر سکتی ہو کرو، ٹھکنے کی پروا مت کرو۔ اگر آگے بڑھنا ہے تو۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے، مجھ میں اسپرٹ نہیں محنت کرنے کی؟“

”آف کورس ہے، صلاحیت کے ساتھ تم میں لگن بھی ہے جذبہ بھی، میں نے تو بس ایزے فریڈ یونی ایڈوانز دے دی۔ کیا تم نے مانڈ کیا میری بات کو؟“

”نہیں نہیں، بالکل بھی نہیں۔ بلکہ مجھے تو آپ کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا۔“ کوئل نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ جناب! انسان اس کو ہی ایڈوانز دیتا ہے جسے وہ کچھ سمجھتا ہے۔ مجھے تو اچھا لگتا ہے یہ سوچ کر کہ آپ مجھے اہمیت دیتے ہیں یا مجھے کچھ سمجھتے ہیں۔“

کوئل جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔

احمد خاموش رہا مگر مسکرایا۔ اسے سی کی خنک فضا

وہ جواب دے رہا تھا یا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لے رہا تھا جب کول نے ایک چھوٹا سا گفٹ پیک اس کے سامنے رکھا۔

”یہ کیا بھی؟“

”برتھ ڈے گفٹ۔“

”اس سب کے بعد یہ ضروری تھا؟“

”بالکل۔۔۔“

”میری سالگرہ یہ مجھے کوئی خالیوش کرے اور گفٹ نہ دے تو مجھے تو بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ اسی سے تو پتا چلتا ہے کہ آپ کسی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ کتنی محبت کرتے ہیں اس سے اور۔۔۔“ کول نے روانی اور بے اختیاری میں بولتے ہوئے ایک دم ہی خود کو روکا۔ ”گفٹ دیکھ لوں۔ اجازت ہے۔“ احمد نے اس کے چہرے پر فحالت کے آثار دیکھ کر بات پلٹی۔ ”آپ کا گفٹ ہے۔ جب چاہیں دیکھ لیں، مگر یہاں نہیں۔“

”یہاں کیوں نہیں؟“

”بس ایسے ہی۔“

”کوئی ہم وغیرہ تو نہیں ہے کہ میں گفٹ کھولوں اور۔۔۔“

”میرا دھماکہ کرنے کا انداز مختلف ہے۔ میں اس کے لیے کسی ہم کو استعمال نہیں کروں گی۔“ کول نے ہنستے ہوئے اسے جواب دیا۔

”اوکے“ اب میں چلتا ہوں، باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ”کچھ دیر بعد احمد اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تھینکس فار ایوری تھینگ۔“

”تھینکس تو مجھے کرنا چاہیے، آپ نے میری جرات کو عزت بخشی۔“ کول بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر رکا۔

”ایک سربراہ تم نے مجھے دیا اور ایک گڈ نیوز میرے پاس ہے تمہارے لیے۔“

”کیسی گڈ نیوز؟“

”ریکارڈنگ کمپنی والوں نے اپنے ایڈ کے لیے دو ماڈلز

فائل کی ہیں، ان میں ایک تم ہو۔“ احمد نے توجہ ج

”تمہیں کیسے پتا آج میری برتھ ڈے ہے؟“

”آپ کو یاد ہے میں نے ایک بار آپ کا اشار پوچھا تھا۔ آپ نے اپنی ڈیٹ آف برتھ کے ساتھ اپنا اشار بتایا تھا۔ مجھے یاد رہ گیا۔“

”اچھا اور یہ؟“ احمد نے گٹار کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں آتا ہے یہ پلے کرنا؟“

”نہیں! صرف ابھی برتھ ڈے کی دھن بجانی سیکھی ہے تین دن میں۔“ کول نے سر ہلاتے ہوئے ج

”کیوں سیکھی؟“ احمد نے روانی سے پوچھا۔

”آپ کے لیے۔“ کول نے بھی اسی بے ساختگی

اور روانی سے جواب دیا۔ احمد یک دم خاموش ہو گیا۔

”آپ کو برا لگا؟“ کول نے گھبراہٹ کے سوال کیا۔

”نہیں، برا تو نہیں لگا۔“ احمد نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر؟ اچھا لگا؟“

”اس کا جواب بعد میں بتاؤں گا۔ ویسے سچ بتاؤں تو

اس وقت مجھے زبردست قسم کی بھوک لگ رہی ہے اور

غالبا تم نے میرے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے تب

ہی ایک کے کمر اور فلیور سے لے کر اس ٹرائی میں

موجود تمام چیزیں میری فہورٹ ہیں۔ میں مکلف بالکل

نہیں کروں گا۔ بلی داؤے، ان میں سے تم نے کیا بنایا

ہے؟“

”کچھ بھی نہیں، سب کچھ بازار کا ہے، میری کوکنگ

کوئی خاص نہیں ہے۔“ کول نے گٹار ایک طرف

رکھا۔ ”آپ تو اٹھ کر ہی بھاگ جاتے میرے ہاتھ کا بنا

کچھ کھا کر۔“ احمد مسکرایا۔

”اپنی ویز“ آپ ان باتوں کو چھوڑیں، اپنی برتھ ڈے

انجوائے کریں۔“

”تم کچھ نہیں لو گی؟“

”ہاں، بس یہ کیک پس۔“ کول نے ایک چھوٹا سا

کیک پس کٹ کر پلیٹ میں رکھا۔

احمد پیٹ پوجا کے دوران ہلکی پھلکی ادھر ادھر کی

باتیں کرتا رہا بلکہ زیادہ تر باتیں تو کول ہی کر رہی تھیں۔



دھاکا کا ڈالال۔

”اچھا، کل سالگرہ ہے تمہارے بیٹے کی؟“

شانزے نے چیئل بدلے تو ہوائے سرسری سامنا۔  
”جی کل بارہ اپریل ہے نا، پورے آٹھ سال کا ہو جائے گا میرا شہزادہ۔“ بتول کے لہجے میں مامتا بھری محبت تھی۔

”کل بارہ اپریل، آج۔۔۔“ اکدم ہی شانزے کے ذہن نے کچھ کلک کیا۔

”آج گیارہ اپریل۔۔۔ اودھ خدایا! میں اتنا ہم دن کیسے بھول گئی۔ ہر سال ہی تو اس اکڑو خان کو ش کر رہی ہوں اس کی سالگرہ یہ۔۔۔“ شانزے ٹی وی آف کر کے مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا میڈم جی؟“ بتول نے گھبرا کر اسے دیکھا۔  
”کچھ نہیں، ذرا کمرے سے میرا بیگ تو لے کر آؤ۔“

بتول جا کر اس کا ہینڈ بیگ لے آئی۔

”یہ لو، اپنے بچے کے لیے کوئی گفت لے لیتا میری طرف سے۔“ شانزے نے ہزار ہزار کے تین نوٹ اس کی طرف بھرائے۔

بتول ہچکچائی۔ ”مہربانی، اللہ آپ کا سکھ چین سلامت رکھے، آمین!“ بتول نے احسان مندی سے اسے دیکھا اور نوٹ لے لیے۔

”کل آج کل چھٹیوں پر گیا ہوا تھا، اس کی غیر موجودگی میں بتول با آسانی پکن سنبھال لیتی تھی، اسے کانٹا ٹینٹل کھانے بنانے تو نہیں آتے تھے مگر کسی اور روایتی پکوان وہ بنا لیتی تھی اور خوب بناتی تھی۔“

”بات سنو بتول!“ شانزے نے کچھ سوچتے ہوئے اسے پکارا۔

”جی۔۔۔“

”ایسا کرو، رات کا کھانا رہنے دو، ہو سکتا ہے ہم لوگ ڈنر یا ہری کریس، تم بس اپنے اپنے بچوں کے لیے کچھ بناؤ۔“ بتول کو رہائش کے ساتھ ساتھ کھانا پینا بھی فری تھا۔

”فریق میں کافی ساری چیزیں پڑی ہیں، ان میں سے کچھ لے لوں گی، دوپہر کا کھانا بھی اچھا خاصا بچا ہوا

”کیا؟“ کول انتہائی حیرت اور خوشی کے عالم میں چیخ ہی پڑی، ریکا اینڈ کمپنی سے منسلک ہونے کا مطلب، شہرت اور دولت کے دروازے کھلنا۔

”اب اپنا یہ کھانا ہوا منہ بند کرو اور آرام سے بیٹھ کر اس نیوز کو ابجائے کرو۔“ احمد بایے کرتا ہوا نکل گیا۔

”اوکے بایے۔ ٹیک کیئر۔“ کول جیسے کسی خواب سے جو کنکی تھی اور واقعی یہ ایک خواب ہی تھا۔ ریکا اینڈ کمپنی کے ساتھ منسلک ہونے کا خواب ہر ماڈل دیکھتی تھی مگر بہت کم خوش نصیب ایسی ہوتیں جو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتیں۔ کول دروازہ بند کر کے اندر آئی تو مارے خوشی کے اس کا برا حال تھا۔

کمرے کے وسط میں خوشی کے عالم میں جھومتی ہوئی، گھومتی ہوئی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ بالآخر اس کے سپنے پورے ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔



شانزے شام میں سو کر ابھی تو بالکل فریش تھی۔ مزاج کی گرمی اور احمد کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کی تلخی کے اثرات بہت حد تک کم ہو چکے تھے۔ بچے بھی کب کے سو کر اٹھ چکے تھے اور گیسز لگا کر بیٹھے تھے، شانزے نے ٹائم دیکھا۔ ٹیوٹر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

بتول سرونٹ کو ارڈر سے آگئی تھی، اس وقت وہ بچوں کو تیار کر دیتی تھی، ٹیوٹر کے آنے سے پہلے بچے ریڈی ہوتے تھے۔

”میڈم جی!“ بتول نے اسے مخاطب کیا۔  
”ہوں۔“

”کل شام میں مجھے چھٹی چاہیے، میں کام جلدی پٹنا کر چلی جاؤں؟“  
”خیریت؟“

”وہ جی کل میرے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ وہ الہ دین جانے کی ضد کر رہا ہے اسے الہ دین یا کنگ کرنا ہے۔“

ہے، ہم چاروں کے لیے بہت ہو گا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ شانزے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ اب وقت کم تھا اور مقابلہ سخت۔ پھینچ کر کے خود کو ہلکا پھلکا سانسوار کر رہا ہر آئی۔

”بتول! بچوں کا دھیان رکھنا، میں ابھی آتی ہوں۔“

گاڑی نکال کر مین روڈ پر آئی تو سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب رواں دواں تھا۔

”یا اللہ! بس آگے ٹریفک جام نہ ہو۔“ شانزے نے دل ہی دل میں دعا کی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ احمد کے گھر آنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے، تاکہ اس کے لیے ایک چھوٹی سی سربراہنگ برتھ ڈے کا اہتمام کر سکے۔

مقام شکر تھا کہ بے پناہ اور بے ہنگم ٹریفک کے باوجود، کہیں بھی ٹریفک جام نہیں تھا۔ شہر کی سب سے مشہور اور مشہور بیکری سے احمد کے پسندیدہ فلیپور کا کیک لیا۔ فلاور شاپ سے ٹیوپس کا بوکے خاص طور پر بنوایا۔ موتیا کے ڈھیروں پھول لیے، دونوں پھول احمد کے پسندیدہ تھے۔

گھر واپس آئی تو کیک فریج میں رکھ کر پھول ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ بچوں کو پتا چل جاتا تو فوراً پاپا جان کو فون کر کے اس کے سربراہنگ کی ایسی کی تیسری ہو جاتی۔

نیشے کی میز کو ٹیوپس اور موتیے کے پھولوں سے سجا کر اس نے درمیان میں کیک کی جگہ چھو ڈی۔

پچھلے آٹھ سال سے ان کا یہی معمول تھا کہ سالگرہ دونوں میاں بیوی میں سے کسی کی ہو، بچوں کی ہو یا دونوں کی ویڈنگ اینورسری احمد ڈنر کرانے ضرور لے جاتا۔ سب کو پہلے تو عام دنوں میں ابھی اکثر وہ لوگ ڈنر پر چلے جاتے تھے مگر پچھلے سال، ڈیڑھ سال سے جب سے دونوں کے درمیان تنگیوں اور فاصلوں نے جنم لینا شروع کیا تھا، ایک ساتھ باہر جانے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا تھا۔ بچوں کی کوئی خوشی یا موقع تو پھر بھی ایک ساتھ سیلیبریٹ کر لیتے مگر دونوں کے ذاتی معاملات اور

خوشیاں اب پس پشت جاتی جا رہی تھیں۔

”اور کیا ضروری ہے کہ یہ سلسلہ یوں ہی چلے۔ یہ خلیج اور گرمی ہوتی رہے۔ فاصلے اور بڑھتے ہی رہیں۔ کسی نہ کسی کو تو اپنے رویے میں لچک لانی ہے۔“

شانزے نے حقیقت پسندین کر سوچا۔

”محبت کر کے شادی کی بھی پھر شادی کر کے محبت کہاں چلی گئی؟“ شانزے بھی کبھی حیران ہو کر سوچتی تھی۔

جو کچھ بھی ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ حالات اور معاملات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں، آپس میں ڈسکس کر کے ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں۔ وہی ڈانٹلا گز تھوڑی۔ شانزے سوچتے سوچتے مسکرائی۔ ”گفٹ کا کیا کروں؟“ اس کے خیالات کی رواب دوسری جانب مڑ گئی، احمد کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جب احمد آئے تو وہ اسے گھر پر ہی ملے۔ ”چلو گفٹ کی خیر ہے، ڈنر پر جائیں گے تب ہی کچھ لے لوں گی۔“

ٹیوٹر بچوں کو پڑھا کر جا چکا تھا۔ شانزے بچوں کے ساتھ ملن ہو گئی۔ یہ تاہم اس کا اور بچوں کا ہونا تھا، پھر احمد بھی آ جاتا، پھینچ کر کے فریش ہو کر وہ بھی شامل ہو جاتا۔

مگر آج کافی دیر ہو گئی تھی، احمد اب تک نہیں آیا تھا۔ شانزے کی منتظر نظریں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں اور کان احمد کی کارڈز کے مخصوص ہارن پر لگے ہوئے تھے، آئندہ لیٹ ہو جاتا تھا مگر میسج کر دیتا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ مگر آج ابھی تک کوئی میسج بھی نہیں آیا تھا۔

”میں ہی فون کر کے پوچھ لوں؟“ اس کے دل نے کہا مگر پھر فوراً ”ہی دل کے گھمے برائے غالب آگئی۔“ تاک تو شانزے احمد کی بھی بہت ناخوش تھی۔

”ساری لچک میں ہی دھکاوں۔ ہر بار میں ہی کھپو وائز کرتی ہوں، اب فون کر کے بھی میں ہی پوچھوں کہ موصوف کہاں ہیں۔ خود بھی تو بتا سکتے ہیں کہ کب آئیں گے۔“ شانزے کی تنک مزاجی عود کر آ

ہے۔“ فواد حسن کا معنی خیز لب و لہجہ سن کر وہ ٹھنک گئی۔

”ایکسپلین کرو۔“

”میرا خیال ہے احمد آن دیر سے گھر آئے گا۔ شام میں کوئل کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے ویسے۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔

”مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا تمہیں بتاتے ہوئے مگر تمہارے علم میں یہ بات ضرور ہونی چاہیے کہ احمد اور کوئل ایک دوسرے کے کافی قریب ہو رہے ہیں۔

دونوں کے قریبی حلقوں میں گومپس شروع ہو چکی ہیں۔ حیرت ہے کہ تم ابھی تک لاعلم ہو۔ آئی ایم سوری شانزے! میں نے شاید تمہیں ہرٹ کیا مگر۔“

”تم نے مجھے ہرٹ نہیں کیا فواد! بلکہ میری آنکھیں کھولی ہیں، ہرٹ تو کسی اور نے کیا ہے۔ تم کیوں ٹکٹی فیل کر رہے ہو۔“ شانزے بمشکل مسکرائی۔ ایک بے حد تلخ مسکراہٹ۔ اندر تک وجود پورا کڑوا ہوا رہا تھا، مسکراہٹ کیوں نہ کڑوی ہوتی۔

”ویسے کسی نے جی ایف ایف کہا ہے کہ بیوی وہ فرد ہوتی ہے جسے سب سے آخر میں اپنے شوہر کی بے وفائی کا علم ہوتا ہے۔ اپنی وزیر تھینکس ٹوٹیل۔“

”بات سنو! زیادہ مٹشن لینے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ گرانسپس آتے ہیں، مگر ابھی جا رہے ہیں ہی لاائف ہے۔“

”فواد! میں بعد میں بات کروں گی، ٹھیک ہے۔“ شانزے نے شہر شہر کر کہا۔ یہ شہر او ایسے سمندر کی سطح جیسا تھا، جس کی تہ میں بے شمار طوفان چل رہے ہوں۔

”اوکے، اوکے، ہم بعد میں بات کر لیں گے، خدا حافظ۔“ فواد نے جلدی جلدی کہا۔

”خدا حافظ۔“ شانزے نے زیر لب کہہ کر فون آف کر دیا۔

کتنی دیر وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ اندر سے دل چاہ رہا تھا کہ چھوٹ چھوٹ کر روئے مگر حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھیں خشک تھیں۔

رہی تھی۔

”چلو، تیار ہو جاتی ہوں، تھوڑی دیر تو ہو ہی جاتی ہے، کیا پائرنلک میں پھنسا ہوا ہو۔“ شانزے نے احمد کو مار جن دیتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

اپنی وسیع و عریض وارڈ روم سے اس نے پستی رنگ کے سوٹ کا انتخاب کیا۔ اصلی شیفون پر سچے ریشم اور چاندی کے تاروں کا بے حد خوب صورت اور نفیس کام تھا۔

پون گھنٹہ لگایا اس نے تیار ہونے میں۔ آئینہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔

”میں ہی فون کر کے پوچھ لیتی ہوں اب تک کیوں نہیں آیا۔“ شانزے نے پرفیوم لگاتے ہوئے خود کو تنقیدی نظروں سے آئینے میں دیکھا اور مطمئن ہو کر اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔

”فون آگیا موصوف کا۔“ شانزے نے چھپ کر موبائل اٹھایا، مگر اسکرین پر چمکتے نمبر دیکھ کر اس کی خوشی کچھ کم ہو گئی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو، شانزے کیسی ہو؟“

”ٹھیک، تم سنو۔“

”بس، میں نے سوچا تمہاری خیریت معلوم کر لوں، صبح والا ڈپریشن اور مٹشن کچھ ختم ہوا یا نہیں؟“

”بالکل ختم ہو گیا۔“ شانزے کھلکھلائی۔

”گلد ویری گلد۔ یونہی ہنسی رہا کرو اور سنو، کیا ہو رہا ہے۔“

”انتظار۔“

”کس کا؟“

”آئی تھنک کہ اس وقت عموماً ہر اچھی بیوی اپنے ہزینڈ کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔“

”بعض اچھی بیویاں بہت بھولی بھالی ہوتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اچھی بیوی کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہزینڈ کہاں ہے اور کس کے ساتھ



جھاگ جھاگ سمندر کی پھری لہروں کو دیکھ کر وہ سوچتا رہا۔

”نہ کوئی مسیح، نہ کوئی کال۔“ اس نے موبائل نکال کر ایک بار پھر چیک کیا۔ حالانکہ نتیجہ اچھی طرح معلوم تھا۔

”تم ہی کر لو کال۔“ اس کے دل نے چپکے سے مشورہ دیا۔

”مگر میں کیوں کر لوں۔ آج میرا دن ہے، میری برتھ ڈے۔ کتنی بھی ناراضی ہو، لڑائی جھگڑا ہو، وہ ہر سال خود مجھے دس کرتی ہے، سالگرہ منانے کا اہتمام کرتی ہے، ساری رنجشیں اور تلخیاں یوں ختم ہو جاتی ہیں کہ جیسے تھیں ہی نہیں۔ مگر اس بار یہ رسم بھی گئی تو تم خود یہ چاہتی ہو کہ فاصلے قائم رہیں، دوریاں اور بڑھ جائیں۔ کیا انڈیپنڈنٹ ہونے کا زعم انتہا طور ہوتا ہے کہ محبت کو نکل جائے؟“ احمد کی نظریں سامنے جی تھیں۔ شوریدہ سر لہریں بڑے جوش کے ساتھ آگے تک آئیں اور پتھروں سے سرخ پنج کروہیں دم توڑ دیتیں۔

”پتھروں سے سر ٹکرانا سراسر بے وقوفی ہے مگر پھر بھی یہ لہریں باز نہیں آئیں۔“ احمد نے موبائل پیٹ کی جیب میں ڈالا تو انگلیاں کسی اور چیز سے بھی ٹکرائیں۔ اس نے وہ پیکٹ بھیج نکالا۔

”کومل کا ریا ہوا گفت۔“ اس نے غور سے پیکٹ کو دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا اسے سمندر کے سپرد کر دے، مگر بس ایک لمحے کو یہ خیال آیا اور گزر گیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے رپہ رپہ کیا۔

”بہت ہی خوب صورت اور منگنی رسٹ وایج تھی، ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ۔“

”دیکھتے ہیں، یہ تعلق وقت کے ساتھ کمزور ہوتا ہے یا مضبوط۔“

”تعلق؟ کیا تعلق ہے ہمارا آپس میں، ایک اچھی فرزند شپ یا اس سے بھی آگے بڑھ کچھ؟ احمد الجھن میں تھا، وہ ابھی تک خود بھی اپنی فیملنگز ٹھیک سے

”کیا یہ میرے لیے صدے کی بات نہیں؟“ شانزے نے خود سے سوال کیا۔ اسے اپنی کیفیت پہ چیرائی ہو رہی تھی۔ رونا آ رہا ہے مگر آنسو نہیں آ رہے آٹھ میں۔

”یا پھر میں مینٹلی اتنی اسٹرونک ہو چکی ہوں کہ بڑے سے برا شاک بھی بغیر آنسوؤں کے سہ جاؤں۔“ وہ ڈرنک روم میں چلی گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود کو غور سے دیکھا۔

کچھ دیر پہلے جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا تو خود پر کسی بے حد خوب صورت مجسمے کا نگاہ ہوا تھا۔ ہر عیب اور شکن سے پاک، بے داغ سرپا، مگر اب اس مجسمے میں دراڑیں پڑنا شروع ہو چکی تھیں۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے جیولری اتارنی شروع کی، لباس تبدیل کر کے میک اپ صاف کیا اور بالوں کو مینڈ میں جکڑ کر ہر آگئی۔

”بتول!“ لاؤنج میں آکر اس نے بتول کو مخاطب کیا۔

”جی!“

”فرنیج میں کیک رکھا ہے۔ لے جانا، اپنے بیٹی کی برتھ ڈے پہ کٹ لینا اور ڈرائنگ روم میں ٹیبل صاف کر کے سارا کچر اڈسٹ بن میں ڈال دو۔“

بتول نے انجیسے سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا، کچھ پوچھنے یا کہنے ہمت نہ ہوئی۔

شانزے کچھ دیر وہیں بیٹھی جانے لیا سوچتی رہی، پھر بید روم میں آکر فرنیج کی ایک گولی پانی کے گلاس کے ساتھ بھاگی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اس وقت وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر ایک پُر سکون نیند چاہتی تھی۔ صبح اس کا آپیشل مارننگ شو تھا۔

\*\*\*

اچھا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی ویو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا تھا۔

”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

کچھ نہیں یاد رہا تھا۔

کیا شانزے کے ساتھ بڑھتی ہوئی دوری اسے کول سے قریب کر رہی تھی۔ کیسا عجیب تھا یہ بندھن، مجبوری کا یا مرضی کا؟

کتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا بلکہ اندھیرے میں تاحد نگاہ تک بس ایک سیاہی مائل سی چمکتی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ لہروں کا شور اور ہنگامہ اس پر سوار تھا۔ بلا خبر بڑے مضحل انداز میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

زندگی بہت عجیب سی ہو چلی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ اپنے کیرئیر کے لیے جدوجہد کی تھی، محنت کی تھی، ایک ساتھ مل کر خوشیوں کے اور کامیابیوں کے خواب دیکھے تھے، بہت سے خواب اک اک کر کے پورے ہوئے مگر دونوں کے آپس کے تعلقات اور خوشیوں میں بہت سی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے قریب رکھنے والی ایک دوسرے سے جوڑنے والی محبت کی، الفت کی نازک سی ڈور ہاتھوں سے پھسل جاتی رہی تھی۔

اور اگر کسی دن یہ ڈور پوری ہی ہاتھوں سے نکل گئی تو؟ احمد نے دانت پیچ کر بڑی تیزی سے موڑ کاٹا تھا، کار کے ٹائر چر چر اٹھے تھے۔



وہ گھر میں داخل ہوا تو پھر بھی جانے کیوں ایک مومہوم سی امید کا دیا اس کے دل میں روشن تھا۔

اس کی محبت کرنے والی بیوی ہر سال اسے سر پر انز دیتی تھی شاید آج بھی۔ کاش آج بھی۔۔۔ اپنی سوچوں میں الجھا الجھا وہ تھکا تھکا سالانہ منج میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کسٹل مندی سے اٹھ کر اس نے پانی نکال کر بہا۔

ریفریجریٹر کے منج پانی نے اسے اندر تک کافی چرسکون کر ڈالا تھا۔

پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ اس نے بچوں کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ کمرے کی نیلا گوں اور ٹھنڈی فضا میں دونوں بچے سو چکے تھے۔ احمد نے ایک نظر اپنی

گھڑی پر ڈالی۔

گیارہ بجتے والے تھے۔

”نامم بھی تو بہت ہو گیا آج۔“ اس نے سوتے ہوئے دونوں بچوں کو باری باری پیار کیا۔

دونوں ذرا کی ذرا کسمپاست احمد ان کو تھپک کر باہر آگیا۔ آہستگی سے دروازہ بند کیا۔

اپنے بیڈ روم میں آیا تو ایک منج مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

شانزے دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔

دل میں ٹھنڈا آس کا دیا یلغٹ بجھ گیا۔

نازک سی ڈور، دھیرے سے کچھ اور پھسل رہا تھا۔

بھولی بھری سی کوئی بازگشت کانوں میں گونجی۔

”تمہارا برتھ ڈے میری زندگی کا سب سے اسپیشل دن ہے۔ پتا ہے کیوں۔۔۔ کیونکہ تم دنیا میں آئے ہو تو مجھے ملے ہونا۔ تمہارا ساتھ میری خوش بختی ہے،

تمہارا دنیا میں آنا میری خوش نصیبی، بہت ہی مبارک دن ہے میرے لیے تمہارا برتھ ڈے، ہم ہر سال یوم الفت کے نام سے منایا کریں گے، ٹھیک ہے۔“

انہ وہ باتیں!

”اتنی جلدی فراموش کر گئیں سب کچھ؟“ احمد نے ایک شکایتی نظر شانزے کے خوب صورت

خوابیدہ چہرے پر ڈالی۔

پہنچ کر کے آؤا تر چھائیڈر لٹ گیا مگر کتنی دیر ہو گئی کرو میں بدلتے بدلتے، نیند کا نام و نشان تک نہیں

تھا۔ وہ بیڈ روم سے ملحق اپنی اسٹڈی میں چلا آیا۔

ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبائی اور دھیرے دھیرے کش لینے لگا، وہ عادی نہیں تھا، بس کبھی بکھار

جب بہت زیادہ ٹینشن میں ہوتا تو ٹرڈا دھواں اپنے اندر اتار تار تار۔

لیپ ٹاپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر چمکتے سمزدیگھ کر اس نے کال

ریسپونڈ کر لی۔

”ہیلو، کیسے ہیں آپ۔“

ہو رہی تھی۔ ایک فریق ایک قدم پیچھے ہٹا تو دوسرا دو قدم پیچھے ہٹ جاتا۔

شاز نے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھی۔ ازدواجی زندگی میں پھیلتا تھامی کا خاموشی کا فاصلوں کا خلا تیزی کے ساتھ بڑا ہوتا جا رہا تھا، وہ بے بسی سے اس بڑھتے خلا کو کھدکھدی رہی تھی۔

وہ ذہنی ابتری کا شکار تھی۔ بکھر رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ اپنا مارننگ شو ختم ہی کر دیتی مگر سارے مشکل حالات اور ہر کڑے لمحے میں ایک شخص تھا جو اس کے ساتھ ساتھ کھڑا تھا۔ اسے تسلی دینے کو، اس سے ہمدردی کرنے کو، اسے سارا دینے کو۔ فواد حسن اس کا غم گسار بھی تھا اور چارہ ساز بھی۔ تسلی و تشفی دینے کا ہر لفظ اسے ازبر تھا، زخموں پہ پھاسے رکھنے کے انداز اسے خوب آتے تھے، اسی کا دم تھا کہ وہ خود کو سمیٹ کر رکھنے کی اور معمولات زندگی جیسے تیسے جاری رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چائے کا کمرشل تھا۔ بہت محنت سے بنایا گیا تھا۔ سب نے ہی اپنی اپنی جگہ خوب محنت کی تھی۔ محنت تو کومل نے بھی بہت کی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ کمرشل اور ماڈل کو تھوڑی بہت پسندیدگی تو ملی مگر اس طرح ہٹ نہیں ہوا جیسے کہ سب کو خصوصاً کومل کو توقع تھی، اسے اپنی امیدوں کے پورا نہ ہونے پر خاصا دھچکا لگا تھا۔

اس کے چہرے پہ چھائے مایوسی کے رنگ احمد سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔  
”آج رات فارغ ہو؟“ احمد نے اسے کال کر کے پوچھا تھا۔

”ہاں، میری کیا مصروفیت ہوگی بھلا؟“ کومل کا لہجہ پھیکا پھیکا سا تھا۔

”آج ڈنر میرے ساتھ کرو گی؟“  
”اُس مائی پلہیزر۔“ کومل کے پھپکے سے لہجے میں خوشی کا رنگ بگ بگ گیا۔

”میں یک کرلوں گا تمہیں، کتنے بچے آؤں؟“  
”جب بھی آجاؤ میرا انتظار تو ابھی سے شروع ہو گیا“

”فائن اور تم سناؤ؟“  
”بس سوچا لوں کر کے پوچھ لوں گفت پسند آیا؟“  
”ہاں اچھا ہے۔“  
”صرف اچھا؟“ سن کر مایوسی ہوئی۔  
”بھر کن الفاظ میں تعریف کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔“

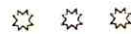
”لفظوں کے جادوگر تو آپ ہیں۔ ہم تو بس سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہنے والے لوگ ہیں؟“  
کومل ہنسی۔

”میں بھی سیدھے سادے انداز میں ہی اپنے بات کہتا ہوں پتا نہیں کیوں کسی کو جادوگری لگتی ہے، کسی کو ساحری۔“ احمد کا موڈ غیر محسوس طریقے سے خوشگوار ہونے لگا۔ تقریباً ”آدھ گھنٹے کومل سے بات کر کے اس نے فون آف کیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔

اس کی ہنسی میں اس کی باتوں میں کچھ تو تھا، اس کی اداسی، افسردگی سب کچھ اس ہنسی نے سمیٹ لی تھی۔  
دل کا بوجھ یکنشت غائب ہو گیا تھا۔

”کس رستے پہ قدم رکھ رہے ہو میاں صاحبزادے؟“  
اندھ سے کسی نے سرزنش کی۔ جب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کسی کی قربت اور ہم سفری کا احساس نہ ہو، آنکھوں میں اجنبیت اور رویے میں سرد مری اثر آئے تو ریتے بدل ہی جاتے ہیں۔ یہ تسلی شاید دل نے اسے دی تھی یہ دل بھی عجیب بے ایمان سا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ پرانے رستے کو چھوڑتے ہوئے دھڑک بھی رہا تھا اور نئے رستے پہ قدم رکھنے کے لیے ہمک بھی رہا تھا۔

”کیا صحیح ہے کیا غلط اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ میں سوچ سوچ کر خود کو کنیشن میں کیوں مبتلا کروں۔“ وہ خود غرض نہیں تھا مگر اس وقت خود غرضی کے ساتھ ساتھ سوچتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔



دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی، جو دن بدن گہری



”کیا؟“ احمد چونکا۔

”آپ کے ساتھ ڈنر۔“

وہ بے ساختہ مسکرایا۔

”چلو پھر اس اچھے کے بارے میں سوچو۔ بالکل فریش اور بھی فیس چاہیے تھے۔ نوٹیشن نوڈ پریشن“

احمد نے فون آف کیا اور کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔



وہ اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال رہی تھی جب فواد حسن تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف آیا۔ ہاتھ لبراکر اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ شانزے نے کار روکی اور شیشہ نیچے کیا۔

”کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟“ اس نے کچھ حیرانی اور پریشانی سے فواد کو دیکھا۔

”ہاں ہاں خیریت ہی ہے، تم پروگرام ختم ہوتے ہی اتنی جلدی بھاگ لیں۔ مجھے کچھ کہنا تھا تم سے۔“ وہ کھڑکی پہ دونوں ہاتھ جمائے جھکا ہوا اس سے مخاطب تھا۔

”بولو۔“

”تمہیں بتانے آیا تھا آج کا پروگرام بہت زبردست، بہت ہی شاندار کیا ہے تم نے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم جن کرانسنز سے گزر رہی ہو، اسے ایک طرف کر کے اتنی زبردست پرفارمنس بھی دے سکتی ہو،“

”یو آر نیلی آر پلیٹنٹ اینڈریو لیدی۔“  
”کبھی کبھی نہ بریلیٹن ہونا اپنے کچھ کام آتا ہے نہ بریو ہونا، بلکہ یہ دونوں باتیں بعض اوقات ہمارے گلے کا طوق بن جاتی ہیں۔ شانزے پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

”سب کچھ ہماری تھکنگ اور دے آف تھکنگ پر ڈھینکنڈا ہے، میرے نزدیک تمہاری یہ دونوں خوبیاں ایسی ہیں جو تمہارے گلے کا طوق نہیں بلکہ تمہارے پیروں میں پڑی زنجیروں سے آزاد ہونے میں تمہاری مدد کر سکتی ہیں۔“ فواد سنجیدگی سے گویا تھا۔

”ہے۔“ ابھی تو لیج ٹائم بھی شروع نہیں ہوا۔ اتنا لمبا انتظار کرو گی؟“

”میں اس سے بھی لمبا انتظار کر سکتی ہوں، آزما کر دیکھ لیں۔“ کومل نے معنی خیز انداز میں دعو کیا۔

”ہم آزمانے کے قائل نہیں ہیں، کوئی بھلامنس آزمائش پہ پورا نہ اترے تو؟“

”اور جو کوئی بھلامنس آزمائش پہ پورا اتر جائے تو؟“ کومل اسی کی ٹون میں بولی۔

”پھر تو اس کا انعام دیا ہے۔“

”مرضی کا۔ منہ مانگا انعام؟“

”بالکل۔“

”یہ انعام دے گا کون؟“ کومل نے سوال کیا۔

”یہ انعام لے گا کون؟“ احمد نے اسی کے انداز میں سوال کیا۔

”جو آزمائش پہ پورا اترے گا۔“ کومل کا جواب برجستہ تھا۔

”تو پھر انعام بھی وہی دے گا جو کسی کو آزمائے گا۔“ احمد کو نہ جانے کیوں اپنے مزاج سے ہٹ کر اس غیر سنجیدہ اور کسی حد تک بے سرو پا گفتگو میں مڑا رہا تھا۔

”ہم تو منتظر ہیں مگر۔“ کومل نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا۔

”کسی کسی انتظار میں بردا لطف ہوتا ہے۔“ احمد ذرا سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”کوفت بھی تو ہوتی ہے۔“ کومل نے ایک گہری سانس لی۔

”بے یقینی بھی ہوتی ہے، کسی انتظار میں مایوسی اور ناامیدی کی چھین بھی ہوتی ہے۔“ کومل کو یکایک یاسیت نے آن گھیرا۔

”ایک تو تم بڑی جلدی ملکہ جذبات بن جاتی ہو، اتنی جلدی نہ تو ناکام ہونا چاہیے نہ ہی مایوس۔ اب ابھی سے اچھا اچھا سوچنا شروع کرو تاکہ آگے بھی اچھا اچھا ہی ہو۔“ احمد نے نصائحانہ انداز اختیار کیا۔

”ایک اچھا نو رات میں ہونے والا ہے۔“

اب کچھ بھی تولد کو نہیں بھاتا تھا۔  
حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ احمد اور  
اس کے درمیان فاصلوں کی دراڑ بڑھ کر خلیج بن گئی  
تھی اور بڑھتی ہی جا رہی تھی، تلخ جھڑپیں اور لڑائی  
جھگڑے قسم ہو کر اب بات چیت بھی برائے نام ہی رہ  
گئی تھی۔ کوئل اور احمد کے بڑھتے ہوئے تعلقات اب  
دوستوں اور شناساؤں کی زبانوں سے آگے نکل کر  
اخبارات اور میگزینز کی چٹ پٹی خبروں کی زینت بن  
رہے تھے۔

کتنی دیر لان میں چل قدمی کر کے وہ اندر آئی تو  
ٹھنک گئی۔ خلاف معمول احمد تک سبک سے تیار  
ڈاننگ نیبل پر بیٹھا تھا۔ بول ناشتا بنا کر کچن سے لا  
رہی تھی۔

”آپ کا ناشتا بھی لے آؤں جی؟“ بول نے اس  
سے سوال کیا۔  
”بس ایک گلاس جوس۔“ شانزے کرسی گھسیٹ  
کر بیٹھ گئی۔

چھٹی کے دن کہاں کی تیاری ہے؟ احمد کو کن  
اکھیوں سے ایک نظر دیکھتے ہوئے اس نے سوچا مگر اتنا  
نے سوال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے نیبل پر  
پڑا تازہ اخبار اٹھالیا، مین پیج احمد کے پاس تھا۔ وہ  
دوسرے صفحے کھولنے لگی۔ ”معا“ احمد کی آواز اس کی  
سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ایک گھنٹہ بعد میری فلائیٹ ہے ملائیشیا کی۔“

شانزے کی سماعتوں پر جیسے کوئی بم پھوٹا تھا۔

”بہت جلدی خیال آگیا بتانے کا۔“ اس نے چھپتی  
ہوئی نظروں سے احمد کو دیکھا۔

”تم ملتی ہی کب ہو۔ صبح میرے اٹھنے سے پہلے جا  
چکی ہوئی ہو، رات کو سوئی ہوئی ہوئی ہو۔ کس وقت  
بتانا؟“

”موبائل کس مرض کی دوا ہے؟“ شانزے کی بات  
آدھی منہ میں ہی رہ گئی۔ وہ اب بے یقینی کے ساتھ  
اخبار کے اس اندرونی صفحے کو دیکھ رہی تھی جہاں شوہر  
کی چٹ پٹی خبریں چھپی ہوئی تھیں۔

شانزے کے دل کو کرب کی ایک لہر کاٹی ہوئی گزر  
گئی، کوئی بہت زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی مگر لگتا ہی  
تھا کہ وہ کوئی بہت بھولا بسا دور تھا جب ان دونوں کی  
شادی کے دن قریب تھے۔

”میں تو شادی کے بعد جب واب سب چھوڑ دوں  
گا“ احمد اکثر اسے چھیڑتا۔

”کیوں؟“ وہ کچھ خفگی اور کچھ پیار سے اسے گھورتی۔

”بس۔“

ابھی سے دل چاہتا ہے کہ

خوب صورت سی پیروں میں اک زنجیر ہو

گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا“

وہ ہنس پڑی۔

”ہیلو، کہاں کھو گئیں؟“ فواد کی آواز پر وہ چونک

پڑی۔

حال سے ماضی میں جانا تکلیف دہ تھا اور ماضی سے

واپس حال میں آنا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔

”اوکے“ تم جاؤ۔ دھیان سے جانا اور خیریت کے

ساتھ گھر پہنچنا، ٹیک کیہ۔“ فواد نے اس کے گم صم

چہرے کو دیکھ کر ہدایت کی۔

”اللہ حافظ!“ شانزے ایک گہری سانس لے کر

گاڑی اشارت کرنے لگی۔

فواد پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا، اس کے جانے کے بعد

بھی وہ کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔



آج چھٹی کا دن تھا۔ عموماً چھٹی کے دن وہ دیر سے

سو کر اٹھتی تھی۔ پورے پختے کی تھکن اور نیند ان دو

دنوں میں ہی پوری ہوتی تھی، مگر اب تو کئی ہفتوں سے

چھٹی کے دن بھی سو رہے آٹھ گھل جاتی اور پھر

کروٹیوں پر کروٹیں بدلتے پر بھی نیند آنے کا نام نہیں

لیتی تھی، وہ آٹھ کر بیٹھ جاتی یا ہر لان میں نکل جاتی، ننگے

پاؤں چل قدمی کرتے ہوئے کتنے ہی چکر لگاتی۔

آنکھوں کو تراوٹ بخشتا سبزہ رنگ و خوشبو لاتے پھول،

اس کی زندگی اور یہ گھر یہ گھر جسے میں نے بڑے اربانوں سے بنایا تھا، جس کے لیے اتنی جان ماری، اتنی قربانیاں دیں۔ شادی اس نے کی ہے اور گھر کی تباہی کا الزام مجھ پر کیا خوب لطیفہ ہے۔

شانزے فواد حسن کے سامنے پھٹ پڑی۔ وہی ایک تھا اس کا رازدار، غم گسار، وگر نہ دوست تو بہت تھے مگر ہر ایک کے سامنے اسے اپنے دکھ رونے کی عادت نہیں تھی۔

”یہ تو ہونا ہی تھا اک دن۔“ فواد ترم سے اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”اب“ اب کیا کرو گی تم؟“ فواد نے بدستور اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے پاس کیا آپشن ہے کچھ کرنے کے لیے؟“ شانزے نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بدلتے پتچھے دھکیلا۔

”جو آپشن احمد کے پاس تھا، وہی تمہارے پاس بھی ہے۔ وہ اپنے لیے نئے راستے“ نئے لوگ جن سکتا ہے تو تم بھی۔“ فواد حسن نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے رد عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”نئے راستے نئے لوگ؟“ شانزے کو جیسے چند لمحے لگے تھے اس کی بات سمجھنے کے لیے۔

”تو کیا بنی ہوئی زندگی گزارو گی؟ کمپوز وائز کرو گی؟“ فواد نے اناس سے سوال کر ڈالا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ شانزے نے قسطیت کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

”کچھ بھی ہو، تم کچھ بھی کرو، خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔ زندگی کے ہر لمحے اور مرحلے پر میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ فواد کی بات پر شانزے چونک کر اسے دیکھا۔

”احمد بہت بد نصیب ہے، تمہاری قدر نہیں کر سکا۔“ چند لمحے بعد وہ پھر دھیرے سے بولا تھا اور شانزے یک تک اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ آج تک اسے ایک دوست اور بہت اچھا دوست سمجھ کر اپنے معاملات شیر کرتی چلی آئی تھی مگر اس وقت

اس کی بے یقین نظرس تیزی کے ساتھ اخبار کی سطروں پر پھسل رہی تھیں۔

”ابھرتی ہوئی ماڈل کو مل خان اور معروف ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک احمد مغل کی بڑھتی ہوئی دوستی اور قربت رشتہ ازدواج میں بدل گئی۔ شنید ہے کہ ہنی مون کے لیے دونوں نے ملائیشیا کا انتخاب کیا ہے۔“ آگے اور جانے کیا کیا لکھا ہوا تھا۔ شانزے کی نظرس دھندلانے لگیں۔

”اس لیے جا رہے ہو ملائیشیا؟“ شانزے نے شوہر کی خبر والا وہ صفحہ اس کے سامنے پنچا۔

احمد نے پہلے تو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک نظر اسے دیکھا۔ ایک نظر اخبار کو، پھر وہ صفحہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

جیسے جیسے وہ بڑھتا جا رہا تھا اس کے ماتھے کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔ ”واٹ ریش!“ اس نے طیش میں اخبار ایک طرف پھینکا۔

”پتا نہیں کیا کیا کیواسی چھاپتے رہتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ بڑبڑایا۔

”کچھ کیواسیس ج بھی ہوتی ہیں۔“ ”مگر یہ جھوٹ ہے۔“ وہ غزبایا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارے اس جھوٹ پر یقین کر لوں گی؟“ شانزے کا پورا وجود جیسے کسی طوفان کی زد میں تھا۔

”تمہیں یقین کرتا ہے کرو، نہیں کرنا تو مت کرو۔“ وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر تن فن کر نکلا ہوا گیا۔

”ہمت ہے تو جیج کا سامنا کرو۔ میدان چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے ہو۔“ شانزے حلق کے بل چلائی۔

”یہ میدان نہیں۔ میری زندگی اور گھر ہے جسے میں نے بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا مگر تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔“ وہ لب بھینچے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر لمبے لمبے دُک بھرتا ہواں سے چلا گیا۔



”وہ کہتا ہے، میں نے۔ میں تباہ کر دیا ہے سب کچھ“



بنائے میں ماہر ہیں۔“ احمد بڑبڑایا۔  
 ”کول ڈاؤن احمد! شوز میں آنے اور رہنے کی قیمت  
 تو چکانی پڑتی ہے۔ یہ اسکینڈلز بھی اسی قیمت کا ایک  
 حصہ سمجھ لو اور ویسے بھی۔“ کول ایک لمحے کو رکھی۔  
 ”رانی ہوتی ہے تو پہاڑ بننا ہے نا۔“

”رانی اور پہاڑ کے وجود میں زمین آسمان کا فرق ہوتا  
 ہے۔“ احمد نے اسے بتایا۔

”آف کورس!“ کول نے کندھے اچکائے۔  
 ”ویسے اگر تمہیں یہ نیوز یا گوسپ اتنی ہی بری لگتی ہے  
 تو تم ڈینائے کر سکتے ہو۔“ وہ گزرتے دنوں میں کافی بے  
 تکلف ہو گئی تھی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے ان بکھیروں میں الجھنے کی،  
 آج میں تروید کر دوں کل کو یہ صحافی اس کا بھی یقین  
 نہیں کریں گے اور پھر کچھ نہ کچھ چھاپ دیں گے۔ یہ  
 لوگ ہر معاملے، ہر شخص کو شک کی عینک لگا کر دیکھتے  
 ہیں۔ انہیں ہمیشہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا نظر آتا  
 ہے۔“ احمد نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

”بائی داوے، یہ ڈینائے تو تم بھی کر سکتی ہو، تم کیوں  
 نہیں کر دیتیں یہ نیک کام؟“  
 ”کیونکہ مجھے یہ خبر ہی نہیں لگی۔“ کول بیگ  
 کندھے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا مطلب؟“ احمد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
 ”کم آن احمد! تم بچے نہیں ہو، نہ ہی مین ایجر سوچنا  
 ضرور۔“ وہ ہائے کستی ہوئی مسکرا کر نکل گئی اور احمد نہ  
 جانے کیوں متحیر سا بیٹھا رہا۔

یہ تو ہونا ہی تھا دوستی اور بے تکلفی نئی منزلوں کی  
 طرف اشارہ کر رہے تھے کول نے کھل کر اظہار کر دیا  
 تھا مگر وہ خود کیا کر رہا تھا۔

کیا وقت گزاری؟

یا پھر اپنی ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں  
 سے فرار کی ایک غیر شعوری کوشش؟  
 وہ سوچتا رہا اور اپنے آپ سے الجھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

شاز نے اپنے بیڈ روم میں تھی۔ بچے ٹیوٹر سے پڑھ

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس دوستی نے یکایک  
 ایک نیا رخ، ایک نیا انداز اختیار کر لیا ہو۔  
 زندگی کب، کس وقت، کیا سے کیا ہو جاتی ہے، کچھ  
 پتا نہیں چلتا، شاز نے بے اختیار ایک گہری سانس  
 لیتے ہوئے سوچا۔

”فواد! میں اس وقت بہت پریشان اور بہت الجھی  
 ہوئی ہوں۔ تم پلیز ایسی کوئی بات مت کرنا، جس سے  
 میری الجھنوں میں اضافہ ہو۔“

”میں تمہاری الجھنوں اور پریشانیوں کو بڑھانا نہیں،  
 انہیں بانٹنا چاہتا ہوں۔“

”بہت بڑا دعوا کر رہے ہو۔“ شاز نے بغور  
 اسے دیکھا۔

”آزما کر دیکھ لو۔“ فواد نے چیلنج کیا۔

شاز نے فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

احمد لائینا سے واپس آیا تھا۔ دونوں کے درمیان  
 تناؤ اور سرد مہر کی دیوار اونچی سے اونچی ہوئی جا رہی  
 تھی۔

کیا جگ تھا کیا چھوٹ۔

کیا حقیقت تھی، کتنا فساد تھا۔

نہ احمد نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی نہ  
 شاز نے اس سے کوئی وضاحت طلب کی۔  
 کول نے بھی یہ خبر پڑھی اور احمد کے سامنے ہنستے  
 ہنستے دوہری ہو گئی۔

”اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ احمد نے انتہائی  
 سنجیدگی سے اس کے گلابی ہونٹے چہرے پہ نظریں  
 جمائیں۔

”اوہ سوری، آرم سوری! مجھے بس یہ سوچ کر ہنسی آ  
 رہی تھی کہ ہمارے فیوچر کے بارے میں بھی ہم سے  
 پہلے ان میڈیا والوں نے فیصلہ کر دیا ہے۔“ کول اسے  
 سنجیدہ دیکھ کر اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے  
 لگی۔

”ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے۔ رانی کا پہاڑ

لاؤنج دونوں کی ہنسی اور آوازوں سے گونج رہا تھا۔  
جب احمد آیا۔

بڑی خالہ سے وہ بھی بہت اچھے طریقے سے ملا۔ پھر  
معذرت کر کے اٹھ گیا۔ فریش ہو کر، چھینچ کر کے،  
دوبارہ واپس آیا اور ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔  
”میں ذرا بتول کو دیکھ لوں۔“ شانزے پکن میں چلی  
گئی۔

احمد کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی اس نے،  
ایک سرومیری تھی جو اس کے دل اور پورے وجود پر  
چھائی ہوئی تھی۔

خالہ نے اس کے اس طرح اٹھ جانے پر ایک گہری  
سانس لی تھی۔ احمد کا چہرہ بے تاثر تھا، کچھ بتا نہیں چل  
رہا تھا۔ وہ بے حد نارمل ہو کر بڑی خالہ سے باتیں کر رہا  
تھا۔

”آج کاؤنرا اسپیشل ہونا چاہیے۔ کسی چیز میں کوئی  
کمی نہ ہو، ٹھیک ہے۔“

وہ یونہی بتول کو مدایت دے رہی تھی۔ حالانکہ وہ  
اچھی خاصی ماہر تھی شاید، یہ شکایت کا موقع دیا ہو۔  
”آپ اطمینان رکھیں میڈم جی! نہ آپ کو کوئی  
شکایت ہوگی، نہ بڑی بیگم صاحبہ کو۔“ بتول بڑے  
انہماک سے ڈنر کی تیاری میں مگن تھی۔

شانزے کچھ دیر بے مقصد وہیں کھڑی رہی، پھر باہر  
آگئی۔

”مہاجان! آپ رست کر لیں کچھ دیر۔“ احمد کو نظر  
انداز کر کے وہ بڑی خالہ سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں، میں شاور لوں گی، مگر ابھی نہیں تھوڑی دیر  
میں۔“

”اچھا، میں ابھی آتی ہوں۔“ شانزے کھڑے  
کھڑے ایسے غلبت میں بولی جیسے جی بچ کوئی بہت  
ضروری کام ہو۔

خالہ نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔  
احمد کو آئے اتنی دیر ہو گئی تھی اور شانزے نے  
اسے مخاطب کیا تھا نہ ہی احمد نے اس سے کوئی بات کی  
تھی۔ خالہ جان کے لیے یہ بڑے اچھے کی بات تھی۔

رہے تھے۔ مضحل کی وہ یونہی آنکھیں بند کیے لیٹی  
جانے کیا کیسوچ رہی تھی۔ ماضی کے بارے میں، حال  
کے بارے میں، مستقبل کے بارے میں۔

وہ اپنے خیالات میں کم تھی جب ایک مانوس آواز  
پر چونک اٹھی۔ وہ میٹھی، محبت بھری آواز لاؤنج سے  
دوبارہ آئی تو وہ بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ تقریباً ”بھاگتے  
ہوئے وہ لاؤنج میں آئی تھی۔

بڑی خالہ کا مہمان چہرہ سامنے تھا۔ وہ دوڑ کر ان کی  
بانسوں میں ساگئی۔

”خالہ آپ۔۔ اچانک کیسے؟“ شدت جذبات سے  
اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ صرف بڑی خالہ ہی  
نہیں بلکہ اس کی ماں بھی تھیں۔ دو سال کی عمر میں اپنی  
ممی کی وفات کے بعد وہ خالہ کی گود میں آگئی تھی اور  
انہوں نے خالہ کے ساتھ ساتھ ماں ہونے کا بھی پھر  
پورا حق ادا کیا تھا۔ شانزے کی شادی کے بعد وہ کینڈا  
اپنے بڑے بیٹے کے پاس شفٹ ہو گئی تھیں۔ ابتدا  
میں شانزے کا ان سے مستقل رابطہ رہا تھا، پھر وقت  
کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں اور مصروفیات بڑھیں تو  
اس رابطے میں کمی آنے لگی، پھر بھی دو چار مہینوں بعد  
خیر خیریت دریافت ہو ہی جاتی تھی۔

آج انہیں اچانک یوں اپنے روپو پر کر شانزے کی  
خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

”کیسی ہو میری جان؟“ ایک گرم جوش اور بھرپور  
معانقہ کے بعد انہوں نے شانزے کی پیشانی بڑی  
محبت کے ساتھ چومی۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ سائیں، اتنی ویک کیوں ہو  
گئی ہیں؟“ شانزے نے بیک وقت انہیں غور اور  
تشویش سے دیکھا۔

”ویک؟ ارے بھئی پاکستان آنے کے لیے  
اسپیشلی ایکسپریس سائز کر کے فائبر کے جی ویٹ لوڑ کیا  
ہے۔ میری اسمارٹ نیس کو ویک نیس تو نہ کہو۔“ خالہ

نے زندہ دلی سے بھرپور انداز میں بھاگتی کو دیکھا۔  
”اوہ سوری، غلطی ہو گئی۔“ شانزے دونوں ہاتھوں  
سے اپنے کان چھو کر دل سے ہنسی تھی۔

خاصی تکلیف ہوئی مجھے۔“ خالہ جان نے صاف گویٰ کامظاہر کیا۔

”جاہل عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے منہ سے ہنسنے لگے گی بنیادیں ڈھاکر اس پر اپنے کامیاب گیر کی بنیاد رکھتی ہے۔“ وہ دوبارہ بولیں تو شانزے چند لمحے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی۔

”آپ مجھے ہلیم کر رہی ہیں ماما!“

”نہیں! میں فقط جاہل عورت کی اصطلاح کی وضاحت کر رہی ہوں۔“

”کیا عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کا اپنے ہنر کا اظہار کر سکے؟ کام میں لاسکے۔ عزت، دولت اور شہرت کے سفر میں عورت اگر مرد سے آگے نکل جاتی ہے تو مرد کی انا سے برداشت نہیں کر پاتی۔ وہ فوراً اسے گھرداری کے نام پر پنجرے میں کیوں قید کر دیتا چاہتا ہے؟“ شانزے نے بارہو سوال کر ڈالے۔

خالہ جان کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھریں۔

”میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟ ایک طرف تم یہ بتا رہی ہو کہ وہ کسی ماڈل سے شادی کر چکا ہے یا کرنے والا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤ۔“

”وہ کئی سالوں سے یہی چاہ رہا تھا کہ میں شوہر چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بچے ہالوں، گھر سنبھالوں۔ پہلے دبے لفظوں میں کہتا تھا پھر واضح لفظوں میں کہنے لگا۔ بہت پریشانز کیا مجھے، مگر میں نہیں مانی، پھر کوئل والا معاملہ شروع ہو گیا۔ سننے میں تو یہی آیا ہے کہ دونوں نے شادی کر لی ہے مگر کفرم نہیں ہوا ابھی۔“

”تم نے احمد سے بات کی اس معاملے پر؟“ خالہ نے سوال کیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے اس سے کچھ پوچھنے کی یا بات کرنے کی۔ چور کب اعتراف کرتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے؟ ایک نہیں دس شادیاں کر لے میری طرف سے۔ بھاڑ میں جائے مجھے کیا۔“ شانزے کا لہجہ پھنکاریں مارنے لگا۔

خالہ نے ایک گہری سانس لی۔

رات کو وہ اپنے بیڈ روم کے بجائے خالہ جان کے ساتھ گیسٹ روم میں تھیں۔ ان کے استفسار کرنے پر شانزے نے انہیں اپنی پوری رام کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ حیران ہوئیں مگر نہایت تنجید کی سے سب کچھ سنا۔

”احمد تو بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار لڑکا تھا، اسے کیا ہو گیا۔“ خالہ جان دھیرے سے بڑبڑائیں۔

”یہ وہ احمد نہیں ہے جسے میں جانتی تھی، آپ جانتی تھیں۔ یہ تو کوئی اور ہے بالکل اجنبی سا۔ جسے میں بھی بری لگتی ہوں، میرا فیم، میری کامیابی، میرا گیر اسے سب کچھ برا لگنے لگا ہے۔“ شانزے بھٹ پڑی۔

”مگر کیوں؟“ خالہ نے بے یقینی سے آنکھیں پھاڑیں۔

”بس، وہی سبیل شاؤنزم، میں کم کر رہا ہوں، کافی ہے تم گھر بیٹھ کر بچے پالو، گھر کو دیکھو، ہونہ! میں تو اپنے اچھے بھلے گیر پر لات مار کر گھر بیٹھ جاؤں، جاہل عورتوں کی طرح گھرداری کروں، اس کے بچے پالوں اور یہ باہر جود مل چاہے کرتا رہے، دوستیاں کرے، افسر چلائے یا شادی کرے، مرد کو ہر بات کی آزادی ہے۔“

کئی دنوں سے شانزے کے اندر پکنا ہوا لاوا آج پھٹ کر بہ نکلا تھا۔

”شانی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ گھرداری کرنے والی عورتیں جاہل ہوتی ہیں؟“ خالہ نے بے حد تاسف سے اسے مخاطب کیا۔

”جن عورتوں میں باہر نکل کر کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی وہ گھر میں بیٹھ کر گھرداری نہیں کریں گی تو اور کیا کریں گی۔“ شانزے نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں انہیں جواب دیا۔

”تمہاری اس بات پر کئی کھنٹے بحث ہو سکتی ہے کہ بچوں کو پالنے پونے، اچھی تربیت کرنے اور طریقے، سلیقے سے گھر گریہتی کی ذمہ داریاں نبھانے والی عورت معاشرے کی کتنی باصلاحیت اور کارآمد رکن ہوتی ہے۔ ویسے تمہارے منہ سے اس طرح کی بات سن کر



تھیں۔

شانزے اس کی نظروں اور باتوں کے مفہوم خوب سمجھتی تھی مگر غریب خیال اس کی واضح حوصلہ افزائی سے گریز کر رہی تھی۔

”تانیہ بلال کی پارٹی میں آؤ گی کل؟“ فواد نے خود ہی موضوع بدلا۔  
”مشکل ہے۔“  
”کیوں؟“

”بتایا تو تھا تمہیں، میری امی آئی ہوئی ہیں کینڈا سے۔ آج کل میرا جتنا بھی فاس وقت ہے ان کے لیے ہے۔“

”دکب واپس جائیں گی یہ محترم خاتون؟“ فواد نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”فوانسہ!“ شانزے نے اسے آنکھیں دکھائیں۔  
”مذاق کر رہا ہوں یا ر! تم سیریس مت ہو۔“

”اچھا ہوا تم نے بتا دیا کہ مذاق کر رہے ہو۔ ورنہ میں تو سیریس ہونے والی تھی۔“ شانزے نے ہنسنے ہوئے ذومعنی بات کی۔

”میری ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ کچھ معاملات میں میں واقعی بالکل سیریس ہوں۔ بلوی۔“ فواد نے فوراً اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ایک بار بھروسا ٹوٹ جائے تو کسی پر بھی یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ شانزے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”چلتی ہوں۔“ اس نے اپنا موبائل بیگ میں ڈالا۔  
”ایک شخص پر سے بھروسا اٹھ جائے تو کیا ساری دنیا بے اعتبار ہو جاتی ہے؟“ فواد نے بھی سنجیدگی سے سوال کیا۔

”کبھی کوئی ایک شخص ہی ہماری پوری دنیا اور کل کائنات ہوتا ہے۔ اس سے اعتبار ختم ہو جائے تو سمجھو ساری دنیا سے بھروسا اٹھ جاتا ہے۔“ شانزے نے ہشکل مسکراتے ہوئے اسے بانے کما اور باہر نکل گئی۔

”شانہ بیٹا! گھر بیٹا آسان نہیں ہوتا۔ بہت وقت اور محنت لگتی ہے مگر بڑے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ تم نے اتنی آسانی سے، اتنے آرام سے سرینڈر کر کے خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا؟“

”میں نے سرینڈر نہیں کیا۔“ شانزے نے تیزی سے جواب دیا۔ ”اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے آگے روؤں گی یا گڑگڑاؤں گی تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ میں کسی بھی لحاظ سے نہ اس سے کمزور ہوں نہ کم تر نہ نئے راستے تلاش کر سکتا ہے تو نئی راہیں میرے لیے بھی کھلی ہیں۔“ نادانستہی میں وہ فواد حسن کی کھی ہوئی بات اپنی زبان سے دہرا رہی تھی۔

”تم آج بھی اتنی ہی جذباتی اور بے وقوف ہو، جتنی شادی سے پہلے تھیں۔“ خالد جان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے بڑے آرام سے تبصرہ کیا۔

”اب سو جاؤ، باقی باتیں کل کریں گے، میں بہت تھکی ہوئی ہوں، نیند آرہی ہے اب۔“  
”اچھا ٹھیک ہے، آپ آرام کریں، گڈ نائٹ۔“ شانزے نے جھٹ ان کی بات مانی۔

”گڈ نائٹ!“ خالد جان نے آنکھیں موند لیں۔ وہ تو شاید فوراً ہی سو گئی تھیں مگر شانزے کو نیند کی مہربان بانہوں نے بہت دیر میں لیا۔



”تمہارا ڈریس بہت اچھا ہے آج، کافی کول لگ رہے ہو۔“ شانزے نے کھلے دل سے فواد کی تعریف کی۔  
”سفید اسٹائلش کرتا شلوار میں وہ واقعی بہت فریش اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔“

”یہ ڈریس... وہ ہنسا۔“ گفت ہے۔  
”ڈریس ڈیرائنسو سے فرینڈ شپ کے یومی بنی فٹنس ہیں۔ ویسے نیہما کا دوئی بڑی مہربان ہیں آج کل تم پر۔“ شانزے نے مسکراتے ہوئے اس پر غور کیا۔

”وہ مہربان ہو تو ہو۔ ہم تو کسی اور کی نظر عنایت کے منتظر ہیں۔“ فواد کا لہجہ گہمیر ہو گیا۔ اس کی والدہ انہ اور پُرشوق نظریں شانزے کے خوب صورت چہرے پر جمی



فرائض صرف میرے حصے میں آئے ہیں۔ یہ کون سا اصول ہے؟ اور آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ دوسری شادی کر کے وہ خود اپنے بیوی بچوں کے کون سے حقوق ادا کر رہا ہے۔“ شانزے نے بولنا شروع ہوئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

”مجھے یقین نہیں ہے کہ احمد ایسا کر سکتا ہے۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

”یہی یقین، بھروسہ اور اعتبار ہی تو ہمیں مار ڈالتا ہے۔“ شانزے کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

”چپ رہنے سے غلط فہمیاں اور دوریاں بڑھتی ہیں۔ وہ تم سے خفا ہے تم اس سے خفا ہو۔ بات کرو تو مسائل کا کوئی حل نکلے۔“ خالہ نے دھیمے دھیمے اسے سمجھاتے ہوئے تجویز دی۔

”ہم اتنی دور جا چکے ہیں ایک دوسرے سے کہ نہ میں اسے نظر آتی ہوں نہ وہ مجھے نظر آتا ہے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔ وہ اب بھی تمہارے قریب ہے۔ اسے دیکھو تو محسوس تو کرو۔“

”یہ وہم مجھے پہلے تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اب تو ساری خام خیالی اور غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔“ شانزے کے چہرے پہ درد و کرب کے سائے پھیل گئے۔

”تم کیا فیصلہ کرنے والی ہو؟“ خالہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، جیسے اس کا فیصلہ اس کے چہرے اور خدو خال میں نہیں چھپا ہو۔

”فیصلہ تو تقدیر کرے گی، میرے اختیار میں کیا ہے۔“ شانزے نے محول مول جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پہ ابھن اور کشمکش کے آثار اس کی اندرونی حالت کی نگاہی کر رہے تھے۔



”یہ آنکھ پھولی کب تک رہے گی احمد! تم کوئی فیصلہ کہہ کیوں نہیں دیتے۔“ اپنی گداز گوری کلائی میں ننگن گھماتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

”فیصلہ؟“ احمد نے کسی حد تک بے بسی سے اسے

رات۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے خالہ نے جو کچھ کہا اسے سن کر شانزے اچھل پڑی۔

”آپ نے احمد سے بات کی ہماری ریلیشن شپ کے بارے میں؟ کیوں آپ سے کس نے کہا تھا اس شخص کے آگے گڑگڑانے کو؟“ شانزے بیک وقت صدمے اور حیرانی کی کیفیت سے دوچار ان سے مخاطب تھی۔

”پہلی بات تو یہ کہ میں نے احمد سے صرف بات کی تھی نہ اس کے آگے گڑگڑائی ہوں نہ کسی قسم کی کوئی ریکویسٹ کی ہے اور جہاں تک تمہارے ”کیوں“ کا سوال ہے تو یاد رکھو میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا گھر اور زندگی آباد دیکھنا چاہتی ہوں میں۔“

”میں نے بھی تو یہی کوشش کی تھی مگر میں ایسی کب تک اس گاڑی کو کھینچتی رہوں۔“ تھک گئی ہوں۔ بے زار ہو گئی ہوں میں۔ جب اسی نے ہاتھ چھوڑ کر راستہ بدل لیا تو میں کیوں اس کے پیچھے پیچھے اس کی ہمراہی کی بھکھا لگوں۔“ شانزے نے چیخ مچی۔

”احمد کا کہنا ہے کہ تمہارے رویے نے اسے تم سے دور کیا ہے، بقول اس کے بچے بہت ننگلیکٹ ہو رہے ہیں، وہ مرد ہے، اس کی ذمہ داریاں اور فرائض کا دائرہ گھر سے باہر ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں اور فرائض کا دائرہ گھر کے اندر ہے، انہیں نبھاتے ہوئے اپنے کیریر کو بنانا، یا اصلاحیتوں کا اظہار کرو، مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔“

”آپ بھی اسی کی زبان بول رہی ہیں خالہ۔“ شانزے ان کی بات کاٹ کر نخعی سے گویا ہوئی۔

”وہ غلط نہیں ہے بیٹا! اس وقت تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”بچوں کی اور گھر کی ساری ذمہ داریاں اٹھا تو رہی ہوں۔ سارے فرائض نبھا رہی ہوں اب اور کیا کروں؟ گھر پہ بیٹھ کر روٹی ہنڈیا کروں، جھاڑو پوچھا لگاؤں یا کپڑے دھوؤں۔ بتائیے میں کیا کروں گھر ہم دونوں کا ہے، بچے ہم دونوں کے ہیں، لیکن ذمہ داریاں اور

احساسات سے بے خبر اس کی سنے بغیر اپنی اپنی جا رہی تھی۔  
”اور بچے؟“ احمد کی کچھ سوچتی ہوئی نظریں کو مل پر مرکوز ہو گئیں۔

”واٹ ڈیو مین! کیا بچے تم رکھو گے اپنے پاس؟ کیا وہ اگیری ہے اس بات کے لیے؟“ کوئل کو اس کے سوال سے خاصا دھچکا لگا تھا۔

”ہو سکتا ہے میں ہی رکھ لوں اپنے بچوں کو؟ پھر؟“  
”میرا نہیں خیال کہ تمہاری مزرائی آسانی سے بچوں کو تمہارے پاس رہنے دے۔ ایک ماں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے یہ سب۔“ کوئل نے نفی میں سر ہلایا۔

”میری مسز کے لیے یہ سب بہت آسان ہے۔“  
احمد پلک چمکے بنا اس کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔  
”میں تو فی الحال کئی سال تک اپنے بچے بھی پالنے کے موڈ میں نہیں ہوں تو۔۔۔“ کوئل نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کا مفہوم عیاں تھا۔

”ڈونٹ مائنڈ احمد! بچوں کو جو بیار ان کی سگی ماں دے سکتی ہے۔ جیسے وہ ان کی کیر کر سکتی ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مجھ سے اس قسم کی کوئی ایکسپیکٹیشن نہیں رکھنا۔“ کوئل نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

”ہوں! احمد نے لب بٹھینچے۔  
کوئل کا موڈ کچھ خراب سا ہو گیا تھا۔ وہ شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی اور احمد اس کے چہرے کو۔



آج چار لڑکیاں کافی دیر لگ گئی۔ بالوں کو نئے انداز میں ترشوا یا تھا پھر اپنی معمول کی بیوٹی ٹرینٹ، گھر پہنچی تو بچے اور خالہ کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”آئم سوری۔ ویری سوری! میری وجہ سے آپ کو وٹ کرنا پڑا۔ حالانکہ اتنی جلدی جلدی مچائی میں نے“  
پھر بھی دیر ہو گئی۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ نہ جانے کیوں اتنا الجھا ہوا اور متذبذب تھا۔ اپنی مرضی سے دریا میں اترا تھا، اب دزدیدہ نظروں سے اس ساحل کو دیکھ رہا تھا جہاں سے اس دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔

وہ تو ہمیشہ ہر معاملے میں بہت کلیئر رہا تھا، زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک مبہم اور غیر واضح رستے کا انتخاب کر بیٹھا تھا، جس پر وہ چل بھی رہا تھا۔ اتنا بے بس اور بے اختیار تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔  
”اب کیا سوچنے لگے؟“ کوئل نے جیسے آگے سوال کیا۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ احمد نے گیند اس کے کورٹ میں ڈالی۔

”وہی جو تم چاہتے ہو۔“ کوئل کا جواب فوری اور برجستہ تھا۔

”میں کیا چاہتا ہوں؟“ احمد نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔

شانزے اور اس کی محبت کی دوری نے اسے کوئل سے قریب کر دیا تھا۔ مگر اس دوستی اور قربت میں محبت کہیں نہیں تھی؟ اپنے سکون اور خوشی کے لیے وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا بھی لیتا مگر بچوں کا خیال آتے ہی اس کے قدم وہیں رک جاتے۔

”اس سارے معاملے میں بچوں کا کیا قصور ہے؟“  
ہر خیال کی تان یہیں آکر ٹوٹ جاتی اور وہ بے بسی سے خود کو دیکھتا رہتا۔

”لوگوں کی گوسب سے تنگ آگئی ہوں میں۔ نیوز میں آئے دن ہمارے بارے میں کچھ نہ کچھ آتا رہتا ہے۔ میں تنگ آگئی ہوں اس سب سے۔“ وہ بھی چھینچھلا گئی تھی، حالات کی لمبی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”شانزے کو کب ڈائیس کر رہے ہو؟“ کوئل نے اس کی سماعتوں پر ایک ہم پھوڑا تھا۔

”میں اپنی محبت کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتی۔ وہ تمہاری زندگی سے نکلے گی تب ہی میں تمہاری لائف میں آؤں گی۔“ کوئل اس کے



”ہم بس ابھی ابھی ہی بیٹھے تھے“ خالہ جان نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالا۔ شانزے نے بچوں سے پوچھ کر انہیں چاول دیے اور خود اپنے لیے سلاڈ نکالا۔ ”کھانا کھاؤ تھیک سے۔ یہ کیا کھا رہی ہو؟“ خالہ نے اسے ٹوکا۔

”خالہ امی! چار پونڈ وزن بڑھ گیا ہے میرا۔ کھانے پینے میں پرہیز کیا۔ پھر کافینو بڑھ کر آٹھ بارہ اور سولہ بھی ہو سکتا ہے۔“ شانزے نے کھیرے کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسا اور منہ تک لے گئی۔

کھانے کے بعد خالہ اپنا چائے کا کپ اور شانزے گرین پی ٹی کا کپ لے کر بیٹھ گئیں۔

”کی وی دیکھیں گی؟“ صوفیہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے شانزے ریوٹ ہاتھ میں لیا۔

”میں یہاں کی وی دیکھنے نہیں آئی۔ ہٹاؤ اسے!“ خالہ نے کچھ کوفت اور کچھ بے زاری سے کہا۔ ”تم لوگوں کو دیکھنے، ملنے اور باتیں کرنے آئی ہوں۔“ انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”کیا ہوا؟“ شانزے کو لگا کوئی خاصی بات ہے۔

”شانو بننا! میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔“ خالہ نے ایک توقف کے بعد آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

”احمد کو تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے تم سے دور

کیا ہے، تمہارے اس زعم نے اسے راہ بھٹکنے پر مجبور

کیا کہ تمہارے جیسی کامیاب کیریئر وین کو شوہر کی

کوئی خاص پروا اور ضرورت نہیں ہوتی۔“ خالہ امی

نے اسے آئینہ دکھایا۔

”اچھا!“ وہ تختی سے مسکرائی۔

”میں نے مان لیا کہ مجھ میں بہت ساری برائیاں

ہیں، خامیاں ہیں مگر کیا ان سب کا حل یہی ہے کہ وہ

کسی اور کی باتوں میں جھولنے لگے! پھر مجھے نچا دکھانا،

سبق سکھانا مقصود ہے۔ عورت اپنے شوہر کے

ہاتھوں شاید ہر قسم کی ذلت برداشت کر لے مگر یہ ذلت

بہسی برداشت نہیں کر سکتی جسے بے وفائی کہتے ہیں۔“

شانزے کے خوب صورت چہرے پر غصہ بھی تھا،

برہمی بھی اور بے بسی بھی۔

”احمد راستہ بھٹکا ضرور ہے مگر راستہ بدلا نہیں ہے

اس نے سنہ وہ عیاش ہے نہ بے وفائے اور۔۔۔“

”لوگ جو کچھ بتاتے ہیں اس کے متعلق وہ جھوٹ

ہے؟“ میگ لینز میں جو کچھ چھپتا ہے اس کے اور کو مل

کے متعلق وہ سب کو اس ہے؟“

”لوگ رائی کا ہٹاؤ بھی تو بناتے ہیں۔“ خالہ

مسلل احمد کا دفاع کر رہی تھیں۔

”رائی کا وجود ہوتا ہے تو ہٹاؤ بنتا ہے۔“ شانزے

اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”رائی اور ہٹاؤ کے فرق کو سمجھو شانزے! انہیں

ایک ٹراژڈی میں تو لانا کہاں کا انصاف ہے؟“

”آپ کیوں اتنی وکالت کر رہی ہیں اس شخص کی؟“

شانزے چڑگی۔

”آپ بالکل بھی اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اس کی

اور کو مل کی خبروں کو لے کر مجھے کس کس طرح کی

نظروں اور باتوں کو فیس کرنا پڑا ہے۔ لوگ بظاہر

ہمدردیاں جتاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے مذاق اڑاتے ہیں۔

میں تو خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔“

”میری احمد کے ساتھ تفصیلی بات ہوئی تھی نہ تو

اس نے کو مل کے ساتھ شادی کی ہے اور نہ ہی نیوچر

میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔“

”آپ کر لیں اس بات پر یقین، مگر میں نہیں کر

سکتی۔“ شانزے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے جس نے

ان دونوں کے نکاح کے بارے میں بتایا ہے وہ میرا سچا

ویل و شر ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ مجھ سے نہیں بول

سکتا۔“

”کس نے گمراہ کیا ہے تمہیں احمد کے بارے میں‘

اتنا زہر بھر دیا دل و دماغ میں کہ صحیح بات سننے کی بھی

روادار نہیں رہیں۔“ خالہ امی بھی جھنجھلا اٹھیں۔

”میرے دل و دماغ میں یہ زہر خود احمد نے ہی بھرا

ہے اپنی حرکتوں سے، کسی اور کو کیا ضرورت ہے یہ

حرکت کرنے کی۔“ شانزے نے دودھ جواب دیا۔

”کیا چاہ رہی ہو تم۔ کھل کر تو بتاؤ۔“

”سپیشل“۔ شانزے کے دو ٹوک جواب نے ان پر جیسے کوئی بم گرا تھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔



”پھر کیا سوچا تم نے؟“ فواد نے آج واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ پھر سوال۔

”میں نے احمد سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے ڈانسورس کر دے۔“ ایک لحظے کو شانزے کی آواز کپکپا گئی تھی۔ حالانکہ احمد کے سامنے تو اس نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا مگر اس وقت۔۔۔

”کیا کہا اس نے؟“ فواد کے لہجے میں چھپی بے تابی پر شانزے نے غور نہیں کیا۔ ابھی ابھی اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“

”کیا مطلب کچھ بھی نہیں۔“ فواد تقریباً چلا اٹھا۔

”وہ خود تو دوسری بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا ہے۔ تمہیں کیوں بچ میں لٹکا کے رکھا ہے؟ فیصلہ کیوں نہیں کرتا۔“

”فیصلہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا۔“ شانزے بھی بھئی بھئی سی تھی۔

”ڈونٹ وری شانزے! میں ہوں نا تمہارے ساتھ‘ خود کو اکیلا مت سمجھو۔“

”میں اکیلی نہیں ہوں فواد! میرے دو بچے بھی ہیں۔“ شانزے نے اسے بتایا نہیں جتایا تھا۔

”اس بات کا کیا مطلب ہے؟“ فواد نے نسبتاً محتاط لہجہ اختیار کیا۔

”مطلب یہ کہ میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی قبول کرو گے؟“ شانزے نے واضح الفاظ میں اس سے کہا۔

”بچے صرف تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہیں وہ بھی تو کچھ لگتا ہے ان کا۔“

”احمد نے میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تو اب الگ ہو کر یہ ذمہ داری کیسے اٹھالے گا۔“

”ٹیک اسٹ ایزی یا رہا ہائل اور بورڈنگ کس مرضی کی دوا ہیں۔“ فواد نے لاپرواہی سے بولتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”ہائل؟“ شانزے نے حیرت میں لپٹی بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھا۔

”میں اپنے بچوں کو اپنے ساتھ‘ اسے پاس رکھوں گی۔ ہائل میں نہیں۔“ شانزے کا لہجہ قطعی اور الفاظ دو ٹوک تھے۔

”اوکے‘ اوکے۔“ فواد نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔

”جو تمہاری مرضی اور خوشی‘ وہی کرنا۔ میں تمہاری مرضی‘ راضی اور تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“ فواد نے کہا۔

”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے‘ میں کیا کر رہی ہوں۔“ شانزے نے دھیرے سے بدبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”تم جو کچھ کر رہی ہو‘ بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔“ فواد کے حساس کانوں تک اس کی سبز ہواٹ پہنچ گئی۔

”تم اسٹرونگ ہو تو اسے بروڈ کرؤ احمد کو دکھاؤ کہ تم اس کے سارے کے بغیر جمبی ایک کامیاب اور پرفیکٹ لائف گزار سکتی ہو۔ اب وہ دور نہیں رہا کہ عورت ایکسپلاٹ ہوتی رہے‘ روتی رہے‘ سسکتی رہے‘ پھر بھی مرد کے آگے پیچھے کھومتی رہے کہ اس کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں۔“

فواد کی جوشیلی تقریر بھی اس کی بھیجی بھیجی آنکھوں میں رونق کی کوئی جوت جگانے میں ناکام ہی رہی‘ وہ خالی خالی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”کم آن یا رہا بیچیرا۔“

شانزے نے زبردستی مسکرانے کے انداز میں ہونٹ پھیلا دیے۔

”یوں نہیں۔ جیسے تم مسکراتی ہو دل سے ویسے ہی مسکراؤ۔“ فواد نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”گڈ گرل۔“ وہ مسکرایا۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ اک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی

تھی۔

”پلے لینڈ اور۔۔۔“ چھوٹی بہن کی بات شاہ میر نے جلدی سے کاٹ دی۔

”میں یہاں کی بات نہیں کر رہا فوٹس گرل! ہم آؤٹ آف کنٹری نہیں جائیں گے۔ ہے ناپا!“ اس نے باری باری کنفریشن کے لیے۔۔۔ ماں باپ کا منہ دیکھا۔

”ضرور جائیں گے بیٹا!“ احمد نے اسے تسلی دی۔ ”کہاں؟“ دونوں بچوں کے چہروں پہ بے حد اشتیاق تھا۔

”جہاں آپ کہیں۔“ ”پر اس۔“ شاہ میر نے جگمگاتی آنکھوں سے احمد کو دیکھا۔

”نکار اس۔“ احمد مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے، پھر ہم لندن چلیں گے۔ میں علیزے، ممما اور بیٹا، ہم سب ڈن؟“ ”اوکے ڈن۔“

”ہم ڈننی لینڈ بھی جائیں گے۔“ علیزے نے بھولہن سے اپنی فرمائش بیان کی۔

”ڈننی لینڈ امریکا میں ہے اسٹوڈ! لندن میں نہیں،“ شاہ میر نے فوراً اپنی معلومات کا رعب بھاڑا۔

”ڈونٹ وری! ہم اپنی بیٹی کو ڈننی لینڈ بھی دکھائیں گے۔ نیکسٹ ایر چلیں گے ٹھیک ہے۔“ احمد نے بیٹی کو تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

کیسی خزاں خزاں سی سہ پہر بے رنگ، اجاڑ، ویران سی، سرمئی شام اپنے پر پھیلائے کو تھی۔

کچھ ضروری شاپنگ کر کے وہ مال سے نکل رہی تھی۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ شانزے نے چیک کیا۔

”ہیلو!“

”ہیلو، کیسی ہو؟ کہاں ہو؟“ اس نے ایک ساتھ دو سوال کر ڈالے۔

”ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔“ وہ مال کی میڑھیاں اترتے

☆ ☆ ☆

انگلیوں میں سلگتا سگریٹ ختم ہونے کو تھا، اس نے بے دردی سے ایش رے میں مسلا، جو پہلے ہی بھر چکی تھی۔

مسلسل بیداری اور سگریٹ نوشی سے آنکھیں سرخ اور بوجھل ہو رہی تھیں۔ ”تو یہ انجام ہونا تھا۔ ایک محبت کا اور محبت بھری زندگی کا۔“ احمد نے شدت کر بے آنکھیں بند کیں۔

جب سے شانزے نے واشگاف لفظوں میں اس سے علیحدگی کی بات کی تھی، وہ ایسی تکلیف محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی دودھاری تلوار اسے کاٹتے ہوئے نذر گئی ہو۔ اتنا خالی، اتنا ادھورا، نامکمل اپنا آپ پہلے کبھی نہ لگا تھا۔

دل کو سینے سے نوچنے کی کوشش کر رہا تھا کوئی۔ سارے بھگڑے اختلافات اپنی جگہ، مگر اب جب کہ یہ سب معاملات اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والے تھے تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بدن سے روح نکلنے کو ہے۔

شانزے کے ساتھ اس کے تعلق، محبت اور رشتے کی جڑیں بہت اندر تک۔ گہرائی میں کہیں پیوست تھیں۔ اسے اک دم جڑ سے اکھاڑنا انتہائی مشکل اور تکلف دہ کام تھا۔ جسم و جاں کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی جڑیں، نکالنا بھلا کس کے بس میں ہوتا ہے؟

☆ ☆ ☆

آج بہت عرصے بعد وہ دونوں ڈنر کی میز پر اکٹھے ہوئے تھے۔

سب ہی اپنے اپنے خیالات میں، فکرات میں گم تھے۔ خالہ امی سچی کبھار کوئی بات احمد اور شانزے سے کر لیتیں، جس کا مختصر سا جواب مل رہا تھا۔ اچانک شاہ میر کو ہی کچھ یاد آیا۔

”ممما! ہم اس بار سروریکیشن میں کہاں جائیں گے؟“



ہوئے بولی۔  
 ”اب فون پر کیا سناؤں، تم آؤ تو کچھ کہوں۔“  
 شانزے خاموش ہو گئی۔  
 ”آج کا کیا پروگرام ہے تمہارا۔ آجاؤ دُزر ساتھ کرتے ہیں۔ کچھ یاد ہے آخری بار ایک ساتھ دُزر کیا تھا؟“ فواد کا لہجہ جتنا دل والا تھا۔

”آج تو میں بڑی ہوں! خالہ امی نیکسٹ ویک چلی جائیں گی، میں زیادہ تر ٹائم ان کے ساتھ ہی گزارتی ہوں۔“

”چلو دُزر نہ سہی، شام کی چائے ہی ساتھ پی لو۔ کچھ تو ٹائم نکال لو مجھ غریب کے لیے بھی۔“  
 ”وعدہ نہیں کرتی، کوشش کروں گی آنے کی۔“  
 شانزے نے آہستہ سے کہا۔  
 ”تو آرہی ہو ابھی؟“

”ابھی نہیں، کل، پرسوں یا اس کے بعد۔“  
 ”بہت انتظار کر داتی ہو تم۔ خیر کرتے ہیں انتظار تمہاری کل پرسوں کا۔ اوکے اللہ حافظ۔“  
 ”خدا حافظ۔“

موبائل آف کر کے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی۔ اشارت کرنے سے قبل چند لمحے اس نے کچھ سوچا پھر مسکرا کر گاڑی اشارت کرنے لگی۔  
 اس کا ارادہ تھا فواد حسن کو سر پر از دینے کا۔  
 گاڑی کا رخ اس نے فواد کے آفس کی طرف موڑ دیا۔

شام کا وقت تھا۔ سڑکیں ٹریفک سے بھری ہوئی تھیں مگر خوش قسمتی سے کہیں زیادہ ٹریفک جام نہیں ملا۔ بیج ٹائم پر وہ پہنچ گئی اور پھر شاید ساری عمر اب اسے اللہ کا شکر ادا کرتا تھا کہ وہ صحیح وقت پر وہاں پہنچی تھی۔

واپسی کا سفر کچھ طویل اور کچھ مشکل تھا مگر واپس تو اسے آنا ہی تھا۔ وہ جسے ٹھنڈے، میٹھے، خوشگوار پانی کا چشمہ سمجھی تھی وہ گندا بدبو دار سڑے ہوئے پانی کا جوہر نکلا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس گندے جوہر کو دیکھ

رہی تھی جس کی بدبو اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس متعفن جوہر سے فوراً ”دور چلی جائے“ وہ واپس ہو رہی تھی۔ دور جا رہی تھی، مگر خبر کی سی نوک بھی کوئی ہو دل میں اترتی جا رہی تھی، تکلیف بے پناہ تھی۔

”مرد کی فطرت میں ہی دھوکے بازی ہے۔ عیاری ہے، چال بازی ہے۔ بے ایمانی ہے۔ وہ شدت کرب سے لب بچنے مرد کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ خود کتنی غلط تھی۔ اپنی خامیوں اور برائیوں پر کبھی نگاہ ہی نہ کی انسان تھی نا، بیشتر انسانوں کی طرح بے صبر ہیں، نا شکر ہیں اس میں بھی تھا، وہ بھی بڑے عم خود بارسا تھی اور اپنی زندگی میں آنے والے دو مردوں احمد فخل اور فواد حسن کو کٹھنوں میں کھڑا کر کے فرد جرم عائد کر رہی تھی۔ خود کو مظلوم سمجھ کر آنسو بہا رہی تھی۔

اتنی باصلاحیت اور اتنی مشہور ”کامیاب“ شانزے احمد کے ساتھ کیا کچھ غلط ہوا اور کیوں ہوا؟



شانزے گھر پہنچی تو سارا وجود یوں شل تھا۔ جیسے صدیوں کا سفر طے کر کے آئی ہو اور شاید یہ صدیوں کا ہی سفر تھا۔ کتنا کچھ بدل گیا تھا اس دوران۔ سوہ خود اس کا دل اور زندگی۔ اور آج کا یہ دن۔ اس سے زیادہ برا دن اس سے زیادہ تکلیف دہ دن شاید ہی اس کی زندگی میں آیا ہو۔

”کیا ہوا؟“ خالہ امی نے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا جس پر دکھ کی تحریر تھی۔ صدمہ بھی رقم تھا اور ساتھ ساتھ شکست کا احساس بھی۔

”کچھ نہیں بس سر میں درد ہے۔“ وہ ان سے نگاہیں چراتی سر درد کا بہانہ کر کے کمرے میں بند ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا مگر صبح تو اسے اٹھنا تھا۔ اپنا بار تنگ شو کرنا تھا۔

”زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب انسان خواہ مرد ہو یا عورت، مشین بن جاتا ہے۔ ہر احساس سے عاری صرف اپنا کام سر انجام دیتا ہے، جو اس کے

نوا حسن ناکامی اور نامرادی کی انتہا گہرائیوں میں نیم  
جان پڑا ہوا تھا۔



کتنی دیر ہو گئی تھی اسے دراز میں کچھ ڈھونڈتے  
ہوئے۔ چیزیں نکالتی اور واپس رکھ دیتی۔ جانے کیا  
ڈھونڈ رہی تھی۔

”کیا ڈھونڈ رہی ہو؟ اتنی دیر ہو گئی ہے مجھے دیکھتے  
ہوئے۔“ بالا خرہ حالہ امی نے مداخلت کرنی ڈالی۔

”کچھ بھی نہیں وہ۔۔۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہی تھی  
بھول گئی۔“ شانزے غائب دماغی سے کتنی بیڈ پر آکر  
بیٹھ گئی۔

”شانزے مجھے بتا دو کہ کیا بات ہے۔ پچھلے تین دن  
سے تمہیں دیکھ رہی ہوں آنسوؤں کو اپنے اندر مت  
روکو رونا آ رہا ہے تو رولو جی بھر کے۔“

خالہ امی کے کہنے کی دیر تھی کہ شانزے جیسے بکھر  
گئی۔ ان کے کندھے پہ سر رکھ کر وہ بلک بلک کر رودی۔

بہت دیر رونے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں اور  
چہرہ صاف کر کے خالہ امی کی طرف دیکھا۔

احمد کی بے رخی، بے اعتنائی، اس کے ساتھ لڑائی  
جھگڑے احمد اور کوئل کا انیس، تعلقات اور شادی کی  
خبریں، ان سب نے اسے نوا حسن کی طرف مائل  
ہونے پر مجبور کر دیا، جو کب سے دوستی سے آگے بڑھ  
کر اس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا۔ اور آخر میں اس  
نے تین دن پہلے والی اس شام کے بارے میں بھی بتایا  
جب نوا حسن کا مکروہ چہرہ اس کے سامنے آیا۔

”مجھے معلوم ہے، غلطی میری تھی، میں۔۔۔“  
شانزے نے الف سے لے کرے تک سب کچھ  
بتانے کے بعد مزید کچھ کہنا چاہا تھا کہ خالہ امی نے اس  
کی بات کاٹ دی۔

”غلطی؟ یہ صرف غلطی نہیں تھی شانزے! انہا  
تھا۔ شوہر کے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی طرف مائل  
کیسے ہو میں۔ خیانت محض عملی نہیں ہوتی، ذہنی بھی

ذمے ہو۔ آج شانزے احمد مشین بن گئی تھی۔ صبح  
معمول کے مطابق وہ بیدار ہوئی۔ تیار ہو کر کیرے  
کے سامنے آئی اور اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ کسی چالی  
والی گڑیا کی مانند۔ چالی بھر دو تو ہنستی مسکراتی رقص کرتی  
ہے دل بھاتی ہے۔

شوہر کو تو کچھ دیر بعد نوا حسن اس کے پاس آیا۔  
معمول کے مطابق مسکراتا ہوا۔ اس کے چہرے پہ اتنا  
خلوص بلکہ اہوا تھا کہ اس کے اندر نوا حسن کا اصلی چہرہ  
کھوجنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔

شانزے ایک تک اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ واقعی  
بہت اچھا اور اکار تھا۔

”نکل سے تمہارا موبائل رٹائی کر رہا ہوں۔“  
مسلسل آف جا رہا ہے۔ خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں تھی اسی لیے موبائل آف تھا  
میرا۔“ شانزے نے شرے شرے لہجے میں جواب  
دیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ چونکا۔  
”میں کل تمہارے آفس گئی تھی شام میں۔“  
”میرے آفس۔۔۔ شام میں؟“ نوا کے چہرے پہ  
ہوا یاں اڑنے لگیں۔

”ہاں شام میں۔ جس وقت تم کو مل سے باتیں کر  
رہے تھے۔“ شانزے کے اطمینان میں ہنوز کوئی فرق  
نہیں آیا تھا مگر اس کا یہ اطمینان مصنوعی تھا۔ اس کے  
اندر تو جیسے بھانپ جھل رہے تھے۔

”کک۔۔۔ کوئل سے۔“ انتہائی باصلاحیت اور  
براعت نامہ نوا حسن کی نہ صرف زبان لڑکھائی بلکہ وہ خود  
تجبی لڑکھا گیا۔ اس کی حالت ایسے کوہ پیما جیسی تھی جو  
چوٹی سے محض چند قدم کے فاصلے پر ہو اور اچانک پاؤں  
پھسل گیا ہو۔

وہ بے بسی سے خود کو گرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ممکنہ تسخیر  
شدہ چوٹی اس سے دور بہت دور ہو رہی تھی۔

”میری بات سنو شانزے! ایٹمی ایکسپلین۔“  
نوا نے خشک ہوئے لبوں پہ زبان بھیری۔  
شانزے نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔



ہوتی ہے۔ اپنے شوہر کے علاوہ تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا بھی کیسے؟“

”آپ جانتی ہیں میں نے احمد سے کتنی محبت کی ہے۔ کتنا چاہا ہے اسے اسے چاہتا میری عادت بن گئی تھی، ایسی عادت جسے انسان کبھی جھوٹ نہیں سکتا۔ اس نے کسی اور کی طرف نگاہ کی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ مجھے فواد سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں تھا خالہ۔ محض دوستی ہی تھی مگر احمد کو نیچا دکھانے کے لیے اس سے انتقام لینے کے لیے میں فواد کی طرف بڑھی۔“ شاز نے شکست خوردہ لہجے میں بول رہی تھی اور ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے میرے اندر برداشت کی کمی ہے۔ میری طبیعت میں انتقام کا جذبہ ہے۔ اسی لیے اسی لیے تو آج میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر گرہی ہوں۔“ شاز نے سچائی اور دیانت داری سے اپنا محاسبہ کر کے سارے اعترافات کر لی جارہی تھی۔

تین روز پہلے کی وہ شام کیسے پھول سکتی تھی جب وہ زلت کی اتھاہ گھرائیوں میں گری تھی۔ وہ فواد حسن کو سربراہ دینے اس کے آفس پہنچی تھی اور خود سربراہ ہو گئی تھی۔

”تم سے اتنا ذرا سا کام نہیں ہو سکا۔ اتنا عرصہ لگا دیا۔ کیسی حسینہ ہو تم؟ تمہارے حسن اور اداؤں کا جادو پلا نہیں احمد پر؟“

”فصل بگو اس مت کرو۔“ کوئل شاید بھڑک کر بولی تھی۔

”پہلے تم اپنی بات کرو۔ تم نے برا مس کیا تھا کہ جہانزیب کا دواؤں کے ساتھ میرا کانٹریکٹ سائن کرواؤ گے۔ تم بتا نہیں کیا کر رہے ہو اور وہ نیمہاواڈیا کو سائن کر رہا ہے۔“

کوئل نے ایک نئی ابھرتی ہوئی ماڈل کا نام لیا۔ اور جہاں تک احمد کو رام کرنے کی بات ہے تو میں کسی انسان کو اپنے بس میں کر سکتی ہوں پتھر کو نہیں اس چٹان کو اپنے مرکز سے ہٹانا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ کیسا شخص ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں وہ میرے

قریب آتے آتے مجھ سے لڑکھٹا رہتا ہے۔ کبھی بہت اپنا اپنا سا لگتا ہے اور کبھی بالکل اجنبی بن جاتا ہے۔“ کوئل نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”میں نے بہت کوشش کی مگر اس کی روئس اپنی فیملی میں ہی گڑی ہوئی ہیں۔ وہ قحطی طور پر اپنی فیملی سے دور ہو سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں؟“

”امیزنگ، ایش وری امیزنگ۔۔۔ پوسی! ایک عورت جو وفا، ایثار اور قربانی کا پیکر بھی جاتی ہے جسے فیملی میکر کہا جاتا ہے اسے میں نے کیسے ٹھٹھی میں کر لیا۔ اپنے شوہر، بچوں اور گھر کی پروا کیے بغیر وہ میرے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے اور تم ایک مرد کو اپنی ٹھٹھی میں نہیں کر سکیں۔ وہ مرد جسے راست بدلنے کو منہ کا ڈالنا پڑتا ہے۔ وہ تو منتظر ہوتا ہے۔ کسی کی نظروں سے شکار ہونے کا کسی کی اداؤں سے کھائل ہونے کا۔ تم سے تر نوالہ بھی نہیں کھایا گیا۔“ فواد حسن کچھ استہزائیہ انداز میں اور کچھ طیش میں کوئل کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”شاز نے احمد تمہارے لیے سوئے کا نڈا بننے والی مرغی ہے۔ اس کی دولت اور صلاحیت سے تمہیں آئندہ کئی فائدے اٹھانے ہیں، تم جیسے تلاش اور کنگال انسان کو اس کا زرخیز بنک ٹیلنس زمین سے آسمان پر

## مصطفیٰ

### عمرہ احمد



قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37 اردو بازار، کراچی

منگوانے کا پتہ:



”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے نظر اٹھا کر شانزے کو دیکھا۔  
 ”کتنے دن کی چھٹیاں لی ہیں تم نے؟“ احمد لیپ  
 ٹاپ چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔  
 ”چھٹیاں تو میں لی ہیں میں نے۔“ شانزے نے  
 دھیرے سے جواب دیا۔

”اوہ!۔“ احمد نے ایک گہری سانس لی۔  
 ”تو تم۔۔۔ ہمارے ساتھ نہیں جا رہی؟“  
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

”پھر؟“ احمد کی آنکھوں میں ابھرنے لگی۔  
 ”مجھے ایک دوسرے چینل سے برنج شو کی آفر تھی  
 میں نے اسے جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے،  
 نیکسٹ مینٹھ سے میرا شو اسٹارٹ ہو گا۔“

”یہ چینل کیوں چھوڑ دیا؟“ احمد اب بغور اسے دیکھ  
 رہا تھا۔

”برنج شو دیر سے شروع ہو گا۔ مارننگ میں گھر اور  
 بچوں کے لیے ٹائم مل جائے گا۔“ شانزے ساہو سے  
 انداز میں بولی۔

احمد خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔  
 ”تمہاری واپسی اچھی لگ رہی ہے۔“ وہ اک دم  
 ہی مسکرایا تھا۔

شانزے کے لبوں پہ بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ  
 بے اختیار آگئی۔

”میں اس لیے واپس نہیں آئی کہ میرے گھر کو  
 میری ضرورت ہے بلکہ اس لیے واپس آئی ہوں کہ  
 مجھے تم سب کی ضرورت ہے۔“ شانزے نے اعتراف  
 کیا اور آخر اعتراف کرنے میں حرج ہی کیا تھا، پھر اس  
 پر بہت سا شکر بھی واجب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی  
 عزت رکھ لی تھی جو ذلت اس نے اپنے اوپر جھیلی وہ  
 دنیا کے سامنے طشت ازبام نہیں ہوئی۔ وہ رسوائی احمد  
 کے سامنے نہیں آئی۔

وہ ندامت اور توبہ کے عمل سے گزر رہی تھی اپنی  
 جنت اور محبت اسے واپس مل ہی جاتی تھی۔



لے جا سکتا ہے، سو تمہیں جو کچھ چاہیے تم نے اس  
 کے حساب سے محنت کی اور کامیاب ہو گئے یا پھر شاید  
 وہ عورت ہی ایسی ہے، شاخ سے ٹوٹے پھل کی طرح  
 کسی کی بھی آغوش میں گرنے کو تیار۔۔۔ ہو سکتا ہے  
 تمہاری جگہ کوئی اور ہو تا تو وہ بھی شانزے کو اسی طرح  
 ٹریپ کر لیتا۔ اس کی کمزوریوں اور خامیوں نے تمہیں  
 اتنا طاقت ور بنا دیا کہ وہ تمہارے پھیلے جال میں  
 آسانی سے آگئی، مگر اس کا شوہر وہ کچھ اور ہی ہے۔“  
 کوئل سانس لینے کو رکی۔ ”سچ کہوں۔ احمد مجھے اتنا  
 اچھا لگنے لگا ہے کہ میں سوچتی ہوں کاش اس کے جیسا  
 لائف پارٹنر مجھے بھی مل جائے جو میرا فادار ہو۔“  
 ”اوہو! شکاری خود شکار ہو گئے۔“ فواد نے زور سے  
 قہقہہ لگایا۔

باہر کھڑی شانزے احمد پتھر کی مورت بن چکی تھی۔  
 اپنی ذات کا زعم اپنی صلاحیت کا سارا گھنٹہ سب کچھ  
 فواد حسن کے پیروں تلے کھلا جا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے خود کو ٹھنپتی وہ باہر آئی تھی۔ اس کا  
 پورا وجود بڑی طرح کانپ رہا تھا، غصے سے بھی اور توہین  
 اور ذلت کے احساس سے بھی۔

وہ کس طرح گھر پہنچی تھی وہی جانتی تھی۔  
 خالدہ امی کے آگے دل کا بوجھ بکا کر کے اب وہ چپ  
 چاپ بیٹھی تھی۔



بچوں کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے اس  
 نے ایک بار پھر سب چیزوں کا جائزہ لیا، کہیں کچھ رہ نہ  
 جائے۔ اپنے جائزے سے مطمئن ہو کر شانزے نے  
 سکون کی ایک گہری سانس لی۔  
 تیاری تقریباً مکمل ہی تھی۔ دونوں بچے بے حد  
 خوش اور پرجوش تھے احمد اسٹڈی روم میں تھا۔  
 شانزے کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی پھر دروازہ کھول کر  
 اندر چلی گئی۔

احمد لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ تیزی سے مصروف  
 اس کی انگلیاں ایک لمحے کو رکیں۔

مصباح علی

گنگوڑی

اس نے پانچویں بار کروٹ بدلی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے روشنی لگتی تھی۔ وہ جیت لیٹی بس چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چھت پر کئی برسوں کی دھول پڑی ہو، جو وہ اپنی پلکوں سے جھاڑ رہی ہو۔ اس کی سوچوں میں کچھ کل تھا تو وہ اس کے ملے خراٹے اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی پشت کو گھورا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ خراٹوں میں اس کا شمار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کتنے بے خبر ہیں یہ، کیسے سمجھاؤں؟ مجھے تو کبھی کسی قابل سمجھا ہی نہیں۔“ اس نے آہ بھر کر رخ سخن پھیر لیا۔ ڈرینک ٹیبل کے آئینے میں اس کا چہرہ خاصا بھاگ رہا تھا۔ وہ اپنی حلقہ زدہ آنکھیں دیکھنے لگی۔

”اٹھارہ برسوں میں شکل کیا سے کیا ہو گئی۔ بھاگتے، بھاگتے جوڑ، جوڑ دھکنے لگا، مگر اس کے معیار تک نہ پہنچ سکی۔“

اس نے تاسف بھری سانس کھینچی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ باؤں میں چپل اڑی، دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا۔ اک نظر — اسے دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کی نظر سامنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں سے آتی روشنی کی لکیر پر پڑی اور ساتھ ”کھی کھی“ بابا کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سوچیں جھٹک کر کمرے کی طرف چل دی۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں۔“ وہ دروازے کھول کر اندر آئی۔ ربیعہ، ضیاد، عفان، بیڈ پر پھسکا مارے منوبلی کھیل رہے تھے۔ ربیعہ نے ضیاد کا کان زور سے پکڑ رکھا تھا اور وہ ”اوی اوی“ مکر تاجا رہا تھا۔ جبکہ عفان بند منہ سے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش میں۔

”ربیعہ! چھوڑو بھائی کا کان، شرم نہیں آتی، اتنی بڑی ہو گئی ہو اور جانوروں کی طرح لڑتی ہو۔“ ارم نے کہا۔

”جانوروں کی طرح کہاں کہاں! میں نے تو انسانوں کی طرح پکڑ رکھا ہے۔ یہ دیکھیں۔“ اس نے اور زور سے اس کا کان کھینچا اور ہنسنے ہوئے بولی۔

”مما! یہ چور کی سزار کھی ہے۔ اس نے پہلے یہاں



سے پانچ سو پونڈز کا کارڈ چرایا تھا اور اب آکسفورڈ اسٹریٹ کا کارڈ۔“ اس نے ایک جھٹکا اور دیا۔  
 ”نہیں ماما۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کا میں نے نہیں چرایا، یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ ضاد چلا، چلا کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ مامی نے تب تا، وہ مسلسل ”نگال نکال“ کی تکرار کر رہی تھی۔ عفان فوراً بیڈ سے چھلانگ مار کر اتر گیا اور سامنے کھڑا ہو کر آکسفورڈ اسٹریٹ کا کارڈ ”پانچ تاج“ گرد کھارہا تھا۔  
 ”یہ تو میرے پاس ہے۔“

”غصیٹ، کمینے۔“ اس نے ضاد کا کان چھوڑا اور تکیہ اٹھا کر عفان کو مارا، مگر وہ موقع پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کی توجہ تھ گئی۔ لیکن سامنے رکھا ٹیبل کا کل دان تکیے کی چوٹ سے نیچے جا گرا۔ آج ویسے کمال تھا۔ ارم کو غصہ نہیں آیا۔ نہایت شرارتی لاپرواہ بیچہ تھی تو سترہ برس کی، مگر چھوٹے بھائیوں سے ابھی تک کھیل کود، مار پٹائی جاری تھی۔ اور منع کرنے پر یا تو رونے لگ جاتی یا پھر ماں کے آگے منہ بھاڑ کر ہنستی رہتی۔ اپنی بچکانہ حرکتوں پر اکثر ہی ارم سے ڈانٹ سنتی اور کبھی کبھار دھموکے بھی کھالتی۔ مگر بچے گلے کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں۔ مگر آج وہ خاموشی سے اسے دیکھے گی۔ اس کی کسی حرکت پر غصہ نہیں آیا تھا۔ پھولے پھولے ہنسنے والے بالوں کی مزید ابھی ہوئی پونی بنائے مہمندیوں تک آستینیں چڑھائے اور دو پٹا تو جانے کہاں تھا۔ مگر بھائی کو مارنے پر پورا دھیان تھا اور ایم پی تھری الگ اس کی گود میں راگ الاپ رہا تھا۔

”ربیعہ! تمہارے پیپرز ہونے والے ہیں اور تم کتنی بے فکری سے کھیل رہی ہو۔“ وہ کھولی سی بولی۔  
 ”میں کہاں کھیل رہی تھی، وہ تو یہ بد تمیز چور اچکے کھینے کی ضد کر رہے تھے۔ چلو اٹھو۔ میری کتاب پر ہی بیٹھ گئے جاہل۔“  
 اس نے ضاد کو دھکیلتے ہوئے اس کے نیچے سے کتاب کھینچی اور تیرہ دراز ہو گئی۔  
 ”بارہ تو بج گئے ہیں۔ اب کیا پڑھو گی۔ سو

جاؤ اب۔“

ارم نے ایک اور بڑا کمال کیا۔ ”کیا پڑھو گی؟ سو جاؤ۔“ وہ جرنیل سے آنکھیں پھاڑے ماں کو دیکھنے لگی۔  
 ”اے کیادیکھ رہی ہو۔“ وہ گلہ دان نیبل پر رکھتے ہوئے مسکرائی۔

”دیکھ رہی ہوں آپ کا غصہ کہاں گیا؟“ وہ اس کی بات پر پھر مسکرائی۔

”تھپیل آپ ہنتی ہیں تو لیٹ جاتی ہوں۔“ اس نے کتاب بند کر کے سرہانے رکھی۔ ”ماما! اب صبح آٹھ بجے ہی نہ آوازیں دینا شروع ہو جائیے گا۔ کل کالج سے چھٹی ہے، ڈر سے اٹھوں گی۔“ اس نے رضائی ٹانگ مار کر کھولی اور لیٹ گئی۔

”اور ہاں۔“ جب ارم جانے کے لیے مڑی تو اس نے پھر پکارا۔

”ماما! یہ اپنا لنگر ساتھ لیتی جائیں۔ اسے کبھی ڈر لگتا ہے۔ کبھی پانی مانگتا ہے۔ مجھ سے نہیں پلایا جاتا راتوں کو اٹھ اٹھ کر پانی۔“ اس کا اشارہ چھوٹے عفان کی طرف تھا، جو اس کی رضائی میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ارم اس کی بات پر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔  
 غالباً ”سوچ رہی تھی۔“ یہ تو کسی کو اٹھ کر پانی نہیں پلا سکتی اور باپ کے ارادے دیکھو۔“ وہ سوچ ہی رہی تھی۔ جب ربیعہ کی لاتیں کھا کر بارہ سالہ عفان اپنا سا منہ لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

”لائٹ تو بند کرتی جائیں۔“ اس کی ہانک پر وہ پھر مڑی، اک نگاہ اس کی بے خبری کو دیکھ کر لائٹ بند کی اور باہر نکل گئی۔



شام کا پنجھی اپنے پروں میں دن سمیٹ چکا تھا۔ بچوں کے کمرے سے خوب اودھم مچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جن میں نمایاں ربیعہ کی تھی۔ ارم بھی اپنا کام سمیٹ کر ان کے درمیان آئی۔ بی بی پو پر ایشیا کپ لگا تھا اور آخری گیندوں پر آفریدی کے چھکوں کی بارش ہو رہی تھی اور پھر آفریدی نے آخری بال پر چھکا



روزہ رکھ کر آ رہے ہیں، وہ بھی کہیں بیٹھے بیچ ہی دیکھ رہے ہوں گے۔“ وہ بڑبڑاتی اٹھی۔  
جائے جانے لگی وی کا تار لگا کر فل آواز برصادی۔  
ابھی اس نے آٹا گوندھنا ہی شروع کیا تھا۔ جب فارینہ کی ٹالیاں پینے کی آواز آئی۔ یقیناً ”رمیز راجہ کی شاندار پختی مکمل ہوئی تھی۔ پھر بھلا ارم کیسے بچن میں تک سکتی تھی۔ وہ آنے میں تھڑے ہاتھ لیے چلاتی ہوئی کمرے میں آئی۔  
”کیا ہوا، کیا ہوا۔“

”راجہ کی پختی ہو گئی۔“ فارینہ زور سے اس کے گلے جا لگی اور گوندھا آٹا فارینہ کی پشت سے الماس نے ان کی لاروائی پر دو حرف بھیجے اور خود ہی کچن میں چلی گئیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ ارم سولہ سال کی اور فارینہ پندرہ سال کی۔ کھیل کود، پھول رنگ، فطیل موسم اس کی عمر کے ہی تقاضے تھے اور وہ اپنی عمر کے رنگوں پر کھلکھلاتی ہوئی۔ بالکل پوری اترتی تھی۔ لالہائی، کچھ شرارتی اور کچھ نا بوجھ۔ اور بے ضرر سی خواہشات، ان بھی منی خواہشات پر اسے اکثر ہی ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

چند دن پہلے الماس تین فینسی سوٹ لے کر آئی تھیں۔ گھر آتے ہی پہلے اسے پیارے دکھائے اس کی رائے لی اور پھر اٹھا کر پینے میں ڈال دیے۔  
”امی! وہ لجا جتے سے بولی۔“ وہ آپ نے رکھ کیوں دیے؟ ہمارے اسکول میں پارٹی ہونے والی ہے۔ ہم دونوں کو اس پر سلوا دیں۔“

”سل جائیں گے، پہلے جو رکھے ہیں وہ پہنوں۔“ ان کی اتنی بے نیازی پر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔  
”پینی میں رکھے رکھے کیسے سل جائیں گے۔ باہر نکالیں۔ میں درزن کو دے آتی ہوں۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں کہتی ان کے کندھے پر جھول رہی تھی۔

”جب شادی ہو جائے گی تا تب سلوا کر پین لیتا“ اب میرا دماغ نہ کھلا۔ جا کر برتن دھو۔“ وہ مٹر کے دانے نکالتے ہوئے اسے کام بناتے لگیں اور وہ حیرانی سے انہیں تک رہی تھی۔

لگایا تھا شاید۔  
”ہرے۔“ اس نے دونوں ہاتھ اونچے اٹھا کر زمین سے تقریباً ”ڈیڑھ فٹ اونچی چھلانگ ماری تھی۔ یقیناً ”کستان میچ جیت گیا تھا۔ جس کی خوشی ریجہ کے انگ انگ سے پھوٹی نظر آرہی تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی ٹی وی کے ساتھ چپکے کھڑے تھے اور ارم کرسی کے بازو پر کہنی ٹکائے ایسے بیٹھی تھی کہ بند مٹھی پر گال ٹکا تھا اور نظریں اسکرین کے بجائے ریجہ پر تھیں۔  
جائے وہ سوچوں کی کس مرستی میں سوار تھی۔ مگر یقیناً اس کمرے میں بالکل نہیں تھی۔



”امی ایلیز آگے سے ہٹ جائیں، پلینز۔ پلینز امی۔“ ارم سر پر اچھی طرح دوپٹا لپیٹے ہاتھ میں سورہ یاسین پکڑے خوب ہل ہل کر دعا مانگ رہی تھی۔ جب الماس بیگم اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ اس نے آیت پر انگلی رکھ کر پھر ان کی منتیں کیں۔  
”امی پلینز! اب آگے سے تو ہٹ جائیں راجہ کی پختی مکمل ہونے والی ہے۔“

”راجے کھیل رہے ہیں اور رائیاں دعائیں مانگ رہی ہیں۔“ وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولیں۔  
”کب سے آوازیں دے رہی ہوں، سنائی نہیں دیا۔“ چلو اٹھو آٹا گوندھو، ابا آنے والے ہیں تمہارے۔“

”اچھا گوندھ دیتی ہوں، آپ بیٹھ تو جائیں۔“ اس نے کھسک کر الماس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔  
اس کا شروع تو تب تو تاج الماس نے آگے بڑھ کر ٹی وی کا تار کھینچ دیا۔

”سارا دن برباد کر دیتا ہے یہ میچ۔ اللہ کرے شروع میں ہی بار جائیں کم بخت،“ مینہ تو چین سے گزرے گا۔“

”اوں ہوں امی۔“ بد دعا پر دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ”ان بے چاروں کے ایسے ہی پیچھے پر گئی ہیں آٹا ہی گوندھنا ہے نا گوندھ دیتی ہوں، ابا بڑا افریقہ سے

چہرے پر مصنوعی خفگی پیدا کر کے گھر کا۔  
”ابھی بتاؤں تمہیں۔“

اس نے اسی انداز میں اچھلتے ہوئے ہاں میں گردن ہلائی۔  
”بدمیز نیچے چلو جلدی سے۔“ وہ قدرے مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں اور رسی پکڑ لی۔  
”ای۔“ فارینہ نے منہ بنایا۔

”آجائیں گے نا، بارش تو رکنے دیں۔“ ارم منتیں کرتی ہوئی ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ الماس اس کی آنکھوں کے رنگ دیکھ رہی تھیں۔ جو خوشی کے مارے بار بار بدل رہے تھے۔ انہوں نے اس کے گیلے بال چہرے سے ہٹائے اور ماتھے پر بوسہ لیا۔

”ارم! اب تم بڑی ہو گئی ہو، بچپنا چھوڑ دو اور چلو نیچے۔“ حلیہ درست کرو، کسی ممان نے آنا ہے۔“ وہ ان کی رسی ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے نیچے اترنے لگیں، جب فارینہ نے ہانک لگائی۔

”ای کسی نے۔۔“  
”بتا دو گی۔ نیچے آؤ۔“ وہ تقریباً ”ساری میڑھیاں اتر گئی تھیں۔“

انہیں اوپر گئے تقریباً ”گھنٹہ ہوا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں نیچے کا سارا منظر نامہ ہی بدل گیا تھا۔ ہر چیز ضرورت سے زیادہ قریب سے رکھی تھی۔ صاف ستھری اور اپنی اپنی جگہ پر۔ بچن سے آنے والی خوشبوؤں نے نتھنوں سے گزر کر منہ میں پانی بھر دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے یکن میں ہی آ گئیں۔

”ای! کیا بنایا ہے۔“

”جو بھی بنایا ہے، چھوڑو اور جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ، تمہارے ابا بھی آنے والے ہوں گے۔“

غالباً جو بھی آرہے تھے خاصے وی آئی پلی تھے۔ تب ہی الماس بہت مڑ جوش تھیں۔ ڈھیر چیزیں بناؤالیں اور بطور خاص ارم کو تیار ہونے کے لیے اچھے کپڑے اور چیزیں دی تھیں۔ جب وہ دونوں نہادو کر صاف ستھری اندر آئیں تو ڈھیر ساری نصیبیں بھی کر دیں جن میں سرفرست خاموش بیٹھنا، دوپٹا سر پر رکھنا، بے

”میں نوکرائی بنی کام کروں اور چیزیں پٹنی کے لیے ایوین۔“

وہ منہ ناک چڑھا کر چھت پر چلی گئی۔ بات بھی کسی حد تک جائز تھی۔ ابھی ہر چیز ہی شادی کے لیے۔ اتنا خوب صورت ڈزنیٹ لائیں، سنبھال کر رکھ دیا۔ شوخ رنگوں کی بیڈ شیٹ لائیں، پلاسٹک کے لفافے چڑھا کر پٹنی میں پھینک دی۔ کالج کے گلاس شادی کے لیے، نرم رضائیاں شادی کے لیے، زور ہوئے شادی کے لیے اور تب تو حد ہی ہو گئی۔ ارم کی سہیلی کی سالگرہ تھی۔ اس نے جانے کی ضد کی مگر الماس تو مان کر نہ دیں۔

”جب شادی ہو جائے گی نا تو جہاں مرضی آنا جانا، جیسا مرضی کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، اب بھلا کنواری لڑکیوں کو کون راتوں میں کسی کے گھر جانے دے۔“ وہ الماس کی بات پر ششدر رکھٹی تھی۔ اس کی ہر خواہش کو دبائے کے لیے ان کے اندر ایک روایتی ماں انگڑائی لیتی جو ڈانٹ ڈپٹ کر اسے راضی کر لیتی تو ابھی وہ رو دھو کر انہیں منالیتی۔

\*\*\*

دوپر سے تیز بارش ہو رہی تھی۔ دونوں بہنیں رسی لے کر چھت پر جھک گئیں۔ موسلا دھار تیز بارش، قہقہے لگاتی تالیاں، پٹینی، رسی کو دتی دونوں بہنیں۔ الماس نے انہیں کتنی آوازیں دی۔ مکران کی سماعتوں میں قہقہے اور بارش کے سر تھے۔ آخر تک آکر وہ خود ہی اوپر آ گئیں۔ پھیلے پالوں سے پانی پکٹتا، گیلے کپڑے جسم پر چپکے اور انگ انگ میں رعنائی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر اپنی آواز میں بجلی کی کڑک پیدا کر کے بولیں۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں، سنائی نہیں دیتا کیا؟“ مستی میں ہونٹ بھیج کر ہنسی روکتے ہوئے ارم نے دونوں ہاتھ سے ”نہیں“ کا اشارہ کیا۔ رسی کو دتے ہوئے گردن بھی نفی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس کے معصوم انداز پر انہیں پیار تو ٹوٹ کے آیا۔ مگر



کے لیے رکیں۔ ”لوکا بھی تو ارم سے بہت بڑا ہے۔ ستائیس، اٹھائیس تو ماں اپنے منہ سے کہہ رہی ہے۔“

”اگر لوکا بڑا ہے تو عقل بھی تو بڑی ہوگی، ویسے بھی بڑی عمر کا مرد زیادہ بہتر رہتا ہے اور پھر جیسی وہ لالباہی ہے، وہ سنبھال لے گا۔ بس تم فکر نہ کرو، دعا کیا کرو، اللہ بہتر کرے گا۔“

ابا کے بہتر بہتر کی رٹ نے اماں کے تفکرات مٹا دیے اور واقعی وہ سال بعد بیاہ کر انیتک کے گھر کی رونق بن گئی۔ دلسن بنی وہ اس قدر خوش تھی جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ ظاہر ہے اب اماں کی روک ٹوک سے جان چھوٹی، نئے فیشن کے کپڑے، جوتے، نرم گداز بستر، نئے ڈھیر سارے زیور اور پھر اب اپنی مرضی سے سونا جگانا۔ اپنی مرضی سے آئے جائے گی، نہ کتابیں چٹائی پر بس گئی۔ بس اپنا گھر، اپنا کمروہ، اپنی مرضی، واہ کیا بات ہے۔

شادی کے شروع دن تو بہت اچھے گزرے تھے۔ ہر روز ڈھیروں میک اپ تھوپ کے، نت نئے کپڑے پہن کے روزانہ ہی کسی کے ہاں دعوت ہوتی۔ دی آئی بی پروٹوکول ملنے پر وہ اندر تک خوش ہو جاتی۔

ایک شام انیتک کے کسی رشتے دار کے ہاں دعوت تھی۔ اس نے خوب میک اپ کر کے بالوں کی اونچی سی پونی بنائی۔ وہ کچھ دیر تو دیکھتا رہا پھر قدرے ناگواری سے بولا۔

”اے ذرا کم کرو۔“ اس کا اشارہ میک اپ کی طرف تھا۔ جو اس نے مرے دل سے اسٹیج پھیر پھیر کر ہٹا لیا۔

”اور یہ بھی کھولو۔“ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے انگلی سے اس کی پونی ہلائی تھی۔ غالباً، پونی بنا کر وہ اس کے ساتھ اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ بہر حال اس نے بات مان لی۔

وہ دونوں بایک رہتے۔ ابھی رشتے دار نے گھر سے خاصے فاصلے پر ہی تھے۔ جب اس کی نظر سامنے سے آتی گول گپوں کی ریڑھی پر گئی۔ اس کے منہ میں بھر

وقوفوں کی طرح منہ بھاڑ کر نہ ہنسا اور ہاں ان کے منہ کو بھی تکتی نہ رہتا۔ ”وہ آنکھیں بند کیے قوالوں کی طرح سرودھتی رہیں اور یقیناً“ وہ سرودھنے کا ہی اثر تھا کہ وہ بہت سمجھ دار بنی خاموش بیٹھی رہی۔ جس کی آنے والی مہمان خاتون بھی قائل ہو گئیں۔

”بہت کم گو ہے، آپ کی بیٹی۔“ امی کی گردن فخر سے تکی ہی تکی کر ارم کو اپنا گونگانا کھٹکا۔

”نہیں آنی، امی نے منع کیا تھا زیادہ بولنے سے۔“ اس کی بات پر جہاں امی کھسپائی ہو کر زبردستی مسکرائی تھیں۔ وہیں مہمان خاتون کو اس کی خوب صورت شکل اور برہنہ پن پسند آئی تھی۔



رات کا وقت تھا۔ الماس نے پانچویں چھٹی بار انہیں کھانا کھانے کی یاد دہانی کرائی تھی۔ غالباً، ”نی وی پر کوئی سیرل لگا ہوا تھا اور دونوں ہی وقفے کے انتظار میں تھیں۔ جیسے ہی وقفہ آیا وہ کھانا لینے کے لیے کچن کی جانب بڑھی۔ اس کے قدم صحن کے بیچ ہی رک گئے تھے۔ غالباً، امی، ابا آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔

”دیکھ لو ارم کے ابا۔ سوچ کر ہی فیصلہ کرنا، ابھی تو وہ سولہ کی ہی ہے۔“ امی کی نظر بھری آواز پر ابا خاصے مضبوط لہجے میں بولے تھے۔

”وہ کون سا آج ہی شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں، کرتے کرتے بھی سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا اور ویسے بھی شادی کے بعد خود ہی لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔“

”کہہ تو تم صحیح رہے ہو مگر۔“ امی کی فکر کسی طور دور نہ ہو رہی تھی۔

”اگر۔۔۔ مگر چھوٹے۔ قسمت بار بار دستک نہیں دیتی الماس بیگم۔ اتنا بڑا گھر، کاروبار ہے، پھر سارے بس، بھائی شادی شدہ اور لوکا بھی بڑا شریف ہے، ہماری بیٹی عیش کرے گی۔“

”گھر کاروبار کی بات تو ٹھیک ہے مگر۔“ وہ کچھ لمحے



گیا۔ ”انیق! مجھے گول گپے کھانے ہیں۔“ اس نے  
لجابت سے کہتے ہوئے اس کی کمرہ لائی۔  
”ہم کھانے پر ہی جا رہے ہیں۔“

”میں وہ بھی کھاؤں گی۔“ وہ جھٹ سے بولی اور  
”پلینے۔ پلینے یا نیک روکیں۔“ شروع ہو گئی۔

”تمہارا دماغ ٹھک ہے۔ اتنا میک اپ تھو پ کر،  
سڑک پر کھڑے ہو کر گول گپے کھاؤں تمہیں۔ گھر  
لے آؤں گا۔“ اس کے لہجے کی تیزی بھی اسے سمجھ  
نہیں آئی۔

”میں نے یہاں کھانے ہیں پلینے۔“ وہ اپنے سابقہ  
انداز میں اسے جھوٹے دے رہی تھی تو اس نے زور  
سے جھڑک دیا۔

”ارم۔۔۔ شرافت سے بیٹھو۔“ اس نے ارم کی  
ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔ ”میرے ساتھ اگر کہیں آنا  
چاہتا ہو تو انسان بن کے، تمیز کے ساتھ جایا کرو،  
نہجیں۔“ کھسیانی ہو کر ہنسی رہی۔ واپسی پر اس نے  
ای کی طرف جانے کی فرمائش کی، جو وہ سہولت سے  
ٹال گیا۔

”ابھی کچھ دن پہلے تو گئی تھیں، پھر کسی دن چلیں  
گے۔“

”چھا چلیں سامنے والی گلی میں، میری سہیلی کا گھر  
ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اوھر چلتے ہیں۔“ اس کی بے  
جائزہ باتوں پر وہ زچ ہو گیا۔

”یار! اب تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ بھول جاؤ  
سہیلیوں کو اور اماں کو، میاں ہے اسے ٹائم دو۔“

وہ اپنا سامنے لے کر رہ گئی۔ کوشش تو وہ بھرپور کرتی،  
مگر کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہو جاتی۔ کبھی کپڑے پرکس کرنا  
بھول جاتی، کبھی جوتے، جرابیں سنبھالنا بھول جاتی، وہ  
صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا اور وہ دیر سے سونے کی وجہ  
سے اٹھ نہ پاتی۔ وہ اسے جھنجوڑ، جھنجوڑ کر اٹھاتا تو وہ  
آہستہ آہستہ گرتی پڑتی اچھتی۔

”صبح ہو بھی گئی، ابھی تو سوئے تھے۔“ وہ جمائی  
روکتے ہوئے جھول رہی تھی۔

”خدا کے لیے مجھے ناشتا دے دو، بھلے پھر سارا دن

سوئی رہنا۔“ اس نے توبے سے بال رگڑ کر گھیرا تو لپے  
اس کے منہ پر اچھلا۔ نمی کے احساس سے اس کی  
آنکھیں پوری کھل گئیں۔  
”اچھ۔۔۔“ اس نے ارم کی نرم کلائی پکڑ کر کھینچی۔  
”اور کتنا آرام کرو گی، ناشتا لے بھی آؤ۔“  
”ناشتا۔۔۔“

وہ منہ میں بدبلائی۔ اس کے بعد برتنوں کا ڈھیر،  
پھر صفائی والی کے ساتھ لپٹائی، پھر بھابھی کے ساتھ  
دوپہر کا کھانا تیار کروانا، پھر برتن، پھر چائے، پھر برتن اور  
اگر مشین لگائی میرا تو بیڈ ہی بیج جائے گا۔ پھر رات کا  
کھانا اور پھر برتن افس۔ ناشتے کے نام سے ہی دن بھر  
کی تھکا دینے والی روٹین اس کی آنکھوں کے سامنے  
ناچنے لگی۔

”کیا ہوا؟ جاؤ واش روم، پھر ناشتا بھی بنانا ہے۔“  
احتمول کی طرح اپنی طرف گھورتی ارم کو اس نے پکڑ کر  
جھنجوڑا ڈالا۔

”اچھا۔۔۔“ اس کی آواز ڈوب کر ابھری تھی۔  
آلیٹ اور بریڈ کی سوندھی خوشبو سے کچی ٹرے، جس  
میں چائے، دوہہ بسکٹ، مہاب، کی طرح کے لوازمات  
تھے، لاکر اینق کے سامنے رکھی۔ ٹھہری سی، صاف  
ستھری کم عمر بچی سامنے بیٹھی خاصی دلکش لگ رہی  
تھی مگر اس کی دلکشی نوالہ منہ میں رکھتے ہی غائب  
ہو گئی۔

”یہ کیا۔۔۔ اتنا آکل۔“

”وہ۔۔۔“ وہ پونٹوں پر زبان چھیرتے ہوئے بولی۔  
”امی نے کہا تھا، آپ فرائیڈ سلاکس لیتے ہیں۔“  
”یہ تو نہیں کہا ہو گا آکل سے کھاتے ہیں۔ تم میں  
خود عقل ہے یا نہیں۔“ اس نے بچا نوالہ اس کے  
سامنے ہی بچ دیا۔

”ابھی تک ناشتا بنانا نہیں آیا، جانے آئے گا بھی یا  
نہیں بے وقوف!“ وہ بدبڑا ہوا بسکٹ کے ساتھ  
چائے چڑھا کر ادھورا سا ناشتا کر کے چلا گیا۔ وہ کچھ بل  
اس کی باتوں کے زیر اثر رہی۔ پھر ”ہونہہ“ کر کے خود  
کھانے لگ گئی۔

”جاؤ کرو اپنے کام۔“ اس کے بے گانے انداز پر وہ ریموٹ بند پر اچھال کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ہلکی دستک دے کر اس کی ساس نے دروازہ کھول کر بھاٹکا۔

”یہ آٹا کس نے گوندھا ہے۔“ اینیق کی نظریں اس سے ہٹ کر اس کی فخریہ صورت پر گئی۔ وہ بھی اچھا گوندھنے پر تعریف ہوگی۔

”میں نے۔“ اس کی سوچ کا فخر لمحے میں در آیا۔

”کیوں؟ کسی بارات نے آتا ہے جو اتنا ڈھیر گوندھ دیا۔“ آواز سے زیادہ ان کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ وہ بے چاری ایک نخت ہی گھبرا گئی۔

”وہ۔۔۔ امی بھابھی نے کہا تھا حساب سے گوندھنا۔“

”ہاں تو حساب سے کہا ہو گا۔۔۔ بے حساب تو نہیں کہا ہو گا۔“ وہ کھڑاک سے دروازہ بند کر کے جیسے آئیں ویسے چلی گئیں۔

”کوئی کام عقل سے نہ کرنا، ہمیشہ سب کے سامنے شرمندہ ہی کروانا،“ احمق کہیں کی۔“ وہ اس کی تیز چلتی سانسوں کی پروا کیے بغیر یا نیک کی چابی اٹھا کر دانت پیتا باہر نکل گیا۔ کتنے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں میں مرچوں کی صورت چھنے لگے۔ وہ مرنے کے انداز میں بند پر بیٹھی تھی۔ نظریں وی اسکرین پر جا بھری، بہاں اس کی پسندیدہ مووی لگی تھی۔ اس نے کلائی سے آنکھیں رگڑیں اور ناخن کاٹتے ہوئے مووی دیکھنے لگی تھی۔ یقیناً ”وہ چند لمحے والی بات بھول چکی تھی۔“



شام کا وقت تھا۔ ملے گھرے بادلوں کے بیچ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کی بڑی منڈیوں سمیت رہنے آئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے بچوں کو باؤ لنک کروانے کے بہانے چھت پر لے آئی۔ آج کل ویسے ہی بچے اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

”کاش! تیرا بارش آجائے۔“ اس نے آسمان پر بادلوں کو ملنے دیکھ کر سوچا تھا۔

”کاش! اینیق بھی آجائیں۔۔۔ پر وہ نہ ہی آئیں تو اچھا

ایسا اس کے ساتھ اکثر ہی ہوتا تھا۔ آج تو تلنے ہوئے تیل زیادہ ہو گیا تھا۔ کبھی آلیٹ میں نمک مرچ کا تناسب بکڑ جاتا تو کبھی چائے ٹھنڈی انڈیل لاتی۔ اگر قسمت سے ناشتا اچھا ہو جاتا تو کس روپیہ کے کھانے میں نکل جاتی۔ اپنی طرف سے اچھا اور بہترین کرنے کی کوشش میں ایسا ضرور ہوتا کہ اینیق کا مسرور انداز۔ تلخی میں بدلتا اور وہ اسے ڈپٹا گھورتا باہر نکل جاتا۔ ابھی چند دن پہلے کی بات تھی۔ وہ ہنڈیا کا سارا پھیلاؤ سمیٹ کر کچن سے باہر نکل رہی تھی۔ جھٹلی صاحبہ نے بہت پیار سے کہا۔

”مرم! پلینز آٹا گوندھ دینا،“ میں بازار سے ابھی لیس لے کر آئی۔ ”وہ چادر پلیٹ کر باہر نکل رہی تھیں۔ جب آواز دے کر اسے یاد دہانی بھی کروائی۔

”ذرا حساب سے گوندھنا۔“ رات کو بھی اسی نے گوندھا تھا۔ دس افراد کے لیے اتنا آٹا گوندھا کہ بمشکل سات آٹھ روٹیاں بنی تھیں۔ اینیق تو اسے گھورتا رہ گیا تھا۔ کیونکہ اسے کھانے کے لیے بہت دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔ اب وہ ہل بل کر آٹا گوندھتے ہوئے بھابھی کی رات والی ہنسی یاد کر رہی تھی۔ سب کو خوش ہو کر رہتا رہی تھیں۔

”اینیق کی کنبوس بیگم نے آٹا گوندھا تھا بھی۔“

”چلو آج تو نہیں مذاق بنائیں گی میرا اور اینیق کا۔“

اس نے آٹا گوندھا اور کمرے میں آکر پھیلاؤ سمیٹنے لگی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی اپنے قریب بیٹھنے کی فرمائش کر ڈالی۔

”ابھی آتی ہوں، ذرا الماری ٹھیک کر لوں۔“ وہ کہہ کر کپڑوں کی الماری کھولنے لگی۔

”بعد میں کرتی رہنا ٹھیک۔ ابھی میں باہر چلا جاؤں گا۔ ایک تو مجھے دیکھ کر ہی تمہیں سارے کام یاد آجاتے ہیں۔“ اس کے نزدیک بننے پر وہ الماری کا پرٹ بند کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”جی کیا کہنا ہے۔“

”کچھ نہیں کہنا۔“ وہ اسی کے انداز میں چبا کر بولا۔

ہے۔“ دماغ نے خواہش کی فوراً ہی تردید کر دی۔  
 ”آتے ہی مجھے کیس گئے، اوپر کیا لے دو قوفوں کی  
 طرح۔“ دیکھ رہی ہو۔ میں کیا لے دو قوف لگتی ہوں؟“  
 اس نے اپنے گالوں کو انگلی اور انگوٹھے میں بھینچ کر  
 سوچا۔ آسمان کو اس کی بے ضرر خواہش اچھی لگی اور  
 چند بوندیں اترنے لگیں اور ساتھ ہی ساس کی تیز پکار  
 بھی۔ وہ دل موس کر نیچے چلی گئی۔

”جی۔“ اس نے قریب جاکر پوچھا۔  
 ”پچن میں دیکھو، کیا ہو رہا ہے، اکیلے اسامی لگی ہوئی  
 ہے۔ اور تم شیشے میں کسٹرو بناؤ۔“ وہ فرماں برداری  
 سے گردن ہلاتی جانے لگی تو انہوں نے ایک بار پھر  
 تصدیق کی۔

”آتا ہے بنانا یا وہ بھی نہیں آتا۔“  
 وہ ان کے انداز کو خاطر میں لائے بغیر خوشی خوشی  
 سر ہلانے لگی۔ ”جی جی تو آتا ہے۔“  
 خواہ دل کتنا ہی موسم میں اڑکا ہوا تھا۔ مگر وہ دل جان  
 سے بولی بھی اور اس نے اتنا غلط بھی نہیں کہا تھا۔

کسٹرو، نوڈلز، چائے، سینڈویچ، پکڑے یہ سب چیزیں  
 وہ اچھی بناتی تھی۔ اس نے پچن میں آکر دودھ کی  
 دیکھی چولہے پر چڑھائی، باؤل میں کسٹرو پاؤڈر گھولنا  
 شروع کیا۔ وہ آمیزہ اس میں ڈالنے والی تھی کہ باقی  
 اپنے بیٹے کے لیے پانی لینے پچن میں آگئیں۔ وہ اسے  
 اسٹرابری فلیور حل کرتے دیکھ کر مسکرائیں۔

”ایق کو کسٹرو بہت پسند ہے۔ کھر فل ڈش ہے  
 نا۔“ وہ بھی باقی کی تائید مسکرا کر کرنے لگی اور یقیناً  
 ایق کی پسند من کر بات دل میں گد گداتی تھی۔

”چلو موسم تو اچھا ہے، وہ بھی خوش ہو جائیں  
 گے۔“ وہ پانی گلاس میں ڈال کر سیدھی گھڑی ہوئیں۔  
 ”میں تو اس کے لیے اسٹرابری اور بنانا اکٹھے بناتی  
 تھی۔“ وہ ہنسنے کی پکار پر مڑتے مڑتے ”جیلی بھی بنالیتا“  
 کا مشورہ دے گئیں۔ جیلی تو وہ پہلے ہی بنا چکی تھی۔

اب بنانا فلیور کا ڈبا ڈھونڈنا تھا۔ اس نے کمینٹس  
 چھاننے شروع کیے۔ ڈبا نکالا اور پہلے سے حل شدہ  
 آمیزہ میں پانچ چھ چمچے بھر کے ملائے اور پکتے دودھ

میں ڈال کر پیچہ ہلانے لگی۔ وہ تو ابال آنے سے پہلے ہی  
 تیار ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈوسٹے میں انڈیل کر  
 سیٹ کیا۔ رنگ اسے قدرے عجیب لگا مگر میاں کی پسند  
 تھی۔ وہ کھل گئی۔ قدرے ٹھنڈا ہونے پر اور ج جیلی  
 کے ٹکڑے کاٹ کر بہت پیار سے اس پر سجائے اور  
 فریق میں رکھ دیا۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ برآمدے کے پردے  
 پھر پھڑٹے ہوئے چند بوندیں بھی کھانے پر چھڑک  
 دیتے۔ وہ کھانے کے دوران بار بار صحن میں نئے ملے  
 دیکھ رہی تھی اور فارین کو یاد کر رہی تھی۔ کھانا کھا چکے  
 تھے۔ ساس نے اسے کسٹرو یاد دلایا۔ وہ ”جی اچھا“ کہہ  
 کر پیالا نکال لائی اور درمیان میں رکھ دیا۔ پیالا دیکھتے ہی  
 جیسٹھ نے ناک چڑھائی۔

”یہ کیا ہے؟“  
 ”بھائی جان، کسٹرو ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔  
 ”اس کے رنگ کو کیا ہوا؟“ باقی نے حیرت سے  
 پوچھا۔

”وہ بنانا بھی کس کیا تھا نا، آپ نے ہی کہا تھا کہ  
 اکٹھے ہی۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی باقی ہنس  
 پڑیں۔ ”لیکن میں نے اکٹھے کس کرنے کا تو نہیں کہا  
 تھا۔ خیر چھوڑو، یہ نئی ڈش بن گئی۔“

”افریقہ کی“ باقی کے بات بدل کر کسٹرو ایق کی  
 طرف بڑھانے پر وہ ”افریقہ کی“ چبا کر کہہ گیا۔

”یہ کیا؟“ جب جبے حلوے کی طرح دھپ سے  
 ایک ٹکڑا پلیٹ میں آگرا تو اس کی آنکھیں مزید پھیل  
 گئیں۔ اس نے کھر فل کرنے کے لیے اسٹریچر ایک  
 کے چند ٹکڑے بھی درمیان میں لگائے تھے جنہوں  
 نے پہلے سے ہی سخت کسٹرو کی پچی کی بھی جذب کر لی  
 تھی اور کسٹرو کو ڈھیلے کی شکل دے دی۔

”یہ کسٹرو ہے یا، کسٹرو کا حلوہ۔“ وہ براؤنش سے  
 ٹکڑے جس پر تیل جیسی جیلی رکھی تھی دیکھ کر اندر  
 تک کھس گیا۔ اس نے پلیٹ ہاتھ سے برے سر کاٹی۔  
 ”اگر ایسے ہی نقصان کرتی رہیں نا تو سال کے اندر



لمحے دل میں اتر جاتے۔ ایسے میں اگر رنجہ ”بھال  
بھال“ کر کے روتی تو اس کا جی چاہتا اس کے گلے میں  
گیند چھنڈا دے یا منہ پر اس کا ٹیپ لگا دے۔ آج کل  
اس آفت کی پڑیا نے ناپائیدار کیا تھا۔ مچھلی کی طرح  
پانی پر لپکتی اور سارے کپڑے بھگو لیتی۔

اس نے کچھ دیر پہلے ہی اس کا منہ ہاتھ دھلوا کر،  
صاف ستھرے کپڑے پہنا کر بیڈ سے اٹارا اور اپنے  
قریب ہی کارپٹ پر کھڑا کیا تھا اور خود کمرے کی سیمنٹنگ  
میں لگ گئی۔ بی وی چل رہا تھا۔ بیڈ شیٹ جھاڑتے  
ہوئے اس کی نظریں بار بار اسکرین پر جاری تھیں۔  
شارجہ کپ لگا ہوا تھا۔ پاکستان اور بھارت کا بیچ تھا۔  
بھارت کی پاری کے بعد کھانے کا وقفہ آیا تھا۔ اس  
نے صبح ہی فتح اپنے سارے کام بھگائے۔ ساس نے  
واشنگ مشین لگوائی، اس نے بھابھی کے ساتھ مل کر  
جلدی، جلدی کپڑوں کا بکھیرا سمیٹا۔ دوپہر کا کھانا وقت  
سے پہلے تیار کیا۔ برتن دھوئے اور پھر رنجہ کو سلائے  
کے خیال سے پاس کھڑا ہی کیا، تاکہ اس کا بستر سیٹ  
کروے۔ مگر وہ آپنی مخلوق جانے کب چلتی ہوئی ساس  
کے ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ارم بیڈ شیٹ جھٹکنے  
والے انداز میں پکڑے لی وی دیکھ رہی تھی۔ سعید انور  
اور عامر سمیل اوہنگ کے لیے بلے گھماتے میدان  
میں آ رہے تھے۔ اس کا جو دھاس کی کرخت آواز نے  
توڑا۔

”ہر وقت کمرے میں تھسی آرام فرماتی رہنا“ اتنی  
لمبی رات ہوتی ہے۔ اس میں دل نہیں بھرتا۔“  
”آرام؟“ اس کا دماغ ہوم کیا۔ ساس اور  
بھابھی کہتی ہیں رات میں آرام کیا کرو، انیق کہتے  
ہیں سارا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام کرنے کے  
کیے۔ رات میں میرے لیے وقت نہیں نکال سکتیں۔  
اوپر سے دن رات رنجہ۔۔۔ جانے آرام کہاں تھا؟  
اسی آرام کو ڈھونڈنے میگے جاتی تھی کہ وہاں جا کر کئی  
دن رہوں گی، مسلسل سوؤں گی، مگر وہاں جاتے ہی  
ایک دو دن امی بازار پسند کی شاپنگ کروانے لے  
جاتیں اور باقی دو تین دن کو لنگ میں طاق کرنے

میں سڑک پر آ جاؤں گا۔ گھر میں اتنے افراد موجود ہیں،  
جب خود عقل نہیں ہے تو دوسروں سے لے لیا کرو،  
نہیں شان کھتی تمہاری۔“ وہ غصے میں گھورنے  
کے ساتھ ساتھ ڈانٹ رہا تھا۔

”کوئی کام ڈھنگ سے نہ کرنے کی لگتا ہے، قسم  
کھا کر آتی ہو۔“ وہ سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر  
اسے صلواتیں سنا کر کمرے میں جا چکا تھا۔ غالباً اسے  
اپنی گھڑ بن اور بھابھی کے سامنے۔۔۔ مکی محسوس  
ہوتی تھی۔ دل میں تو وہ اکثر ہی اس کے کام اور بن،  
بھابھی کے کاموں کو موازنہ کرتا رہتا تھا۔ زبان سے  
اب شروع کیا تھا۔ یادوں کی تیز گرج چمک ارم کو اپنے  
اندر محسوس ہوئی تھی۔ اتنے لوگوں میں وہ بمشکل اپنے  
آنسو روک پاتی تھی۔



زندگی کا چلن یوں ہی قائم تھا۔ وہ کاموں میں  
مہارت حاصل کر کے اس کا دل جیتنا چاہتی تھی۔ مگر  
کاموں کا پھیلاؤ تھا، جو دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے ہی  
سال اس کی گود میں رنجہ آگئی۔ اس کی پیدائش کے  
تکلیف دہ مراحل، پھر جھوٹی سی بچی کے نہ تم ہونے  
والے کام، گھر گرجہستی کی مصروفیت اور پھر میاں کی  
فرمائشیں اور تقاضے وہ بالکل الجھ کر رہ جاتی۔ اسے  
شکایت کا موقع نہ دینے اور دل جیتنے کی دوزخ دھوپ میں  
کبھی ارم کی کٹائی جل جاتی۔ کبھی انگلیاں کٹ  
جاتیں۔ کبھی کسی چیز سے ٹکرا کر چوٹ کھالیتی اور کبھی  
تو اس کی ”جلدی جلدی“ کی پکار میک اپ کرتے  
ہوئے مسکارہ پلکوں کے بجائے آبرو میں سجا دیتا۔ ان  
حرکتوں پر ہونے والی عزت افزائی نے مسکراتے چہرے  
کا بھولہ پن احساس کمتری اور گھبراہٹ میں بدل دیا تھا۔  
ہاں البتہ ایک بات تھی کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد کام  
سیلیقے سے کرنے لگی تھی۔ گھر کے سارے کام بھابھی  
اور ساس کے مشورے سے خاموشی سے کرتی رہتی،  
کام کچھ ٹھیک ہوتے، کچھ غلط ہوتے، کبھی ساس اچھی  
خاصی سنا دیتیں، تو کبھی جیٹھانی اپنے تجزیے کرتیں تو

خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ آج میچ دیکھنے کے لیے جلدی گھر آیا تھا۔ سارے گھر والے اس کے کمرے میں بیٹھے محبت سے میچ دیکھ رہے تھے۔ وہ ریجہ کو گود میں لیے دل میں سوچ رہا تھا کہ یہی نہیں۔ وہ گھنٹہ سو کر باپ کی آواز آتے ہی اٹھ کھڑی تھی اور اب کبھی ماں کی ناک میں انگلی دیتی، کبھی آنکھوں میں۔ وہ بار بار اس کی انگلی دلوچ کر اسے گھورتی، مگر وہ مسکرانے لگ جاتی۔ بھابھی کو میچ سے دلچسپی نہیں تھی اور ان کے بچوں کا ہوم ورک بھی رہتا تھا۔ وہ بچوں کو لے کر انھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ساس نماز پڑھنے کے لیے انھیں تو اسے بھی حکم صادر کر گئیں۔ ”ارم! یہ سارے دن کا تھکا ہوا آیا ہے، کھانا دے دو اسے۔“ ان کا حکم اس کے اندر تک گڑواہٹ گھول گیا تھا۔ اس نے حمایتی نگاہوں سے انیق کو دیکھا۔ یقیناً ”وہ اس کی محبت دیکھتے ہوئے ضرور میچ دیکھنے کی حمایت کرے گا اور دوسرے بھی کچھ دیر پہلے ہی اسے چائے پلائی تھی۔ مگر وہ تو لگتا تھا جنت کی تھی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔“ اس نے اقرار کرتے ہوئے گردن ہلائی اور اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے ہی ہاتھ ریجہ کو پکڑنے کے لیے بڑھا دیے۔ ارم نے ریجہ کو اس کی گود میں پٹخا۔ جس پر وہ گھور کر رہ گیا اور پھر اس کے مڑنے پر بانگ لگائی۔

”اس کا فیدر بھی دے جانا۔“

اس کا جی چاہا ”دودھ“ دیکھی سمیت اس کے منہ پر مارے یا زور زور سے روئے بے بسی سے اس کی آنکھوں میں دھندلا پانی آیا تھا۔ مگر انیق نے اس کی خاطر آواز ضرور اونچی کر دی تھی، تاکہ وہ چین میں ہی کنٹری سٹی رہے۔

روٹی بیلے ہوئے اس کا سارا دھیان معین خان کی بیٹنگ پر تھا۔ کیونکہ سارا ٹیم اسی کے شائرس پر منحصر تھا۔ اس کے اندر بھی روایتی حریف کے خون نے جوش مارا تھا۔ اس نے بھرپور شارت لگائی تھی۔ روٹی تو سے پڑا لے ہوئے اسے لگا جیسے وہ اس کی گیند دھکیل کر بانڈری پار کروا رہی ہو۔ بانڈری تو جانے پار ہوئی بھی یا

سر بالیوں سے نپٹے، شوہر کی کمزوری کو پکڑنے کے حربے سکھاتیں۔ البتہ وہاں جا کر ریجہ سے جان چھوٹ جاتی تھی۔ فارینہ اس کے کام بھاگ بھاگ کر بڑے شوق سے کرتی تھی۔ اسے میکے آئے چار پانچ دن گزرتے تو میاں صاحب ٹپک پڑتے۔ دل نہ لگنے کا ریجہ بہانہ اچھا بھی اور آرام دہ راہ جاتا۔ اس وقت ساس اسی آرام کے طعنے دیتیں گیلی ریجہ کو اٹھائے کمرے میں لے آئیں۔

”ذرا دھیان نہیں رکھا جاتا ایک بچی کا؟ اگر بالٹی میں الٹ جاتی تو کیا ہوتا۔“ عامر سہیل نے ایسا زور کا شارٹ لگایا۔ گیند اچھلتی کودتی بانڈری تک گئی۔ پورا شارچہ اسٹیڈیم میں مٹانے لگا۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اسکرین پر ڈالی اور پھر گیلی ریجہ پر اس کا جی چاہا اس سمندری خلقت کو سمندر میں ہی ڈبو آئے، تاکہ خوب تیر کر اپنا جی خوش کر لے۔

”جانے کون مائیں ہیں جنہیں اپنے بچے اچھے لگتے ہوں گے۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے۔ اسے صندوق میں بند کر دوں۔“ وہ دل میں کرختے ہوئے اس کے کپڑے خوب کھینچ کھینچ کر اتار رہی تھی اور بچی کان بال گردن کھینچنے سے خوب چیخ رہی تھی۔ اس کے چلانے پر ساس نے پھر آواز دی۔

”کیوں رو رہی ہے یہ؟ اسے کچھ کھلا پلا کر سلاؤ۔“

نیند آرہی ہوگی بچی کو۔“

اس نے اسے گود میں بھر کر زور سے دلوچا اور بدبو داتے ہوئے فیڈ کروانے لگی۔ زیادہ غصہ اسے یکسوئی سے میچ نہ دیکھنے پر آ رہا تھا اور نکل ریجہ کی کمر پر رہا تھا۔ ایسا تب ہوتا تھا جب انیق سامنے نہ ہوتا۔ اب بھی اس نے اتنی زور زور سے اسے تھپکایا کہ بچی نہ چاہتے ہوئے بھی سو گئی۔ ارم نے کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔

ہدف پورا کرنے کے لیے پاکستانی ٹیم فل فام میں تھی۔ جہاں رنز تیزی سے بن رہے تھے وہاں دکنیں بھی دھڑا دھڑا کر رہی تھیں۔ صرف چند اور زکیم بائی تھا اور میچ ڈرامیٹک لائن پر کھڑا تھا۔ انیق کو گھر آئے



نہیں، مگر اس کی ساری کلائی تو بے پر رکھی گئی تھی۔ اس کی دلخراش چیخ پر اریق دوڑتا ہوا آیا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟ کیا سوتے ہوئے بنا رہی تھیں۔“ وہ اس کی کلائی پکڑے پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ جو بھیجا ہے نا اس میں، کبھی اسے بھی استعمال کر لیا کرو۔“ اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کی کن پٹی پر دباؤ دے رہی تھیں۔ ایک شدید تکلیف کو پر سے میاں سے بے عزتی اس کی آنکھیں بھاری اور جڑے جننے لگے۔

”دو سال ہو گئے شادی کو مگر مجال ہے، کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہوا، جانے کن خیالوں میں لکھوئی رہتی ہو، جب شادی کے قابل نہیں تھیں تو پتا نہیں تھا ماں باپ کو، میرے سر پر ضرور لانا تھا۔“ اک نندی تھی جو آنکھ کنارے تیزی سے اڑنے لگی۔

”انتا کام نہیں ہوتا جتنا سرپس۔“ اس کی نگاہ کلائی سے ہٹ کر اس کے سرخ گالوں پر پھسلنے پانی پر گئی۔ آنکھیں تو بھاری ہونے کی وجہ سے کھل نہیں رہی تھیں۔ غصہ تو اسے بہت آ رہا تھا، مگر اس کے آنسو دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

”اب بچوں کی طرح رو کیوں رہی ہو، میں نے تھوڑی جلائی ہے، خود ہی آنکھیں بند کر کے پکا رہی تھیں احمق۔“ اس نے کینٹ میں رکھی برن آئنٹمنٹ نکالی اور اس کی کلائی پر مل دی۔ جلد اچھی خاصی جل گئی تھی۔

”درد کچھ کم ہوا۔“ اس کے ہنسنے ہوئے پوچھنے پر ار م نے گردن ”ہاں“ میں ہلادی۔ ”یہ اتنی بڑی کھوڑی ہلا دیتی ہو، جو بالکل خالی ہے، ذرا سی زبان نہیں ہلا سکتیں۔“ اس کے آنسو اور تیز ہو گئے۔

”جاؤ، جا کر کمرے میں بیٹھو، امی دے دیں گی مجھے کھانا اور پاں۔ جیت گیا ہے پاکستان۔“ اس کی بھاری پلکیں اٹھیں اور تکلیف کی جگہ حیرت اور مسرت پھیل گئی تھی۔ درد کچھ کم ہوا تھا یا تو میاں کے ہاتھ سے مرہم لگا تھا اس لیے یا پاکستان کے جیتنے کی خوشی تھی۔

فی الحال وہ ہریات بھول گئی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ وہ جملہ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ ”جب شادی کے قابل نہیں تھیں۔ تو ماں باپ کو پتا نہیں تھا، میرے سر پر ضرور لانا تھا۔“

”تو کیا میں اس کے سر پر لادی گئی ہوں، وہ مجھ سے تنگ آ گیا ہے، وہ مکمل مرد ہے، اسے مکمل بیوی چاہیے تھی، جو اس کا خیال رکھے، ناکہ کم عمر لڑکی جس کا اسے خیال رکھنا پڑے، میں اپنی حماقتوں اپنی خواہشوں کی وجہ سے اپنے ماں باپ کی بے عزتی کرواؤں گی۔“

اسے اپنی حماقتوں پر رونا آنے لگا۔ شروع شروع میں جب کام جھنجھٹ لگنے لگتے تو تھک جاتی اور اپنی ماں کے پاس جا کر اکثر روتی، شکوے، شکایتیں کرتی تو الماس بیگم اسے سمجھاتے، پکارتے، خود رونے لگ جاتیں۔ فارینہ نے بھی سمجھایا۔

”پلیز تم امی، ابا کو کچھ مت بتا کرو۔ تمہارے جانے کے بعد وہ دونوں بہت پریشان رہتے ہیں، ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

وہ ماں باپ کی طبیعت خرابی سے ڈر گئی تھی اور واقعی اس نے کچھ نہ بتانے کی قسم کھالی۔ کم از کم وہ اپنے وجود سے انہیں تکلیف نہیں پہنچائے گی، اپنے آنسو اپنے اندر ہی رکھے گی اور جب جب انیت کے منہ سے ماں باپ کے لادنے کی بات سنی تو عہد کیا تھا کہ اب وہ مکمل دھیان سے کام کرے گی۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ اپنے ماں باپ کو باتیں نہیں سنوائے گی۔ وہ اپنی ہر مرضی، خواہش، موسم، سچ، ڈرامے سب اس کے تابع کرنی چلی گئی۔ ذیل ڈول تو شادی کے بعد قدرے بھاری ہو گیا تھا۔ اب شکل سے معصومیت کی جگہ گھبراہٹ بھلنے لگا۔ البتہ وہ خود ان سب میں کہیں نہیں تھی۔ شاید اس کی اپنی ذات تو کہیں کھو گئی تھی۔ وقت، عمر کے ساتھ اس میں اچھی خاصی میچوہلی آگئی تھی۔ ضداد اور عفان ڈھائی ڈھائی برس کے فرق سے آگے پیچھے اس کی گود میں آگئے تھے۔ مگر اب اسے کام کا پھیلاؤ، پھیلاؤ نہیں لگتا تھا۔





ہولتے ہوئے تیزی سے کبل کھولا اور لینے کی تیاری کرنے لگی۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ میری بیٹی کم عمری کی وجہ سے ساری زندگی کم عقلی کے کمرے میں نہ کھڑی رہے۔ جیسے میں کھڑی ہوں آج تک۔“ وہ اپنے آنسو جڑوں میں دبا کر فوراً ہی کبل تان کر سوتی بن گئی۔ وہ بھی چند لمحے اس کی پشت کو گھورتا رہا۔ پھر لیٹا تو نیند نے آلیا۔ کمرے میں صرف اس کے خرائے تھے یا پھر نیند کا خمار، مگر وہ ساری رات جاگتی رہی۔ اس کی وہ بیٹی جس کی شرارتوں پر وہ خوب پٹائی کرتی تھی۔ اب اس کے سینے پر سوار تھی۔ وہ کسی صورت اسے جلے، مٹے، اپنے آنسو پیتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔



ایشیا کپ میچ کی تقریب کب کی ختم ہو گئی تھی۔ ریجہ ایک ہاتھ میں موبائل پر میسج ٹائپ کرتی۔ دوسرے ہاتھ میں ایم بی ٹھری لیے کمرے سے نکل گئی۔ مگر ارم کبھی پر مہمنی نکائے ایک ٹک اسے لاہروائی سے لاؤنچ میں عفان سے چاکلیٹ چھین کر کھاتے اور پھر صفا کے چپے سے چٹکی کاٹ کر انجان بنی کتاب کے صفحے پلٹتے دیکھ رہی تھی۔ وہ صفحے پلٹتے ہوئے ایم بی ٹھری کی الپ پر سر دھن رہی تھی۔

”بابا کی رانی ہوں آنکھوں کا پانی ہوں۔“

”میں ان آنکھوں کی روشنی ان کی چمک اتنی جلدی بجھنے نہیں دوں گی۔“

اس نے تہیہ کیا اور کمرہ سمیٹنے لگی۔ وہ آفس سے آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے۔ بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر لاؤنچ میں بیٹھے اپ ڈیٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ چائے بنا کر لے آئی۔

”آپ نے باجی سے بات کی۔“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے چائے کی چمکی بھر کر کپ پرچ میں رکھ دیا۔

”آپ کو اس کی معصومیت پر بالکل ترس نہیں آتا۔“

وہ ایک گھریلو عورت کی طرح کام میں لگی رہتی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی اسے بے وقوف، احمق کا طعنہ ضرور دے دیتا، جس پر وہ صرف ایک تھکی نگاہ اس پر ڈالتی، پھر مسکرا کر گردن جھٹکتی اور اپنے کام میں لگ جاتی۔



وقت اپنی بیل منڈیر پر چڑھا تا رہا۔ دنیا کی روایت کی طرح رشتے گھر تقسیم ہو گئے تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ اس کی معصوم سی ریجہ سترہ سال کی ہو گئی۔ وہ نہ صرف شکل و صورت میں بلکہ لاابالی پن اور شرارتوں میں ماں کی مثل کالی تھی۔ شاید لاہروائی عمر کا تقاضا تھا۔ باجی کا بیٹا سول انجینئرنگ کے بعد جاب کے سلسلے میں کینیڈا گیا تھا اور تقریباً چھ برس بعد واپس پاکستان آ رہا تھا۔ باجی کی خواہش تھی کہ اسے شادی کے بندھن میں باندھ کر ہی بھیجا جائے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے انیق اور ارم سے ریجہ کا رشتہ مانگا تھا۔ انیق کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ارم نے ہمت کر کے سوچنے کا وقت مانگا لیا تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، باجی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اتنا بڑا گھریا، بڑھا لکھا اور کیا چاہیے تمہیں۔ ہماری ریجہ عیش کرے گی۔“ وہ کمرے میں آتے ہی اس کی عقل پر ماتم کرنے لگا تھا۔

”مگر گھر بڑا ہے تو عمر میں بھی تو بہت بڑا ہے۔“ وہ دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھتے ہوئے خود بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ہماری ریجہ ابھی بہت چھوٹی ہے، شادی کے تقاضے نہیں سمجھ سکتی۔ آپ باجی کو انکار کریں۔“

”دو چار سال بعد بھی تو بیاہنا ہے، تو ابھی کیا حرج ہے، کفران نعمت مت کرو۔ قسمت بار بار دروازے سے نہیں کھٹکتی، مگر تم میں نہ عقل ہے اور نہ ساری زندگی آتی ہے۔“ انیق نے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے جس انداز میں کہا۔ اس پر وہ طیش میں آگئی۔ غم و غصے اس کی آواز بھی بھرا گئی۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں۔“ اس نے دانت جما کر

”بابا“ وہ کہنی سے آنسو رگڑ کر سامنے دانت نکالتے عفتان کی طرف اشارہ کرنے لگی۔  
 ”بابا! اس بد تمیز نے بد عادی ہے، کمینہ بھوکا اپنے موبائل کے لیے مرا جا رہا تھا، ہائے! بہت درد ہو رہا ہے، بابا! ماریں اسے دیکھیں، دیکھیں کیسے ہنس رہا ہے۔“

اس نے ایک نظر عفتان کو دیکھا اور پھر ریحہ کی برستی آنکھوں کو۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اتنی تکلیف نہیں ہو رہی، جتنا وہ شور مچا رہی ہے۔ وہ اپنی تکلیف پر پچھین سے۔ ایسے ہی بلبلاتی تھی، جب تک سامنے والے کو ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ شاید اس میں ابھی تک بچپن تھا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ایک گونج تھی جو ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی۔

”جب شادی کے قابل نہیں تھیں۔ ماں، باپ کو پتا نہیں تھا۔ میرے سر پر ضرور لادنا تھا۔“

اس کی الجھی پھولی ہوئی پونی پر بوسہ دیتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ارم کی تکلیف پر وہ باتو اسے ڈانٹتا تھا پھر زور سے ہنس پڑتا تھا، مگر بیٹی کی تکلیف کے احساس سے ہی آنکھیں بھر گئیں۔ ہاں اللہ ارم نے آگے بڑھ کر اسے پیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اطمینان بھری سانس لی۔ موبائل اٹھایا اور مسکرا کر عفتان کو دے دیا۔

”میں باپ ہوں اس کا، عقل ہے مجھ میں۔ اس کے حق میں بہتر فیصلہ ہی کروں گا۔“ وہ چند لمحوں کے لیے فکری سے پھینک بدلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر یاسیت سے بولی تھی۔

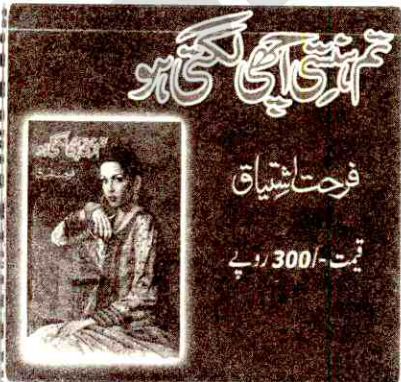
”آپ چاہتے ہیں کہ وہ عون کے برابر ہونے کے لیے ساری زندگی بچپن کے بل کھڑی رہے۔“ لمبی سانس بھرتے ہوئے چند لمحوں بعد بولی۔ ”اپنی اور اس کی عمروں کا فاصلہ ناپتے، کانتے، وہ خود تو بالکل بٹ جائے گی، ختم ہو جائے گی، لیکن یہ فاصلہ مستقل رہے گا۔“ اینق! مرد کو پہلے دن ہی پرفیکٹ بیوی چاہیے ہوتی ہے، اس نے لمبی آہ بھری۔

”کم از کم آج کے مرد میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ بیوی کی لاپرواہی، کم عمری پر رد و ڈال دے، درگزر کر دے۔“ وہ چائے کا کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے آپ سے کبھی شکوہ نہیں کیا، کسی فرمائش کے لیے ضد نہیں کی، آپ سے ڈر کر دل میں ہی اپنی خواہشیں دبا کر رہی، مگر میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کی شادی کا کم از کم چار یا پانچ سال تک نہیں سوچوں گی۔“ اس کے جملوں سے اینق کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی اور بھنوں میں اچکا کر اسے غصے سے گھورا۔

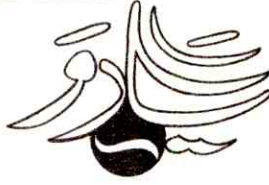
”آپ بھلے جو مرضی کریں، اب میں کسی سے نہیں ڈروں گی، اس کے لیے بولوں گی، احتجاج کروں گی، میں اس کے اڑان سیکھنے سے پہلے پر نہیں کانٹوں گی۔ میں باجی سے خود بات کروں گی۔“

وہ آخری جملہ مضبوط لمحوں میں کہہ کر مڑی۔ ریحہ، عفتان کا موبائل چھین کر بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آ رہی تھی، کسی چیز میں الجھ کر دھڑام سے گر گئی اور موبائل بھی دور گر گیا۔

”ہائے! بابا میں مر گئی، اوئی ماما۔ ہائے“ وہ اپنا پاؤں پکڑے چلا رہی تھی۔ اس کے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے چوٹ کے منظر ہی تھے۔ اینق صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب ہی بچپن کے بل بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں دیکھنے لگا۔







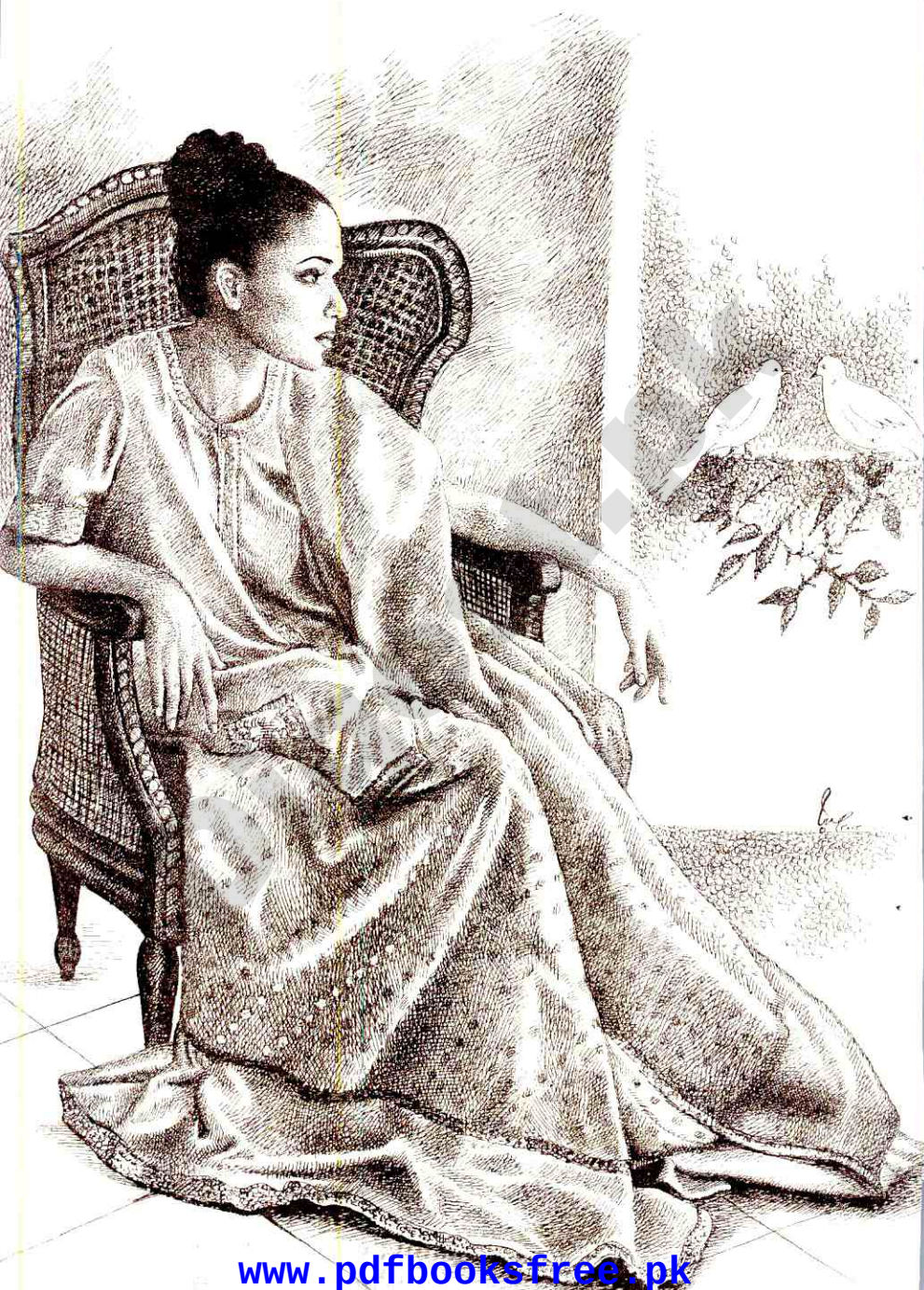
امرحہ کی پیدائش کے وقت اتفاق طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں ”منخوس“ مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا اماں ’دادی اور مہینوں بہن بھائی دانیہ‘ ’ہما اور علی اسے اکثر جہنم جلی‘ ’منخوس‘ کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قہقہے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روئی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب ہمتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لاہری میس گزارتی ہے۔ جہاں وہ لاہری بہن تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم بڑھائی پر دھیان دو اور اسکا لرشپ لے کر ہا ہر ملک چلی جاؤ۔ امرحہ اپنے بانی بہن بھائیوں کی طرح بڑھائی میں کمزور ہے، مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے، مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے، مگر چند روز قبل دو لہما کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر پھند لگ جاتا ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں لہا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید سچ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف پروان ملک کا ڈی ویو یورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکا لرشپ فارم بھرتی ہے، مگر ہر جگہ سے انکار ہو تا رہتا ہے۔ بالا خرما چھپو یورسٹی سے اسے اسکا لرشپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلباء سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے۔ جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

## مکمل ٹاول







بعد امرجہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد درک ہوتا ہے۔ دادا جی امرجہ کے لیے پیسے اکٹھے کر کے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذرا، شرلی، بیٹی لو اور لیلیٰ کو اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرجہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے شغل کا ک نامی اپنے باپل گنا گھ میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا، ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ریک کے ساتھ مل کر ڈاکو منترز فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرجہ کے بابا جی کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس پیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں انیک ہو جاتا ہے۔ امرجہ انہیں سلی دیتی ہے اور ڈاکو منترز فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرجہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرجہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرجہ اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرجہ کی جھنجھل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے یہ اس کا گھر ہے، وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرجہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا، ناجائز؟ دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی، جوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرجہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تنہائی سے اس کی تربیت کی ہے۔ امرجہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔ ویرا کا ساتھ امرجہ کو احساس دلایا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرجہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا، وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

### تیسری قسط

اور مشرقی لڑکیوں کے لیے یہ موت جلد نازل ہوتی ہے۔

وہ برف سے الٹی زمین پر چل رہی ہے لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ وہ زمین میں دھنسن رہی ہے۔ دل احساسات کا اکھاڑا ہے اور دماغ اس اکھاڑے کا شیر۔ یہ شیر دھاڑتا ہے تو دل جل کر۔۔۔ بجھ کر۔۔۔ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

مشرق کے اکھاڑوں میں یہ شیر نگر عکریا جاتا ہے۔

مشرق دنیا سی بھی ہے اور سامری بھی۔۔۔  
مشرق میں بہت بھی ہیں اور باتاں بھی۔۔۔

کہا جاتا ہے کہ شادی ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے دوران آپ فرشتوں سے ”ابدی محبت“ کی دعاؤں کے تحائف وصول پاتے ہیں۔



اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی خوش نصیب لوگ کرتے ہیں۔

کچھ یہ بھی کہ کائنات میں حقیقی جشنِ کالجہ دودلوں کے مقدس ملن کالجہ ہوتا ہے۔

اور جاڑ ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔  
اور اجازت نامے کا بلند رتبہ ہے۔۔۔ بلند بہت بلند۔

اور پاک کتابیں، حکایتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی اشرف المخلوقات کی اولین شادی عرشِ خدا پر انجام پائی اور بعد ازاں ہونے والی ہر شادی عرشِ خدا پر انجام پائی شادی کا ہی رتبہ پاتی ہے۔

نکاح۔۔۔ سب سے پاک اور پسندیدہ روایت۔۔۔

نکاح۔ دودلوں کی فضیلت۔۔۔

اور داستانیں یہ بھی کہتی ہیں کہ تبت کے بر فیلعہ

پہاڑوں میں روپوش ایک مشک باری، اپنی بہترین پوشاک میں طویل مسافت طے کرتی اس مشک مشک بندھن میں بندھنے والوں پر مشک بید (بید کے خوشبو دار پھول) برسا کر جاتی ہے۔ جاتے جاتے وہ خفے کے طور پر دلوں کی منسکراہٹیں اپنی مٹھی میں قید کر کے لے جاتی ہے۔

اور شادی عہدِ قدیم کا وہ عہد نامہ بھی ہے جس کا دور ”عہدِ جدید“ میں بھی عزت و احترام اور محبت سے کیا جاتا ہے۔

مورگن کرسمس کی رات کو آچکی تھی۔ ماما مرنے اس کی شادی کے لیے ٹھیک ٹھاک تیاریاں کی تھیں۔ کیمرنگ میں مورگن نے شادی کے بعد رہنے کے لیے، جوش کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا گھر لیا تھا۔ جس کی سجاوٹ کے لیے ماما مرنے میسے مورگن اور جوش کو دیے، جو دونوں نے بہت مشکل سے قبول کیے۔ مورگن نے شادی کے لباس، زیورات، شادی کے دن اور آفریاری کی سب انتظامات ماما مرنے کی پسند سے کیے تھے۔ جی کہ اس نے شادی کی انگوٹھی بھی ماما مرنے کی ملی تھی۔

ماما مرنے کے سامنے ان کی ”میں“ ختم ہو جاتی تھی اور ماما مرنے ہی ان کی آنکھوں میں پڑھ لیتی تھیں کہ ان کے بچے کیا چاہتے ہیں، ماں اور اولاد کا وہ رشتہ تھا جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

اپنی شادی کی تیاری سے زیادہ مورگن کو ماما مرنے کام کرنے میں دلچسپی تھی۔ بار بار جانے سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ ماما مرنے میں بیٹھ چیک اپ کے لیے جانا ہے۔ جوش فون کر رہا تھا تھا اور وہ اسے چند سیکنڈ بات کر کے ڈانٹ دیا کرتی تھی۔

”مجھے ڈر ہے کہ ماما کے ساتھ بات کر رہی ہوں“ کیمرنگ کی ہزاروں داستانیں وہ ماما کو سنایا کرتی اور دونوں کے فقیروں سے شل کاک کو نچا کرتا۔

مورگن نے ساوٹا اور امرجہ کو Mates Brides (شہر بالیاں) بننے کے لیے کہا۔ امرجہ جس نے پاکستان میں اپنی خواہش کی داستانوں کی وجہ سے شادیوں میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ مورگن کی شادی کے لیے اتنی پرجوش تھی جیسے اس کی اپنی شادی ہو۔ لیڈر مرنے شہرہ یالوں کے لیے سنہری رنگ کو پسند کیا تھا۔ ساوٹا کی سنہری ساڑھی بنا دی گئی تھی۔ شارلٹ اور مورگن کی چند سہیلیاں جن کی آمد متوقع تھی اور امرجہ کے لیے انگریزی طرز کی خنوں تک لمبی فرائیں۔ فراک کا اوپری حصہ قدرے چست تھا جو نیچے آتے آتے لمبے بناتے گھیر دار ہوتا چلا جاتا تھا۔ ذرا سی حرکت سے ان لمبوں میں تلاطم پیدا ہو جاتا جو بہت بھلا لگتا تھا۔ سنہری موتیوں سے فراک کی پشت کو سجایا گیا تھا اور لمبوں میں اسے ٹانگا گیا تھا کہ جنبش پر وہ لمبوں کے ساتھ جھلمل کرتے گپ چھپ ہونے لگتے تھے۔

امرجہ کے لیے دوپٹے کی جگہ سنہری اسکارف نما کپڑا تھا جسے کندھوں کے پیچھے سے لاکر بائیں شانے پر آگے لہریں دے کر سنہری بروچ لگا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ کام فراک کی ڈیزائنر نے کیا تھا اور کیا کمال کیا تھا کہ امرجہ دوپٹے کے اس انداز پر حیران رہ گئی۔ دوپٹے کی کمی بھی



پوری ہو گئی اور فیشن بھی ہو گیا۔  
کرواپس ضرور آتی ہے۔۔۔ خسارے میں رہ کر بھی  
فائدے میں رہتی ہے۔

محبت جب خلوص دل سے انسانیت کے نام پہ کی  
جائے تو وہ آپ کو عظیم بنا داتی ہے۔  
عظمت کی بلندیوں تک لے جانے کا وصف محبت  
کے علاوہ کسی اور جذبے میں نہیں۔

اس لمحے میں امرجہ نے یہ سوچا تھا کہ کچھ لوگ  
ہمارے اپنے نہ ہو کر بھی ہمیں کتنی خوشی دے دیتے  
ہیں۔۔۔ اور کچھ جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں وہ کیسے  
ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتے ہیں۔ وہ دادی اور لماں کے  
بارے میں سوچ رہی تھی، اپنے خاندان والوں کے  
بارے میں جنہیں اس وقت راحت ملا کرتی تھی جب  
وہ کرب میں ہو کر رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی انہیں  
یاد آ جاتا تھا کہ اسے کیسے کیسے تکلیف دی جا سکتی  
ہے۔

شہر ہالیاں تین تین کی قطار میں دلہن مورگن کے  
پیچھے دامیں بائیں اپنے اپنے گلدستے پکڑے کھڑی  
تھیں۔ وہ ہال کے قد آدم دروازے کے پاس آ کر کھڑی  
ہو چکی تھیں۔ دلہن گھبرا رہی تھی اور وہ بار بار اپنی  
سائیس درست کر رہی تھی۔

ہال میں سب اس کی آمد کے منتظر تھے۔ دلہن کا ہی  
انتظار کیا جا رہا تھا۔ برطانوی معاشرے میں جہاں ایک  
منٹ ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیا جاتا صرف ایک  
دلہن کو دس منٹ تاخیر کی اجازت ہے۔ لیکن  
انگریزی خون کی حامل دلہنیں دس منٹ کی تاخیر بھی گناہ  
سمجھتی ہیں۔۔۔ برطانوی شہزادی، ایڈی ڈیانا کی بہو کیٹ  
ڈلن ڈیوڈ آف کیمبرج نے ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی  
نہیں کی تھی۔ پاکستانی دلہنیں اور بارانی سن لیں ایک  
سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں۔۔۔

اور وقت کی پابندی وہی قویں کرتی ہیں جنہیں  
وقت پر منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔۔۔ جو وقت کو  
ہندوستان کے کوہ نور سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہیں۔۔۔ وہ  
نہیں جن کی کوئی منزل ہوتی ہے نا مقصد۔۔۔ وقت

فراک بلاشبہ بہت مہنگی تھی اور امرجہ سے ایک  
پونڈ بھی نہیں لیا گیا تھا۔ لیڈی مہر کی لاڈلی بیٹی کی شادی  
تھی۔ بانی جن بچوں نے شادیاں کی تھیں انہوں نے  
رجسٹر میرج کی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جو لیڈی مہر کی  
خواہش پر اتنے اہتمام سے ہو رہی تھی اگر مورگن کے  
بس میں ہوتا تو شاید ایک پونڈ بھی اپنی شادی پر خرچ  
نہ کرتی۔ جب شادی کے ہال میں دلہن کے کمرے میں  
اما مہر نے مورگن کو دلہن بنے دیکھا تو وہ بے اختیار  
رونے لگیں۔ وہ مورگن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے  
بیٹھی رہیں۔۔۔ اسے دعائیں دیتی رہیں۔ اس کی نظر  
اتارتی رہیں۔ اور مورگن اپنی گھیر وار سفید پوشاک  
کو کارپٹ پر پھیلائے اما مہر کے قدموں میں بیٹھی ان  
کے آنسو اپنے ہاتھ میں پکڑے نشو سے صاف کرتی  
رہی۔۔۔ اس سے زیادہ مقدس منظر اور کون سا ہو سکتا  
تھا بھلا؟

گلابی پھولوں کا دستہ پکڑے کونے میں کھڑی امرجہ  
اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنی آئندہ  
زندگی میں وہ اس خاتون مہر سے زیادہ عظیم ہوتی ہے  
نہیں مل سکتی نہ ہی وہ خود ان جیسی عظیم ہو سکتی ہے۔  
جس نے ہر قوم و نسل کے بچوں سے والہانہ پیار کیا۔۔۔  
انہیں پالا۔۔۔ انہیں اپنا بنایا۔۔۔ انہیں لین دلیا کہ وہ  
ان کے نہ ہو کر بھی ان ہی کے ہیں۔۔۔ وہ ان کی حقیقی  
ماں بے شک نہیں ہیں، لیکن حقیقی ماں سے کسی  
صورت کم بھی نہیں ہیں۔

یہ سب کرتے خاتون مہر نے بلاشبہ دو رتبے پائے  
ہیں۔ ایک عظیم ماں ہونے کے اور ایک عظیم انسان  
ہونے کے۔ انہوں نے ان سب کے لیے خوشیوں  
کے سامان اکٹھے کیے۔ کامیابی کے بھی۔ ان کے  
لیے محبت کو کبھی تفریق نہیں کیا۔ وہ انہیں جمع کر کر  
کے دیتی رہیں۔ انہیں ضرب ہو ہو کر ملتی رہی۔

کائنات میں یہ خصوصیت صرف محبت ہی اپنے نام  
رکھتی ہے۔ یہ دینے سے اور زیادہ ملتی ہے۔ یہ ملیٹ

آئے یا جائے ان کی بلا سے۔۔۔ اور وہ کیا جانے وقت کس ”کوہ نور“ کا نام ہے۔۔۔  
اور یہ خوش قسمتی بھی صرف عورت کے نصیب میں لکھی گئی ہے کہ دلہن بنے اسے کسی شہزادی اور ملکہ سے کم نہیں سمجھا جاتا۔۔۔  
عورتوں کو اپنی کم مانگی کے رونے رونے چھوڑ دینے چاہئیں۔۔۔ وہ ماں بنتی ہیں تو وہ سب رشتوں سے الگ اونچے مقام پر کھڑی تصور کر لی جاتی ہیں۔۔۔ ایک کم عقل بچی سمجھ جاتا ہے کہ ”عورت ماں“ بن جائے تو پھر کوئی اور اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

بلند وبالا چھت اور قد آدم پھولوں سے جی کھڑکیوں سے گھرے، قدیم برطانوی طرز تعمیر کے چرچ نما ہال کے سرخ قالین پر سفید رنگ کی سنڈریلا فرائیس پہنے اور سر پر گلابی رتن باندھے دو انگریز بچیاں اپنی پھولوں کی ٹوکریوں میں سے پھولوں کی پتیاں نکال نکال کر دلہن مورنگن کے آگے چلتے ہوئے پھینک رہی تھیں۔  
دلہن نے ہال کے کھلے پھانک سے اندر قدم رکھا

۔۔۔ سب کی گردنیں پیچھے اس کی طرف مڑیں۔۔۔ ٹھیک اسی وقت ہال کے اندر پادری سے ذرا ہٹ کر بیٹھے سولہ رکنی وائلن گروپ نے اپنے ساز سنبھالے اور نرمی سے انہیں چھیڑا۔۔۔ وہ اس دھن کو جانے کی تیاری کرنے لگے جو فرشتوں کی دعاؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت۔۔۔ عین اسی وقت کوئی تیزی سے بھاگتے کالے سوٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی باندھتے دلہن کے پیچھے تین اوھر اور اوھر قطار کی صورت چلنے کی تیاری کرتی سہیلیوں کے پیچھے آیا۔۔۔ امرجہ دائیں طرف شارٹ کے پیچھے آخر میں گئی۔۔۔

سنہری پائیوں سے نکلی۔۔۔ ایک امرجہ۔۔۔ عربی شہزادے کے گھوڑے سے اترا۔۔۔ ایک عالیان۔۔۔

وانلین کے دھیمے سراسی وقت دولہا دلہن سے بچے

ہال میں بٹھرے۔۔۔ عالیان کی آمد کی ایسی خوشی۔۔۔ کیا انٹری تھی عالیان کی۔۔۔ وہ سرنگیت ساتھ لایا تھا۔

آہٹ پر امرجہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔۔۔ وہ جلدی جلدی اپنی ٹائی کو باندھنے کی کوشش کر رہا تھا، شاید اس نے زندگی میں پہلی بار سوٹ اور ٹائی پہنی تھی۔ ٹائی کو وہ ایسے باندھ رہا تھا جیسے گلے میں پھندے کو فٹ کر رہا ہو۔

اسے تو ایک ہفتے بعد آنا تھا وہ ایک ہفتہ پہلے کیسے آ گیا تھا۔۔۔ امرجہ کے پیچھے چلتے وہ اپنی ٹائی کے ساتھ مصروف تھا۔۔۔ شاید اسے بھی خود کو ہر صورت دولہا کی طرح خوب صورت دکھانا تھا۔۔۔ اس کے بال سیٹے سے جمتے تھے۔

”کہا جاتا ہے کہ شادی کے دن کوئی مرد اور کوئی عورت دولہا دلہن سے زیادہ خوب صورت نہیں لگ سکتے۔ اور میرا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی لڑکا لڑکی دولہا دلہن سے زیادہ خوب صورت لگنے کی کوشش کرے بل تو ان کے معاملے میں شدید گریز ہوتی ہے۔۔۔ اس کی شادی

## احسن کی بیٹی میں



فاخرہ جبین

قیمت - 400 روپے

منگوانے کا پتہ:

فون نمبر:

32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

نہیں بھی ہوتی اور وہ اپنی شادی جیسا خوش ہوتا ہے۔  
 بننے کی بات نہیں بھی ہوتی اور وہ ہنس رہا ہوتا ہے۔  
 شدید گریز کا معاملہ ہوتا ہے بلاشبہ ”مجھے بتایا جائے کہ  
 دلہن کون ہے؟ کیا صرف سفید لباس والی؟“

امرحہ کے عین پیچھے چلتے موتیوں سے گندھے  
 بالوں سے ذرا پیچھے ذرا فریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔  
 امرحہ نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ وہ سفید پھولوں سے  
 سجے ہال کو دیکھ رہی تھی اور بے حد اونچی چھت سے  
 جھولتے کئی میٹر چوڑے اور لمبے فانوس کو جس کی  
 روشنی نے سارے ہال کو بقیہ نور بنا ڈالا تھا۔ والٹن تھے  
 قہقہے تھے، پھول تھے، قہقہے تھے، دولہا دلہن تھے  
 عالیان اور امرحہ تھے اور اس تقریب کو کیا چاہیے تھا؟

لیڈی مہر کے سب بچے اپنے اپنے بچوں بیویوں اور  
 کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ باقی جوش  
 کے گھر والے، رشتے دار اور دوست تھے۔ کافی زیادہ  
 لوگ تھے سب دو اطراف نشستوں پر براجمان تھے۔

امرحہ کے پیچھے سے گھوم کر ماہر کے ہاتھ کو چوم کر  
 عالیان جلدی سے جا کر دولہا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس  
 نے جوش سے ہاتھ ملایا۔ اپنا تعارف کروایا اور جوش  
 کے شہرہ بالا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

دلہن پادری کے سامنے اور دولہا کے سامنے آکر  
 کھڑی ہو گئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ تعلیم میں پھر  
 شادی کی رسم شروع ہو گئی۔

اجازت نامہ دیا جانے لگا۔  
 اجازت نامہ دہرایا جانے لگا۔

شہرہ بالیاں دلہن سے پیچھے ہٹ کر قطار میں کھڑی  
 ہو گئیں۔ وہ سب دولہا اور دلہن کو دیکھ رہی تھیں۔

امرحہ واجد آج بہت خوش تھی۔ یہ پہلی تقریب  
 تھی جس میں وہ روئے بنا شریک تھی۔ ڈرے بنا۔

اسے کونے میں جھپٹ کر بیٹھنے کی جلدی تھی نہ  
 ضرورت۔ اس کے لیے وقت بدل چکا تھا۔ وہ

پھولوں کو تھامے، گردن اٹھائے، مسکراہٹ سجائے  
 خوب صورت لگ سکتی تھی۔ خوش ہو سکتی تھی۔

وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ خوش تو وہ بلاشبہ  
 بہت تھی۔

مشک باپری آچکی تھی اور مشک بید بر ساری تھی  
 ۔۔۔ شاید وہ ٹھوڑی سی اور مہیاں ہو گئی ہو اور اس نے  
 دلہن کی طرح ہی خوب صورت لگنے والی امرحہ پر بھی  
 کچھ مشک بید بر سائے ہوں۔

اگر اس نے یہ کام نہیں کیا تھا تو یہ کام عالیان کر رہا  
 تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں سنہری ہوتی چارہری  
 تھیں۔ امرحہ اس سے ذرا فاصلے پر سامنے کھڑی  
 تھی۔ امرحہ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ دولہا کے پیچھے کیسے  
 کھڑا ہے نہ ہی اس نے معلوم کرنا چاہا اور عالیان کو یہ  
 معلوم نہیں تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہال میں موجود  
 ہے۔

”دولہا۔۔۔ دلہن۔۔۔ اچھا۔۔۔ اور دوسرے لوگ  
 کیا واقعی یہ ہال میں موجود ہیں۔ ایسا ہو گا۔ میرا  
 نہیں خیال۔“

قدیم اور پر شکوہ چراغ نمائکی سو گلدستوں سے سجے  
 وسیع ہال کے جنگل کرتے فانوس کے عین نیچے پیچھے  
 سرخ قالین پر کھڑا گرانٹ پریناں کے سر کی طرف  
 جھک رہا تھا۔ اس بار وہ ”Gloxinia“ کو اس کے  
 نفاست سے گندھے سنہری موتی جڑے بالوں میں لگا  
 رہا تھا پھر اس نے پریناں کے ہاتھوں کو تھام لیا اور دلہن  
 کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔ ”تم میرے لیے ہمیشہ  
 اس پہلے دن کی دلہن کی طرح خوب صورت اور خاص  
 ہو گی۔“

”اس بار تمہیں اس عہد نامے کو سب کے سامنے  
 دو ہرانا ہو گا۔“ پریناں نے ادا سے کہا۔

”میں عالیان کے ساتھ اس عہد نامے کو دوہرانے  
 کے لیے تیار ہوں۔“

”میں امرحہ کی طرح انتظار کرنے کے لیے تیار  
 ہوں۔“ پریناں نے بالوں میں لگے ”Gloxinia“ کو

محبت سے چھو کر کہا۔ ساتھ ہی وہ مسکرائی۔ وہ  
 مسکرا سکتی تھی اس کے ہاتھ گرانٹ نے تھام رکھے



تھے۔  
سے ہوم کمنگ (Coming) ڈرنک پی تھی۔  
کھانے پینے کا اچھا انداز تھا۔

”میں کسی ایسی ڈرنک کو نہیں جانتی۔“ وہ صاف مکر  
گئی جبکہ وہ ویرالین اون کو پلا چکی تھی۔  
”نہیں جانتیں تو میں بتا دیتا ہوں ٹونی ولسن کہتا ہے

”This is Manchester we do  
things differently here ”

(یہ مانچسٹر ہے ہمیں انفرادیت کا جذبہ ہے)  
تو جب ہم کمر واپس آتے ہیں تو اسے بھی مختلف  
انداز سے ٹریٹ کرتے ہیں۔ تم مانچسٹر میں ہو، ہمیں یہ  
کرنا پڑے گا۔ صرف دو پونڈ کی کاک ٹیل اور  
بس۔“ وہ جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ اسے دو پونڈ کی کاک ٹیل کے لیے قریبی کیفے میں  
لے آئی جہاں اور بھی بہت سے اسٹوڈنٹس دو پونڈ کی  
کاک ٹیل پی رہے تھے۔  
”نئے سال کے لیے کیا کیا عہد و بیان کیے ہیں تم  
نے؟“

”سستی نہ کرنا اور وقت پر نوٹس بنانا۔ دوسرے  
سمسٹر میں 80% رزلٹ لانا۔“ عزم سے کہہ کر وہ  
مسکرائے لگی۔  
وہ ہنسنے لگا لیکن امرتہ نے تو کوئی لطیفہ نہیں سنایا  
تھا۔

”اب تم نے کیوں؟“

”کیونکہ تحقیق کہتی ہے کہ ساٹھ فیصد سے زیادہ  
لوگ سال کے پہلے ہی ہفتے خود سے کیے عہد کو بھلا  
دیتے ہیں اور باقی کے چالیس فیصد سے زیادہ افراد یہ کام  
چھ ماہ کے اندر کر گزرتے ہیں۔“

”میں ان ساٹھ فیصد میں سے ہوں نہ ہی چالیس  
فیصد میں سے۔“ اس نے عزم سے کہا۔

”مجھے خبر ہے تم پر۔“ اس نے اسے چڑایا۔ دو پونڈ  
کی ڈرنک وہ آہستہ آہستہ پی رہا تھا کہ وہ ختم نہ ہو  
جائے۔

”تم دیکھ لینا میں شان دار کامیابی حاصل کروں

عالیان مسکرایا۔ وہ مسکرا سکتا تھا۔ اس کی  
آنکھوں نے شہرے رنگ کو تمام رکھا تھا۔ گلابی  
پھولوں کے گلے دستے میں مسکراہٹ اٹکی تھی۔  
بھٹل کر رہی موٹی جڑی لہروں میں اس کا دل لک چھپ  
گپ چھپ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا  
کہ وہ کیا کرے۔ بھاگ کر جائے اور وائلن کو اپنی  
ٹھوڑی تلے لے کر دھندلے کر ڈالے یا۔ چھت  
کے ساتھ جھولتے فانوس کے ساتھ جھول جائے اور  
اعلان کرتا پھرے۔ یا کئی سوچو لوگوں کے گل دستوں کو  
اپنی بانہوں میں بھر کر شہری پوشاک کے قدموں تلے  
ڈھیر کر دے۔

اور یہ بھی کم تھا۔ یہ سب بھی کم تھا۔  
سب کم ہی ہوتا ہے۔ سب کم ہی لگتا ہے۔  
محبت اس عروج کا جذبہ ہے کہ سب لواٹھیاں تولہ  
ماشہ ہی لگتی ہیں۔



یونیورسٹی پھر سے آباد ہو چکی تھی۔ سترہ جنوری  
سے امتحانات شروع تھے۔ سب دن رات پڑھنے میں  
مصروف ہو چکے تھے۔ اس کے سب دوست اس کے  
لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ وہ خوش تھی کہ  
سب نے اسے یاد رکھا تھا لیکن وہ کسی کو بھی یہ بتانہ سکی  
کہ اس نے سب کو کتنا یاد کیا تھا۔ ان کے جانے کے  
بعد اس کا کیا حال ہوا تھا۔

”میں واپس آ چکا ہوں۔“

”مجھے نظر آ رہا ہے۔“ مورگن کی شادی کے بعد  
یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

”تو چلیے پھر؟“ وہ سویڈن کا پانی پی کر پہلے سے زیادہ  
خوب صورت ہو کر آیا تھا۔

”کہاں؟“

”ہوم کمنگ ڈرنک کے لیے۔“ (گھر واپسی کی  
دعوت کے لیے)

جو جاکچکے تھے انہوں نے جو مانچسٹر میں رہ چکے تھے

گی۔  
 ”میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔۔۔“ سوئڈن کا پانی  
 اسے بری طرح سے راس آیا تھا۔  
 ”تم مجھے چیخ دے رہے ہو۔“  
 ”میں تمہیں چیخ دے رہا ہوں۔۔۔“ نیبل پر ہلکا  
 کر اس نے کہا۔  
 ”اگر میں جیت گئی۔۔۔؟“ امرجہ نے انگلی اٹھا کر  
 کہا۔

”دشکل ہے۔“  
 ”اگر میں جیت گئی ہوں۔۔۔ پھر؟“  
 ”نا ممکن ہے۔“ دونوں شانے ناں میں ہلائے۔  
 امرجہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پاکستان  
 میں ایسے موقع پر کہا جاتا تھا تمہارے منہ میں  
 خاک۔“ وہ یہ بڑبڑا کر رہ گئی۔  
 ”تو جو تم کو کوئی عین وہ کروں گا۔۔۔ وہ گلے میں پھندا  
 ڈال کر چھت سے لٹک جانا ہی کیوں نہ ہو۔“ اوہ اتنا  
 تالاف سمجھتا تھا وہ امرجہ کو۔۔۔

”ٹھیک ہے پھر ڈیڑھ سال بعد ملتے ہیں۔۔۔ اسی میز  
 پر تیار رہنا پھندا ڈالنے کے لیے۔“  
 ”مطلب تم ڈیڑھ سال تک مجھ سے ملو گی نہیں  
 میں چیخ واپس لیتا ہوں۔“  
 ”اف! مطلب اس معاملے کو ہم ڈیڑھ سال بعد  
 دیکھیں گے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکراتے لگا۔ چڑانے والی  
 مسکراہٹ۔

”یہ انگریز خود کو سمجھتے کیا ہیں۔۔۔ سمجھتے ہیں سب  
 یہی کر سکتے ہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔۔۔ سب کر  
 سکتے ہیں ہم۔۔۔ خیر امرجہ دیکھ لے گی اس انگریز کو اب  
 ۔۔۔ امتحانات میں ایک ہفتہ تھا اور سب جنوری کے  
 پہلے ہفتے ہی واپس آچکے تھے اور جنوری کی برف باری  
 میں ایران کا محسن رسولی اور مصر کا موسیٰ فٹ بال گھیلنا  
 چاہتے تھے۔ امتحان تو پھر آجائیں گے بلکہ سال میں  
 دوبار۔۔۔ لیکن ایسی غضب کی سوسالہ ریکارڈ توڑنی  
 برف باری شاید پھر نہ آئے۔ ایرانی اور مصری یقیناً“

سوئے میں بھی خود کو فٹ بال کھیلنے جانتے ہوں گے اور  
 اپنی زندگی کے خاص دن ”شادی“ پر بھی فٹ بال کھیلنے  
 کے بلاوے کو رد نہیں کر سکتے ہوں گے۔  
 محسن رسولی نے دو تیس جمع کر لی تھیں، میچ کے  
 لیے برف سے اُسے گراؤنڈ میں رات کو میچ تھا۔۔۔  
 برف کا ڈھیر اور اس پر فٹ بال میچ۔۔۔ واہ۔۔۔  
 ”تم بھی میرے ساتھ کھیلو؟“ ویرا نے کہا۔  
 امرجہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

”کیا مصیبت آگئی ہے تمہاری جان پر؟“ ویرا نے  
 گھونسا مارا اس کی کربر۔  
 ”میں نے کبھی مونیاں پر فٹ بال گیم نہیں کھیلی۔  
 تم مجھے برف پر خو خوار کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کو کہہ  
 رہی ہو۔۔۔ یعنی میری موت برف پر واقع ہوئی ہے۔“  
 ”کون سا کھیل کھیلنا ہے تو؟“ ویرا ایک اور گھونسا  
 مارنے کے لیے تیار ہوئی۔

”لڈو۔۔۔ دادا کے ساتھ۔۔۔ بالہا، کبھی کبھی کرکٹ  
 وہ بھی اگر کوئی بچہ گیند کرائے آہستہ سے تو میں بلا چلا  
 لیتی ہوں۔۔۔ تیس بال سے ہار ڈیال سے بالکل نہیں“  
 ”تو تم لو کیا فارغ وقت میں کرتی کیا ہو پاکستان میں  
 سائیکل تم نہیں چلاتیں، دوڑ لگانے کے لیے تمہیں  
 کہا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔۔۔ کوئی گیم بھی نہیں آتی  
 تمہیں۔۔۔ کھانے کے علاوہ کچھ کرنا آتا ہے؟“  
 ”ہاں نا۔۔۔ چغلیاں کرنا اور بات بات پر لڑنا۔“  
 امرجہ نے اردو میں کہا اور ہنسنے لگی۔

تو امتحان چھ دن بعد شروع تھے اور وہ میچ کھیلنے کی  
 تیاری کر رہے تھے۔ لڑکیوں میں ایک دیر انھی اور ایک  
 لاء ڈیپارٹمنٹ کی وکٹوریہ۔۔۔ وکٹوریہ کارل کی ٹیم میں  
 تھی اور ویرا محسن رسولی کی ٹیم میں۔۔۔ جس طرح کی  
 بمبار کھلاڑی ویرا انھی کے دونوں ٹیمیں شامل کرنے  
 کے لیے تیار تھیں لیکن ویرا نے چالاکی کی اس نے  
 محسن رسولی کی ٹیم میں شمولیت کی۔۔۔ محسن رسولی  
 یونیورسٹی میں اپنے فٹ بال کے لیے ہی تو مشہور تھا  
 اس کے امکانات روشن تھے میچ جیتنے کے۔۔۔ اور وہی

پاس کھڑی منہ کھولے ہنس رہی تھی۔ اس کا بی چاہ رہا تھا، ویرا کو کندھوں پر اٹھالے۔ ورنہ کارل کو بی اٹھا کر پھینک دے۔ اور نہیں تو پیٹ پکڑ کر برف پر لوٹ پوٹ ہوتے ہنسنے۔ کچھ میچ اس نے دادا کو بھی دکھایا تھا اور وہ بھی ویرا اور اچلا کر لاہور میں بیٹھو ویرا کا حوصلہ برہمار ہے تھے۔

”نہیں بڑی ہنسی آ رہی ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، کالی سنجیدہ لگ رہا تھا جیسے ہار کے بعد لوگ لگا کرتے ہیں۔

”ہاں آ رہی ہے۔“ امرجہ نے منہ گھول کر ایک اور بیٹھ لگایا۔ برا کیا۔

آنکھوں کو چندھیا کر کارل نے اسے تاڑا۔ جیسے کہا ”اچھا تم۔ تم ٹھیک ہے پھر۔“

وہ چند قدم آگے چلا اس کے ہاتھ میں فٹ بال تھا اور پھر وہ ایک دم سے پٹا۔ امرجہ ویرا کی طرف جانے ہی لگی تھی۔ اس کا وہ بیان کارل کی طرف نہیں تھا، کارل نے پلٹ کر پوری قوت سے اس کے سر پر فٹ بال کی کک لگائی۔ امرجہ توازن قائم نہ رکھ سکی اور گر گئی۔ جیسے ہی وہ گری کارل نے تیزی سے اس کے سر پر جمی سرخ ادنی ٹوپی کو کھینچ کر اس کی ناک تک گھسیٹ دیا۔ جی ناک تک۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ امرجہ چلائی۔ یہ بھی برا کیا امرجہ نے کارل نے مٹھی بھر برف اس کے چلاتے منہ میں ٹھوس دی۔ امرجہ نے ہاتھ سے برف منہ سے نکالی۔ کارل نے تیزی سے اپنے گلے میں سے ادنی مفلک کو نکال کر اس کی گرہ بنا کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ڈالی اور گرہ کس دی۔ وہ جواہر کی کوشش کر رہی تھی اور لڑھک گئی۔

”یہ کیا؟ ٹوپی ناک تک۔ برف منہ میں۔ ہاتھ بندھے ہوئے۔“ امرجہ نے کسی مشین کی طرح اس پر برف اچھائی شروع کر دی۔ امرجہ منہ سے بمشکل برف اگل سکی۔ اس کے دانت ٹھنڈے ٹوٹ جانے کے قریب تھے اور کارل منہ اس برف کے ڈھیر میں دفن کر رہا تھا۔ وہ کھلے عام منہ کھول کر

ہوا، محسن رسول کی ٹیم میچ جیت گئی۔ تین دو سے۔ سو دو سو کے قریب اسٹوڈنٹس آئے تھے میچ دیکھنے، دستاویز پینے، مفلک لپٹے، کافی پیتے، منہ سے بھاپ اڑاتے۔ ہر گول پر گراؤنڈ کو سر اٹھانے والے۔ امرجہ کو بھی رہنما تھا لیکن وہ ویرا کے لیے آگئی تھی۔ اور اچھا ہی کیا آگئی ورنہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ بھاری کرنی ویرا کو کیسے دیکھتی۔ امرجہ کا حلق بیٹھ گیا تھا چلا چلا کر۔ اس نے کسی قدر حسرت سے ویرا کو دکھا، برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ ایسے بھاگ رہی تھی جیسے لاونچ میں کارپٹ پر بھاگ رہی ہو، اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ وہ برف میں خود کو دفن کر لے گی ہارے گی نہیں۔ کارل نے پہلا گول کیا تھا اور ویرا نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے اس کی گردن دیوچ لے گئی۔ اور اس نے گردن دیوچ ملی تھی، اس نے کیے بعد دیکرے دو گول کیے تھے۔ مخالف ٹیم کی کمر توڑ دالی تھی۔ وہ پریشر میں آئے اور بمشکل مزید ایک گول کر کے ہار گئے۔

”ویرا۔ ویرا!“ اسٹوڈنٹس نے گراؤنڈ سر پر اٹھا لیا۔ ویرا نے ڈیوڈیکھم کی بے نیازی اور میسی کی چھپی رستی لیے اسٹوڈنٹس کو دیکھا، ہاتھ لہرایا۔ اور اپنی دائیں آنکھ کے کنارے کو رگڑ کر کارل کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ کارل کو تو آگ ہی لگ گئی۔ اس کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ ٹیم غصے میں ابھر بھڑک چکی تھی اور شاید ویرا ایسی چاہتی تھی۔ وہ بھڑک بھڑک کر برف پر گرتے جاتے تھے۔ محسن رسول کی ٹیم فٹ بال لیے لیے اڑی جاتی تھی۔ ویرا برف کی پیداوار تھی اسے برف پر ہرانا مشکل تھا۔ یہ اس کی بے عزتی ہوتی۔ اور اس نے روس کی برف کی عزت رکھنا۔ وہ لوگ میچ جیت گئے۔

امرجہ کو بڑی خوشی ہوئی، ویرا کے جیتنے کی نہیں کارل کے ہارنے کی۔ وہ سب لوگ گراؤنڈ کے گرد گھیرا بنائے کھڑے دونوں ٹیموں کے میچ دیکھ رہے تھے۔ میچ ختم ہوا تو سب کو پھر سے پڑھائی یاد آگئی اور سب جلدی جلدی کھٹکنے لگے۔ اب امرجہ نیٹ کے



ہنس رہی تھی۔ اب ظاہر ہے ہارے ہوئے لوگوں کو ایسی ہنسی بری بھی لگ سکتی ہے۔  
 ”ویرا!“ امرجہ بمشکل چلائی۔۔۔ ویرا اور محسن رسولی کے ساتھ بیچ کی صورت حال پر غور کر رہی تھی، امرجہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ کارل کسی کرین کی طرح اس پر برف اچھالتا، جا رہا تھا اور اس نے امرجہ کو برف کے ڈھیر میں دفنایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امرجہ برف میں۔۔۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا امرجہ نے۔۔۔  
 ”ویرا!“ اس کی آنکھوں پر ٹوپی تھی۔ اسے نظری نہیں آ رہا تھا کہ ویرا کہاں ہے۔ برف کا ایک ڈھیر اس کے منہ پر آکر گر کر وہ لوار چلاؤ۔۔۔ کاش وادی کا کہا بیچ ہوتا وہ واقعی منحوس ہوتی اور کارل کے ہاتھ ٹوٹ جاتے اس کے ساتھ یہ سب کرتے۔

”کارل!“ ویرا کی دھاڑ سنائی دی۔ اس نے بڑھ کر امرجہ کے سر پر سے ٹوپی اٹھائی اور امرجہ نے دیکھا کہ ویرا نے ایک بے حد ناکام کوشش کی اپنی ہنسی کے فوارے کو روکنے کی۔  
 وہ گردن تک برف میں دھنس چکی تھی، ناک سرخ ہو چکی تھی۔ ہونٹ نیلے اور غصے سے وہ نیلی، پیلی، لال سب ہو رہی تھی۔  
 جیسے ہی ویرا نے ٹوپی اٹھائی۔ کارل اور ویرا دونوں کے منہ سے ہنسی کے فوارے نکلے۔  
 ”دادا! آپ ٹھیک کتے ہیں، مجھے امرجہ نہیں ویرا ہونا چاہیے۔“ امرجہ نے دل میں سوچا جب ویرا اسے برف سے نکال کر کھڑا کر چلی تو کارل نے امرجہ کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”بیچ ہو جائے۔۔۔ تم اور میں۔“ کیا بات کی تھی کارل نے۔ وہ بھی امرجہ سے۔۔۔  
 ”اسے فٹ بال نہیں آتا۔۔۔ مجھ سے بات کرو۔“  
 ”تم پرے رہو۔۔۔ Ginger Ball۔۔۔“  
 مجھے اس The Lost Duck سے بات کرنے دو۔۔۔

”The Lost Duck“ وہ چپ کارل کی شکل دیکھنے لگی غصے میں اتلا لال پیلا ہونے کے باوجود وہ اس

فٹ۔۔۔ وقت دس منٹ۔۔۔  
 ”نہیں۔“ امرجہ نے انکار کر کے جان چھڑائی۔  
 ”فاصلہ دس فٹ۔۔۔“ وہ آج ہر صورت اس کے سر پر لک لگانا چاہتا تھا۔  
 ”نہیں۔“ امرجہ نے ایسے کہا جیسے شاہ ایران اسے اپنا تخت پیش کرتے ہوں کہ آج سے آپ اسے سنبھالیں اور وہ کہتی ہو ”نہیں بھئی۔۔۔ بس نہیں کہہ دیتا۔۔۔ بس نہیں۔“  
 ”نہیں۔“ کارل نے واضح دانت پر دانت جمائے اور غصے کو چھپا کر اس کی طرف دیکھا کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتی جو پانچ سال کے بچے بھی کر کے جیت سکتے ہیں۔ کارل کو بس موقع چاہیے تھا اس کا سر پھوڑنے کا اسے برف کی مار مارنے کا۔۔۔

”چلو دس قدم۔۔۔ ہارنے والے کو برف میں گردن تک صبح تک دھنسنے رہنا ہو گا۔ Ginger Ball نے امرجہ کو آنکھ ماری کہ کھیل لومے پر پاگل تھی کیا وہ ابھی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی حیثیت نہیں ہوئی تھی اس کی۔۔۔  
 ”امرجہ کے لیے میں کھیلتی ہوں۔“ ویرا نے ہاتھ اٹھایا۔  
 ”تمہارے لیے کھیل بدل جائے گا۔۔۔ بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر بھاگتے ہوئے ہاتھ سے ہمیں سر پر بال مارنی ہوگی۔۔۔ وقت دس منٹ۔۔۔“  
 ”ٹھیک ہے!“ شاہ ایران کا تخت ویرانے قبول کیا۔  
 اسٹاپ وایچ امرجہ کو دے کر ان کا کھیل شروع ہو گیا۔

کا استعمال تو کبھی نہیں کیا گیا تھا تاہم۔ بھاگی تو کبھی نہیں تھی۔۔۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔۔۔ ایسے برف ملی تھی نہ کارل نامی بلا۔۔۔ جو ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

درا کے ساتھ بھاگتے امرج منہ کے بل گرتے گرتے گئی بار باری۔۔۔ امرج گر جاتی کارل (موت) اسے پیچھے سے آتی تو بہت ہی برا ہوتا۔۔۔

کارل کہیں پیچھے برف پر پھسل کر گر گیا تھا ورنہ وہ ان سے دس قدم پیچھے نہ ہوتا۔۔۔ ویرا اپنی سائیکل پر جھپٹی اور اسے چلا یا۔۔۔ امرج چلتی سائیکل پر بیٹھی۔۔۔ ویرا نے ہی اسے چلتی سائیکل پر بیٹھا اور آترنا سکھایا تھا اس کا ماننا تھا۔ ایمرجی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کام آتی ہیں۔

ایمرجی ”کارل“ میں یہ بات کافی کام آ رہی تھی۔

ویرا نے اپنی رولر کو سڑک کو دنیا کی تیز رفتار ترین چلابانی ٹرین بنا ڈالا جو چلتی ہے تو لگتا ہے اڑ رہی ہے۔۔۔ رولر کو سڑک بھی اڑ رہی تھی۔

”ویرا!“ کارل کی آواز ان کے پیچھے آئی۔ پھولے سانس کے ساتھ وہ چلا یا۔

”کون ویرا؟“ ویرا چلائی اور یہ جاوہ جا۔

جب وہ کارل کی پیچ سے دور ہو گئی تو رولر کو سڑک رفتار آہستہ کی گئی۔۔۔ ہنس ہنس کر ان کا برا حال تھا۔

برف سے ڈھکے چھپے مانچسٹر میں ان کی ہنسی کے قہقہے جل بجھ رہے تھے۔ امرج شاید ہی اپنی زندگی میں کبھی اتنا ہنسی ہوگی۔ اس کا پیٹ ہنسنے کے قریب تھا۔

”تم ہمارے کیس گئیں؟“ امرج نے اس کی کمر میں چٹکی بھری یعنی میرے لیے کھیلے ہی ہار گئیں یو ”Ball“

”Ginger

”کبھی انسان ہار بھی تو جاتا ہے، ہے نا۔۔۔ ویسے اگر میں جیت جاتی تو کارل نے بھاگ جانا تھا۔ ہم اس جن کو برف میں دھنسا سکتے تھے بھلا۔۔۔؟“

”میری دادی کا ماننا ہے میں منحوس ہوں۔۔۔ میری وجہ سے سارے کام خراب ہو جاتے ہیں۔۔۔ آگ

میں فٹ کا فاصلہ رکھ کر فٹ بال کو درمیان میں رکھ دیا گیا۔ فٹ بال پر پہلے کارل۔۔۔ جھپٹا، ویرا بھاگی لیکن کارل نے پھرتی سے اس کے سر پر بال دے ماری۔۔۔ بال ویرا کے ہاتھ آگئی۔۔۔ اس نے کارل کا نشانہ لیا لیکن کارل جل دے گیا۔۔۔ بال کارل کے ہاتھ آگئی ویرا کو بال کو اپنے سر پر لگنے سے بچانا بھی تھا اور بال کو اپنے قابو میں بھی کرنا تھا۔ برف پر پھسلنے گرتے پال پر جھپٹنے مقابلہ نویں سنٹ میں پانچ چار تھا۔ کارل پانچ۔۔۔ ویرا چار۔۔۔ دسویں سنٹ میں کارل نے ویرا کے سر پر ایک اور گول کر دیا۔۔۔ ویرا بری طرح سے برف پر گر گئی۔

”آخری منٹ!“ امرج چلائی۔ وہ بھاگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ آخری منٹ میں ویرا زیادہ سے زیادہ ایک ہی گول کر سکتی تھی نا۔۔۔ گراؤنڈ میں چند ایک اسٹوڈنٹس ہی موجود تھے جو ویرا اور کارل کی مستیاں دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ مذاق میں کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔

”آخری منٹ یہ سیکنڈز۔“ امرج پھر زور سے چلائی۔ وہ بھاگتے بھاگتے ویرا کے قریب جا چکی تھی۔ کارل ان سے دور تھا۔۔۔ بال ویرا کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کارل کے سر پر دے ماری لیکن کارل پھر بچ گیا۔۔۔ اور وہ بال پر جھپٹا۔۔۔ وہ پھرتی سے جھک کر بال اٹھا ہی رہا تھا کہ ویرا پھولے ہوئے سانس کے ساتھ چلائی۔

”امرج۔۔۔ بھاگ۔“ کہتے وہ خود بھی برفانی چھتے کی طرح گیٹ کی طرف بھاگی۔۔۔ امرج بھاگنے کی تیاری تو کر ہی رہی تھی پر ویرا کے کہتے ہی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”بھاگ امرج!“ ویرا پھر چلائی۔ کارل ان کے پیچھے جنگلی تیندوے کی طرح چلا۔

امرج نے اپنی لاہور میں کھائی خوراکیں زندہ کیں اور پورا زور لگا کر بھاگی۔۔۔ ویرا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی رفتار کے ساتھ بھاگنے لگی۔ لیکن کہاں کہاں ویرا کہاں امرج۔۔۔ امرج برفانی چیتا تھوڑی ہی تھی۔

جتنی مرضی صحت بخش غذا میں کھائی ہوں۔۔۔ ان

لگ جاتی ہے۔۔۔ تباہی، بربادی، ایسا سب ہو جاتا ہے۔۔۔



میں ہڑبڑا کر اٹھا۔۔۔ آج تو میرا پہلا پیر ہے۔۔۔ گھڑی اور گھڑی دونوں کی طرف دیکھا وہ کوش شام کے پانچ بج گئے۔۔۔ خدایا۔۔۔ میرا تو پہلا پیر تھا۔۔۔ میں تو رات بھر پڑھتا رہا تھا۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ پھر کیا ہوا آخر۔۔۔ یعنی میرا پیر گُیا۔۔۔ یعنی اب یونیورسٹی کا ڈین بھی مجھے فیل ہونے سے نہیں بچا سکے گا۔ میں اتنا وقت سوتا کیسے رہ گیا؟

کیا میں ساری رات پارٹی کرتا رہا۔۔۔ سارا دن سوتا رہا، نہیں میں تو علی کا سز میں تھا۔۔۔ نہیں مشید میں تو لا بریری میں تھا۔۔۔ وہ کوش میں کہاں تھا۔۔۔ آخر کوئی مجھے بتائے گا کہ میں کہاں تھا۔

میں نچلے فلور پر واقع شاہ ویز کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”شاہ ویز! میں کل رات کہاں تھا، بڑی جلدی بتا۔۔۔؟“

اف شاہ ویز بھی سو رہا تھا۔۔۔ میری طرح اس کا امتحان بھی گیا۔۔۔ وہ بھی فیل۔۔۔

”مجھے کیا پتا تم کل رات کہاں تھے۔۔۔ سونے دو مجھے۔“ شاہ ویز اندر سے ہی چلایا۔

”تمہارا بھی پیپر گیا یادے کر آئے ہو؟“ میں اس کے کمرے کے بند دروازے کے پار چلایا۔

”پیپر۔۔۔ وہ تو صبح ہے۔۔۔ اب دفغان ہو جاؤ۔“

”صبح تو گزر گئی۔۔۔ شام کے پانچ بج رہے ہیں۔“

”تم ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کیوں نہیں لگاتے، صبح کے پانچ بجے ہیں، شام کے نہیں۔“

”اوہ! اچھا۔۔۔ صبح میں۔۔۔ آہ کوش میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔“

یہ کیل تھا، ایگز امنز کے بے جا دباؤ کا شکار بے چارہ اسٹوڈنٹ۔۔۔ یعنی ناچنچر یونیورسٹی میں اس دیوانہ کو پسند ہو چکا تھا جسے ”ایگز امنز“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، پسند نہیں کیا جاتا۔۔۔ تو ایگز امنز کے دنوں کی ایک کیل ہی ایسی کالی نہیں ہے اور بھی مختلف کالیاں ہیں۔

”اچھا؟ تم تو بڑے کام کی ہو پھر۔۔۔ تم وائٹ ہاؤس کے سامنے ایک گھر کیوں نہیں لے لیتیں۔۔۔ روس کے ٹھوڑے حساب کتاب باقی ہیں امریکہ کے ساتھ۔۔۔ تم وہ حساب کتاب کیوں برابر نہیں کروا دیتیں ہمارے؟“ اگر تم واقعی ویسی ہی ہو تو جی تم ہمارے بہت کام کی ہو۔۔۔ ہمارا حساب چکا چکو تو روس آنا۔۔۔ گارڈ آف آنر دیا جائے گا تمہیں۔۔۔“

”گارڈ آف آنر!“ امرجہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ اس کی نخوت کو گارڈ آف آنر۔۔۔ کمال ہو گیا۔

”یہ میری زندگی کا بہترین وقت ہے ویرا۔۔۔ تم ہو، میں ہوں، برف ہے، ناچنچر ہے اور تمہاری سائیکل ہے۔۔۔ میرے لیے اتنے خزانے تھے زندگی کے پاس۔“

”سب سے بڑا خزانہ کارل۔۔۔ ہلایا!“ ہنستے ہنستے ویرا سائیکل گرا بیٹھی دونوں سڑک پر گر گئیں۔۔۔ انہیں ہلکی سی چوٹ بھی آئی لیکن اس چوٹ کی پرواہ کے بھی وہ دونوں تو سڑک پر گری سائیکل کے پاس ہنسنے میں مصروف تھیں۔

”اس کا نام لیتے ہی ہم گر گئے اف، اصل میں منخوس تو کارل ہے۔“

امرجہ کو بڑی خوشی ہوئی کارل کو منخوس ثابت کر کے اس نے جیسے اپنے منخوس ہونے کا بدلہ کارل سے لے لیا اور ساری روشن خیالی کے باوجود وہ دواوی کی طرح پورا زور لگا کر کارل کو ”منخوس“ ثابت کرنے کے لیے تیار تھی۔ بلکہ اس کام کے لیے پارٹ ٹائم کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔۔۔ ساری یونیورسٹی امرجہ کے خاندان کی طرح جب اسے منخوس منخوس کہا کرے گی تو امرجہ کے اندر ٹھنڈک ہی ٹھنڈک پھیل جائے گی۔

۔۔۔ آہ۔۔۔ کاش یہ دن دیکھنا امرجہ کے نصیب میں ہو۔

۔۔۔ کاش یہ دن جلد ہی آجائے۔۔۔ بلکہ آنے ہی والا ہو۔

”کارل دی منخوس مارا۔“



”نہیں! میں تو صرف پڑا کھا رہا ہوں۔ یہ دیکھو  
 اُوہ۔۔۔ میری پلیٹ میں یہ ڈبہ کہاں سے آگیا۔۔۔“  
 گول گول چشمہ ملفوف آنکھیں باہر کو۔۔۔  
 ”تمہارے منہ میں بھی ڈبے کا کچھ حصہ ہے۔۔۔  
 اور خدا کے لیے کرس اس کھڑکی کو بند کر لو تم اوک  
 باؤس کے وہ واحد اسٹوڈنٹ ہو گے جو اتنی ٹھنڈ میں  
 کھڑکی کھول کر پڑھ رہا ہے۔“  
 ”کھڑکی۔۔۔ اُوہ۔۔۔ تو یہ کھڑکی ہے۔۔۔ میں بھی سوچ  
 رہا تھا، میرے سارے کپڑے کہاں گئے۔۔۔ اور میرے  
 جوتے بھی۔“

لا بیرری کی طرف جاتے ہوئے۔  
 ”ہائے۔۔۔ جینا کیسی ہو؟ مائیکل کیمسٹری اسٹوڈنٹ  
 ”میں ماریا ہوں۔“ بائو اسٹوڈنٹ -  
 ”جینا ماریہ نا۔۔۔؟“ ہارنہ مانتے ہوئے، سر کھجاتے  
 ہوئے۔

”ماریہ ایڈم!“ دونوں ہونٹوں کو بگاڑتے ہوئے۔  
 ”ہاں، ہاں وہی جو مک لارین P.13 (پیش قیمت  
 کار) میں آئی ہے۔“

”میری تیسری نسل میں سے شاید کوئی مک لارین  
 خرید کر اسے ہاتھ لگا سکے، میں ایسی جرات فی الحال  
 نہیں کر سکی، میری حیثیت فری بس سے آنے والی ہے  
 اور تم؟“  
 ”میں۔۔۔؟“ سر کھجاتے ہوئے ہی۔  
 ”ہاں تم۔۔۔“

”مطلب۔۔۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔۔۔ میں پڑھنے  
 لا بیرری جا رہا ہوں سارہ۔۔۔“

”ماریہ۔۔۔ مطلب تم کون ہو۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟“  
 سر کھجانے کی باری اب ماریہ نے اپنے ہاتھ میں  
 لے لی ہے۔

”میں اچھا پائے۔۔۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں  
 سوزین۔“ چلا جاتا ہے۔

”میں کون ہوں۔۔۔ کیا نام ہے میرا؟“ جاتے  
 ہوئے۔

”تمہیں تو لا بیرری جانا تھا نا؟“ ماریہ پیچھے سے

”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟“ اپنے فیشن اور  
 لمبوسات کے لیے مشہور لنڈا۔

”تم چار بار پانچ مہینے پہلے لا بیرری آئی ہوگی۔“  
 ”ہاں آئی تو تھی۔۔۔ ایک میگزین چاہیے تھا۔۔۔ پر  
 آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”سارا سمسٹر چھوڑ کر صرف امتحانات کے دنوں  
 میں لا بیرری آنے والے مجھ سے یہی کہتے ہیں“ آپ  
 کو کہیں دیکھا ہے۔“ دوسرے سمسٹر کے امتحانات  
 میں آکر بھی تم یہی کہو گی۔۔۔ میں تھک جا ہوں بار بار  
 اس سوال کا جواب دے دے کر، اس لیے ابھی سے بتا  
 رہا ہوں میں لا بیررین ہوں اور میں لا بیرری میں  
 دیکھا اور پایا جاتا ہوں۔“

آنکھ، کان، زبان، دماغ، خاص کر بالوں میں سے  
 طوطے کیسے اڑتے ہیں سمجھ دیکھا ہے۔  
 ”نہیں۔۔۔ مائیکسٹر یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے  
 امتحانات کے دنوں میں ملیں۔۔۔“

”آئی لو یونی میوزیم۔“ ایما۔۔۔ عام دن۔۔۔  
 ”میوزیم۔۔۔ یونی میں میوزیم ہے؟“ ایما۔۔۔  
 امتحانات کے دن۔۔۔

”اُوہ۔۔۔ شکسٹر کو کیا ضرورت تھی اتنا کچھ لکھنے کی  
 ایک آدھ ڈرامہ کافی نہیں تھا۔“ جو نا تھن 40%  
 بمشکل لینے والوں میں سے۔

”کون شکسٹر؟“ ڈینشل مانچسٹر کے ہر کلب اور بار  
 کے بارے میں جاننے والوں اور 40% کے خواب  
 دیکھنے والوں میں سے۔

”میرے چچا۔۔۔“ جو نا تھن غصے میں۔  
 ”تمہارے چچا ڈرامے لکھتے ہیں۔؟ کس تھیٹر میں  
 لگتے ہیں ان کے ڈرامے۔۔۔ دو ٹکٹس مل جائیں گی؟“

ایک اور۔۔۔  
 ”تم ڈبہ کیوں کھا رہے ہو؟ اوک باؤس ہال میٹ  
 ”میں تو پڑا کھا رہا ہوں۔“ بے حد لائق فائق ممبسا  
 پتلا سا اسٹوڈنٹ کرس۔

”تم پڑا۔۔۔ ڈبے سمیت کیوں کھا رہے ہو؟“

چلاتی ہے۔

کتاب لکھ دانا چاہتا ہے۔۔۔ لیکن وقت ہی نہیں ہوتا۔۔۔ اور ایک بڑی دردناک حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ یاد بھی آخری منٹوں میں آتا ہے امتحانات ایک لمبی۔۔۔ آہ۔۔۔

”میں نے سارا سمسٹر ٹھیک سے کیوں نہ پڑھا؟“ ایک سوال، محاسبہ اور پچھتاوا جو امتحانات کے ختم ہوتے ہی اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ ویسے اسے مر ہی جانا چاہیے ہمیشہ کے لیے۔ ایویں ذہن میں کبلا کر احساس زلیاں جاگتا ہے۔

”مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔۔۔ میں پچھلے پچیس، تیس منٹ سے بڑھ رہا ہوں۔۔۔ آخر نیند پر بھی میرا حق ہے۔“ ایک خواہش جس پر فوری عمل کیا جاتا ہے۔

تو سب اسٹوڈنٹس اس سوال کا جواب جاننے سے قاصر ہیں کہ امتحانات میں اتنی نیند کہاں سے آجاتی ہے۔۔۔ بھوک اتنی کیوں لگنے لگتی ہے۔۔۔ ٹی وی، فیس، بک، یوٹیوب، نیوٹر پیلے سے زیادہ دلچسپ کیوں لگنے لگتے ہیں۔ کتابوں کی پہچان مشکل کیوں ہو جاتی ہے۔

ویسے امتحانات سے پہلے پوسٹ ایگزامینز پر بیان کر لی گئی تھیں۔ جیسے کرشمے آنے سے پہلے کرشمے کے بعد دی اور لی جانے والی پارٹیز پر بیان کر گئی تھیں۔ کون کون آنے گا یا نہی کہاں ہوگی، کیا کیا ہنگامہ برپا کرنا ہوگا۔ امتحانات کے ختم ہونے کی خوشی میں نہیں بلکہ امتحانات سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں۔۔۔

آس پاس کے سب ہی بارز، کلیکس، ریسٹورنٹس اس انتظار میں تھے کہ جلدی سے امتحانات شروع ہو کر ختم ہوں اور بے چارے اسٹوڈنٹس کچھ پانی شامی، مزے شمرے کریں۔۔۔ بے چارے اسٹوڈنٹس۔۔۔

تو یونیورسٹی میں کچھ اس قدر پڑھنے والے اسٹوڈنٹس بھی تھے۔۔۔

”یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ شاید تم میں سے جم۔“ ٹانگ سیڑھتی جولی۔

”ہاں شاید۔۔۔ کئی دنوں سے میں ٹھیک سے منہ نہیں دھو سکا۔ کپڑے بھی۔۔۔ دانت برش کرنے کا تو

”تم یونیورسٹی سے باہر کی سمت جا رہے ہو۔۔۔“ تو تعلیمی دور میں کم سے کم دس بار ہم یہ ضرور سوچتے پاتے جاتے ہیں کہ امتحانات میں فیل ہونا اتنا آسان اور پاس ہونا اتنا مشکل کیوں ہے؟ اسی فیصد پرچے اسی لیکچر باب، سوال پر کیوں مشتمل ہوتے ہیں جو آپ مس کر چکے ہوتے ہیں۔۔۔؟“ ”فیل ہونے کی بڑی وجہ کیا ہے؟“ ”میرا خیال ہے یہ امتحانات ہیں۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”Night before exams is like a night before christmas, you can't sleep and yet hope for a miracle“

اسٹوڈنٹس اپنے تعلیمی دور میں معجزات پر بہت یقین رکھتے ہیں اور ان کے رونما ہونے کی بھی دعائیں کرتے ہیں۔ دوسرا اور تیسرا باب پڑھنے کے بعد وہ یہ دعا کرتے سو جاتے ہیں کہ چوتھے پانچویں اور چھٹے باب میں سے کوئی سوال نہ آئے۔۔۔ اور سارا پرچہ دوسرے اور تیسرے باب پر مبنی ہو۔۔۔ چلو فرض کیا اگر چھٹے باب سے کچھ آئی گیا تو اسی فیصد دوسرے اور تیسرے ابواب سے جو آئے گا وہ پاس کروادے گا۔۔۔ چلو پچاس فیصد ہی سہی۔۔۔ چلو چالیس ہی سہی، اچھا چلو تیس ہی سہی۔۔۔ بس بہت ہے معجزاتی دعائیں۔۔۔ معجزاتی توقعات۔۔۔

امتحانات کے دوران سب سے زیادہ اسٹوڈنٹس خوش فہم ہوتے ہیں۔ امتحانات کے بعد سب سے زیادہ دنیا بھر میں دعائیں اسٹوڈنٹس کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ خون امتحان نامی بلا چوستی ہے اور کوئی پھاندنی حقیقی موت زلزلے کے دن سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

جی ہاں۔۔۔ سچ ہے یہ۔۔۔

امتحان گاہ کے آخری پانچ منٹ میں ہر اسٹوڈنٹ فوق الفطرت طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ ساری

کہیں جا کر ان کے 40 مارکس آتے ہیں۔ Unicorn ہراسٹوڈنٹ کے نیبل پر رکھا نظر آنے لگتا ہے۔ ایگزائمز سے متعلق اقوال دیواروں پر چپکا دیے جاتے ہیں آئینے میں اپنی ہی شکل دیکھ کر ڈرا جاتا ہے۔ اور رات کو چنی مٹی سی نیند میں بھی کتابیں آکر ڈراتی ہیں۔

تو وہ وقت آچکا تھا جو نیندیں تو بلاشبہ بھگائے گا ہی ساتھ تائیاں، ادایاں اور پھوپھیاں بھی یاد کر جائے گا یہ وہی دن ہوتے ہیں نا جب لگنے لگتا ہے کہ ایگزائمز سیزن زندگی سے کبھی جائے گا بھی۔ زندگی کبھی معمول پر بھی تھی۔ رات کو اپنی مرضی سے سونے والی صبح آرام سے اٹھنے والی۔ کپس ہانٹنے والی ادھر ادھر گھوم پھر کر مستیاں کرنے والی۔ آکسفورڈ روڈ اور اس سے منسلک دوسری سڑکوں پر چمقل قدمی کرنے والی۔ اف کبھی اتنے فارغ رہے ہیں ہم۔ پرنٹ ورک میں بڑی بڑی میزوں پر اسنوکر کھیلنے والے، اوک ہاؤس کے گروئنڈ میں آگ جلا کر اس کے گرد رات رات بھر بیٹھے رہنے والے۔ اتنے فارغ کیا یہ سب ہوتا رہا ہے۔

پروفیسر اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر زیر لب مسکرا دیتے، جیسے کہتے ہوں، اب چڑھے گا اصل فلو۔ لائبریری اسٹاف جن بھوت بن جائے کہ اصل امتحان تو اسٹوڈنٹس ان کا لینے والے تھے۔ جو نہیں بھی موجود ہو گا وہ بھی مانگا جائے گا۔

لائبریری اور لرننگ کمانڈ (پڑھنے کی جگہ) رات دن کھلے تھے اور کچھ ایسا سا پیدا کر رہے تھے جیسے وہاں عام انسان نہ ہوں، کسی سیارے سے اتنی مشینی مخلوق ہو جو نہ کھاتی ہے نہ سوتی ہے، بس پڑھتی ہی رہتی ہے۔ اگر ساری مائچسز لوٹی کو ایک دلن مان لیا جائے تو۔

"Commanrs alan gilbert learning"

المعروف علی لرننگ کمانڈ اس دلن کے ماتھے کا جھومر قرار پائے۔ چار اطراف میٹھے سے عجی شیشے سے بنی اور بلڈنگ کے اندر بیٹھے آپ باہر کی دنیا سے لا

بالکل وقت نہیں ملا۔ ایگزائمز ہیں نا۔ پیلے دانت نکال کر مسکرا کر کہا جانے والا تاریخی جملہ۔ جی ہاں تاریخی ہی۔

"تمہاری شکل مارشل سے ملتی جلتی ہے۔"

"میں مارشل ہی ہوں۔ پڑھ پڑھ کر ایسا ہو گیا ہوں۔"

"اوہ shurup (شٹ اپ کی جدید شکل) اس حالت میں گھرنہ چلے جانا۔ اپنی ڈی این اے رپورٹ بھی دکھائی تو بھی گھروالے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے۔"

"آخر تم تیز تیز کیوں نہیں چل رہے۔ ہم یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔"

"مجھ پر بہت بوجھ ہے گراہم!"

"پر تمہارے ہاتھ تو خالی ہیں۔"

"میرے سر پر۔"

"تم نے تو آج ٹوپی بھی نہیں پہنی۔"

"میرے ذہن پر یار! پر خالی کا بہت بوجھ ہے۔ میں نے کچھ غیر ضروری کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔"

"تمہیں یاد ہے نا تمہیں 100 میں سے مارکس لینے ہیں 1000 میں سے نہیں۔"

"ہاں پھر بھی۔ پھر بھی میں نے سوچا شاید۔"

یہ صرف کچھ جھلکیاں ہیں امتحانات کے دنوں کی۔ اور ظاہر ہے اسٹوڈنٹ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو۔ کم و بیش ایک سی حالت سے گزرتا ہے۔ ایک جیسے احساسات کا مالک ہوتا ہے کیونکہ وہ بے چارہ اسٹوڈنٹ ہوتا ہے نا۔ بے چارہ۔

یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس کی ایک خاص تعداد Modafinil اسٹڈی ڈوز بھی لیتی ہے۔ جسے کھا کر اسٹوڈنٹس کے بقول وہ بنا تھکے اور بنا سوئے کئی گھنٹے آرام سے پڑھ سکتے ہیں۔ بہت سے اسٹوڈنٹس وٹامن، ٹونک بھی لیتے ہیں۔ دیواروں پر نوٹس چپکاتے ہیں پڑھنے سے متعلق اکثر۔ اسٹوڈنٹس کے کمرے کی دیواریں ان نوٹس سے بھری ہوتی ہیں پھر



امرحہ نے ہونٹ سکیڑے۔

”سیدھا اور صاف مطلب ہے، یہ بہت آسان سبجیکٹ ہے۔“

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔۔۔؟“ مزاج بگڑنے لگا تھا امرحہ کو عیندگی ضرورت تھی۔

”تمہیں بتا رہا ہوں۔۔۔“ عالیان بھرپور نیند لے کر آیا تھا، جم کر پیٹھ گیا۔

”تم طنز کر رہے ہو۔۔۔“

”حقیقت کو تمہاری زبان میں طنز کیا جاتا ہے؟“ اس نے ذرا آگے ہو کر اس کے سامنے رکھی کتاب کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو امرحہ نے فوراً کتاب کو جھپٹ لیا۔

”اف۔۔۔ اتنی بد تمیزی۔“ اس نے ایسے طنز کیا جیسے اس نے برا مان لیا ہے پھر بھی وہ مزید پھیل کر صونے پر بیٹھ گیا۔

”کافی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ ہنسی دبانے کے لیے اس نے ہونٹ کا کونا دانتوں میں لیا۔

”کس نے کہا تھا میرے لیے کافی لانے کو؟“ اسٹوڈنٹس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ٹوٹ لینے والی یہ کہہ رہی تھی۔۔۔ تھیک ہے آخر کار ہر انسان بدل ہی جاتا ہے۔

امرحہ کو یہ بات بری لگی تھی کہ اس نے اس کے مضمون کو لے کر ایسا کہا۔ دنیا میں ہر انسان نیوٹن، اسٹینن یا عبد السلام نہیں بن سکتا، ذہانت کا معیار مشکل مضمون پڑھنا ہی نہیں۔۔۔ اگر ہر لڑکی مادام کبوری جیسی نہیں بنتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کندھن ہے۔ یا صفر ہے۔

وہ لاء پڑھ کر مارگرٹ پیچر، آئرن لیڈی بن سکتی ہے۔ ایم اے اردو کر کے بانو قدسیہ بن سکتی ہے۔ معمولی سمجھے جانے والے مضامین کو پڑھ کر بھی وہ کیا نہیں کر سکتی۔

”مجھے الہام ہوا تھا۔“ وہ اس کے دبے دبے غصیلے انداز پر زیر لب مسکرا ہی دیا۔

باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ دونوں قد آدم

تعلق نہیں رہتے۔ کسی ارب پتی کے ذاتی گھر کی طرح بے حد نفیس اور صاف ستھرا۔ فائبرو اشار ہو مل کی طرح چمکتی دھمکی گھر کے ماحول سے کہیں بڑھ کر آرام دہ اور پرسکون۔ نرم گرم علی کامنر۔

اسٹوڈنٹس اپنی مرضی سے اپنی تعلیم کے مطابق کامن روم کا انتخاب کر سکتے تھے۔ بال میں بھی پڑھا جاسکتا ہے جہاں کئی دوسرے اسٹوڈنٹس پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ گروپ میں بھی الگ سے گروپ روز میں بھی۔۔۔ دو دو چار چار کے گروپ میں بھی۔ یہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے، چارنگ، ایل سی ڈی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، وائٹ بورڈ وغیرہ وغیرہ۔

پورے رنگ کامن کی ڈیزائننگ اور سیٹ اپ ایسی ہے کہ گمان ہوتا ہے پڑھنے نہیں آئے۔ تفریح کے لیے کبھی ہو مل میں آتے ہیں۔ ساتھ ہی کھنے سے۔ اسٹوڈنٹس رنگ کامنر میں آجائیں تو انہیں کسی دوسری ضرورت کے لیے باہر نہیں جانا پڑتا، وہاں سب کچھ مہیا کر دیا گیا ہے۔

”تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟“ عالیان ہاتھ میں دو عدد کافی مک لیے اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ اوپن ہال میں ایکلی ٹیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اسے ضرورت پڑتی تھی تو وہ اپنی کسی کلاس فیلو سے مدد لینے چلی جاتی تھی۔

”تم ہرنس کے اسٹوڈنٹ ہو اور میں انگلش لٹریچر کی۔۔۔ تم میری مدد کیے کر سکتے ہو۔“ جی ایگز امز کے دنوں میں اسٹوڈنٹس چڑچڑے بھی ہو جاتے ہیں۔

”جانتا ہوں۔۔۔ لیکن تمہارے سبجیکٹ میں ایک اسکول کا بچہ بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“ عالیان جیسے اسٹوڈنٹس کامنر البتہ عروج پر ہوتا ہے۔

”تو وہ بچے اسکول کیوں جا رہے ہیں۔ یہاں آکر اسٹریڈ کیوں نہیں کر لیتے؟“

عالیان نے قمقمے کو بلند ہونے سے روکا۔ کیا جواب دیا تھا امرحہ نے۔۔۔

”ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

شیشے کی کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔  
”برف باری ہو رہی ہے امرجہ! دیکھو۔“ اس کا

مقصد صرف اس کا غصہ کم کرنا تھا۔ لیکن اگلی بات  
کر کے اس نے غلطی کر۔  
”تم تو شاید پہلی بار دیکھ رہی ہو گی؟ اس نے کھڑکی

سے باہر آسمان سے اترتے روئی کے گالوں سے برف  
کے گولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔  
”امرجہ کا غصہ یک دم بڑھ گیا۔“ کیوں میں کیوں پہلی  
بار دیکھ رہی ہوں گی؟“

”ہمارے پاکستان میں سب سب ہے۔ سب۔“ اس  
نے ایسے شانے لرائے جیسے کہتی ہو یو انگریز۔ او  
shurup۔

”برف باری بھی؟“ وہ ٹھوڑی کھجانے لگا پھر اس  
نے ہاتھ ٹھوڑی تے ہی نکالیا۔ کرسس نائٹ برلارڈ  
میسر اپنی پسندیدہ فلم دیکھتے ہوئے، اپنے مقصدے کا گلا  
دباے ہوئے۔

”یونیورسٹی کی یادداشتیں ڈاٹ کام۔“  
”ہاں بالکل۔“ شانے پھر اچکائے۔

”سندری امرجہ مزے سے بیچ کا گلا دباتے ہوئے،  
لارڈ میسر کو کم عقل سمجھتے ہوئے دیسی انداز میں ایسی لمبی  
چھوڑتے ہوئے ایک جھوٹ سوکمانیاں ڈاٹ کام۔  
”لاہور میں برف باری ہوتی ہے امرجہ۔ اچھا۔  
کب کب؟“

”جب جب یہاں ہوتی ہے۔“ امرجہ کے انداز کی  
نظر اتاری جانی چاہیے تھی۔

”اچھا۔ اور کیا ہوتا ہے لاہور میں۔؟“  
لارڈ میسر نے ریموٹ پھینک دیا ہے، انہیں  
صرف یہی فلم دیکھنی ہے۔

”سب۔ سب۔ جو یہاں بھی نہیں ہے سب  
ہے وہاں۔ جی ہاں۔ پھول، پودے، اسکول، کالج،

یونیورسٹیاں، عجائب گھر، بڑے بڑے بازار، شاپنگ سنٹر  
ہولڈرز، سپر جنرل اسٹورز، ٹرین، موٹروے، بڑی بڑی  
سڑکیں، سب ہے ہمارے پاس۔ تم نے کیا سمجھ رکھا  
ہے نہیں۔؟“

”ہوتی ہے۔“ وہ اپنی بات پر قائم رہی۔  
”سندری امرجہ۔“ چچ لارڈ کی چنگلیں اور  
گپیوں کی نہ ختم ہونے والی ڈوریں۔ “لاہور کی  
تاریخ اور ریٹیل لوگوں سے اکساب۔

عالیان نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

”اور یہ سب؟“ اس نے موبائل پر نظر آنے والے کالم کی طرف اشارہ کیا جو لاہور کے موسم کے بارے میں تھا۔

”یہ غلط ہے۔۔۔ کسی جھوٹے انسان نے لکھا ہے۔“ اس بار امرجہ نے شانے اور گردن ایک ساتھ اچکائے اور اتنے یقین اور سنجیدگی سے کہا کہ عالیان کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ ہاں ساری دنیا جھوٹی ہے، غلط ہے۔ صرف تم سچی ہو۔۔۔ مجھے صرف تمہاری بات پر یقین ہے۔ لیڈی مہر کی طرح ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر وہ اپنی مزید مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتا رہا۔  
دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔

سندری امرجہ ایسے ہی جھوٹ بولتی جا میں اور لاڑو میز ایسے ہی سنتے جائیں۔۔۔ وہاں کچھ ایسا ماحول تھا۔۔۔ علی رنگ کے اوپن ہاں میں۔۔۔ کھڑکی کے پاس۔۔۔  
”اگر میں لاہور جا کر رہوں اور برف باری نہ ہو تو تم مجھے کہو گی کہ اس سال ہی نہیں ہوئی۔ اگر میں اگلے سال تک کے لیے لاہور میں رک جاؤں تو تم کہو گی کہ موسم میں خطرناک حد تک تبدیلی آچکی ہے۔۔۔ اور اگر میں آس پاس کے لوگوں سے تصدیق کے لیے پوچھنا شروع کر دوں تو تم کہو گی کہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ تمہاری بے عزتی کروانا چاہتے ہیں۔“ اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اپنی ہنسی کو اندر ہی روک کر وہ بمشکل انتہائی کہہ پایا۔

”تو تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ سب کچھ تمہارے پاس ہی ہے؟“

وہ ہنسا ”تم دو شرلوں کے سرسری جائزے میں بھی حاسد ہو امرجہ۔ میں نے یہ کب کہا کہ ہمارے پاس کچھ ہے۔۔۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ کیا تم پہلی بار برف باری دیکھ رہی ہو۔۔۔ بس تم برا مان گئیں۔“  
”میں بہت یاد دیکھ چکی ہوں۔۔۔ بس۔۔۔“ امرجہ باز آنے والی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے پر کہاں؟“  
”فلموں میں۔۔۔ ٹی وی پر۔۔۔ میگزینز میں۔۔۔ اس

نے روانی سے کہا۔

عالیان نے سر کو اٹھایا۔ علی ازنگ کی چھت کو دیکھا اور اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ ہال میں موجود ذرا زیادہ فاصلے پر موجود اسٹوڈنٹس بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے اور قریب کی نشستوں پر ذرا دیر کو اوٹھنے والے اسٹوڈنٹس ڈر کر، جھرجھری بھر کر چونک کر آس پاس دیکھنے لگے۔

”عالیان!“ ڈر کر اٹھ جانے والی مہین نے اسے گھورا۔

عالیان نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔۔۔ امرجہ خاموشی سے کتاب پڑھنے لگی کہ وہ چلا جائے لیکن اپنی ہنسی قابو میں کرنے کے بعد وہ اس کی ایک کتاب کے کر بیٹھ گیا اور اسے سرسری دیکھنے لگا۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ الٹا اور اسے دیکھتا۔ پھر اسے دیکھتا اور جلدی سے صفحہ الٹ دیتا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے مزاج کو لگاؤ چکا تھا۔

”تمہاری آنکھیں۔۔۔“

”میری آنکھیں کیا؟“ امرجہ کو یقین تھا اب وہ اس کی آنکھوں کو نشانہ بنائے گا۔ کالی گہری۔  
”مجھے بھوری آنکھیں پسند نہیں۔“ اس نے جلدی سے اسے ٹوک دیا۔

”میں نے تم سے اپنی آنکھوں کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔“

”تم میری آنکھوں کو برا کہتے عین نے پہلے ہی کہہ دیا۔“ کیا حکمت عملی اپنائی تھی امرجہ نے۔ واہ۔

”میں نے تمہیں برا کہا؟“

”کہہ سکتے تھے۔ امکانات تھے۔“ کافی ذہین تھی امرجہ ویسے۔ باوام کھاتی رہی تھی نا۔۔۔

”جب کہا ہی نہیں تو۔۔۔؟“

”کہہ دیتے تو۔۔۔؟“

”میں تو بس اتنا کہنے لگا تھا کہ تمہاری آنکھیں بہت گہری ہیں۔ جب تمہیں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ بہت آنسو بہا چکی ہیں، بہت روٹی رہی ہیں۔“



ماما کے ہاتھ میں دیے ان کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔  
صبح ان کا ہاتھ سرد ہو چکا تھا اور سخت بھی۔ اور جب  
لوگوں نے میرے ہاتھ کو ان کے ہاتھ سے نکالنے کی  
کوشش کی تب میں رونے لگا۔ اور بعد میں بھی اس  
منظر کو یاد کر کے روتا رہا۔ یہ میرے اب تک کے  
رونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔  
امرحہ کو اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ ”آئی ایم  
سوری۔“

وہ اٹھا اور چلا گیا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ  
خود کو کس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔  
امرحہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا اپنے بارے  
میں اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ کافی خود غرض ہوئی جا  
رہی تھی۔ غالباً ”ٹھیک کہہ گیا تھا کہ جو روتا نہیں وہ تو  
انسان ہی نہیں ہے۔ اور سب انسان روتے ہیں۔  
کبھی نہ کبھی۔ کسی نہ کسی وجہ کو لے کر۔“

لیڈی مہ اپنے بچوں کے بارے میں صرف اس  
محبت کا ذکر کرتی تھیں جو ان سب کے درمیان تھی۔ وہ  
کبھی یہ نہیں بتاتی تھیں کہ کون کیا، کیوں اور کیسے ہے  
۔۔۔ وہ اس کنڈر سینٹر تک کیسے پہنچا۔ اس کا ماضی کیا  
ہے۔۔۔ وہ کہا کرتیں ”ان کے بچوں کا ماضی کتنا بھی  
بھیا تک رہا ہو، ان کا حال پر عزم ہے اور مستقبل شان  
دار۔ وہ ان کے بچے تھے اور وہ ان کی تکلیفوں کو ان کے  
سوا کسی اور کے ساتھ زیر بحث نہیں لائی تھیں۔  
کبھی مورگن، شارلٹ، ڈیش یا کوئی اور ان کے پاس  
پریشان صورت لیے آتا تو گفتگوں کر رہے ہوتے۔  
بچے بچاؤ کی کوئی باتیں کرتی رہتیں۔  
امرحہ سمجھ سکتی تھی کہ آپ کتنے بھی مضبوط اور بہادر  
بننے کی کوشش کریں۔ ماضی سامنے آکر تھوڑی دیر  
کے لیے ہی سہی پر دلوانہ سا ضرور کر دیتا ہے۔ آپ  
اپنے حواس کھوئے لگتے ہیں۔۔۔ عالیان کے بارے  
میں اگر امرحہ نے کچھ جانا چاہا تو انہوں نے صرف اتنا  
کہا۔

”وہ میرا بہت بہادر بیٹا ہے اور اپنی ماں مار گریٹ  
سے مثالی محبت کرتا ہے۔“

نوٹس لکھتے امرحہ کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ٹھیک کہہ  
رہا تھا۔ اسے اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس کے  
بارے میں اور کس کس بات کا ایسے ٹھیک ٹھیک اندازہ  
لگا چکا تھا؟ اس کی نحوست کا بھی۔ کیا اس کا بھی  
کہ لاہور میں وہ کتنی غیر اہم رہی ہے۔ گھر کا  
خاندان کا حصہ ہو کر بھی حصہ نہیں لے سکی تھی۔ اس پر  
کیسے کیسے طنز کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کا کیسے کیسے  
مذاق اڑایا جاتا رہا ہے۔

وہ امرحہ جو رات کے اس وقت بارہ بجے کے قریب  
مکمل اعتماد سے علی رنگ کامن میں بیٹھی بڑھ رہی ہے  
، ادا کے کمرے میں خوف سے چھپ جایا کرتی بھی کہ  
گھر میں آنے والے مہمان اسے دیکھ نہ لیں۔ اگر وہ  
کسی تقریب میں چلی ہی جاتی تو کوئی ایسی جگہ تلاش  
کرتی جہاں کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ اپنے ہم عمروں کو  
باتیں کرتے، قہقہے لگاتے، پھل کود کرتے دیکھتی لیکن  
اپنی جگہ سے نہ ہلتی۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ  
کرتی تھی۔

”کیوں روتی رہی ہو تم؟“  
”میں کبھی نہیں روتی۔“ کس قدر خوفناک سوال  
پوچھ لیا تھا عالیان نے۔ وہ اس سوال کا جواب کبھی  
نہیں دے گی۔  
”یہ جھوٹ ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔  
”میں کبھی نہیں روتی۔“ کہنا۔  
”جو کبھی نہیں روتا، وہ انسان نہیں ہوتا۔ تم  
انسان نہیں ہو کیا؟“

”تم انسان ہو۔ تم روتے ہو؟“  
”ہاں! رویا ہوں، بہت رویا ہوں۔“ خاموشی کے  
بو جھل وقفے کے بعد وہ بولا۔ اس کی آواز اس ہو گئی۔  
وہ پہلی بار اتنا اداس نظر آیا۔  
”کیوں؟“ امرحہ کو اپنی غلطی کا فوری احساس ہوا۔  
خاموشی سے وہ جیسے سر جھکا کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔  
”دیکھا برا لگتا ہے۔ اپنے رونے کی وجہ کوئی بھی  
بتانا پسند نہیں کرتا۔“

”میں چھ سال کا تھا جب رات بھر اپنے ہاتھ کو اپنی

ہوتی۔۔۔ وہ تھوڑی دیر کو کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔  
 ”کیا یہ کسی خواب کا منظر ہے۔۔۔ یا خواب ہی ہے؟“  
 اسٹوڈنٹس تیزی سے آ جا رہے ہوتے۔۔۔ ٹیل،  
 پیلے، سرمئی، کالے، سفید کوٹوں والے، ٹوپوں والے،  
 منہ سے بھاپ نکالتے۔۔۔ ہاتھوں کو رگڑتے یا جیبوں  
 میں دیسے کتنے پیارے مناظر تھے۔۔۔ ٹھنڈ تھی۔۔۔  
 برف تھی۔۔۔ دھند تھی۔۔۔ اور آزادی تھی۔  
 دوست تھے۔۔۔ پلا گلا تھا۔۔۔ اور کوئی دکھ نہ تھا۔

دو دن بعد امرجہ تھوڑا سا وقت نکال سکی عالیان کے  
 پاس جانے کے لیے، علی رنگ کامن کے گروپ  
 اسٹڈی روم کے شیشے کے دروازے کے باروہ اسے نظر  
 آ گیا۔ کم سے کم گیارہ اور اسٹوڈنٹس بیٹھے تھے اور وہ  
 اسٹ بورڈ کے پاس کھڑا لیکچر سارے رہا تھا۔ پین سے وہ  
 وائٹ بورڈ پر کوئی سوال حل کر رہا تھا۔ امرجہ نے اس کے  
 لیے کافی لائی تھی اب اتنے اسٹوڈنٹس میں وہ ایک مک  
 کلی تو نہیں دے سکتی تھی، اس لیے پلٹ آئی۔ وہ  
 سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی جب عالیان تقریباً  
 اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔

”یہ میرے لیے لائی ہو۔“ اس نے مک پکڑ کر  
 گھونٹ بھرا۔  
 ”ہاں!“ وہ مک ہاتھ میں لے چکا تھا۔ کافی پی رہا تھا  
 اور پوچھ رہا تھا امرجہ نے اسے داد دی۔  
 ”مفت!“ وہ سیڑھیاں اترنے لگا اس کے بال کی  
 طرف بدھنے لگا۔  
 ”ظاہر ہے مفت۔۔۔ یہ ٹویٹ نہیں ہے۔۔۔“  
 ”اوہ شکر کہ یہ ٹویٹ نہیں ہے۔۔۔ ویسے ہی میرے  
 سر پر دس بارہ ٹویٹس ہیں۔۔۔ چار تو کارڈ کی ہیں۔۔۔ اور  
 وہ میری جان کو آیا ہوا ہے۔“  
 ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آئی ہوں؟“  
 ”دو دن سے انتظار کر رہا تھا تمہارا۔“ چلتے چلتے اس  
 نے گردن موڑ کر کہا۔

”میں نے کب کہا تھا۔ میں آؤں گی؟“  
 ”آنا چاہیے تھا۔۔۔“

بس اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ  
 ایک کچھ دار خاتون تھیں۔ انہیں معلوم تھا، کس کے  
 بارے میں کتنی بات کرنی ہے اور اپنے بچوں کے لیے تو  
 وہ بہت کچھ دار تھیں۔

امرجہ اپنے رونے کو لے کر بیٹھی تھی اور سمجھتی  
 تھی۔ اس سے زیادہ دکھ کسی کو ملے ہی نہیں۔ اس سے  
 زیادہ زیادتی زندگی نے کسی کے ساتھ کی ہی نہیں۔  
 قدرت نے سب غم کے پہاڑ اس پر توڑ ڈالے ہیں۔۔۔  
 کسی خوشی کا حق دار اسے ٹھہرایا ہی نہیں گیا۔ ایک  
 امرجہ ہی گیا۔۔۔ ہم سب یہی سوچتے اور اسی سوچ پر  
 یقین رکھتے ہیں۔  
 انسان نے سب سے زیادہ علم جو خود کو سکھایا ہے  
 ”وہ ناشکر گزاری اور شکوہ سرائی ہی تو ہے۔“



سر سبز یا چمندر بونی برف سے اٹ چکی تھی۔ برف  
 بڑی نظر آتی تھی، پہلی بار برف کے ایسے ڈھیروں کو  
 دیکھنے والوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان ڈھیروں پر چھکیں،  
 گو لے بنانا ایک دوسرے کو ماریں۔۔۔ اور بہت سے  
 اسٹوڈنٹس وقت نکال کر ایسا کر بھی لیتے تھے۔ یا چمندر  
 سفید پری کا راج تھا اور گرم خطوں سے تعلق رکھنے  
 والے اس سفید پری پر فدا ہوئے جا رہے تھے جبکہ  
 ٹھنڈے خطوں کے باشندے ایسے موسم سے بہت  
 چرتے ہیں۔ وہ بہار کے دلدادہ ہوتے ہیں کم نہیں منہ  
 سے بھاپ نکالتے اس موسم سے کوئی خاص لگاؤ  
 نہیں۔ اتنے ڈھیر سارے گرم کپڑے پہننے سے انہیں  
 کوفت ہوتی ہے۔۔۔ پاکستانیوں کی تو خیر جان ہوتی ہے  
 سردیوں میں۔۔۔ اور وہ سردیوں کے مختصر دورانیے کو  
 ایسے مناتے ہیں جیسے مغربی کرسمس کی چٹیوں کو۔  
 ”دستانے، ٹوپی چڑھانے، کانوں کے گرد مظفر لپیٹے،  
 گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے۔۔۔ سرخ ناگ  
 لیے۔۔۔ دھند کو اپنے اندر اتارتے دھند کو چیرتے چلتے  
 امرجہ یونیورسٹی میں آتے ہی مبہوت سی ہو جاتی۔  
 دھند یونیورسٹی کی عمارتوں سے ہوتی زمین پر اتر رہی



”تم کہاں جا رہے ہو؟“ امرجہ کو نیچے جانا تھا اسے تو  
 نہیں تھا۔  
 ”میں تمہارے ساتھ۔“  
 ”میرے ساتھ کیوں آ رہے ہو۔۔۔ تم پر ہولیکہ  
 شاید تم کوئی لکچر دے رہے تھے۔“  
 ”میں بریک لینے کے بارے میں سوچ رہی رہا تھا۔“  
 ”میں تو صرف معذرت کرنے آئی تھی تم سے۔“  
 دونوں سینڈ فلور پر آ کر رک چکے تھے۔  
 ”ٹھیک ہے۔ کرو۔“  
 امرجہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔  
 ”کرو بھی۔ میں سن رہا ہوں۔“ کانی کی چسکی لے  
 کر اس نے کہا۔  
 ”معذرت کرنے آئی تھی۔۔۔ جب یہ کہہ دیا تو  
 مطلب معذرت کرنی۔۔۔ اور کیا۔“  
 ”آں۔۔۔ اچھا۔ اب آگے۔“  
 ”آگے کیا؟“ امرجہ کو پھر سے غصہ آنے لگا۔  
 ”تم اتنے پیارے سردماچھڑ میں رہ کر اتنی جلدی  
 گرم کر بیوں ہو جاتی ہو؟“ عالیان مسکرایا یعنی امرجہ سے  
 ناراض ہونا وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے غصے کو وہ  
 پھول کی پتی کی مانند چھو کر اڑا دیتا تھا۔  
 ”اچھا چلو، انگیزامز کے بعد ملتے ہیں۔ مشکل ہے  
 لیکن میں کر لوں گا۔۔۔ ورنہ میرا تعلیمی ریکارڈ خراب ہو  
 جائے گا۔“  
 ”مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“  
 ”مجھے خود بھی میری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔۔۔  
 اچھا تم جاؤ۔۔۔“  
 ”کیسے انسان ہو تم، کسے جانے کے لیے کہہ رہے  
 ہو۔“ کارل کی آواز ان کے قریب، لیکن پیچھے سے آئی  
 اور اس نے برہہ کر عالیان کی گردن دیوچی۔  
 امرجہ تو فوراً وہاں سے غائب ہو گئی وہ امتحانات کے  
 دنوں میں اس سے کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتی تھی  
 لیکن اگلی رات کو وہ خود امرجہ کے پاس آیا۔  
 کچھ فاصلے پر بیٹھی لیڑا پڑھتے پڑھتے لڑھک کر سو  
 چکی تھی اور صوفے اور کارپٹ کے درمیان جھولتی

”امرجہ The Lost Duck علی لرننگ کامن  
 میں سوئے ہوئے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چراتے ہوئے  
 اپنی نوعیت کا جالیہ سوال واقعہ۔۔۔“ فون ہاتھ میں  
 لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ ”یہ گرگرم کچھ ہی دیر میں  
 The Tab Manchester (اسٹوڈنٹس ویب  
 سائٹ) میں آجائے گی۔“

امرجہ کانی چاہا کہ لیزا کی ٹھنڈی ہو چکی کانی اس پر  
 انڈیل دے پر وہ باز رہی۔۔۔ وہ اپنی آنکھوں کی  
 چنگاریاں دبانے سے گھور رہی تھی اور کارل کو یہ نظر آ  
 رہا تھا کہ اسے گھورا جا رہا ہے۔۔۔ وہ ہاتھ پاندھ کر ایسے  
 کھڑا ہو گیا جیسے سوو سوپا رازی اس کی تصویریں کھینچ  
 رہے ہوں۔

”تمہیں غصہ آ رہا ہے؟۔۔۔ ہاں تمہیں تو غصہ آ رہا  
 ہے۔“ وہ مسکرایا۔  
 ”میں عالیان سے کہتی ہوں۔“ امرجہ کو آگ ہی  
 لگ گئی۔

وہ ہنسا ”عالیان میرا باپ نہیں ہے، ویسے ہو تا تو بھی  
 وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہ دھمکی چلنے والی نہیں تھی کہ  
 میں تمہاری اماں سے تمہارے ابا سے تمہاری شکایت  
 کر دوں گی یا ذرا کر دوں ابھی اپنے بھائی کو لے کر آئی وہ  
 تمہاری عقل ٹھکانے لگائے گا۔

”کچھ ہی دیر میں تم یونی میں مشہور ہو جاؤ گی، پھر ہر  
 کوئی تم سے اپنی چوری شدہ چیزوں کا مطالبہ کرے گا



ہزاروں پونڈ کمالیتیں۔۔۔ آج کل تو پرو فیسرز کو پینانڈز کرنے کے لیے کہا جاتا۔۔۔ بابا۔۔۔ منہ مانگے پونڈز ملتے تمہیں امتحانات کے دنوں میں۔۔۔“

لیکن یقیناً“ کارل کو اپنی تیاری سے زیادہ امرجہ کی فکر تھی کہ وہ بے چاری یہ نہ سوچتی ہو کہ اسے کوئی تنگ نہیں کر رہا۔ آخر اس کے ساتھ یہ غیروں والا سلوک کیوں؟ تو وہ اس کے ساتھ ایسوں جیسا سلوک کرنے لگی رات علی لرننگ میں موجود تھا۔۔۔

علی لرننگ میں امتحانات کے دوران بڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو پورا سمسٹر آپ کو نظر نہیں آتے وہ نظر آتے آتے آپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ پورا مہینہ علی لرننگ کامن میں ”ہاؤس فل شو“ ہوتے۔۔۔ جو راتوں کو اپنے بستروں پر سوتے ہیں وہ یہاں آگتھتے اور بڑھتے پائے جاسکتے ہیں۔۔۔ رات رات بھران کی شکلیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ علی کامن، لائبریری، کیفے جو بیس کھٹنے کھٹے رہتے تھے۔۔۔ تو کارل اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔۔۔ امرجہ اس کے اٹھنے کا انتظار کیا اور مکمل توجہ سے پڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے کار۔۔۔ کبھی نوٹس اس کے ہاتھ سے گر جاتے، کبھی پین اور پھریپ ٹاپ بھی گر گیا۔۔۔

اف اب وہ اتنا سامان سمیٹ کر دوسری جگہ جائے۔۔۔ اب تو اسے فلور پر ہی بیٹھنا پڑے گا کیونکہ سب جگہیں پُر تھیں۔۔۔ اور اسے یقین تھا، وہ جہاں بھی جائے گی۔ کارل اس کے سامنے آکر ایسے ہی بیٹھ جائے گا۔۔۔

کارل خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے اور جو چل رہا ہے وہ ایسا کچھ اچھا ہرگز نہیں ہے۔ کارل کے دماغ میں ایک ایسی بھٹری فکس تھی جو کبھی ڈاؤن نہیں ہوتی تھی۔ سب امتحانات کے مارے ہوئے تھے اور وہ انہی سیدھی حرکتوں میں غلطیاں تھا۔۔۔ پھر بھی ہر سال وہ اس کا ریشپ لے لیتا تھا۔۔۔ اگر وہ ایسی حرکتیں نہ کرے اور صرف بڑھے تو یقیناً“ وہ یونی کا ڈین بن جائے سارے کتابیں نوٹس، کاغذ، الپ

۔۔۔ وہ بھی جن کی کبھی ایک بن بھی چوری نہیں ہوئی ہو گی۔۔۔ تم سوچ سکتی ہو میرا کیا مطلب ہے۔۔۔“ ف وہ پھر مسکرایا۔۔۔ گند اچھے۔

امرجہ کارل کو وہیں چھوڑ کر ویرا کے پاس آئی۔ وہ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ گروپ اسٹڈی کر رہی تھی۔ ویرا کو ساری بات بتائی۔۔۔ ویرا ہنسنے لگی۔

”تم فکر نہ کرو۔۔۔ وہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔۔۔ ویسے میں The Tab کے ایڈیٹر کو جانتی ہوں۔۔۔ بات کر لیتی ہوں اس سے۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔“

”یاد سے کر لیتا ورنہ کل تک میں چور مشہور ہو چکی ہوں گی۔“

ویرا نے قہقہہ لگایا ”ویسے ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔۔۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ چور کیا محسوس کرتے ہیں۔“

”مجھے ایسے احساسات معلوم نہیں کرنے، یعنی حد ہے۔۔۔ ایک چور کے احساسات ہی رہ گئے ہیں معلوم کرنے کے لیے۔“

ویرا انہی سے لوٹ پوٹ ہونے لگی ”ایسی باتیں کرتی تم بڑی پیاری لگتی ہو۔ اگر اگلے ہفتہ نام کی کوئی چیز سے تو مجھے امرجہ بٹنا ہے۔۔۔ بیک ایڈی آف پاکستان۔“

”اور مجھے ویرا۔۔۔ خونخوار ایڈی آف ریشیا (دوس)“

ویرا نے وہیں کھڑے کھڑے ایڈیٹر سے بات کی، کچھ دیر بعد ویرا نے ایم ایم ایس جو ایڈیٹر نے اسے بھیجا تھا۔ امرجہ کو دکھایا۔۔۔ وہ امرجہ کی تصویر تھی۔

”جادو سے پینانڈز کر کے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چُپھا دینے والی فریشر امرجہ (The Lost Duck) اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ، یونیورسٹی انتظامیہ سے تحقیقات کی گزارش کی جاتی ہے۔“

”وہ تمہیں چور نہیں جادو گر ثابت کر رہا ہے۔۔۔ تم دیکھتیں، کل تک تمہارے پاس اسٹوڈنٹس کی لائن لگ جاتی پینانڈز م کے لیے۔۔۔“ ہنسنے ہنسنے ویرا بے حال ہو گئی۔۔۔ امرجہ بھی ہنسنے لگی۔

”یہاں بڑی مانگ ہے پینانڈز م کی۔۔۔ تم تو مزے سے

جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک میرے سرے زیادہ  
”تمہیں لیپ ٹاپ عزیز ہو گا۔“

”تم اس کی جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“ عالیاں  
نے آکر ایک زوردار گھونسا اس کی کمر میں جڑا۔ اور  
اس کے ہاتھ سے پین بھٹ لیا۔

کارل نے قہقہہ لگایا ”میں تو یہاں سے گزر رہا تھا  
امرحہ نے ہی مجھے روکا کہ آؤ باتیں کرتے ہیں۔ باتیں  
شانتیں۔“

عالیاں نے امرحہ کی سب چیزیں سمیٹیں اور اس کے  
ہاتھ میں کارل کا پین دیا۔

”اس پین کا استعمال میں تمہیں سکھا دوں گا۔ اگلی  
بار یہ تمہارے پاس آئے تو اسی پین سے اسے کرنٹ  
دینا۔“

امرحہ نے تبرک کی طرح پین کو قبول کیا۔ اور  
اپنی کلاس فیلو کی نیبل پر چلی گئی۔

کارل کا قہقہہ اس کے پیچھے گونجتا رہا۔  
کارل انسانی طے میں ایک غیر انسانی مخلوق۔۔۔

بلاشبہ۔۔۔

پین میں ایک ہیوی بیٹری فیکس تھی جو پین کے  
کیپ کو بائیں طرف حرکت دینے پر کام کرتی اور پین  
کی ٹب سے ہلکا سا کرنٹ نکالتا۔ جو معمول کے

اوقات میں کافی زوردار لگتا۔ عام استعمال میں وہ پین  
ایک عام لکھنے والا پین تھا۔ صرف اس کا مالک ہی  
اس کا استعمال جانتا تھا۔ اور اس کا مالک کارل تھا۔

یہ پین کبھی کارل کا ٹیڈ مارک تھا۔ اب تو کارل  
کے لیے پرانا ہو چکا تھا۔ لیکن امرحہ کے لیے بہر حال نیا  
ہی تھا۔ امرحہ کے لیے ہی اس نے نکالا تھا۔

وہ اس پین کا استعمال ’یونی میں‘ اسٹوڈنٹس سے  
بھرے کوریڈورز، لان، کلاسز، کراؤنڈ’لا سیرری، سب  
ویز، بس، ہوٹل، بارز، کلب، کیفے پر جگہ کیا کرتا،  
خریداری کے دوران بھی، سڑک پر چلتے رش والی جگہ

پر بھی۔۔۔

کئی بار کلاس میں اس نے پروفیسرز کو بھی یہ جھٹکے  
دیے تھے۔ جس دن اس کا یہ موڈ ہوا وہ پہلی رو میں

ٹاپ، پین وغیرہ کو اپنی بانہوں میں عارضی طور پر سمیٹ  
کر وہ بمشکل اٹھی اور نئی جگہ کی تلاش کرنے لگی۔

وہ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ اس کے ہاتھ پر بجلی گری  
۔۔۔ جی بجلی۔۔۔ آسمانی نہیں۔۔۔ زمینی۔۔۔ کارل نے  
اپنے ہاتھ میں پکڑے پین کو اس کے ہاتھ پر لگایا تھا

ایک دم سے پیچھے سے آکر۔۔۔ اور اس کے ہاتھوں میں  
پکڑی سب چیزیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ لیپ  
ٹاپ بھی ”ٹھا“ کر کے گرا تھا۔ اب اللہ ہی جانتا تھا وہ

چلے گا یا سستے داموں بکے گا بھی نہیں۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ امرحہ چلائی۔

”کیا ہوا؟“ ”اف کارل کی معصومیت۔۔۔“

”تم نے کیا لگایا ہے میرے ہاتھ پر؟“

”میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔۔۔ صرف یہ ایک پین ہے  
میری ہاتھ میں۔۔۔ میں پڑھ پڑھ کر تھک چکا تھا سو چاقم  
سے باتیں شانتیں کر لوں۔۔۔“

”اس پین میں کچھ تھا۔۔۔ ضرور کچھ تھا۔“ امرحہ  
قہقہہ کھا سکتی تھی اس میں کرنٹ تھا۔

”تمہیں میرے اس پین پر شک ہے؟“ اس نے  
پین لہرایا۔ ”دیکھو یہ صرف ایک پین ہے۔ اس سے  
لکھا جاتا ہے۔ لکھنا سمجھتی ہوتا۔ ایسے۔ ایسے  
لکھتے ہیں۔“

امرحہ نیچے بیٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی وہ بھی نیچے  
بیٹھ کر اس کی چیزیں سمیٹنے لگا اور ایک بار پھر امرحہ کے  
ہاتھ پر کرنٹ کا ایک جھٹکا لگا۔ امرحہ نے چیخ ماردی

کارل نے دونوں ہاتھ اٹھالیے۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک  
ہے۔۔۔ نہیں کرتا تمہاری مدد میں۔۔۔ تم تو جنگلیوں کی  
طرح چلا رہی ہو۔۔۔ میں یونیورسٹی انتظامیہ سے بات

کرتا ہوں آخر وہ یونیورسٹی میں خلائی مخلوق کو داخلے  
کیوں دیتے ہیں۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے نا۔۔۔  
اس طرح تو تم لوگ ہمیں باگل کر دو گے، آخر ہم کیوں  
پاگل ہوں تمہارے لیے۔“

امرحہ نے لیپ ٹاپ اٹھالیا۔ ”اگر تم یہاں سے  
نہیں گئے تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔“

”اس طرح تمہارا لیپ ٹاپ بھی ٹوٹ جائے گا۔“

سکیں، دوسرے دن ملنے والے اس کے ہاتھوں تیسرے دن بھی اوتن سکیں۔ وہ داڑھی اور بال بڑھالیتا، دوسرے دن کٹالیتا، تیسرے دن ہرے رنگ کی لوگ چوتھے دن گنچا۔۔۔ ساتھ کان ناک، ٹھوڑی اور بھنوں میں بالیاں۔۔۔ پانچویں دن لمبے بال۔۔۔ کارل

“Ask me

جس نے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانے جانا ہے اسے وہ بڑے آرام سے یونی سے باہر کسی بھی دوسری عمارت میں بھیج دیتا۔۔۔

کئی بے چارے معصوم ایشیائی جوڈرے ڈرے سے تھے اور اپنی ماما اور پاپا کے ساتھ یونیورسٹی کے گیٹ تک آئے تھے ان کو اس نے ہاتھ روم میں لاک کر دیا۔ جی اس کے پاس اوزار تھے وہ دروازے کے ہینڈل میں ایک باریک سلاخ ڈاڑا کر اسے جام کر دیتا تھا۔۔۔ وہ گیلا لاک۔۔۔ اب یہ اندروالے کی طاقت پر ہے کہ وہ کس زور سے ہینڈل کے ساتھ زور آزمائی کرتا ہے اور کتنی جلدی باہر آتا ہے۔۔۔

اور ایسے کام وہ بہت احتیاط سے کرتا۔۔۔ اسے بھی یونی میں رہنا تھا۔۔۔

چند لڑکیوں کو اس نے سائنس لیب میں بند کر دیا تھا۔۔۔ امرجہ کی قسمت اچھی تھی کہ ویلم ویک پر اس کا ٹکراؤ کارل سے نہیں ہوا تھا۔۔۔ ورنہ تو اس کی سائنس لیب میں ہی موت واقعی ہو جاتی۔۔۔

اور فریشر ویک پر ایک فریشر امرجہ لیب سے مردہ نکلتی۔۔۔ اور مائچسٹر میں اپنی آمد کے چوتھے دن تابوت میں بند ہو کر پاکستان واپس جاتی۔۔۔ اور داوا یہ معلوم نہ کر سکتے کہ پاکستان میں تو سب اس بے چارے کی بجی کے پیچھے بڑے رہتے تھے، مائچسٹر میں کون اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔۔۔

ہر فریشر ورور کر۔۔۔ گلیب پر اپنے گھر والوں کو ہری وگ، گجے سر، لمبے بالوں والے Ask me کا قصہ سنا رہا ہوتا۔۔۔

فریشر کے آتے ہی یونی میں کارل۔۔۔ کارل، ہوری ہوتی۔۔۔

بیٹھ جاتا اور بلاوجہ لیکچر کے دوران یہ ظاہر کرتا کہ اسے لیکچر میں فلاں فلاں پوائنٹ سمجھ ہی نہیں آرہے۔۔۔ پروفیسر چلتے اس کے قریب آجاتے۔۔۔

کارل دونوں ہاتھوں کو کھڑا ہو کر لہراتا اور ایسے لہراتا جیسے اسے بات کے دوران ہاتھ چلانے کی عادت ہے۔۔۔ بہت سے لوگوں کو یہ عادت ہوتی ہے۔۔۔ خیر ہاتھ چلاتے چلاتے پین پروفیسر کی ٹھوڑی، گردن، کان کی لو اور کبھی ناک سے ٹکرا جاتا۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ تو اور بے چارے پروفیسر۔۔۔ بھری کلاس میں چلا اٹھتے۔۔۔ ڈر کر۔۔۔ حواس باختہ سے ہو جاتے ایک دم سے اچھل پڑتے۔۔۔ بے چارے پروفیسر صاحب۔۔۔

ایسے موقعوں پر کلاس کے لیے اپنے قہقہوں کا گلا دینا مشکل ہو جاتا۔۔۔ علیان کہیں قریب ہی ہوتا تو اس کی کمر پر چنگی بھرتا۔۔۔

”کسی کی جان جائے گی تیرے اس چھوٹے موٹے کرنٹ کے گولے سے۔“

”گئی تو نہیں نا۔۔۔ دیے بھی سائنس کتنی ہے کہ ایک عام انسان کے جسم میں اتنے خاصے ویلیج کے کرنٹ کو سنبھالنے کی طاقت ہوتی ہے۔۔۔“

”سائنس کتنی ہے یا کارل کہتا ہے۔۔۔“

”کارل کسی سائنس سے کم ہے کیا۔۔۔؟“ آنکھ مار کر۔۔۔

تو یہ ہے کارل۔۔۔ انسانی حلیے میں غیر انسانی مخلوق۔۔۔

ویلم ویک پر اس نے فریشر کا کافی بھرتہ بنایا تھا۔ وہ تو سارا سال ویلم ویک کا انتظار کرتا تھا فریشر میں تو اس کی جان ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے سارے پرانے اوزار نکال لیا کرتا تھا۔۔۔

اکثر سینرز فریشر کو گائیڈ کرتے ہوئے کانڈ پر یہ بھی لکھ دیتے ”اور کارل سے بچ کر۔“

Have a safe welcome week

کارل ویلم ویک کے پانچ دن نت نئے انداز اپناتا

تاکہ پہلے دن ملنے والے اسے دوسرے دن پچان نہ



کے لیے جشن تیار ہے۔۔۔ بڑے بوڑھے بچوں کو سرخ لفافوں میں ملفوف ”کلی منی“ (خوش قسمتی کے سکے) دیتے ہیں۔ چینی روایات کہتی ہیں کہ سرخ رنگ ایک کی علامت ہے جو ان کے سیانوں کے بقول بد قسمتی اور بدی کو دور کرتی ہے۔ قدیم وقتوں میں بے بانسوں کو جلایا جاتا تھا تاکہ بدی اور بلا میں آگ کو دیکھ کر بھاگ جائیں، شر کو آگ سے دفعان کیا جاتا تھا۔

بدی اور بلا میں۔۔۔ دنیا کی ہر قوم انہیں دفعان کرنے کا چارہ کرتی ہے، غیر اور اچھی قسمت۔۔۔ دنیا کی ہر قوم اس کے حصول کے لیے تنگ و دو کرتی ہے۔ چینی نیا سال۔۔۔ خاندان کے ملاپ کا تہوار۔

پہلے چاند کی چندرہ کو سرخ چینی ساخت لالٹینوں کا تہوار منایا جاتا ہے۔ لالٹینیں جن پر ’پھول‘ پودے‘ برندے‘ بڑی جانور‘ تاریخ اور روایتی قدیم تاریخی شخصیات کندہ ہوتی ہیں سے عبادت گاہوں کو سجایا جاتا ہے اور ہاتھوں میں لے کر شام کو چاند کی روشنی میں پریڈ مارچ کیا جاتا ہے، چینی سال۔۔۔ بہار کا آغاز۔۔۔ دعاؤں کے ساتھ۔۔۔ خوشیوں کو لیے۔۔۔ بدی کو دور کرتے۔۔۔ روایات کو زندہ رکھتے۔

سرخ سرخ۔۔۔ روشن روشن۔۔۔ منظم اور پر جوش سال کے آغاز پر اپنی میزوں کو Dumpling (روایتی چینی کھانا) سے سجاتے ہوئے۔ دعا میں دیتے ہوئے۔۔۔ چاولوں کے جباروں کو بھرتے ہوئے کہ نئے سال پر چینی چاول کے جار کا خالی رہ جانا بد قسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔

چینی کبھی دوسری اقوام کی مذہبی‘ روایتی‘ علاقائی تقریبات کو حقارت سے نہیں دیکھتے۔۔۔ اور اپنے لیے وہ دوسری اقوام سے بھی یہی توقع کرتے ہیں۔

انہیں ابتدائی اسباق میں ہر خاص و عام کے احترام کا سبق پہلے دیا جاتا ہے، اسی لیے یہ ہر ایک کے سامنے تعظیم سے جھکتے نظر آتے ہیں اور انہوں نے دنیا پر یہ مہمت کر دیا ہے کہ وہ احترام کرنا جانتے ہیں۔

ماچسٹر میں اس سال کی ڈریکٹن پریڈ (نئے سال کی پریڈ) کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں۔ پریڈ اکتیس

اسٹوڈنٹ یونین کے صدر اور باقی لوگ اسے سنجیدگی سے محتاط رہنے کے لیے کہتے تو وہ بڑی معصومیت سے کہتا۔  
”چنانچہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیا میں نے کسی کی جان لے لی ہے یا میں لکڑہوں۔“  
یعنی وہ جان لے گا تو ہی کوئی چھوٹا مٹا جرم مانا جائے گا۔



چینی کہتے ہیں۔  
”اگر میں ایک سرسبز شاخ سے اپنے دل کو سجاؤں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک خوش گلو پرندہ اس پر آکر نہ بیٹھے۔“

اور ان کا کہنا ہے کہ  
”محبت کرنے سے پہلے احترام کرنا سیکھیں۔“ اور یہ بھی کہ۔

”ایک بوڑھے کا عشق میں مبتلا ہو جانا خزاں میں پھول کھلنے کے مترادف ہے۔“

اور خزاں میں محبت کا پھول ہی کھلنے کی جرات کرتا ہے۔ بدھانے سب جانوروں سے کہا کہ نئے سال پر نبھ سے آکر ملو۔ صرف بارہ جانور بدھانے ملتے آئے اور بدھانے ان بارہ کے نام ایک ایک سال کر دیا تیل‘ سرخ‘ خرگوش‘ بکری‘ چیتا‘ خنزیر‘ سانپ‘ ڈریکٹن‘ چوہا‘ گھوڑا‘ بندر اور کتے کے چینی سالانہ کیلنڈرز ان جانوروں کے ناموں سے ترتیب پاتے ہیں اور چینی اپنے سال کے آغاز سے پہلے پورے جوش و خروش سے اپنے گھروں کو صاف کر کے سجاتے ہیں‘ نئے کپڑے خاص طور پر سرخ لباس بنواتے ہیں۔ سرخ کاغذوں اور سرخ پارچہ جات پر لکھی روایتی نظموں سے گھر کے دروازوں‘ دیواروں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کو سجاتے ہیں۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔۔۔ پرانا وقت بیت چکا ہے۔  
پرانے وقت کو الوداع کہا جائے گا۔۔۔ نئے وقت

بچانے کی سعی کرتا رہا تاکہ وہ کومہ میں نہ چلے جائیں  
..... کئی گھنٹے بعد دوسرا بچہ مدلا سا اور پہاڑی لوگوں نے  
مل کر چھ مہینے تک ان کی نیند راری کی۔ میرے دادا ہر  
سال نئے سال کی دعاؤں میں ان سب پہاڑی چٹانوں  
کو یاد رکھتے ہیں اور ان کے لیے خوشحالی اور خوش قسمتی  
کی دعائیں کرتے ہیں۔ ”وہ امرچہ کو پھان سمجھتی تھی  
اس کے نزدیک سب پاکستانی پھان ہی تھے۔ امرچہ کو  
خوشی تھی کہ پہاڑی پھانوں نے اسے مانچ سزا اور اتنی  
بڑی یونی میں معتبر کر دیا ہے۔

کسی بھی قوم کے ایک فرد کی گئی نیکی بلاشبہ ساری  
قوم کا سرخسرے بلند کرواتی ہے۔  
”مجھے ہنسی آئے گی۔“ امرچہ کو ابھی بھی تامل تھا۔  
”تو ہنستی رہتا، بلکہ چھٹا لگیں لگاتا۔ کوئی فرق نہیں  
پڑے گا۔ روتے روتے لوگوں کا وہاں کیا کام۔  
وہیے تم کس جانور کا لباس پہننا پسند کرو گی؟

میں انتظام کر دوں گی۔ چاہو تو کوئی ماسک نہ پہنا  
..... تم ڈرگین کا لباس بھی پکڑ سکتی ہو لیکن اس کے لیے  
تمہیں مسلسل حرکت میں رہنا ہوگا، تم ٹھک جاؤ گی،  
میں روایتی چینی لباس کمونو پہنوں گی اور میرے ہاتھ  
میں بڑا سا چینی پکھا ہو گا میرا میک اپ بہت گہرا ہو گا  
..... چاہو تو تم میرے ساتھ یہ بن سکتی ہو۔ یا تم  
Percussion (دو بڑی گول دھاتی ہلیٹھوں پر مشتمل  
ساز، دونوں ہلیٹھوں کو آپس میں ٹکرایا جاتا ہے) بجا  
سکتی ہو۔ یا ڈرم۔ لیکن تمہیں ڈرم بجانے کی  
پریشانی نہیں ہوگی۔“

”نہیں، میں کمونو نہیں پہن سکتی۔ گہرا میک اپ  
تو ہرگز نہیں۔“

”اگر تم شرما رہی ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ڈرگین  
کا لباس پہن لو۔ اے پہن کر قطعاً یہ معلوم نہیں  
ہو گا کہ تم ہون لڑکی یا لڑکا۔ تمہاری مخصوص مشرقی  
جھجک بھی قائم رہے گی۔ بھلے سے ماسک کے اندر  
شرماتی گھبراتی رہنا۔ ہنسی۔ قہقہے لگاتی رہنا۔“  
امرچہ دل کھول کر ہنسی ”ٹھیک ہے۔ میں ڈرگین  
بن جاتی ہوں۔“

جنوری نئے سال کے پہلے دن تھی، یہ سال گھوڑے کا  
سال تھا، پچھلا سال سانپ کا سال تھا۔ امرچہ کی چینی  
کلاس فیلو جی سن (Jee sun) نے سب کلاس فیلوز  
کو رجسٹریشن کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ امرچہ کے  
پاس بھی آئی تھی۔

”میں تو جانتی بھی نہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے  
میرے لیے تو کھڑے ہو کر دیکھ لینا ہی بہت بڑی  
دیرافت ہوگی کہاں اس میں شرکت کرنا۔“

”پریڈ میں جاؤ گی تو سب جان جاؤ گی۔ تمہیں  
زندگی میں کھڑے ہو کر پریڈ دیکھنے کے تو کئی بار مواقع  
مل جائیں گے شرکت کرنے کے نہیں۔ اس سال تو  
نوے ہزار سے زیادہ لوگ شرکت کریں گے۔“

وہ ہنسنے لگی ”نہیں! میں نے یہ سب کبھی نہیں  
کیا۔“

”جو کیا نہیں وہ کرو گی بھی نہیں۔ چینی پاکستانی کو  
”ناں“ نہیں کہتے ایک پاکستانی چینی کو ”ناں“ کیسے کہہ  
سکتا ہے۔ غیر چینی لوگ پریڈ میں شرکت کرتے ہیں تو  
ہمیں اچھا لگتا ہے، ہمیں یقین ہوتا ہے کہ نئے سال کا  
آغاز ہم نے سب اقوام کی دعاؤں اور محبت سے کیا  
ہے۔ ہم دونوں تو ایشیائی خطے کے دو اہم دوست بھی  
ہیں اور ہمسائے بھی۔ قطار میں تین غیر ملکی کھڑے  
ہوں تو ہم پہلے پاکستانی کے آگے Bow کرنے کو ترجیح  
دیتے ہیں۔“

امرچہ متاثر ہو گئی۔ جی سن ٹھیک کہہ رہی تھی  
امرچہ کبھی بھی کسی بھی طرح کی مدد کے لیے جی سن  
کے پاس جاتی وہ فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتی  
تھی۔ ابتدائی تعارف میں اس نے امرچہ کو گھٹے سے  
لگایا تھا اور دوبار اس کے آگے جھکی تھی۔ اس نے  
اسے بتایا کہ اس کے دادا تجارتی غرض سے ایک بار  
پاکستان گئے تھے اور پہاڑی علاقے میں خوفناک  
حادثے کا شکار ہو گئے تھے، سردیوں کے دن تھے، اتفاق  
سے دو پھان پہاڑی بچوں نے انہیں دیکھ لیا اور ایک  
بچہ کئی گھنٹے ان کے ساتھ برف میں ان کی ٹوٹی ہوئی  
ٹانگ کو سارا دینے اور انہیں بے ہوش ہونے سے



لیے، جب مجھے انہوں نے۔“ چینی خاتون نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا ”ریو زکیا تھا تو یہ اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس کوئی انگوٹھی نہیں تھی تو انہوں نے ایک اسکول جاتی بچی کے بالوں میں سے رن کھول کر میری انگلی میں باندھ دیا کہ مجھے کوئی انگوٹھی والا نہ لے اڑے۔“

دونوں میاں بیوی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ امرجہ دیکھ سکتی تھی کہ دونوں نے کس محبت سے اپنی زندگی گزاری ہوگی۔

سرخ رن امرجہ کی آنکھوں میں بس گئے۔ آنکھوں کے پاس لاکر وہ انہیں دیکھنے لگی۔ اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا کہ یہ رن کیس کھونہ جاتیں۔ اس نے انہیں اپنے کراس بیگ کی محفوظ جیب میں رکھا۔

پھر ہاتھ کو کراس بیگ پر مضبوطی سے ٹکا لیا اسے لگنے لگا کہ سارے چوروں کی نظر اس کے ان دو عدد رن پر ہی لگی ہوگی۔

سرخ نظمیں دیا رچہ ویرانے اپنے بال کھول کر سر پر باندھ لیا۔ اور نکلن این اون نے پن لیا۔ امرجہ نے یہ دو چیزیں انہیں خوشی سے دے دی تھیں۔

”لاؤ وہ رن بھی میری کلائی پر باندھ دو۔ ایک تم باندھ لو۔“ امرجہ نے ویرا کو نہیں بتایا تھا کہ رن کے ساتھ کیا کہانی منسلک ہے۔ امرجہ کی جیسے جان ہی نکل گئی۔

”وہ میں پاکستان لے کر جانا چاہتی ہوں۔“

”رن؟“ ویرا حیران ہوئی۔

امرجہ نے سر ہلایا۔

”میں پن کر نہیں واپس کر دوں گی۔ اس پر جو ستارے لگے ہیں مجھے وہ اچھے لگے ہیں۔“

”میں نے ابھی رن نہیں باندھا۔ میں انہیں ان چھوڑ کر کھانا چاہتی ہوں۔“ امرجہ نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”بعض معاملات میں تم بہت عجیب ہو امرجہ!“ مجھے لگتا ہے میں پوری کی پوری ہی عجیب

”میں وعدہ کرتی ہوں یہ تمہاری زندگی کا یادگار لمحہ ہو گا۔ تم پر قسمت مہربان ہوگی۔“

امرجہ اور زیادہ مسکرانے لگی۔ ”نظارا رہے گا پھر اس لمحے کا۔“



چینی نئے سال کی رات میں سب مل کر چائنا ٹاؤن گئے۔ چائنا ٹاؤن کسی بھی ملک یا شہر میں آباد چینوں کے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں سب چینی ایک مخصوص علاقے میں بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ چائنا ٹاؤن کی حدود کے آغاز پر سرخ پیکے سبز، روایتی چینی رنگوں سے بنی چینی طرز تعمیر کا بڑا پھاٹک آتا ہے۔ جس کے دونوں اطراف جانوروں کے بڑے بڑے مجسمے گھوڑے کا تھا۔ ایک بہت بڑے ڈریگن کو بالوں کی مدد سے اونچائی پر ٹانگ دیا گیا تھا۔ باجبا چینی اسٹائر لکے تھے جن پر چین کی روایتی چیزوں کی بھرمار تھی، ناچنے کے درختوں کی شاخیں تو سب سے ہی سرخ گول چینی ساختہ لالٹینوں سے سجادی گئی تھیں۔

این ویرا اور وہ مزے سے مفت چینی کھانے کھاتے رہے۔ تمام اسٹائر پر یا کھانے بہت کم قیمت پر دستیاب تھے یا مفت بانٹے جا رہے تھے۔ امرجہ ایک چینی تحفہ بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک عدد چینی شادی شدہ جوڑا اپنی شادی کی سلور جوبلی پر تحائف تقسیم کر رہا تھا اور ناچنے والوں کے اسٹوڈنٹس کا وہاں اتنا رش تھا کہ لگتا تھا سب اسٹوڈنٹس آئندہ زندگی اس ایک تحفے پر گزارنے والے ہیں۔

تحفے میں ایک عدد روایتی سرخ یا رچہ تھا جس پر چینی زبان میں نظم لکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں پننے کا چینی طرز کا نکلن تھا اور دو سرخ رن تھے۔ امرجہ کو دو عدد سرخ رنوں کی سمجھ نہیں آئی۔ جب ان میاں بیوی کے اسٹال پر رش زرا کم ہو گیا اور ان کے سب تحائف تقسیم ہو گئے تو امرجہ ان سے پوچھنے لگی۔

”ایک تمہارے لیے اور ایک تمہارے شوہر کے





سب سوانگ چینی روایات، تاریخ، ان کی معاشرت کے عکاس تھے۔ مشرق میں اگاجین مغرب میں چل پھروڑ رہا تھا، حقیقی قوموں کی یہی نشانی ہے، وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں اسی درخت کی شاخیں، تنے اور پتے لگتے ہیں جس درخت کی جڑ ان کی دھڑی میں لگی ہوئی ہے۔

چند ایک ایسے گروپس تھے جنہوں نے سرخ لباس پہنے تھے اور ہاتھوں میں بڑی بڑی دھاتی پلٹیں پکڑ رکھی تھیں اور وہ انہیں بجاتے چلے آ رہے تھے۔ پریڈ میں بڑے بڑے جانوروں کے مجستے تھے جنہیں بانہوں کے ذریعے اٹھایا گیا تھا۔ یہ سال گھوڑے کا سال تھا اس لیے گھوڑے کے مجستے زیادہ تھے۔ ایک بڑا اور اونچا گھوڑا پریڈ کے آگے اور پیچھے چل رہا تھا۔ غرض ہر طرف سوانگ تھے۔ رنگ تھے۔ لوگ تھے۔ چین تھا۔ تاریخ تھی۔ بہار تھی۔ نیا سال تھا۔

سرخ اور پیلا رنگ چھایا ہوا تھا۔

ڈرموں کی تھاپ کمال کی تھی۔

سارا ماچسٹر اٹھ آیا تھا پریڈ دیکھنے کے لیے۔ اس پاس کے شہروں سے بھی لوگ خاص پریڈ دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڑے افراد کا شوق دیدنی تھا۔ وہ ماچسٹر کی تاریخ میں ہونے والی شاندار پریڈوں میں سے ایک کو دیکھ رہے تھے۔

امرد ڈریگن کے لباس میں بھی ویر اور این اون بھی ساتھ تھیں۔ ان سب نے ڈریگن کا سوانگ رچایا تھا اور وہ گھوڑوں، مرغوں، خرگوشوں، سانپوں، بندروں اور باقی جانوروں کے ساتھ چل رہی تھیں۔

جب امرچ ڈریگن بنی تو ہنستے ہنستے دھری ہو گئی اور اس نے پریڈ کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ جی سن ٹھیک کہہ رہی تھی وہ اپنے بڑے اور چوڑے ڈریگن لباس کے اندر جتنا جی چاہے ہنس سکتی ہے۔ شرما سکتی ہے۔ جھینپ سکتی ہے۔ وہ سر تپایا ڈریگن کے مونے لباس میں بھی۔ باہر سب کو ایک ڈریگن نظر آتا تھا امرچ نہیں۔

لبے، مونے، ڈریگن، کمر بانسوں پر اٹھا کر گھمایا، نچایا اور اچھالا جا رہا تھا۔ ڈریگن اتنا بڑا تھا کہ اسے کم سے کم ڈیڑھ سو افراد نے اپنے قد سے اونچا کر کے اٹھا رکھا تھا۔ وہ سب مسلسل اسے قدرتی حرکت میں رکھے ہوئے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا اصل ڈریگن ان کے سروں پر اڑ رہا ہے۔ ڈریگن کے پیچھے اور درمیان میں کئی سو چینی بچوں کا گروپ تھا جو گردن میں ڈرم لٹکائے انہیں ردھم سے بجاتے آہستہ روی سے چل رہے تھے۔ بچوں کے لباس سفید تھے جن پر انہوں نے سرخ رومالوں کو گردن میں ترچھا کر کے باندھ رکھا تھا۔ قریباً انہی بچوں کی تعداد جتنا ایک اور گروپ ان لڑکیوں کا تھا جو چینی روایتی لباس کو نوپونے ہوئے تھیں اور ہاتھ میں بہت بڑے ساز کے چینی روایتی عکھے پکڑ رکھے تھے۔ ان لڑکیوں کا میک اپ بہت گہرا تھا۔ آنکھیں قدرتی آنکھوں سے بہت بڑی بنائی گئی تھیں۔ یہ سب ایک زبان دھیمی آواز میں چینی روایتی گانا گا رہی تھیں، ساتھ ہی روایتی رقص پیش کر رہی تھیں۔

ایک گروپ سرخ لباس میں چینی مارشل آرٹ کی عکاسی کر رہا تھا۔ بہت سوں کے ہاتھوں میں چینی ساختہ بڑی بڑی پٹنکین تھیں، جو مختلف جانوروں کی اشکال پر مبنی تھیں اور جنہیں فضا میں چھوڑا گیا تھا اور ان کی ڈوروں کو اپنی کلائیوں میں باندھ رکھا تھا۔ بہت سے لوگ الگ الگ گیٹ اپ میں بھی تھے، وہ چین کی تاریخ سے منسلک مختلف شخصیات کا سوانگ رچائے ہوئے تھے۔ ان کے میک اپ اور لباس کمال کے تھے۔

دو کے جوڑے بنے بہت سے کوئی ایک بڑا جانور بنے ہوئے تھے۔ یعنی ایک ہی لباس میں ایک سر تھا اور دوسرا دھڑ۔ اور یہ دو لوگ ڈریگن یا گھوڑا یا چیتا بنے مسلسل بھاگتے گھومتے اور ناچنے میں مصروف تھے۔ ہزاروں افراد کی ڈریگن پریڈ میں ہزاروں سوانگ تھے۔ کوئی خرگوش بنا، اچھل رہا تھا، کوئی گھوڑا بنا، دوڑ رہا تھا، کوئی بندر کے لباس میں تماشے دکھا رہا تھا اور کوئی چیتا بنا، دوڑ رہا ہے۔

جیسا کہ اس نے ویرا کو دیکھا تو اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ویرا ہے۔ یقیناً ”اس کے ڈریگن کو دیکھ کر بھی نہیں بوجھا جاسکتا تھا کہ اس کے اندر امرجہ ہے۔ سڑکوں سے ست روی سے گزرتے چائنا ٹاؤن کی طرف جاتے مختلف جگہوں پر ان پر چوکر رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئیں۔ جنہیں مشین کے ذریعے فضا میں چھوڑا جاتا اور فضا کی میزبندی تک ایسے رنگ برنگی ہو جاتی جیسے تیلیوں کے قافلے ان پر ٹوٹ پڑے ہوں۔۔۔

امرجہ نے اب کھل کر مسکراتا شروع کر دیا تھا، وہ ڈریگن بنی ہاتھ ہلا ہلا کر بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اسے مزا آرہا تھا۔ اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جہاں جہاں ان پر رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئی تھیں وہاں وہاں امرجہ کو لگا تھا یہ سب اس کے لیے کیا جا رہا ہے۔۔۔

لاہور میں چھپ چھپ کر رونے والی لڑکی کے لیے

ایک منحوس مان لیے گئے انسان کے لیے۔۔۔ امرجہ افسوس کر رہی تھی کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔ زندگی میں آپ نے لوگوں، نئی خوشیوں، نئے جشموں سے روشناس ہوتے ہیں تو ماضی کے دکھ بے معنی اور چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ اپنی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیانا دانی کرتے رہے ہیں۔ زندگی میں دکھ اور سکھ دونوں ہوتے ہیں۔ بس انہیں کشید کرنا پڑتا ہے۔۔۔

پاکستان سے جو لوگ، تعلیم، روزگار کے سلسلے میں یورپ آتے ہیں وہ یہ ضرور سوچتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو ایسا پر رونق اور فعال کیوں نہ بنایا۔ شادی ہو کر جانے والی خواتین یہ ضرور سوچتی ہیں کہ اف کیانی وی دیکھ دیکھ، خریداری کر کر کے اپنی زندگی برباد کرتے رہے پاکستان میں۔۔۔

تو نیا ماحول آپ کو نئے اسباق ضرور پڑھاتا ہے۔۔۔ کچھ اچھے کچھ بُرے۔۔۔ کچھ آپ کی مرضی سے۔۔۔ کچھ زبردستی۔۔۔

شام گہری ہو چکی تھی۔۔۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے چل رہے تھے، لیکن تھکنے نے آج ان سے دوستی کر لی تھی، وہ پھولوں سے لدی دور سے ہی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ چائنا ٹاؤن کے قریب پہنچ رہے تھے۔۔۔ دور سے پریڈ کے استقبال کے لیے بجائے جانے والے ڈرموں اور دوسرے سازوں کی آوازیں آرہی تھیں۔۔۔

”امرجہ!“ ڈرموں کی پرزور تھاپ اور دھاتی ہلشوں کی گونج میں یہ نام اس کے قریب بیٹھے سر سنگیت لیے گونجا۔

اس کے قریب ہی ایک اور ڈریگن کھڑا تھا۔۔۔ وہ قد میں اس سے اونچا تھا۔۔۔ ڈریگن نے ماسک اتارا۔۔۔ اور مسکرایا۔۔۔ وہ عالیان تھا۔

ایک لڑکی ہے امرجہ۔۔۔ شہر روشن۔۔۔ شہر قلم کا۔۔۔ شہر بے مثال لاہور سے۔۔۔ ایک لڑکا ہے عالیان۔۔۔ شہر جمال۔۔۔ شہر افکا۔۔۔ شہر لا زوال مانچسٹر سے۔۔۔

نئے سال کے پہلے دن۔۔۔ بہار کے پہلے دن۔۔۔ شہر بے مثال۔۔۔ شہر لا زوال کے پاس ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔۔۔

اور ایک محبت ہے



جہاں بے مثال۔

جہاں لازوال۔

جہاں جاوداں۔ جاوداں۔ جاوداں سے۔

کے قریب جھکا دیا۔۔۔ اس نے ایسا خوشی سے کیا۔۔۔  
امرجہ شہزادی اسے ہزاروں راتوں پر محیط الف لیلیٰ  
سنائی تو شاید وہ خوشی سے سرکوائے ہی جھکے رکھتا  
۔۔۔ سر نہ اٹھاتا۔

”ہاں! لیکن کبھی کبھی تو ان سب کے ساتھ بھی  
مسکراہٹیں اچھی نہیں لگتیں۔“ اس نے آس پاس  
کے سارے ماحول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ تو کچھ ہو جانے سے سب اچھا اچھا لگتا ہے۔“  
ایک بچہ جو اپنے باپ کے کندھوں پر سوار تھا اور  
تالیاں بجاتا تھا کہ اس کے گال پر نرمی سے چٹکی بھر کر  
کہا۔ بچہ کھلکھلا اٹھا اور اپنے باپ کے بالوں کو  
شرارت سے مٹھیوں میں جکڑ لیا۔

امرجہ نے ماسک اتار دیا۔۔۔ اس سے ٹھیک سے  
عالیان کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی۔

”کیا ہونے سے اچھا لگتا ہے؟“ امرجہ اس کی بات  
ٹھیک سے سن نہیں سکی تھی۔ ہجوم کے شور کی وجہ  
سے اسے چلا کر پوچھنا پڑا۔۔۔

عالیان نے ذرا رک کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔  
رک گیا۔ روک دیا گیا۔۔۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا۔

”محبت کے ہو جانے سے۔۔۔“ اس نے بلا وجہ ہی  
چلا کر کہا جبکہ امرجہ اپنا ماسک اتار چکی تھی چلانے کی  
ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً وہ ڈریگن پریڈ میں شامل  
ایک ایک انسان کو بھی سنا نا چاہ رہا تھا۔ سڑک کے  
اطراف میں کھڑے مردوں، عورتوں، بڑے بوڑھوں  
اور بچوں کو بھی۔۔۔ سارے ماحول کو سب ساری دنیا کو  
اس کے ہونٹوں سے نکلے الفاظ کی گونج ”یقیناً“ چائنا  
ٹاؤن کی محراب کے پاس تیس چالیس بڑے بڑے  
ڈرموں کو اپنے سامنے رکھے سرخ لباسوں میں ملبوس  
پیلی بیٹیاں سر پر باندھے چینیوں تک بھی گئی ہوگی۔  
انہوں نے لفظ ”محبت“ کی گونج کو پا کر۔۔۔ اسے اپنے  
اندرا تار کو بھر پور خوشی سے۔۔۔ عقیدت و احترام سے  
۔۔۔ دونوں ہاتھوں میں پکڑی ڈرم اسٹنکس کو سر سے  
اوپر اٹھا کر سرخ ڈرموں کی پیلی زمین پر دے مارا۔  
محبت کے سازی کی پکلی گونج کو سنی۔

امرجہ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی پریڈ میں  
شامل ہے۔ اتنے ہزاروں لوگوں میں وہ چاہتی بھی تو  
معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف اپنے کلاس فیلوز  
کا ہی معلوم تھا۔ عالیان کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ  
آخری وقت میں کسی طرح سے ڈریگن لباس حاصل  
کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور افزا تفری میں پریڈ میں  
شامل ہوا اور اسے تلاش کرتا رہا ہے۔

”دادو دوجھے۔۔۔ میں نے تمہیں اتنے سارے  
جانوروں اور ماسکوں میں سے پہچان لیا۔“

”دادو جیتی ہوں تمہیں۔“ اتنے سارے ہزاروں  
لوگوں میں سے جو اپنی شکل اور وضع قطع چھپائے  
ہوئے تھے کسی ایک کو ڈھونڈ نکالنا قابلِ داد تھا۔ دو  
ڈھائی سو کے قریب تو صرف امرجہ جیسے ڈریگن ہی  
تھے۔

”کتنی زبردست پریڈ ہے نا یہ امرجہ۔“ وہ اس کے  
ساتھ ساتھ چلتے لگا۔ ڈریگن کا سرتار کر اس نے ہاتھ  
میں پکڑ رکھا تھا تاکہ اس کی آواز آسانی سے سنی  
جاسکے۔ امرجہ کو وہ معمول سے زیادہ خوش لگا۔

”امرجہ! مجھے ایسے جشن، ایسے ہتوار، جب سب  
خوش ہوں، مگھارے ہوں، مسکرا رہے ہوں بہت اچھے  
لگتے ہیں۔“ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے پریڈ کو  
دلچسپی، شوق، جوش و خوشی سے دیکھتے ایک چھوٹے بچے  
کے گال پر نرمی سے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس  
نے اسی بچے کے ساتھ کھڑے دو سرے بچے کے بالوں  
میں محبت اور لگاؤ سے ہاتھ پھیرا۔

اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ غیر معمولی پُر خوش  
اور خوش ہے۔

”تمہیں بھی پسند ہے یہ سب؟“ اس نے اس کے  
سر کی پاس سر جھکا کر کہا۔

”ہاں! مسکراہٹیں کسے اچھی نہیں لگتیں؟“ امرجہ  
کو چلا کر بتانا پڑا۔۔۔ عالیان نے کان کو اس کے ماسک

مشرق نے مغرب میں آکر میلہ سجایا۔  
استقبال کا آغاز ہوا۔ خوش آمدید۔ بہار کو گلے  
لگانے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔ بہار کی آمد آمد ہے۔  
خزاں کو رخصت ہو جانا چاہیے۔  
اولفظ محبت سے ابتدا کریں۔ آؤ اس کی انتہا  
کریں۔ رجوم (شہاب ثاقب) کا ایک طویل قافلہ  
رقص کنال گہری ہو چکی شام میں رک ابر (بادل کی سیاہ  
دھاری) سے ہونا ہوا عالیاں اور امرجہ کے سامنے سے  
گزرنا۔

وہ ایک (سجرت) ابابیل تھی وہ جہاں کی تہاں  
کھڑی تھی۔

”میرا دل چاہتا ہے میری شادی ایسے ہی ہو۔“ اس  
کی بھوری آنکھوں میں کئی خوش کن چمک دار رنگوں  
کی دھاریاں تلاطم مچانے لگیں۔  
”جانوروں کی طرح۔“ امرجہ نے دوبارہ غلطی  
نہیں کی عالیاں کی طرف دیکھنے کی نہیں۔ ”وہ ہنسا۔  
”ایسے پریڈ کی صورت۔ اتنے ہی لوگوں اور ایسے  
ہی سازوں کے ساتھ۔“

وہ برطانیہ کا شہری تھا۔ تو یہ خواہش کیوں نہ رکھتا  
کہ اس کی شادی بھی شادی جیسی ہو۔ پریڈ کی  
صورت بارات جائے۔ کبھی میں ہٹھائے اور اپنی  
دلہن کو واپس لائے۔ اور آس پاس کھڑا ہجوم ان پر  
مسکراہٹوں اور دعاؤں کے ساتھ پھولوں کی بارش کر  
دے۔

وہ اور اس کی دلہن ہاتھ ہلا ہلا کر سب کی مسکراہٹوں  
کا جواب دیتے ہوں۔ دنیا بھر میں شادی خاندان کی  
شادیاں دیکھنے والے زندگی میں کم سے کم ایک باریہ  
خواب ضرور دیکھتے ہیں کہ ان کی شادی بھی پرنس  
چارلس، پرنس ولیم کی طرح ہو۔ وہ تو پھر برطانیہ کا  
شہری تھا۔ اس نے یہ خواب کم سے کم سو بار تو ضرور ہی  
دیکھا ہو گا۔

”اچھا خواب۔ دیکھ لینا چاہیے۔“  
”اگلے سال چینی نئے سال پر تم اپنی یہ حسرت پوری  
کر لینا۔“

امرجہ نے اسے اچھا مشورہ دیا تھا۔ ہاں یہ اچھا  
مشورہ ہی تھا بے شک۔ رجوم کا ایک اور قافلہ اس  
بار صرف عالیاں کی آنکھوں کے آگے سے گزرا اور  
اس بار وہ ان بھوری آنکھوں میں ہی ٹھہر گیا۔ وہ ایک  
لحظے کے لیے سوچ کا شکار ہوئیں پھر انہوں نے  
جھٹ قافلہ رجوم کی باگیں اپنے ہاتھوں میں تھام لیں  
فیصلہ ہو چکا تھا۔  
وہ امرجہ کو ساری روشنیاں اپنے اندر سموئے دیکھ  
رہا تھا۔  
ایران میں زر پور جھیل کا کنارہ ہے۔  
ایک خسرو کمالی ہے۔ ایک اس کا رباب ہے۔  
اور اس کے ہونٹوں پر امیر خسرو کی رباعی کی صورت  
ہے۔  
از آمدت اگر خبری دانستم  
(اگر تیرے آنے کی خبر مجھے ملے)  
پیش قدمت کوچہ را گل کی کنتم  
(میں تیرے قدموں سے پہلے گلی میں پھول  
پکھاؤں)  
گل کی کنتم گل گلاب کی کنتم  
(پھول پکھاؤں گلاب کے پھول پکھاؤں)  
خاک قدمت بدی دم واردانستم  
(تیرے قدموں کی خاک پر اپنا آپ واردوں)  
یارم۔ یارم۔ یارم۔ یارم۔  
(میرے دوست، میرے یار۔ میرے محبوب)  
جھیل کی لہریں رقص کرنے لگی ہیں، وہ خسرو کمالی  
اور اس کے رباب پر فدا ہیں، وہ اس کے ہونٹوں سے  
نکلنے لگی تیرے پر غار ہو ہو جاتی ہیں۔ پرندے خسرو کمالی  
کے سر پر گول گول گھومتے جاتے ہیں۔ وہ اس گیت پر  
قربان ہو ہو جاتے ہیں۔  
خسرو کمالی پیشانی پر گلابی رومال باندھے اس کنارے  
کی طرف دیکھتا جاتا ہے جہاں سے زہرہ آفندی کو آنا  
ہے۔  
وہ آئے گی، ضرور آئے گی، اس کا رباب دعا گو ہے،





عالیان مارگرٹ کا۔۔۔  
لفظ لفظ ترانہ۔۔۔ لفظ لفظ مرثیہ۔۔۔  
اور ایک ساز برب تھا۔۔۔  
زربو جھیل کنارے بچتا ہوا۔۔۔  
ڈرین پریڈ میں گونجتا ہوا۔۔۔

پھر جھیل کے پینے میں گونگا پڑا ہوا۔۔۔  
”امرہ! بھوری آنکھیں سیاہ پڑنے لگیں۔ اس  
نے امرہ کو ایسے دکھا جیسے وہ اسے کوئی دھوکا دے رہی  
ہو اور وہ جانچ رہا ہو کہ اسے دھوکا کیوں دیا جا رہا ہے۔۔۔  
”تم۔۔۔ یہ سب کیا؟“ اسے سمجھ نہیں آئی کہ سوال  
کو کن الفاظ سے ترتیب دے کہ من پسند جواب پا  
سکے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کبھی؟“  
”ہمارے یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔۔۔ میں بہت خوش  
ہوں۔۔۔ تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔۔۔ ہم تو دوست ہیں نا۔۔۔  
لیکن پلیز نرم دوبارہ ایسا کچھ نہ کہنا۔۔۔ جلدی سے کہہ کر  
اس نے ماسک پہن لیا اور پریڈ کے ساتھ آگے بڑھنے  
لگی۔۔۔

اور پھر ساری پریڈ آگے بڑھنے لگی۔۔۔ ساری دنیا۔۔۔  
ساری کائنات۔۔۔ صرف ایک وجود کھڑا تھا۔۔۔ ساکت تھا۔۔۔  
پتھر کا ہو چکا تھا۔۔۔

وہ عالیان مارگرٹ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔  
جو سارے ماچسز کو اکٹھا کر کے اس کی کھڑکی تک  
لے جانے والا تھا وہ سارے ماچسز میں اب خود کو ڈھونڈ  
ڈھونڈ اکٹھا کرتا پھرے گا۔

چینی ماں روتے بچے کو چپ کروانے میں ناکام ہو  
چکی تھی۔ اس کی شکل ٹہرے سایوں کی زمین تھی۔۔۔  
وہ اپنے عقیدوں پر پختہ تین رکھنے والی لگتی تھی۔ اور  
اسی لیے پریڈ میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔  
اور وہ زیر لب دعائیں کر رہی تھی کہ نئے سال میں  
نخواست اور بلا میں اس سے دور رہیں۔۔۔ لیکن بچہ  
چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

پریڈ چائنا ٹاؤن کی خراب کے اندر داخل ہو رہی  
تھی۔

ڈرموں کی تھاپ اب کان کے پردے پھاڑ رہی

فرق نہیں پڑتا۔۔۔ میں تو تم سے ہی شادی کروں گا۔۔۔ تم  
سوچنے کے لیے وقت لے سکتی ہو لیکن اس سے بھی  
فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ میں سارا ماچسز اکٹھا کر ڈالوں گا۔  
اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر جب تم سارے ماچسز  
کو کھڑا دیکھو گی تو تمہیں ”ہاں“ کا بورڈ اکٹھا کر سب کو  
دکھانا ہی پڑے گا۔۔۔

وہ اپنی رو میں بول رہا تھا۔۔۔ وہ عالیان تھا ”ہاں“ کے  
بل بورڈ اس کا حق تھا کیونکہ وہ سارے ماچسز کو اکٹھا  
کر لانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

”میں۔۔۔ میری منتی ہو چکی ہے۔۔۔ پاکستان میں  
میری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔۔۔ میری شادی ہوئی۔  
انک انک کر وہ اتنا ہی کہہ سکی رجوم کے سب  
قاتلوں نے اپنی باگیں عالیان کے ہاتھوں سے  
چھڑوا لیں۔

”خسرو کمالی کے رباب کی تان ٹوٹی۔۔۔ اس کی  
مناجات سم گئیں۔“  
”رتن دیب سے سچی رتھ اڑان بھرتی منہ کے بل  
پاتال کی طرف لپکی۔۔۔“

”قاتلین باف کے حقیقی بار پچے میں آگ بھڑکی۔۔۔“  
سڑک کے کنارے پریڈ دیکھتی خاتون کے گود کے  
بچے نے چلا کر رونا شروع کر دیا۔۔۔ چینیوں کا ماننا ہے کہ  
سال کے پہلے دن بچوں کا رونا بخس ہوتا ہے۔

چینی عورت سسم سی گئی اور اس نے شد و مد سے  
بچے کو چپ کروانا شروع کر دیا۔۔۔ لیکن بچہ اور۔۔۔ اور  
رونے لگا۔۔۔ وہ روتا ہی جا رہا تھا۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ یہ کیسے۔۔۔  
ابھی تو وہ قلعاریاں مار رہا تھا۔۔۔ اس نے تلی بھی بجائی  
ہو گی۔ بھانت بھانت کے جانوروں کو دیکھ کر وہ کیسے  
محفوظ ہوا ہو گا۔۔۔ چینی رقاصوں کی طرح وہ بھی ناچنا  
چاہتا ہو گا۔۔۔ اس نے اپنی ماں سے ڈرم بجانے کی  
فرمائش بھی کی ہو گی۔

پھر۔۔۔ یہ سب کر کے بھی۔۔۔ اب وہ رونے لگا۔۔۔ وہ  
کیوں رونے لگا؟

اور ایک گیت تھا۔۔۔

خسرو کمالی کا۔۔۔

حق نہ ہو گا۔

اور کیا۔ اور کیا۔ اس کا دل خون کے آنسو روئے گا۔

خسرو کمالی نے رباب کو زورور میں پھینکا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس طرف زہرہ آفندی کی جگہ ایک شیر کھڑا تھا۔

وہ جانتا تھا اس شیر کا نظر آنا خس ہے۔ خس ہے۔

چینی پریڈ کے اس اور اس کنارے بھی ایک شیر اپنا منہ صاف کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ شکار کر چکا تھا۔ وہ مشرقی اکھاڑوں کا نگر گر پایا جانے والا شیر ہے۔

\*\*\*

بانو قدسیہ کہتی ہیں ”محبت مرگ سے پہلے جنم کا نام ہے۔“

اور مجھے ایسا لگتا ہے ”محبت جنم سے پہلے مرگ کا نام بھی ہے۔“

یہ پہلے آپ کو مار ڈالتی ہے پھر جی میں آئے تو جنم دے دیتی ہے۔ یہ پہلے انگارہ بنتی ہے۔ جی میں آئے تو۔ تو نظر اسے۔

یہ ”مم“ کا پر چار کرتی مایہ۔ مایہ۔ محبت ہے۔ یہ ”مم“ سے بیھن لیتی۔ محبت۔ مرگ۔ مرگ ہے۔

یہ محال۔

یہ محرق (جلادینے والی)۔

اور یہ محشر ہے۔

محبت ”مم“ سے۔ یہ امر سے پہلے ”مرن“ ہے۔

محبت مطلق (قید کی گئی)

محبت مضطرب۔

اور یہ محبت مشرک بھی ہے۔

وہ پاکستان ہی رہ چکی ہوئی اور اس پر ایسا برا وقت نہ

آیا ہوتا۔ کاش پاکستان میں سب اس کے لیے ٹھیک ہوتا۔ اسے اپنے ماحول سے نکل بھاگنے کی تمنا نہ ہوتی،

تھی۔

عالیان کا دم گھٹ رہا تھا پھر بھی اس نے ڈر یکن ماسک پہن لیا۔

اور پہلے آہستہ روی سے پھر تیزی سے پریڈ کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگا، عجیب انسان تھا وہ دو قدم پر محراب تھی اور وہ وہاں تک نہ جا سکا اور الٹی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ڈر یکن ماسک بہت بدہیت لگنے لگا تھا اس بدہیت کو دیکھ کر ڈر قطعاً ”نہیں لگ رہا تھا بس دل مٹھی میں آیا لگتا تھا۔“

امرہ چینی ساختہ محراب کے پار ہو گئی اور پھر اس نے ہمت کر کے گردن موڑ دیکھا۔ کوئی بہت بے دردی سے پریڈ کو چیرتا بھاگ رہا تھا جیسے اس کے آس پاس آگ بھڑکتی ہو۔ نہیں جیسے اس کے اندر آگ لگی

اس ڈر یکن نے خود کو پریڈ سے الگ کیا۔ اور لوگوں کے جھوم میں خود کو گم کرتے۔ اپنے ماسک کے اندر ہی خود کو بلک بلک کر رونے دیا۔

امرہ نے خود کو لوگوں کی بھیڑ میں گم کر دیا۔ وہ ابھی ماسک اتارنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

دو لوگ خود کو بھیڑ میں گم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بھیڑ سے نکلنے کی بھی۔ الگ ہو جانے کی بھی اور مل جانے کی بھی۔ ایک وقت میں اتنی خواہشیں۔ ماسکس کی کشادہ سڑکوں پر پھیلی۔ ہزاروں لوگوں سے الٹی ڈر یکن پریڈ ماسک جلوس کی صورت اختیار کر گئی۔

کیونکہ، کیونکہ ایک ماں کی گود میں بچہ حلق پھاڑ کر رو رہا تھا اور ماں کی ساری کوشش اسے چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ نئے سال کی آمد اس کے لیے نیک شگون نہیں لائی تھی۔ کیا اب سارا سال اسے رونا پڑے گا۔؟

خیر اور بھلائی اس سے دور رہے گی۔ بلائیں اور شر اس پر حملہ آور ہوں گے۔ کیا خوش قسمتی پر اس کا کوئی

... اسے یہاں آنے کی چاہ نہ ہوتی۔ وہ شخص جو اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اندر باہر ہر طرف تھا۔ جو ہر طرف سے اسے اپنی طرف آتا نظر آتا تھا۔ وہ شخص اسے ساری زندگی نہ ملا ہوتا۔

لیکن وقت کی کمان میں اس کی اپنی مرضی کے تیر ہوتے ہیں اور وہ انہیں اپنی مرضی سے تاک کر چھوڑتا ہے۔ وہ ایک آنکھ میچے۔ سانس گم کیے۔ نشانہ باندھے بیٹھا ہے۔ اپنے من پسند وقت۔ یہ چھوڑا۔ اور شکار چت۔

اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموش رہے اور سب سے دور بھی۔ تعلیم مکمل کرے۔ اور گھر جائے۔ اور یہی سب ہونا تھا۔ اواسی اور خاموشی کو لیے چند دن گزر گئے۔ اور بقول بانو قدسیہ ”مسکراہٹ سمیت وہ غائب ہونے کا فن جانتا تھا۔“

عالیان فن کار اسے ان چند دنوں میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈنا نہیں چاہا تھا۔ پھر بھی۔ وہ غائب ہونے کا فن سیکھ چکا تھا۔

”تم بہت اداس رہتی ہو؟“ ویرا پوچھ رہی تھی وہ سونے کی تیاری کرنے ہی والی تھی بس۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ سونے کے لیے اٹھ ہی نہیں رہی تھی۔

”نہیں! میں ٹھیک ہوں۔“

”میں نے کب کہا تم ٹھیک نہیں ہو۔ بریڈ میں“ عالیان آیا تھا تمہارے پاس۔ شاید اس نے کچھ کہا تھا تم سے۔ ”ویرا اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔“

”کیا کے گاؤہ؟“ امرجہ نے کتاب جو سامنے رکھی تھی اور پچھلے کئی گھنٹوں سے رکھی تھی کو پڑھنے کی کوشش کی۔

”کچھ بھی کہہ سکتا ہے وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ بعد میں میں نے اسے بہت اداس ہو کر جاتے دیکھا۔“ ویرا واقعی موساد کی خفیہ ایجنٹ تھی اتنے رش میں بھی

اس نے یہ سب نوٹ کر لیا تھا۔

امرجہ ویرا کو دیکھنے لگی۔

”تم خاموش کیوں ہو امرجہ؟“

”اس نے کہا وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”اوہ۔۔۔ اور تم نے کیا کہا؟“ ویرا مسکرائی۔

”میں نے؟“ سوال اٹھایا اقرار۔

”ہاں ظاہر ہے تم نے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے مجھے لگا، وہ تمہارا اچھا دوست بننا چاہتا ہے لیکن اسے کچھ اور ہی بننا تھا نا۔“ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”میری متنی پاکستان میں ہو چکی ہے۔ میرے جاتے ہی میری شادی ہو جائے گی۔“

”تمہاری متنی۔ تمہاری متنی ہو چکی ہے؟“

”نہیں۔“ امرجہ نے اواسی سے کہا۔

”تو تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔ تم نے ایسا کیوں کیا امرجہ؟“

”جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔ بس۔“

”بس؟“ ویرا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم عالیان کے لیے ایسے بات کر رہی ہو؟“

”کیسے بات کر رہی ہوں؟“

”اپنا انداز دیکھو امرجہ۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں وہ تمہارے پاس آتا ہے باتیں کرنے کے لیے۔ عالیان۔

اپنا انداز دیکھو۔ جانتی ہو کون ہے عالیان۔

پروفیسرز کے بعد یونی کی آنکھ کا تار اسے۔ جس طرح

وہ یونیورسٹی کی پیس کے پاس کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کرتا ہے کبھی دیکھا ہے؟“

”میں نے اسے کبھی نہیں کہا انتظار کرنے کے لیے۔“

”ایک صبح، صبح بائے کہنے کے لیے وہ ہم سے دس پندرہ منٹ پہلے وہاں کھڑا ہوتا ہے۔“

”میں اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہتی۔“

”تم کم عقل ہو۔“

”میں کم عقل ہوں۔“

”تم نا سمجھ ہو بہت۔“

”میں بہت نا سمجھ ہوں۔“



”شٹ اپ۔۔۔ تم نے اپنی منتفی کا جھوٹ کیوں بولا؟“ تم تو سیدھے سیدھے عالیشان کی بے عزتی کر رہی ہو۔“  
 ”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے تم مذاق اڑا رہی ہو۔“ امرجہ نے بے بسی سے ویرا کو دیکھا۔

”تمہارے وہاں محبت سب حساب کتاب لگا کر کرتی ہے امرجہ؟“ ویرا بے حد سنجیدہ ہو چکی تھی۔  
 امرجہ خاموش رہی، وہ اتنی ذہین کبھی نہیں رہی تھی کہ مدلل انداز سے اس سوال کا مقدمہ لڑ کر جیت سکتی۔

”کیسے تم نے اس کے خاندان، اس کے مذہبی، غیر مذہبی ہونے کا حساب کتاب لگایا اور اسے انکار کر دیا وہ بھی جھوٹ بول کر کہہ بہت ذہین ہو تم۔۔۔ اسنے حاصل جمع کا فائدہ دیکھا۔۔۔ تم نے دیکھا کہ تم اس کے ساتھ نقصان میں رہ رہی ہو تو تم نے جھٹ جھوٹ بول دیا۔ اور ایسے جھوٹ بولا کہ وہ تمہارا دوست تو رہے لیکن کچھ اور نہ بنے۔۔۔ ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ میں انسان کم ششین زیادہ ہوں، آج میں تمہیں کہتی ہوں تم انسان کم کھلکھولے تر زیادہ ہو۔ اس کی ذہانت، اس کی قابلیت کئی بھڑا میں۔۔۔ وہ کتنا اچھا انسان ہے یہ سب بھی۔۔۔ بس اس کا باپ ہونا چاہیے۔ اس کا خاندان عیورپ میں یہی سب ہے۔۔۔ تو سب کیا ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔۔۔ تمہارا مذہب ایسے لوگوں سے نفرت سکھاتا ہے۔۔۔ تم بہت مذہب مذہب کی باتیں کرتی ہونا۔ تمہیں چھوٹے کپڑے پہننا پسند نہیں۔۔۔ تمہیں چھوٹا طرف رکھنا، چھوٹا دل رکھنا پسند ہے۔ ایسے جھوٹ بولنا۔۔۔ بے عزتی کرنا۔؟“ امرجہ خاموش ویرا کو دیکھ رہی تھی۔ خاموش۔۔۔  
 ”مان لیا کہ وہ تمہارا اہم مذہب ہے۔ پھر۔۔۔“  
 ”وہ۔۔۔ مسلمان ہی ہے۔“ امرجہ کی کمزور آواز نکلی۔

”گڈ۔۔۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟“ امرجہ پھر سے خاموش ہو گئی۔  
 ”اوہ۔۔۔ اچھا وہ اکیلا ہے۔ اس کے باپ کا پتا نہیں، وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس لیے۔۔۔ اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ اس کے

میری مرضی۔۔۔“  
 ویرا نے فقوڑی ویرا اس کی طرف دیکھا۔۔۔ ایک شخص تمہیں پوچھ کر رہا ہے امرجہ! اور تم نے مناسب الفاظ میں اسے ٹال دیا۔۔۔“ ویرا تالی ہار کر طنز نہ ہنسی۔  
 امرجہ کے جیسے کسی نے گال پر پھڑوے مارا۔  
 ”تم صاف انکار کر دیتیں اسے۔ ایسے بہانے اس کی انسلٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس روسی ویرا کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔  
 ”بہت عجیب ہو تم۔ بہت زیادہ۔۔۔ اتنے ذہین انسان کو کیسے تم نے جھوٹ بول کر انکار کر دیا۔“  
 ویرا تو عالیشان کی ذہانت کی فین تھی۔  
 ویرا نے ایک بار اور تالی بجائی۔  
 ”ٹیک لیڈی آف پاکستان۔۔۔ دی گرٹ لیڈی۔۔۔ ہونہ۔۔۔“

امرجہ کا منہ سرخ ہو گیا وہ روپے کو ہو گئی۔  
 ”کیسے نہ کرتی میں انکار۔۔۔ پتا نہیں کون ہے وہ۔۔۔ عیسائی، مسلمان، یا یہودی۔ مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔ آنرک۔۔۔ واؤ۔۔۔ کیا ہو گا۔“  
 امرجہ تیز آواز میں چلا اٹھی اسے ویرا کے انداز سے تکلیف پہنچی تھی۔  
 ویرا خاموش ہو کر اسے دیکھتی رہی۔  
 ”اپنی معمولی سی وجہ کے لیے؟“  
 ”معمولی وجہ نہیں ہے یہ ویرا۔ نہیں ہے یہ سب معمولی۔ اس کے باپ کا خاندان کا کوئی آنا پتا نہیں ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔“  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟“ ویرا کی آواز تیز ہو گئی۔

”یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔۔۔ غیر مذہبی۔۔۔ غیر اخلاقی اقدام کی پیداوار۔۔۔ معمولی باتیں نہیں ہیں یہ سب۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسی باتیں ہوں گی یہ سب۔۔۔“  
 ”طمانچہ!“ ویرا استہزائیہ ہنسی ”خاندان۔۔۔ واؤ۔۔۔“

ناجائز ہونے سے مسئلہ ہے۔ اگر وہ ناجائز نہ ہوا امرِ  
 ”تو۔۔۔؟“  
 ”تو بھی نہیں۔۔۔ نہیں وہ مجھے نہیں پسند۔۔۔ میں  
 نے انکار کر دیا۔“ امرِ کو یہ جواب سب سے زیادہ  
 مناسب لگا۔

”شاید تم اسے پسند کرنے لگو؟“  
 ”میں اسے پسند نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ میرا اچھا دوست  
 ہے۔۔۔ جیسے تم ہو۔“

”شاید تم اسے پسند کرنے لگو۔“ ویرا سنجیدگی اور  
 سختی سے اپنی بات دہرا رہی تھی یا شاید تم اسے پسند  
 بھی کرتی ہو لیکن اپنے خاندان کے لیے۔۔۔ اپنے  
 معاشرے کی روایات کے لیے۔۔۔  
 ”میں اسے کیوں پسند کروں گی۔۔۔ کیوں کروں گی۔۔۔  
 کون سی خوبی ہے اس میں؟ اگر وہ قابل ہے تو یوں میں  
 ہزاروں اور بھی ہیں۔۔۔ مجھے اسے ہاں کہنے کے لیے  
 مجبور نہیں کیا جاسکتا۔“

”تم مجھے مطمئن کرو امرِ۔۔۔ مجھے اس سب کی  
 سمجھ نہیں آ رہی“ ویرا جم کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”شاید تمہارا خیال ہے کہ اگر وہ مسلمان ہے بھی تو  
 تم جتنا اچھا انسان نہیں ہے۔ وہ تمہاری طرح عبادت  
 نہیں کرتا ہو گا۔ تمہاری طرح حلال فوڈ کا استعمال  
 نہیں کرتا ہو گا۔ اسے بنیادی مذہبی تعلیمات کے  
 بارے میں نہیں معلوم ہو گا۔ اور اگر وہ تمہارے  
 خاندان کے پاس جاتا ہی ہے تمہارا ہاتھ مانگے تو اسے  
 ان سب باتوں کی وجہ سے رد کیا جاسکتا ہے۔۔۔ ہے نا  
 امرِ۔۔۔؟“

امرِ خاموش رہی۔

”جواب دو امرِ۔۔۔“

”ہاں!“ امرِ چلا اٹھی۔۔۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو  
 ۔ اتنا آسان نہیں ہے یہ سب۔۔۔ بہت مشکل ہے یہ  
 سب۔۔۔“

”تم لوگ یورپ میں رہنے والوں کے بارے میں  
 یہی سب سوچتے ہو تمہیں جانتی ہوں۔۔۔ تمہیں لگتا ہے  
 اقدار صرف تمہارے مشرقی ملکوں میں ہی ہیں۔۔۔

روایات اور مذہب کی پاسداری بھی۔“ ویرا اب  
 باقاعدہ اسے ذلیل کر رہی تھی۔  
 ”اور کیا بچ نہیں ہے یہ۔۔۔ کیا نام ہے عالیاں کے  
 فادر کا۔۔۔ اس کا سر نہ ہمارا کرٹ کیوں ہے؟“  
 ”تم اس سے پوچھ لو۔۔۔“

”میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔۔۔ اور تم  
 جاؤ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم عالیاں کی اتنی بڑی  
 حمایتی ہو۔“ امرِ بھڑک اٹھی۔

”اگر تم غور کرو تو میں تم دونوں کی حمایت کر رہی  
 ہوں۔۔۔ لیکن تم لوگ بہت نا سمجھ ہوتے ہو۔۔۔“

”ہم کون؟“ امرِ کی تیوری چڑھ گئی۔

”تمہارے ملک پر طنز نہیں کر رہی امرِ۔۔۔ تم

لوگ یعنی تم جیسے کم عقل لوگ، مسطحی لوگ۔۔۔ روایات،  
 معاشرے کے علم بردار۔“

”بس بہت ہو گئی اب جاؤ۔۔۔ میں نے جو کرنا تھا کر  
 لیا۔“

ویرا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اور چلی گئی۔  
 کھڑکی میں کھڑی وہ اندھیری رات کے گہرے  
 اندھیروں کو دیکھتی رہی، ویرا اسے اس نے جان چھڑالی  
 تھی اب خود سے لیے چھڑائے گی۔ دنیا بھر سے چھپ  
 کر بیٹھا جاسکتا ہے ایک اپنے آپ سے چھپ کر رہنے  
 کی جگہ نہیں ملتی۔ دنیا بھر سے کیا کچھ نہیں کہہ دیا  
 جانا ایک اپنے آپ سے کہنے کے لیے ہی کوئی لفظ  
 نہیں ملتا۔

تو کیا محبت جنم سے پہلے مرگ نہیں۔۔۔؟



بھٹتے کی رات ہے۔۔۔ اور یہ ہارٹ راک کیفے کا  
 ڈانس فلور ہے۔ ڈی جے اپنے میوزک کے ساتھ  
 تجربات کرنے سے پہلے ایک خاص ڈسک کو پلے کرنا  
 چاہ رہا ہے۔۔۔ یہ ڈسک اسے پارٹینڈر کارل نے دی  
 ہے۔ کیفے میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی بھرمار ہے۔۔۔  
 خاص کر بزنس اسکول کے اسٹوڈنٹس کی۔ ڈانس فلور  
 پر ڈانس شروع ہوا ہی جاتا ہے کارل کاک ٹیل بنا رہا

ہے۔ عالیاں ابھی ابھی اس کے سامنے رکھی اونچی کرسی پر نیم دلی سے آکر بیٹھا ہے۔ اسے کارل نے کچن سے بلایا ہے ڈی جے نے ڈسک پلے کر دی ہے۔ ”تمہاری مفتی ہو چکی ہے؟“

”نہیں۔۔۔“

”تم نے جھوٹ بولا عالیاں سے۔۔۔؟“

”جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔ کیسے نہ انکار کرتی، پتا نہیں کون ہے۔ وہ مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہے تو پاپ کا کیا ہو گا۔ آئزک۔۔۔“

”اتنی معمولی سی وجہ کے لیے۔۔۔؟“

”معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔۔۔ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ کون سی خولی ہے۔ اس میں۔۔۔ مجھے اسے ہاں

کننے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔“

”شاید تمہارا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہے بھی تو تم جتنا اچھا مسلمان نہیں ہے۔“

”ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کیا نام ہے عالیاں کے“

”فادر کا۔۔۔ اس کا سر نیم مارگریٹ کیوں ہے۔۔۔“

”وہ ناجائز۔۔۔ ہو سکتا ہے اس لیے بھی؟“

”ہاں! ہاں۔۔۔“

”تمہاری طرح، حلال فوڈ کا استعمال نہیں کرتا ہو گا اس لیے بھی۔۔۔؟“

”ہاں!۔۔۔“

”کیا نام ہے عالیاں کے فادر کا؟ کیا نام ہے۔۔۔ فادر

۔۔۔ اس کا سر نیم مارگریٹ کیوں ہے؟ فادر۔۔۔ فادر۔۔۔

خستیں لالہ صبح بہارم، پیاپے سوزم از داغے کہ دارم

(صبح بہار کا پہلا لالے کا پھول ہوں جو عشق کے داغ سے مسلسل ترپ رہا ہوں)

محبت جگا جوت ہے جسے ٹٹھی میں کر کے آنکھوں کے سامنے رکھ لیتا آسان نہیں۔۔۔ آنکھیں نہیں

چند ہیاتیں قسمت چند ہیایا جاتی ہے۔ وہ اتنی جلدی کہاں مہیاں ہوتی ہے۔

انسان سب سے زیادہ خواب محبت کے دیکھتا ہے۔

انسان پر سب سے زیادہ خواب محبت کے بھاری پڑتے ہیں۔

انسان کسی بھی مزاج یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، محبت کی اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتا ہے کہ دعا کے لیے

وہاں موجود ایک اسٹوڈنٹ عالیاں مارگریٹ کی طرف گردن موڑے دیکھ رہا تھا۔ کارل نے ایک آنکھ دبا لی اور منہ بنا کر بھڑکے کی آواز نکالی، لیکن

عالیاں نہ وہاں موجود یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو دیکھ رہا تھا نہ ہی کارل کو۔ وہ اپنے جوتوں کی نوک کو گھور رہا تھا۔

اسے آج معلوم ہوا تھا۔ ایک دم سے کیسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آپ جوتے کی نوک تلے آجاتے ہیں۔

اس کے منہ پر کبھی کسی نے ہنسنے نہیں مارا تھا اس کے سرخ ہوتے منہ پر آج پھپھو کی بو چھاڑ کر دی گئی تھی۔

کاک ٹیل بناتے کارل کے ہاتھ رک گئے۔ عالیاں کا رد عمل اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ اس نے اٹھ

187 2014 ستمبر

www.pdfbooksfree.pk



میں کوڑے دان کے پیچھے جا کر دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی پہلی محبت یاد آ رہی تھی۔

”مارگریٹ جوزف۔۔۔ اس کی ماں جو اس کی بھوری آنکھوں کو اپنی نیلی آنکھوں سے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔۔۔ اور جیسے خاموشی کی زبان سے کہتی جاتی ”مجھے کیا معلوم تھا یہ آنکھیں مجھے ایسے لے ڈوبیں گی۔۔۔ لیکن میں خوش ہوں کہ یہ مجھے لے ڈوبیں۔۔۔ میں شکر گزار ہوں کہ مجھے یہ آنکھیں عطا کی گئیں۔۔۔ میں ان میں اپنی مورت دیکھ سکتی ہوں۔ میں کیسے نہ شکر گزار ہوں۔“

اس کی آنکھیں اس کے لہنائی باپ جیسی تھیں۔۔۔ وہ مارگریٹ کے مرہ ہوتے وجود میں جان ڈال دینے والی آنکھیں تھیں۔۔۔ وہ انہیں گھنٹوں کیوں نہ دیکھا کرتی۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک کمرے کے نسبتاً گندے سے فلیٹ میں رہتا تھا جس کے ایک کونے میں کچن تھا اور دوسرے کونے میں واش روم۔ بیڈ کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ ایک کھڑکی تھی جس کے آگے ایک کرسی دھری رہتی تھی۔ اس کرسی پر کھڑے ہو کر عالیاں کھڑکی سے سر نکال کر اپنی ماں کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ مارگریٹ کے انتظار میں اس نے اپنی آنکھوں کو بہت تھکایا تھا۔

کمرے میں کچن اور واش روم کی بو ہمہ وقت رچی رہتی تھی لیکن یہ فلیٹ اس وقت مہک اٹھتا جب مارگریٹ آکر اسے اپنی ہانوں میں بھرتی کرتی۔ مارگریٹ جو ایک ہسپتال میں صفائی پر مامور تھی اس کے جسم سے کئی طرح کے کیمیکل کی بو آتی۔ مگر یہ بو عالیاں کے لیے دنیا کی بہترین خوشبوؤں سے بڑھ کر تھی۔

مارگریٹ جوزف مسکرائے کی کوشش کیا کرتی تھی لیکن وہ ایک بری اداکارہ تھی۔ اس نے زندگی کو زندہ دلی ہمت، جوان مردی سے گزارنے کے کچھ اقوال رٹ رکھے تھے۔ وہ انہیں ہر روز دہراتی اور مسکرائے کی بھدی اداکاری کرتی اپنے کام پر چلی جاتی۔ مسکرا کر گھر کا دروازہ بند کرتی۔۔۔ تھوکتی۔۔۔ روز کی اداکاری۔۔۔ زندگی اقوال پر کامیاب ضرور کی جاسکتی ہے خوش طالع

بقاعدہ ہاتھ اٹھائے اندر ہی اندر اتنی آرزو ضرور کرتا ہے کہ کائنات میں چھپا کر رکھی گئی ساری محبت اس کی جھولی میں ڈال دی جائے۔ کسے نہ کہے پر اتنا ضرور سوچتا ہے کہ محبت کو وہ کچھ بھی کر کے چرائی لائے۔

ساری محبت چرائینے کا خواب عالیاں مارگریٹ نے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ خواب اس پر بہت بھاری گزرا تھا۔ کیونکہ محبت وہ شجر ممنوع بھی تو ہے جو جھولی پھلوا کر مست مست بنا چکائی ہے اور پھر بھی وہ بن کھول کر در شہوار کے درشن نہیں کرواتا۔

جھولی پھیلانے رقص یا رقص اپنے پیر جلا بیٹھے ہیں تب بھی نہیں۔ بس نہیں۔

وہ اپنا تن من جسم کر ڈالتے ہیں تب بھی۔۔۔ نہیں۔“ وہ خود کو گھسیٹ رہا ہے جس برف نے ماچسز کو اپنی ہتھیلیوں میں لے رکھا تھا، وہ اسے گرتا دیکھتا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اسے دیکھنا تھا کہ چلتے چلتے کیسے گرا ساجاتا ہے۔

برف میں ایک قلندری خاصیت، بہت کمال کی ہے۔ یہ گرتی ہے تو شور نہیں مچاتی۔۔۔ گر کر پکھل کر ختم ہو جاتی ہے تو کبھی واہٹا نہیں کرتی۔ برف اپنے سینے پر بڑے ترگر جاتے اس کے قدموں میں یہ خاصیت محفل کر دینا چاہتی تھی۔

ماچسز کی اتنے سالوں دیکھی بھالی سردی میں اب عالیاں کادم کھٹ رہا تھا۔ اس کی ناک بے حد سرخ ہو چکی تھی۔ اور آنکھیں بھی سردی سے نہیں صدمے سے۔ اس کی بھوری پچوں سی چمک لیے آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انسان تھانے روٹا تو مٹا تھا۔

محبت کا سنہرا خواب جو دیکھ لیا تھا۔ خواب کے ٹوٹ جانے پر ٹوٹا تو بننا تھا۔ آسمان کے سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ماچسز کی شاہراہوں پر بکھر رہے تھے۔ کائنات محبت پر۔ کائنات کا ٹوٹ پھوٹ جانا تو بنتا ہے۔

سڑک پر چلتے وہ ایک بند گلی کے کنارے رک گیا۔ جس کے اندر ایک بڑا کوڑا دان رکھا تھا۔ وہ اندھیرے

خون اگلنے لگے، 'یہ لو تھڑے کے مالک کو جلد ہی مر جانا چاہیے۔'

جس چلبی تکلیف دہ باد کو عالیان مار گریٹ کو اپنے دماغ میں زندہ رکھتا تھا وہ کچھ یوں تھی کہ کمرے کی واحد کھڑکی کے آگے رکھی کرسی پر کھڑا دینیے جھانک کر اپنی ماں کو تلاش رہا تھا۔ نیچے ایک مصوف سڑک تھی جس پر چھوٹی چھوٹی کئی دو کائیں اور اسٹورز واقع تھے۔ مار گریٹ تھکی تھکی اس سڑک پر چلتی اسے نظر آ گئی۔ وہ اندر آئی اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر چل کر اس کے پاس آئی اور وہی اپنی اداکارانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا جبکہ خود وہ کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ 'تم بہادر ہو نا۔؟' مار گریٹ نے ایک اچھی مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔

جب عالیان تھوڑا بڑا ہوا تو اس نے کئی سالوں تک خود کو ہڑیا کر رکھتے اور کہتے سنا۔ 'نہیں! میں بہادر نہیں ہوں۔'

دو تہا لوگ جب ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کی جرات کرتے ہیں تو حقیقتاً 'وہ یہ کتنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ' 'اب تیار ہو جاؤ۔' تم بہادر ہو یا نہیں۔ تمہیں بہادری دکھانی ہوگی، نتائج حقیقتیں تمہاری ریکی زندگی میں کھلنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا تم بھی تیار ہو؟

اپنی بھوری آنکھوں سے وہ مار گریٹ کو دیکھنے لگا۔ ہاں کی ناں۔

'مامیلا کے پاس جا رہی ہیں۔'

مار گریٹ نے اس کے گال پر پیار کیا اور کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھا۔ وہ ایک بری اداکارہ تھی۔ زیادہ دیر تک مسکرا نہ سکی۔ پھر بہت دیر کے بعد وہ وہاں سے ہٹی اور ایک چھوٹے سے بیگ میں اس کے کپڑے رکھنے لگی۔ ایک دوسرے سفری بیگ میں اس نے اپنی ایک جینز اور دو شرٹس رکھیں۔ دونوں بیگ اٹھا کر اور اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے اپنی دوست کے پاس لے آئی اور اس کے گل چوم کر چلی گئی۔

نہیں۔ ایسی زندگی کو سیاہی سے تو پچایا جاسکتا ہے لیکن سرت ریکی نہیں رنگا جاسکتا۔ یہ دھنک جلی تو ہو سکتی ہے دھنک ڈھلی نہیں۔

یہ اس زمزمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو دل کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہے۔ ایسی زندگی زندگی تو نہیں ہوتی۔ کیونکہ وجود میں دھرا لو کھڑا چت ہو جاتا ہے۔ یہ لو کھڑا جو دل ہے۔ اور جس دھوکے باز بزدل کا کوئی علاج نہیں۔ یہ غداری کرتا ہے۔ اور اس غداری پر اسے موت کی سزا ملتی ہے۔ تو مار گریٹ اقوال پر زندگی گزارنے کی کوشش کرتی رہی اور لحاف میں منہ دے کر پوتی رہی۔ اس نے زندگی کی ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ اس نے ایک مسلمان سے محبت کر لی تھی۔ ایک ایسا لبنانی مسلمان جو وہاں کام کے لیے آیا تھا۔ پونڈز کے لیے۔ محبت کے لیے نہیں۔ وہ اس روایت کا پاس دار تھا کہ سفر کے دوران گاڑی کے نئے اور انوکھے اسٹیشنوں پر رک جانے کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ سفر میں اسٹیشن تو آتے ہی رہتے ہیں۔ تو کیا سفر کو ہی روک دیا جائے۔ وہ سمجھ دار تھا۔ اس نے سفر کو نہیں روکا۔

نیلی آنکھوں پر پری چروں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔ کس چہرے کی ہے اس جہان میں۔ پھر ایک انسان کے لیے زندگی تباہ کر لینا کہاں کی روایت ہے۔ اگر ہے بھی تو ہم نہیں مانتے ان روایات کو۔ سب قصے کہانیاں ہیں۔

اس کی چھ سالہ زندگی اپنی ماں کی دہلی سسکیاں سننے گزری۔ وہ سمجھتی تھی وہ سو رہا ہے۔ پر ایسی آہوں کے سائے تلے سو جا گیا گناہ کے مترادف ہوتا۔ وہ دن بھر کام کرتی۔ رات بھر روتی۔ ایسی حالت میں وہ زیادہ دیر تک زندہ کیسے رہتی۔ کیونکر زندہ رہتی۔ جو انسان چن میں کام کرتا۔ بیڈ پر لیٹا، کھڑکی میں کھڑا، دروازے پر نظر میں رکھے خود کو پھرالے۔ وہ زندہ رہ کر زندہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ ایسے انسان کو تو جلد مرجانا چاہیے۔ جس کا لو کھڑا دل خون بنانے کے بجائے۔



کوشش کی۔۔۔ کس کس شخص کے پاس اس کا پوچھنے کے لیے گئی۔۔۔ خدا کے آگے کیسے ختمیے گزراؤں اور اسے یاد کر کے کیسے کیسے روتی رہی اس نے کیا کیا۔۔۔ اس نے جیب سے ایک کانڈ نکالا اور کہا۔

”یہ تمہاری طلاق کے کانڈ ہیں۔۔۔ میں نے اپنے مذہبی اسکالر سے اس کی تصدیق کروائی ہے۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی، لیکن مجھے ہے۔۔۔ تم دستخط کر دو۔“ پھر اس نے ایک لفافہ میرے آگے کیا اور کہا۔

”یہ لو پیسے اور واپس جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا لعنتی کافر عورت!“ اسے بے طرح یاد کرنے پر وہ مجھے طلاق دے رہا تھا۔

اس کے لیے میں خدا کے آگے کیسے کیسے گزراؤں یہ سن کر وہ مجھے لعنتی کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔۔۔ جو اس نے ایک کافر عورت سے شادی کر لی۔۔۔ وہ تعلق ایک لعنت تھا۔ میں سوچا اس نے کہا میں ایک لعنت ہوں۔۔۔ میں اللہ نے تو مجھے بھی بنایا ہے اور اسے بھی۔ کیا اللہ لعنتیں بناتا ہے۔ کیا اللہ ایسا نا انصاف ہے کہ ایک کو اس جیسا انسان بناتا ہے اور ایک کو مجھ جیسا۔ اس نے کہا میں ایک کافر عورت ہوں۔۔۔ وہ کافر کسے کہتا تھا۔۔۔ خدا کو نہ ماننے والے کو۔۔۔ خدا کو چھوڑ دینے والے کو۔۔۔ اور ایک انسان کو چھوڑ دینے والے کو۔۔۔ ایک انسان کو نہ ماننے والے کو کیا کہتا ہے وہ۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے مجھے گالیاں دیں۔۔۔ میرے مرے ہوئے والدین پر الزام لگایا۔ کہ میں حرام کی پیداوار ہوں۔۔۔ میں سر پاپا حرام ہوں۔۔۔ میری رگوں میں ناجائز اور گندا خون ہے۔۔۔ میں اور میرے آباؤ اجداد شراب پیتے رہے ہیں اور میرے والدین کو شادی کی کیا ضرورت رہی ہوگی۔ میں ایک گندے غلیظ مغربی معاشرے کی پیداوار، کتنے کتنے گل کھلا چکی ہوں گی، وہ گالیاں دیتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میں کیا کیا ہوں۔۔۔ وہ مجھے جتا رہا تھا کہ مجھے چھوڑ آنے کی اصل وجوہات کیا تھیں، وہ میرا کافر

مار گریٹ چلی گئی۔۔۔ اور کتنی ہی صدیوں بعد واپس آئی۔ اتنی صدیوں بعد کہ عالیاں نے جان لیا کہ اس کی ماں سوئے، چاگتے، کام کرتے، خاموش بیٹھے، سستی کیوں بھی رہتی تھی اور مسکراتے میں وہ اتنی بری اداکارہ کیوں تھی اور یہ بھی کہ اس کی نظریں کن ورنوں میں بھٹکا کرتی تھیں اور اس کے وجود سے آپس کیسے اور کیونکر نکلا کرتی تھیں۔ جب وہ آئی تو وہ سون آئی کے گھر کے پچھواڑے میں ایک طرف بیٹھا کھیلنے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان بچوں نے کئی بار اسے کھلانے کی کوشش کی تھی۔۔۔ لیکن وہ اپنی ماں پر ہی گیا تھا۔۔۔ وہ ایک برا کھلاڑی تھا۔۔۔ وہ کھیل کو کھیل نہیں سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے جیسے اسے خبر ہی ہو گئی کہ اس کی ماں کیسے اس کے قریب ہے۔ وہ گھر کے اندر آیا۔۔۔ دور سے ہی اس نے مار گریٹ جوزف کی ہچکیوں کو سن لیا۔ وہ ساری اداکاری کو بلائے طاق رکھ کر رو رہی تھی۔

”ہاں! وہ مجھے نظر آیا تھا۔۔۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ تین ہفتے میں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی۔ اس کے دوست نے کہا تھا۔۔۔ مجھے چند ماہ بھی رکنا پڑے تو میں وہیں رکوں۔ وہ وہیں ملے گا۔ اور وہ مل گیا۔ اور اس نے۔۔۔ اس نے جسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔۔۔ وہ قیمتی کپڑے پہنے سڑک پر چل رہا تھا مجھے ان دیکھا کر کے وہ تیزی سے وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگی۔۔۔ لیکن اتنی جلدی نبھانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ سڑک پر ادھر ادھر بھاگتے میں چلا رہی تھی۔ اور سون اپھر بھاگتے بھاگتے میں خود کو گم کر لیا۔۔۔ کہ شاید کسی کو نے میں خود کو چھپا کر مجھے دیکھتے وہ مجھ پر ترس کھا کر ہی آجائے۔ میں گری ہی رہی اور روتی ہی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔۔۔ نہیں آیا وہ۔۔۔ اگلے دن وہ میرے ہوسل آیا۔۔۔ دیکھو کتنا آسان تھا اس کے لیے مجھے ڈنمارک میں ڈھونڈ لینا۔ اور میں اتنے سالوں میں اسے دنیا بھر میں نہ ڈھونڈ سکی۔۔۔ میں بہت ناگاہک بہت بے کار ہوں نا سون! جانتی ہو میرے دو گھنٹے رونے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ پچھلے چار سالوں میں میں نے کیسے کیسے اس سے رابطہ کرنے کی



معلوم ہوتا۔۔۔ میں اس سے ایسی محبت کرنے لگوں گی کاش مجھے یہ بھی معلوم ہوتا۔۔۔ اور کاش وہ کھویا ہی رہتا۔۔۔ میں ساری عمر اسے ڈھونڈتی ہی رہتی۔ میری آنکھیں اس کے انتظار میں تھک کر مردہ ہو جاتیں لیکن ایسے ذلیل نہ ہوتیں۔ اس کی زبان سے نکلا زہر میرے کان میں نہ چکا ہوتا۔۔۔ سون! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگانے والا جب ان ہی ہونٹوں سے تھوکتا ہے تو کرب کا کیسا لاوا وجود میں پھٹتا ہے۔۔۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔۔۔

مارگرٹ نے اپنے وجود کو اپنے ہاتھوں میں پلینا چاہا۔ وہ ایسے تڑپ رہی تھی جیسے اس پر بوند بوند تیزاب چڑکایا جا رہا ہو اور اس کے پاس نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔۔۔

دوبارہ کی اوٹ میں کھڑے اس بچے نے اس تیزاب کی بو اپنے ناک میں گھٹے محسوس کی۔

”میں اس بھری دنیا میں جا کر کے بتاؤں کہ اس نے مارگرٹ نامی شاہکار کی پردہ کشائی کیسے کی۔۔۔ کاش میں اسے کبھی نہ ڈھونڈ پاتی۔۔۔ میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کا گناہ کیوں کیا۔۔۔ میں نے گناہ ہی کیا۔۔۔ اگر اسے یہ سب کتنا ہی تھا تو وہ مجھے برطانیہ میں ہی کہہ کر چلا جاتا۔ وہ کاغذ جو وہ اپنے مذہبی اسکالر سے تصدیق کروا لیا تھا، مجھے وہیں دے کر چلا جاتا لیکن اس کو مجھے خوار کرنا تھا،۔۔۔ اسے میں پہلے لعنت کیوں نہیں لگی۔۔۔ اسے مجھ جیسی کافر عورت کے سر پر منڈلا تاخدانی قبر پہلے دکھائی کیوں نہیں دیا۔۔۔ ملک بدلتے ہی اسے اپنی عقل آگئی۔ ایک امیر بیوہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اسے میری اوقات یاد آگئی؟

مجھے سب کہا کرتے تھے، ”یہ علی دس شادیاں کر لیں تو پلٹ کر کسی ایک کی طرف بھی نہیں دیکھتے۔ پر میں نے کسی کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے اس کا اعتبار کیا جس نے مجھے دھتکار دیا۔۔۔ اس نے تو مجھ سے بوند ز کے لیے گرین کارڈ کے لیے بھی شادی نہیں کی تھی۔۔۔ اس نے تو مجھے زندہ درگور کرنے کے لیے سب کیا تھا۔۔۔ برطانیہ میں شادی کرنے والا ڈنمارک میں مجھے طلاق

ہونا تھا۔۔۔ غیر مذہب ہونا تھا۔۔۔ پھر اس نے میرے خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔۔۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ دراصل کس کا مذہب سچا ہے۔۔۔ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ میں ڈنمارک کی حکومت کو اپنے اور اس کے تعلق کو لے کر درمیان میں نہ لاؤں یا برطانیہ کو وہ مجھ پر یہ ثابت کرنے لگا کہ اپنی بات میں وہ کس قدر سچا ہے۔۔۔ وہ ایک سچے مذہب کو ماننے والا ہے۔۔۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اس کا مذہب انتہائی سچا ہے اچھا ہے تو اس کی وہ کس تعلیم کے تحت میرے ساتھ برا کر رہا ہے سون! کس کا سچا ہے اس کے لیے تو آپ کو خود کو سچا ہونا پڑتا ہے نہ پہلے تو خود کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔۔۔ ورنہ مذہب۔۔۔ کون سا مذہب ہے جو یہ سب کرنے کی تعلیم دیتا تھا جو وہ میرے ساتھ کر رہا تھا۔۔۔“ وہ سون کے ہاتھ پکڑ کر اس سے سوال کرنے لگی۔

”اس نے کہا وہ بھٹک گیا تھا۔۔۔ وہ میرے جال میں آ گیا تھا۔۔۔ میں نے اپنی خوب صورتی کا استعمال کیا۔۔۔ بھٹک تو میں گئی تھی۔۔۔ پھنس تو میں گئی تھی اس کی محبت کے جال میں۔۔۔ میں کتنی خوب صورت ہوں۔ اس کا احساس تو اس نے مجھے دلایا تھا۔ وہ تو کہا کرتا تھا اللہ اپنے شاہکاروں میں مجھے بھی شمار کرتا ہو گا۔۔۔ اور وہ کہا کرتا تھا۔ اللہ کی مہربانی اس نے زمین والوں کے نصیب میں اس شاہکار کی رونمائی کی۔۔۔ مجھے شاہکار تو اس نے بنایا تھا۔۔۔ پھر اس نے مجھے لعنت کیوں بنا ڈالا۔۔۔ سون! میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔۔۔ کوئی لعنت کے طوق کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے جبکہ اسے پہلے ”شاہکار“ کے رتبے پر فائز کر دیا گیا ہو۔

میرا تو سب چلا گیا نا۔۔۔ اس کا کیا گیا۔۔۔ وہ تو قیمتی لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت میرے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ بھگی ہوئی تو میں بھی اس کے آگے گزر کر اتو میں رہی تھی۔۔۔ بھلا بتاؤ سون! جو نفع میں رہتے ہیں وہ میری طرح جھک کر گزرتے ہیں۔۔۔ ایسے خوار ہوتے ہیں۔۔۔ خسارے میں کون رہا سون۔۔۔ وہ میرے ہاتھ پیر کاٹ ڈالتا۔ اس نے میرا دل میری روح کاٹ ڈالی۔۔۔ وہ اتنا ظالم ہو گا کاش! مجھے

”شاید ابھی۔۔۔ آج رات۔۔۔ ورنہ کل صبح۔۔۔ میں نے انہیں خط لکھے ہیں فون بھی کیے ہیں۔“  
 ”وہ گندے ہیں۔۔۔ وہ نہیں آتے۔۔۔“  
 ”وہ آتے ہیں۔۔۔ وہ آجائیں گے۔۔۔“  
 وہ اتنا اچھا تھا کہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اس نے اپنی اولاد کو بھی دیکھنے کی چاہ نہ کی۔ اس کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کی آنکھیں اس جیٹی ہیں۔ کچھ کچھ اس جیسے نقوش۔۔۔ گھنی۔۔۔ بھنویں۔۔۔ گھنی پلکیں۔۔۔ سفید رنگت میں مبہم گندی رنگت کی جھلک۔۔۔ مغرب میں عرب گھلتا ہوا۔

عرب پر مغرب چھٹا ہوا۔۔۔  
 وہ ایسا تھا۔ جس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے باپ نے خود کو دنیا میں چھپا لیا تھا۔  
 اور مارگریٹ آخر تک یہ جان نہ سکی کہ جو گم ہو جاتے ہیں ڈھونڈنا انہیں جاتا ہے۔ جو خود کو چھپا لیں انہیں ڈھونڈنا کتنا تزیل ہے۔۔۔ تزیل۔۔۔ گناہ عظیم۔ ایسے گناہوں سے خود کو بچانا چاہیے۔  
 تو ایسے چھپ چکے مرد کی واپسی کی قصے کہانیاں اب بس ہوتی تھیں۔۔۔ دروازے پر ٹکی لگا ہوا بند ہوئیں۔ اب وہ مارگریٹ نامی عورت صبح اٹھتی اپنی آنکھوں کی سرخی کو میک اپ کی تہ میں چھپاتی۔ پھر بھی بدہیت ہی لگتی۔۔۔ دو گھونٹ کافی پھکیوں کی مانند حلق سے اُترتی۔۔۔ جلتے کئے گوشت کی بو کی تھوں میں مدفون اداکارانہ مسکراہٹ کو نکالتی اور اسے اسکول کے لیے تیار کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کے سڑک پر ایسے چلتی جیسے اپنا ہی تابوت اٹھائے اپنی قبر کی طرف جاری ہو۔

اپنی ماں کے زیر سایہ وہ بھی ایسے ہی چلا کرتا جیسے قبرستان جا رہا ہو۔۔۔ دو انسان خود کو تابوت میں لٹائے۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔ طے شدگی سے۔۔۔ دو انسان اپنے ہی پیروں پر چل کر اپنی اپنی قبر کی طرف کیسے جایا کرتے ہیں۔ مارگریٹ اور اس کے بیٹے کو کچھ کر جانا جا سکتا تھا۔

پھر وہ اسے اسکول سے گھرائی اسے ایک سینڈوچ

دے رہا تھا۔ مجھے میری میرے والدین کی میرے مذہب کی غلاظت کے بارے میں بتا رہا تھا اس نے ایک بار بھی میری آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کے سیلاب کو نہ دیکھا۔ اسے یہ پرواہ بھی نہیں تھی کہ میں اس کے قدموں میں گر کر جاتی ہوں۔۔۔ میں کیسے اس کے بغیر کرب میں مبتلا رہی جان کر بھی اس نے ہمدردی سے بھی میری طرف نہ دیکھا۔۔۔ میں نے اسے اس کے بیٹے کے بارے میں بتایا تو اس نے اس بات کو۔۔۔ اس بات کو ایسے سنا سوں جیسے میں اسے۔۔۔ میں اسے اپنے کسی بوائے فرینڈ کے بچے کے بارے میں بتا رہی ہوں۔۔۔

وہ ایک طلاق کا دکھ لے کر نہیں پلٹی تھی۔ اسے اس طلاق کے ساتھ کئی اور تازیانے مارے گئے تھے اور غلاظت کا ڈھیر ثابت کر دیا گیا تھا۔

محبت کا پادہ زمین بوس ہوا۔۔۔ تمنا تمام ہوئی۔۔۔ کیونکہ محبت وہ پھنکار زوہ کنیا کماری بھی ہے جو کرائی ہے اور جوگ محبت کے شراب کی مستحق بانی ہے۔

وہ خاموشی سے اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔۔۔ مارگریٹ نے آنسو پونچھ لیے۔۔۔ کتنی بد صورت ہو گئی تھی وہ اتنے سے دنوں میں۔ اس کے کپڑے گندے اور بدبو دار تھے۔ اس کے وجود سے ایسی بساںڈ اٹھتی تھی جیسے کچا گوشت دھیمی آج پر جل رہا ہو۔۔۔ مارگریٹ کے پیٹ کے ساتھ لگے اس کا دم گھٹنے لگا۔ امرجل کی دھار ازہر آب تھی۔

زہر زباب (ہمہ وقت جاری رہنے والا زہریلا چشمہ) نے اپنا ذہن اس کے وجود میں کھول دیا تھا۔

اس میں سے بساںڈ کیوں نہ آتی۔ اور پھر اس دن کے بعد سے اس نے اسے یہ کہنا

چھوڑ دیا  
 کر مس کی ان چھٹیوں میں ہم ہلز جائیں گے۔۔۔  
 ”سچ۔۔۔؟“

”ہاں! بس تمہارے پیلا آجائیں۔“  
 ”وہ کب آئیں گے؟“



بنا کر دیتی، گھر کو لاک کر کے چلی جاتی اور رات کو آتی۔ اس وقت تک وہ کھڑکی میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا۔ سینڈوچ دیے کا ویسا ہی رکھا ہوتا۔ کھانا بھوک لگنے پر کھایا جاتا ہے اور اس کی بھوک مارگریٹ کی صورت دیکھتے ہی مرجاتی۔ وہ دعا کرتا نہیں جانتا تھا اس لیے صرف سوچا کرتا تھا کہ کاش اس کی ماں سے ایسی گندی بدبو نہ آیا کرے۔ کاش۔۔۔ وہ اس بو سے چھٹکارا پالے۔

اس کے باپ کی واپسی کے قصے جو وہ اسے سنایا کرتی تھی۔ اب بند ہو چکے تھے لیکن پرانی تصویروں کو دیکھنا اس نے بند نہیں کیا تھا، وہ ایک تصویر کو، جس میں وہ جھیل کے پانی میں پیر ڈوبے بیٹھا تھا اور گردن موڑے مسکرا رہا تھا اور جنگم کرتی آنکھوں کو لیے عرب کا شہزادہ لگ رہا تھا اس کے چہرے کے ساتھ لگا کر دیکھا کرتی اور دیر تک دیکھا کرتی۔

”ہاں! تم میرے جیسے ہو“ وہ خوش ہوتی اور گہرے ساروں میں گھر جاتی پتا نہیں وہ کس بات پر خوش ہو سکتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ یہی سب کر کے کہا کرتی۔

”دیکھو تو۔۔۔ تم تو بالکل اپنے پایا جیسے ہو۔“ پھر وہ اپنی نرم آنکھیں صاف کر لیتی۔ ”تمہارے پایا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے، تم ان جیسے ہو میں خوش ہوں اس پر۔“

”ہاں! تم میرے جیسے ہو“ کا عمل وہ ہر رات کیا کرتی جیسے اسے ہر دن یہ ڈر ہو کہ کہیں وہ اس تصویر جیسا تو نہیں ہو رہا۔ اس شخص جیسا ہی۔

اسے اپنی زندگی کا آخری مرد اپنی زندگی کے پہلے مرد جیسا نہیں چاہیے تھا اب۔

”تم مجھے چھوڑو تو نہیں جاؤ گے نا۔“ وہ اس سے پوچھتی نہیں تھی بس بڑبڑاتی تھی اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ چھوڑ جانا کسے کہتے ہیں۔ وہ ہاں کرتا نا ناں۔

جن دنوں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تھی ان دنوں وہ رات رات بھر بڑبڑاتی رہتی، اس کی بڑبڑاہٹ عجیب ہوتی جیسے ہچکیاں لیتی ہو۔ مدفن

ہچکیاں۔۔۔

”اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہاری دائیں آنکھ کی کمان کے کنارے پر بنے اس تل کو اپنی مٹھی میں لے لوں۔۔۔ اور اسے کہیں چھپا دوں۔۔۔ ہاں چلو اپنے دل میں۔۔۔ تاکہ جب تم نہ سو تو کوئی اور اس تل کے رقص پر فدا نہ ہو جائے۔ میں کسی اور کو تم پر فدا ہوتے دیکھ سکتی ہوں۔ میں مرجاؤں گی۔“

”کل میں فرش صاف کرتے پھسل گئی۔ میری ناک سے خون بننے لگا۔ میں رونے لگی، تم ہوتے تو اپنی آستین سے میرا خون صاف کرتے اور مجھے بانوں میں بھر کر کہتے ”مارگریٹ دی سپر وومن۔۔۔ سپر وومن بھی روتی ہے کبھی۔۔۔ اور تمہاری نیلی آنکھوں میں ایک ہی چیز بھلی نہیں لگتی ”آنسو“ تم وہ کام کیوں کرتی ہو مارگریٹ جو مجھے اچھے نہیں لگتے تم ”آہ“ کیوں کرتی ہو۔۔۔ اگر تمہیں کسی وجہ سے رونا ہی ہوا کرے تو تم خود کو کیس چھپا لیا کرو۔۔۔ پھر اپنی روتی صورت کو میک اپ سے چکالیا کرو۔۔۔ مجھے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم روتی رہی ہو۔“

”میں روتی رہی ہوں۔“ مارگریٹ صبح تک یہی ایک فقرہ بڑبڑاتی رہتی۔ اس نے تھوک کر جلادی گئی محبت کی پوشاک میں خود سے ہی پیوند کاری کر لی تھی۔۔۔ وہ ایک ایسی جذامی بوہیا بن گئی جس کے زخم ہی اس کی دوا تھے۔ اسے کسی وید کے پاس جانے کی حاجت نہ تھی۔

کوئی ایسی محبت کو طوق زدہ، زنجیر مارے جو گدھ بنی ہوئی ہوئی نوچتی ہے۔ ایسے مردار خوار کو کوئی رحم والا مردار کرے۔۔۔ کوئی رحم کرے۔۔۔

اور جب جب وہ بہت زیادہ بڑبڑانے لگتی اور اس کے کانوں میں مزید سکت نہ رہتی سننے کی تو وہ اپنے کانپتے ہاتھ سے ہولے مارگریٹ کے گم کو چھوٹا اور وہ جھمر جھری لے کر بڑبڑاتا بند کر دیتی۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیتی۔ نہیں اپنے بیٹے کو نہیں۔۔۔ عرب کے گم ہو چکے اپنے شہزادے کو۔۔۔ جس کی محبت کو مار کر بھی وہ نہیں مار پار رہی تھی۔ اور جو



خود کو زندگی کے کنارے پر گھسیٹ لائی تھی اور موت کی طرف ہاتھ ہلاتی تھی۔

اور کون کہتا ہے کہ موت سیاہ شب خون ہے۔۔۔ موت نے قطعاً ”مارگریٹ کی زندگی پر شب خون مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ کام تو خود مارگریٹ کر رہی تھی وہ خود سے بیتایا نہی کر چکی تھی۔ ذرا سی تپش ملتے ہی وہ جل کر بھسم کیسے نہ ہو جاتی۔ ایسی حالت میں اسے کون بچا سکتا تھا۔ کوئی معجزہ ہی۔ اور وہ کوئی نبی پیغمبر تو نہ تھی وہ تو صم گزیدہ تھی اور معجزے ایسے لوگوں پر اتنے مہربان نہیں ہوتے۔

ایک رات وہ مر گئی۔ اس رات اس نے اپنی زندگی کے آخری مرد کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بار بار اپنے ہونٹوں اپنے گالوں اپنی آنکھوں سے لگاتی۔

اس کی زندگی کے اس آخری مرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ انسان بڑا حساس واقع ہوا ہے۔۔۔ موت کی آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔۔۔ نو مینی زندگی نموپاتی ہے تو ایسا دواویلا مچاتی آتی ہے۔۔۔ موت تو سالوں۔۔۔ سالوں اور سالوں ہی نموپاتی ہے اپنی آلد پر کس اہتمام کا دواویلا نہیں مچاتی ہوگی۔۔۔ وہ رو رہا تھا۔۔۔ دواویلے پر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

اپنی طرف سے مارگریٹ اپنے ماں باپ اپنے گھر اپنے بچپن اپنے اسکول کی باتیں کر رہی تھی اسے سنا رہی تھی لیکن دراصل وہ اسے ہر دوسری بات کے بعد اس پہلے شخص کے قصے سنانے لگتی تھی جو اس کی پائلنٹی موجود تھا سہا رہا۔۔۔ جو اس کے آخری وقت میں آنے والا تھا نہ ہی بتا جاتا تھا۔

مارگریٹ کو کوئی خواہش نہ تھی اس شخص کو خدا کے حضور مورد الزام ٹھہرانے کی۔۔۔ وہ وہاں بھی یہی کرنے والی تھی۔۔۔ وہ اللہ سے اسے مانگنے والی تھی۔۔۔ وہ رحم دل خاتون تھی وہ جو اس کے لیے اللہ سے رحم مانگنے والی تھی۔

”وہ پینے کے بعد وہ ہمیشہ کپ کو اوندھا کر دیا کرتا تھا۔۔۔ یہ اس کی عادت تھی۔۔۔ چچھے اس کی یہ عادت

بہت پسند تھی۔“

ہاں واقعی مارگریٹ کو اس کی یہ عادت پسند تھی۔ اس کی کافی کامگ خالی ہوتے ہی اوندھا ہو جاتا۔ بڑے ہوتے ہوئے اس نے کئی اوندھے کپ پاؤں کی ٹھوکر سے توڑ ڈالے۔۔۔ اوندھے کپ دیکھ کر وہ پاگل سا ہو جاتا۔ اس کا بس نہ چلنا کہ کیسے وہ اس دنیا کو اس بھٹی میں جلا ڈالے جو اس کے ماں کے اندر بھڑکتی رہی تھی۔

”تمہاری آنکھ کی مکان کے کنارے بھی مل ہو۔ تمہارے دنیا میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے اس تل کو ڈھونڈا۔۔۔ میں نے نو مینی اس ایک تل کے لیے دعائیں کی تھیں۔“ اور آخری بات جو کر کے وہ خاموش ہو گئی وہ بس اتنی سی تھی۔

”بس اب تم میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔“

اس نے اس ہاتھ کو ہونٹوں سے لگالیا۔۔۔ لگائے رکھا۔۔۔ لیکن وہ اس کا بیٹا تھا اس کا محبوب نہیں۔ صرف چھبیس سال کی جوان بوڑھی ہو چکی۔ نیلی آنکھوں اور بھیگی گلابی رنگت والی مارگریٹ کو اس نے تابوت میں آنکھیں موندے سوتے دیکھا۔ اور تابوت کے کنارے وہ دیوانوں کی طرح رویا۔

عالیان مارگریٹ۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کس سے سب سے زیادہ نفرت کرنی ہے۔ اپنے باپ سے۔

آپنی سوسن نے اسے اوور کڈ زینٹر میں داخل کروا دیا تھا جو ایک پائوٹ ادارہ تھا اور بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال میں اپوارڈ یافتہ تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے بتایا گیا کہ ایک خاتون نے اسے گود لے لیا ہے اور وہ ان کے گھر ان سے ملنے جا سکتا ہے۔ اسے ایک رات اس خاتون کے گھر چھوڑ دیا گیا۔

\*\*\*

وہ خاتون لانا مر تھیں۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی اس کی دونوں ہتھیلیوں کو ہونٹوں سے لگالیا اور اپنی

”سوتا۔“

وہ اس سے کہانی سننے کی فرمائش کرتیں۔ بہت دیر بعد وہ کہانی کی پہلی اور آخری سطریں ان پر پاتا۔  
”ایک۔۔ ایک پری تھی۔“

پھر وہ خاموش ہو جاتا۔ دونوں خاموش ہو جاتے۔ کہانی کئی سالوں تک ایسے ہی اختتام پذیر ہوتی رہی۔ ماما مرے بہت نہیں باری۔ انہیں معلوم تھا۔ انہیں انتظار تھا۔ کہانی آگے ضرور بڑھے گی۔ اور وہ محبت ہی کیا جو اختتام پر صابر ہو جائے۔ کہانی ایک دن آگے بڑھ گئی۔ کئی سال لگے لیکن ایسا ہو گیا۔  
”ایک پری تھی۔۔ وہ جنگل میں پھول لینے نکلی اور دو دھول والے ایک بندر کو دیکھ کر ڈر کر ڈر کر اور جلدی سے ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ درخت نے اس سے کہا کہ وہ پانی میں چھلانگ لگا دے، ورنہ بندر اس کے سارے بال کھا جائے گا۔ بندر اس کے سنہری بال نہ کھا جائے اس ڈر سے اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ لیکن یہ کیا ماما۔۔ پھلیوں نے اس کے سنہری بال کھا لیے۔ باہر وہ نکلی تو۔۔ سب درخت۔ سارے پھول۔ سارے بندر۔ سارے ہی بندر۔ ہاہاااا کرنے لگے۔ ایسے منہ کھول کر ہاہااا۔ ہاہااا ہی کرتے رہے۔“

ماما میری طرح کہانی کہیں سے بھی شروع ہو کر ہاہااا پر ہی ختم ہونا چاہیے ہر صورت۔ بیٹے عالیان نے یہ کر آخر کار سیکھ ہی لیا تھا۔ اس رات ماں بیٹا نشست گاہ میں دیر تک لوٹ لوٹ ہوتے رہے۔ تو عالیان میں زندگی آخر کار نمودار ہو گئی تھی۔ اور یہ محبت کا ہی کمال ہے۔ وہ مرنے کو زندہ کر دیتی ہے۔

زوال کو کمال۔ کمال کو بامکمال۔ ماما میں اس کی جان آچھی تھی اور اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہوا ان سے دور ان کے بغیر رہنا۔ ان ہی دنوں اس نے جانا کہ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جو ہمیں چاہیے ہوتا ہے، وہی ہم سے دور ضرور ہوتا ہے۔ جسے صحتی میں کر لینے کو جی چاہے اس کے لیے دل مٹھی میں ضرور آجاتا۔

آنکھوں پر رکھ لیا۔

”مارگریٹ۔۔!“ انہوں نے ہولے سے سرگوشی کی۔

وہ ان کی گود میں رات بھر بیٹھا رہا اور وہیں سو گیا۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

وہ اپنی آپ تک کی زندگی میں دوسری بار محبت کر رہا تھا۔ اور پھر سے ایک عورت سے۔ ایک سے بدانشی ہوئی تھی۔ دوسری سے معجزاتی۔ کسی آسمانی تختی کی طرح جس کے اترتے ہی بس آنکھوں سے لگا لیا جاتا ہے۔ سینے میں اتار لیا جاتا ہے۔ مقدس محبت۔ جس کی پرستش کرنے پر دل بالکل رستا ہے۔

ماما مرے جدائی اسے شاق گزرتی۔ وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور ان کے لیے رویا کرتا تھا۔ وہ ایک نئی عورت سے مل رہا تھا جس کی آنکھیں گہرے پانیوں میں ڈوبی نہیں رہتی تھیں۔ جن میں آس تھی نہ انتظار۔ اور یہ خاتون بڑبڑایا بھی نہیں کرتی تھیں۔ رویا کرتی تھیں نہ ہی اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر اس کی آنکھوں کو گھنٹوں تکا کرتی تھیں۔ اور ان کے سینے سے لگے ایسے انسانی گوشت کے جلنے کی بو بھی نہیں آیا کرتی تھی۔ کیسی خاتون تھیں وہ، وہ بالکل مارگریٹ جیسی نہیں تھیں۔ جس رات وہ ان کے سینے سے لگ کر سوتا، ساری رات جاگ کر انتظار کرتا کہ وہ کوئی سسکی بھریں گی۔ کسی کو پکاریں گی۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوتا۔

ہاں وہ بہت محبت سے اپنے شوہر۔ اپنے والدین کا ذکر کیا کرتیں۔ یا اسے کہانیاں سنایا کرتیں جن میں پریاں ہوتیں۔ ان کے کھیل تماشے، شرارتیں ہوتیں لیکن کوئی اختتام نہ ہوتا۔ نہ دکھ نہ آہ نہ رونا نہ رلاتا۔

وہ قصہ گو نہیں تھیں۔ کیونکہ وہ ”محبت گو“ تھیں۔

وہ کہانی نہ بن سکتیں کیونکہ وہ انسان ”بننے“ میں مصروف رہتیں۔ وہ کیا کر تھیں۔ انہیں تو تانے کو سونا بنانا تھا۔



کپڑے پہنے، خود کو سجائے بنائے اب تک زندہ ہوتی۔۔۔ وہ اب تک بڑی شان سے زندہ ہوتی۔۔۔ اس کے لحاف اس کے منہ سے نکلنے والے خون کے چھینٹوں سے سرخ نہ ہوئے ہوتے۔۔۔ اس کی راتیں سبک کر نہ گزرتیں۔۔۔ اس کے دن آنکھوں کی نمی چھپاتے نہ گزرتے۔۔۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے اقوال یاد نہ کرنے پڑتے۔۔۔ اور ہر روز اسے خود کو بہادر بنا کر زندگی کے سامنے نہ کھڑا کرنا پڑتا۔۔۔

وہ اسے لیے لیے کھڑے لکھتی۔۔۔ پاگل ہوئی اسے ڈھونڈتی نہ پھرتی۔۔۔

بے وفا اور لعنتی عورتیں اتنے وبال پالتی ہیں بھلا۔۔۔ اور کیا ایسی عورتیں اتنی جلدی مرجاتی ہیں۔۔۔ اور کیا اتنی ہی آسانی سے وہ موت کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ وہ اس شخص کو ڈھونڈ کر مار ڈالے گا۔۔۔ لیکن ماما مہر کا کہنا کہ اسے دل و دماغ کو خاموش رکھو۔۔۔ سارے وبال بیس سے پھوٹے ہیں۔

ولید البشر ”کا خیال آتے ہی وہ اپنے دل و دماغ کو خاموش کروا دیتا۔۔۔ شروع شروع میں مشکل تھا۔۔۔ لیکن اس نے کر لیا۔۔۔ ماما مہر ٹھیک کہتی تھیں اسے وبال پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ اس کی زندگی میں مارگریٹ اور مہر موجود تھیں۔۔۔ اور اسے ان ہی کے سہارے زندگی مکمل کرنی تھی۔



وہ خاموش وقت تھا۔۔۔ ربی ٹھنڈ میں مانچسٹر کی ایک بند گلی کے کنارے وہ خود کو دنیا سے چھپا کر کھڑا تھا۔۔۔ ”مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہو گا تو باپ کا کیا ہو گا۔۔۔ معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔۔۔ نہیں ہے معمولی۔۔۔ اس کے باپ کا خاندان کا کوئی اتنا نہیں ہے۔۔۔ وہ کون ہے وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔۔۔ یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔۔۔ غیر مذہبی۔۔۔ غیر اخلاقی اقدام کی پروان۔۔۔ میرے خاندان کے لیے طمانچہ جیسے باتیں

پندرہ سال کا ہو جانے کے بعد اسے وہ چیزیں دی گئیں جو اس کی ماں کی تھیں۔۔۔ جسے آئی سو سن نے سینٹر کے حوالے کیا تھا۔۔۔ اس نے وہ تصویر جسے وہ اس کے گال کے ساتھ لگا کر گھنٹوں دیکھا کرتی تھیں، سب سے پہلے پھاڑ کر پھینک دی۔۔۔ وہ خط جو غلط پتوں کی وجہ سے واپس آ چکے تھے، انہیں بھی وہ پھاڑ ڈالتا، مگر وہ مارگریٹ کے ہاتھوں سے نہ لکھے گئے ہوتے۔۔۔ کچھ وہ خطوط بھی تھے، جو مارگریٹ کی موت کے بعد واپس آئے تھے، یعنی اپنی موت سے پہلے بھی وہ اسے خط لکھتی رہی تھی۔۔۔ اس نے کبھی ان خطوط کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔ سوائے ایک بار کے۔

”آج سے چار سال پہلے جب تم اپنے گھر والوں سے ملنے کا کہہ کر مانچسٹر سے جا رہے تھے تو مجھے لگتا تھا میں تمہیں مانچسٹر میں آخری بار دیکھ رہی ہوں۔۔۔ یہ ایسا وہم تھا کہ یکن میں کام کرتے میں اپنا ہاتھ جلا بیٹھی۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس میں تمہاری وی رنگ بھول بیٹھی۔۔۔ اس رنگ کو ڈاکٹر کے کوڑا دان میں بہت مشکل سے تلاش کر پائی۔۔۔ کوڑے دان میں اگلے دن اس رنگ کے ملنے نے مجھ اگل سا کر دیا تھا۔“

وہ فون کبھی نہ آیا۔۔۔ خط واپس آتے رہے۔۔۔ جس کی آنکھ کی کمان کے کنارے مل تھا اسے ڈھونڈنے مارگریٹ کا بے لگائے نکلنے کی یہاں تک کہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگی۔۔۔ اور پھر موت نے اسے اپنی سانسیں عطا کر دیں، اپنے سارے وہموں کے ساتھ وہ پوشیدہ ہو گئی۔

وہ اس شخص کا جائز بناتا تھا یا ناجائز۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسکول میں اس کے نام کے آگے ولید البشر لگتا تھا جو بڑا ہونے پر اس نے بدل لیا۔ وہ کسی ولید البشر کو نہیں جانتا تھا۔۔۔ اگر دنیا میں کوئی ولید البشر تھا تو وہ اس کا باپ نہیں تھا۔ ایک بھیڑیا تھا جس نے اس کی ماں کو چر پھاڑ ڈالا اور اسے لعنت قرار دیا۔۔۔ اس عورت کو اس نے لعنت قرار دیا، جس نے اس کے بعد دوستی کے نام پر بھی کسی مرد سے بات نہ کی۔۔۔ اگر وہ ایک لعنت ہی ہوتی تو پھول دار



میں شرکت کرنے کا جو فریضہ (سنے آنے والوں) کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ خاص کر امرجہ کے ساتھ کیے جانے والے مذاق میں تو اسے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ جب جب وہ لڑکی اسے ملی تھی اس کا مزاج ہی بگاڑا تھا اس نے۔

وہ ایک طرف اندھیرے میں کاک ٹیل لیے بیٹھ گیا اور سارا تماشا دیکھنے لگا۔ اور جب وہ رورو کر اردو میں چلانے لگی تو اسے برا لگا۔ اور جب گھٹنوں میں سر دے کر وہ باقاعدہ رونے لگی تو۔

مارگریٹ بچن میں اس کے لیے کچھ پکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور کھڑکی سے اندر۔ بچن کی طرف سے آئی آوازیں سن رہا تھا۔ جب ان آوازوں کو سنتے سنتے وہ خود رونے جیسا ہو گیا تو بچن کی طرف آیا۔

”ماما!“ اس نے روتی ہوئی مارگریٹ کو بلانے کی جرات کی۔ کچھ دیر بعد وہ چھری پھینک کر اس کی طرف پلٹی۔ اس کی انگلی سے خون نکل رہا تھا۔

”میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔“

اگر وہ براؤے میں کام کرتی تو سارے براؤے کو لے ڈالتی۔ اتنے سے بچے کو دلوانے میں وہ ناکام تھی، انگلی کاٹ کر رونے کی وجہ بتا رہی تھی۔

اس نے انگلی سے خون کو بہنے دیا۔ اور روتی رہی، ”مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ بہت درد۔“ اور وہ خاموش کھڑا انگلی کو نہیں ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جن سے خون ابل رہا تھا اور وہ خون فرش پر نہیں اس کے دل پر گر رہا تھا۔

امرجہ واجد سسک رہی تھی اور جب اس نے سیاہ مشقی آنکھوں میں جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ مارگریٹ کی طرح کلاف میں منہ دے کر وہ بھی بہت روتی رہی ہیں۔ ان پر بھی کرب کے بہت سے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ وہ ان آنکھوں میں بکڑا گیا۔

مارگریٹ کو پھر سے کسی نے رلا دیا۔

اب وہ یہ نہیں ہونے دے گا۔

ہوں گی یہ سب۔“

عالیان نے جھرجھری لی۔ اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ جس دیوار کے سہارے وہ کھڑا تھا وہ ٹیلی تھی اور اس میں سے بو آتی تھی۔ نہیں وہ غلط تھا۔ وہ بو تو اس کے اندر سے آرہی تھی۔ انسانی گوشت کے جلنے کی۔

ہاں! اب اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی نیلی دھنکی ہوئی آنکھوں والی ماں نے کیا محسوس کیا تھا، جب اس شخص نے جس سے وہ دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی اسے لعنت قرار دیا تھا۔

اچھا تو کیا اس کا سانس بھی ایسے حلق میں اٹکا ہوگا کہ سینے پر تھوڑے مارنے کو جی چاہتا ہوگا؟

زمین دھسان (دلدل) ہے۔ آکاش اندھیا رکاسیواک ہے۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ لاکھوں کروڑوں تاریکی، غبار سے اُٹے پٹ واہوئے۔

زندگی اندھیا رکی چاکر ہوئی۔ اور لوروشیاں گل ہوئیں۔ اب بس گل ہوئیں۔

اس شخص کے دل کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مارگریٹ کے بیٹے سے بھی بدلہ لیا تھا۔ اسے بھی چپ بھاڑ ڈالا تھا۔ اسی کی ذات کو لے کر اس پر سوال اٹھتے تھے۔ اس شخص کی شناخت سے اس کی شناخت ہوئی تھی۔ جس شخص کے نام کو وہ اپنی زبان سے ادا نہیں کرتا تھا۔ اس شخص کے نام کو اپنے نام کے ساتھ لگانے پر اسے تسلیم کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اسے کوئی پہچان۔ کوئی محبت نہیں چاہیے۔ اسے امرجہ واجد اب نہیں چاہیے۔ اس کی ماں پر گیر اخلاقی اقدام کی انگلی اٹھانے والی۔

امرجہ واجد۔

درد کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ آخر اس نے اس لڑکی کو کیوں پسند کیا۔

اس کی بد قسمتی اسے اس اسٹوڈنٹ پارٹی میں لے گئی۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس فضول سے مذاق

وہ رات اس نے جاگ کر گزاری۔۔۔ مشرقی افق پر  
دو نیم دھڑے تھے وہ ان میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔  
بھوری آنکھوں میں جو دھوپ بجھے پڑے تھے وہ جل  
ٹھٹھے تھے۔

وہ تان سین کی شاگرد رہی ہوگی۔۔۔ اس نے اس  
کے اندر چرغاں کر دیا تھا۔  
وہ حیات کا دہانہ تھی۔۔۔ وہ اسے زندہ کر رہی تھی۔  
وہ مشرقی ساحہ تھی۔۔۔ بس میں کر لینا وہ سیکھ چکی  
تھی۔

اور وہ ہنسنے لگی تھی وہ اس کے زخم مندمل کرنے  
آئی تھی۔۔۔ اسے لڑکیوں میں اتنی دلچسپی تھی جس سے  
کارل کو پڑھ سکے وہ کارل کی ہر گرل فرینڈ کو لے آتا۔  
کارل کے ساتھ یہ سب چلتا رہتا تھا۔ پھر اس نے ایک  
ایسی لڑکی میں دلچسپی کیوں لی جس نے اتنی حقارت سے  
وہی سارے الفاظ اس کے منہ پر دے مارے تھے جو  
کبھی ڈنمارک میں اس کی ماں کے منہ پر مارے گئے  
تھے۔ وہ خود اپنے باپ کے لیے بھی اتنا ہی حقیر تھا۔  
جنتاب امرجہ واجد کے لیے۔۔۔

اس نے استہزائیہ ہنس کر سوچا۔ ”ایک ہی نسل  
کے دو انسانوں کا ایک جیسا نصیب۔۔۔ دونوں کو محبت  
ہوئی۔۔۔ دونوں کو بدلے میں دھتکار لی۔۔۔ دونوں کو  
لعنت قرار دے دیا گیا۔“

دو انسانوں کے نصیب میں اتنی مماثلت۔۔۔ وہ  
واقعی بہت بد نصیب تھا۔ اس کا نوٹ کرونا تھا۔

امرجہ واجد کو اس کی ماں سے زیادہ اس کے باپ کی  
فکر تھی، جس کی غلیظ تصویر کو اس نے پھاڑ کر پھینک  
دیا تھا۔ وہ انگلی اٹھا رہی تھی کہ وہ کون تھا۔ وہ عالیان  
مارگریٹ تھا۔ اور اسے کیا ہونا چاہیے تھا۔ اگر  
عالیان نام اسے اس کی ماں نے نہ دیا ہوتا تو وہ یہ بھی  
بدل لیتا۔

اسٹوڈنٹ بائی کے بعد اس نے خود کو اسے دیکھتے  
پایا۔۔۔ وہ اس کے ڈیڑھ ٹمنٹ تک جاتا۔۔۔ وہ اپنے بے  
دوڑے کو سنہنٹائی یونیورسٹی کے درو دیوار کو ایسے دیکھتی  
جیسے کسی نئے جہان آچکی ہو۔۔۔ وہ اپنے آپ میں

مسکراتی رہتی۔۔۔ خاص کر تب جب اس کے قریب  
سے کوئی عجیب و غریب لباس یا پینو اسٹائل والا  
اسٹوڈنٹ گزرتا۔ اسٹوڈنٹ بائی کے بعد اس نے دیکھا  
کہ ہنسی کو دبائے، زبردستی کا منہ پھلائے وہ سب کی  
معذرت سن رہی ہے جیسے ان پر اس نے ”مٹو“ کر دینا  
تھا لیکن یہ اس کی انسان دوستی کی مثال ہے کہ وہ ایسا  
نہیں کر رہی، ڈیرک جیسے ہاتھ باندھے سزا کے انتظار  
میں کھڑا تھا اور وہ اعصاب ٹانے کسی خوشخوار بادشاہ کی  
اکلوٹی بی بی کی ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔  
”بس۔۔۔ اب تمہیں بھوکے سیروں کے آگے  
ضرور ڈالا جائے گا۔“

وہ اکثر آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے جاتا۔ اس کا  
دوپٹہ اس کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ اسے اتنے بڑے  
بڑے دوپٹے لینے کا شوق بھی تھا اور انہیں سنبھالنا بھی  
نہیں آتا تھا۔ شاید وہ سارے ماچسز کو یہ بتانا چاہتی  
تھی کہ صرف وہ اکیلی ہے ”مشرق کی پہچان“ جی ہاں۔۔۔  
وہ اکیلی۔۔۔

ایک دن جب وہ آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے پیچھے  
آیا تو اس کا دوپٹا اس کے پیچھے والے کے ماؤں میں الجھ  
گیا۔ پیچھے والا معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ اور وہ  
دوپٹے کے کنارے اور اس کنارے کو پیر تلے دبانے  
والے کو گھورتی رہی۔۔۔ کچھ آگے جا کر اتفاقاً ”وہ بے  
چارہ الجھ کر گر گیا۔ اور وہ جو پیچھے کھڑی اسے گھور رہی  
تھی، منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا  
جیسے اس لڑکے کو کہہ رہی ہو۔۔۔

”اب آیا مزہ۔۔۔ اگلی بار دھیان سے چلنا۔۔۔ یو  
ایڈیٹ۔“

اور اسی دوپٹے کو لے کر اگلا منظر کچھ یوں تھا کہ ایک  
ہندوستانی لڑکے نے زمین بوس ہوئے اس کے دوپٹے  
کو پیچھے سے اٹھا کر اسے دیا اور ساتھ کوئی استہزائیہ یا  
طنز پر جملہ کہا اور ہنسنے لگا۔ اور پھر ایک دم سے اس کی  
ہنسی ختم گئی۔۔۔ امرجہ واجد ہاتھ لہرا لہرا کر اسے کچھ کہہ  
رہی تھی۔۔۔

”ہندوستان، پاکستان کی تاریخی ناچاکی کا ایک چھوٹا



سامنظر۔

بات شاید دوپٹے سے ہوتی، اسلام اور دہلی تک جا  
پنچی تھی۔

”ملائق!“ انہی پشت پر یہ سرگوشی بھی سننا پڑتی۔  
رندھے گئے کے ساتھ اور ملائق کا لقب لے کر  
جب وہ پروفیسر ڈیل کے آفس سے باہر آئی تو اسے بھیجنے  
والے اس کے کلاس فیوز کورڈور میں لوٹ پوٹ  
ہونے لگے۔ انہوں نے نجانے کون کون سے جھوٹ  
سچ گھڑ کر اسے بھیجا ہو گا اور یہ بات اسے آفس سے باہر  
آنے کے بعد معلوم ہو گئی تھی۔ وہ خاموش کھڑی ان  
کے قہقہے سنتی رہی۔ پھر خود بھی ہنسنے لگی۔ اس بار اس  
نے ہاتھ میں پکڑی فائل انہیں دے مارنے کی حرکت  
نہیں کی تھی۔

وہ مہمچسٹر کے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ پہلے کی نسبت وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ عالیان کو لگنے لگا تھا کہ وہ کسی وینڈر لینڈ میں آ گیا ہے۔ یعنی صرف ایک لڑکی کے مہمچسٹر میں آ جانے سے سارا مہمچسٹری وینڈر لینڈ میں بدل چکا تھا۔ وہ اب تک اپنی ماں کو یاد کر کے سو رہا تھا۔ اور کئی کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آتی تھی۔ اب وہ اسے سوچتا۔ مسکراتا۔ اور سو بھی جاتا۔ اور کبھی سوچتے سوچتے ٹخاف کو جھٹک کر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور فقیے لگاتا۔ اچھا تو وہ یہی پری تھی۔ جس کی کمائی کہیں سے بھی شروع ہو۔ اختتام الہا پھر ہوتا ہے۔ وہ اپنی کلاس فیلوز سے جو بھٹے لگا۔

Rotatouile دیکھی ہے۔۔۔ وہی چوہے والی؟

”ہاں۔۔۔ کون سی؟“

”جس میں جوہا کھانا پکاتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ سو سوئٹ۔۔۔ وقت ملتے ہی ضرور دیکھوں گی۔“

”ہاں! وہ کتنا کیوٹ لگتا ہے نا وہ کھانا پکاتے۔۔۔ لو اٹ۔“

کوئی بھی اس کی طرح آخ نہ کرتا۔۔۔ ناک نہ چڑھاتا  
 ہاں ٹھیک تھا۔۔۔ ٹھیک تھا کہ وہ مشرق سے آیا بھید  
 تھا۔۔۔ جسے وہ بھول رہا تھا۔۔۔ ان کا ایک انگریز دوست  
 کسی انوکھی بات پر اکثر ہلا کر بوڑھے جرنیلوں کی طرح  
 تاسف سے کہا کرتا۔۔۔

اور اس سے اگلا منظر کچھ ایسے تھا کہ بونی کے باغ میں لگے ایک — بوڑھے کے ساتھ اس کا دوشہ انک گیا وہ ذرا آگے چلی گئی، دوپٹے کے کھنچاؤ سے اسے پیچھے پلٹنا پڑا اور ایسا کرتے وہ اپنے پیچھے آنے والی لڑکی سے ٹکرائی۔ مگر اسے سباز کی عینک گرتے ہی ٹوٹ گئی جو اس نے کچھ دیر کے لیے سر پر لگائی ہوگی۔ ظاہر ہے وہ بے چاری صبر کے گھونٹی بی کر رہ گئی، اگر امرحہ واجد ہوئی تو دھاڑیں مار مار کر روئی۔ اسٹوڈنٹس کی ہمہ وقت کی خالی جیبوں پر ایسے نقصانات کسی ہائپر روجن بم کی طرح چھتے ہیں اور وہ تو پھر اس کا نظر کا چشمہ تھا کتابوں سے زیادہ اہم و ضروری۔ عالیان کو اس سے بات کرنے سے زیادہ اس کے پیچھے پیچھے رہنا دلچسپ اور حیرت انگیز لگتا تھا۔

ایک دن اس کے کلاس فیوز نے اسے پروفیسر ڈرل کے آفس بھیج دیا۔ پروفیسر ڈرل صرف what ایسے پوچھا کرتے جیسے تمہارے ہوں۔ ”تکنا“ یعنی کہ کیا ہیں۔ کیا؟ اب بولنا۔ بولتے نہیں۔“

ایسے what کو سن کر سامنے پیش ہونے والا کتنا ہی ضروری کام کو لے کر آیا ہوتا، یہی سوچنا کہ "آخر کیا ضرورت تھی اتنے معمولی سے کام کے لیے پروفیسر کو تنگ کرنے کی۔"

وہ دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھتے اور منہ پر جانے جیسی سنجیدگی لیے ایسے دیکھتے جیسے کہتے ہوں۔

”تمہاری یہ جرات کہ تم یہاں تک آئے۔ لاؤ دکھاؤ، کیا مسئلہ ہے۔ آئے ہیں بڑے پڑھنے، نیوٹن بننے۔ باتوں سے فرصت تمہیں اور آجاتے ہیں بروفسرز کو تنگ کرنے۔ ہیں۔“

اور پھر وہ اس پیش ہونے والے نیوٹن سے وہ وہ سوال کرتے کہ اس بے چارے بے چاری کو رندھے گلے کے ساتھ معذرت کر کے اٹھنا پڑتا۔



دور رہے اس سے۔

”میں نے خبریں سنیں بی بی سی پر۔ احتجاج دیکھے ہیں۔“

”کبھی کبھار بجلی کا چھوٹا بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے تو بس تھوڑے سے لوگ احتجاج کر لیتے ہیں۔ بس ایسے ہی۔“

امرحہ ایک باکمال پاکستانی تھی، سات سالوں کی خون کے آنسو رلانے والی لوڈ شیڈنگ کو وہ چھوٹا بڑا کبھی کبھار کا مسئلہ کہہ رہی تھی۔

”کبھی کبھار کے مسئلے پر لوگ ایسے احتجاج کرتے ہیں۔ انہوں نے حکومتی اگس کو آگ لگا دی تھی۔“

”تم نے کوئی غلط کر دیکھ لی ہے۔ ایسا نہیں ہو گا۔“

اگ کیوں لگائے گا بھلا کوئی۔ سب ٹھیک رہتا ہے لاہور میں۔ پاکستان میں۔ بہت پیارا ملک ہے ہمارا۔ ہمیں وہاں کوئی مسئلہ کوئی مشکل نہیں ہے۔“

ہاں یقیناً ”بہت پیارا ملک ہو گا۔ جس ملک کی رہنے والی اس کی کسی خامی کو زیر بحث نہیں لارہی، جس کے خلاف وہ ایک بات نہیں سننا چاہتی، وہ ملک کتنا پیارا ہو گا۔ وہ امرحہ سے زیادہ پیارا ہو گا۔“

عالیان کو اس کی یہ حساسیت اتنی اچھی لگی کہ اس نے پاکستان کو لے کر وہ خبریں ہی پڑھیں بند کر دیں جن میں کسی مسئلے کی نشاندہی ہوئی۔ لاہور میں سب ٹھیک ہے۔ جیسے ماچسز میں سب ٹھیک ہے۔

تو امرحہ کا لاہور اس کا ہو گیا تھا۔ جیسے عالیان کا ماچسز امرحہ کا ہو چکا تھا۔ ایسے ہی فاصلے کم ہو جاتے ہیں۔

محبت ہی میں ہم اپنی ساری قیمتی چیزیں تھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتے ہیں کہ لو یہ آج سے تمہاری ہو میں۔

کارل سے امرحہ کو چھپائے رکھنا کسی مہم کو سر کرنے کے برابر تھا۔ بظاہر کارل ایسے ظاہر کیا کرتا جیسے وہ بالکل انجان ہے اور اس کے پاس تو اتنا وقت ہے ہی نہیں کہ عالیان کی نگرانی میں ضائع کرنا پھرے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پوئیس گھنٹے کو چوبیس دن بناتے ہیں۔

”تم نے مشرق کے گھاٹ کا پانی پی لیا ہے۔ تمہاری سمجھ اب سمجھ سے بالاتر ہو چکی ہے۔“

امرحہ سے ملنے کے بعد اب اسے لاہور جانا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہاں سب اس جیسے ہیں۔ کیا سب لڑکیاں ایسے ہی دپیٹوں میں ابھتی ہیں۔ بری بات پر ناک چڑھا کر ”آخ“ کرتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنکھیں نم کر لیتی ہیں۔

جب وہ فارغ ہوا وہ ”لاہور نامہ“ پڑھتا رہتا۔ یعنی اپنے فارس اوقات کار میں وہ ”لاہور“ نہیں رہتا۔ وہ اتنا لاہور میں رہنے لگا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی اسے خود کو یاد کروانا پڑا کہ وہ St-Anselm Hall میں ہے کینٹ یا مال میں نہیں۔ وہ روز پاکستانی اخبار بھی ضرور پڑھتا کہ لاہور میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ لاہور میں کچھ بدل تو نہیں گیا۔ اس نے لوڈ شیڈنگ کے بارے میں اتنا پڑھا کہ اس نے امرحہ سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا واقعی پاکستان بجلی کو لے کر اتنے بڑے کرائسز سے گزر رہا ہے۔“

اس کا رنگ فق سا ہو گیا۔ ”نہیں۔۔۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔؟“

”نہیں۔“ وہ اس کے نہیں پڑنگ تھا۔ ہر روز وہ بجلی کو لے کر خبریں پڑھتا تھا۔

”ایسے ہی۔۔۔ وہ میرا ہاسٹل فیلو بتا رہا تھا۔“ اس نے بہانا بنایا۔

”کیا بتا رہا تھا۔ کوئی پاکستانی ہے یا ہندوستانی۔“ اس نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

عالیان کے لیے یہ حیران کن منظر تھا۔ ”یہی کہ وہاں بجلی کا مسئلہ۔“

”وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے بجلی کا۔ سب ٹھیک ہے۔ جیسے یہاں سب ٹھیک ہے۔ کیوں ہو گا وہاں کوئی مسئلہ؟“ اسے یقیناً ”اس ہوسٹل فیلو پر غصہ آ رہا تھا۔ عالیان دنگ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اپنے ملک کی عزت کو لے کر وہ اتنی حساس تھی کہ ایک غیر ملکی کے سامنے کسی بھی اندرونی مسئلے کو لے کر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی، یعنی یہ ان کے گھر کا معاملہ تھا، غیر ملکی

امرحہ کے نام پر ہی وہ ایسے مسکرایا کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رہ گئے کیسے نہیں مسکرایا کرے گا۔ ہر بار ایک نئی مسکراہٹ۔ اک نئی ادا۔  
رائی امرحہ کی جگہ ایک نئی امرحہ۔ نئی امرحہ کی جگہ قیتی پھر سے پرانی امرحہ۔



رات کے آخری پہرہ اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے میں کارل موجود تھا، اسے کمرے میں آنے کے لیے۔ کسی کے بھی کمرے میں جانے کے لیے چابی کی ضرورت نہیں پڑا کرتی تھی۔ جس حساب سے وہ جاسوسی، ایکشن فلمیں دیکھتا اور ناول پڑھتا تھا اب تک جیمز بانڈ نہیں بن چکا تھا تو یہ اس کی کسر نفسی تھی۔  
”میرے کمرے سے جاؤ کارل!“ اس نے اپنا پورچا کوٹ اتار کر پھینکا۔  
”تم کہاں تھے؟“  
”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“  
”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”تمہارا شکریہ میں ادا کر چکا ہوں۔ اب تم جاؤ۔“  
”شکریہ۔ یہ لفظ پہلے کب ہم دونوں نے استعمال کیا ہے؟ ذرا بتاؤ۔ وہ لڑکی تمہیں پسند نہیں کرتی۔ بات ختم۔“  
”ہاں بات ختم۔ اب جاؤ۔“  
”ہمیں۔ تم تھیک ہے بات ختم کرو۔“ کارل نے اس کی شرٹ گاگریاں پکڑ لیا۔  
”میں بات ختم کر چکا ہوں کارل۔ تم سے بھی اور اس سے بھی۔“ اس نے اپنا گریبان آزاد کر دیا۔  
”اس سے کرنا تو بنتا ہے۔ اس نے تمہاری بے عزتی کی۔ لیکن تم؟“

”میں سب سے ختم کر رہا ہوں۔“ وہ چلایا۔  
”کتنی لڑکیوں کے ساتھ تم نے میرے بریک اپ کروائے۔ میں نے کبھی ایسے ری ایکٹ نہیں کیا۔ چند ایک کے ساتھ تو میں سنجیدہ تھا۔ تم بہت برے

ایک رات جب دونوں سڑک پر شرط لگا کر دوڑ رہے تھے اور کارل جیت چکا تھا تو اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔  
”تم آج کل مسلسل مجھ سے ہار رہے ہو۔“  
”ایک دوڑ میں ہر اکرم مجھے لوڑ نہیں کہہ سکتے۔“  
وہ ہنسا ”ایک دوڑ میں۔ کم آن عالیان۔ اس ہفتے میں یہ تیسری بار ہے۔“

”میری صحت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ میں فٹ نہیں ہوں۔“  
وہ اور ہنسا ”تم ہار رہے ہو۔ مطلب تم کہیں اور جیت رہے ہو۔ مجھ سے ہار کو تم اہمیت نہیں دیتے۔ میرے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ میں نے تم سے کہا کہ مارٹن کو اسٹور روم میں لاک کرنا ہے تو تم نے کہا کہ وہ بے چارہ ڈر جائے گا۔ اس سے پہلے تو تمہیں کبھی کسی کے ڈرنے کی پروا نہیں ہوئی تھی۔“  
”اگر وہ انتظامیہ سے ہماری شکایت کر دیتا۔؟“

کارل منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ ”اس سے پہلے ہم ڈیوڈ کے ساتھ یہ کر چکے ہیں اور اسے تو ہم نے کوڑے دان میں کیا تھا۔ اور بے چارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ تم اب بدل رہے ہو۔ میں تمہیں اکیلا بدلنے نہیں دوں گا۔“ کھونسا دیکھا کر کہا۔  
”میں اب برا ہو رہا ہوں۔“

”نہیں۔ بڑے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں یہ۔“  
مجھے تشویش ہے۔ بلکہ خوف ہے میں اپنا بہترین دشمن کھودوں گا۔ یونو! سرکارل کہتے ہیں دوست ہونہ ہو دشمن ضرور ہو اور تم جانتے ہو، پوری یونیورسٹی میں میری فکر کے صرف تم ہو۔“ کارل نے انگلی اٹھا کر کہا۔

”تم انتظار کر لو۔ فریشز میں بہت سے بھینسے تمہاری فکر کے آچکے ہوں گے۔ جتنی چاہے فکریں انہیں مار لینا۔“  
”میرا خیال ہے وہ مل آچکا ہے۔“ سرکارل نے پُرسوج سر ہلایا۔  
عالیان زیر لب ہنسا۔ ”امرحہ۔۔۔ بل۔۔۔ ہا۔۔۔“

کھڑی بنتے جا رہے ہو۔“

”ہاں! میں بہت برا کھڑی ہوں۔ بدترین انسان ہوں میں۔“ اس نے کارل کو ہلکا سا دھکے کر خود سے دور کیا۔ ”تم جاؤ اب۔“

”تم یہ سب نہیں کر سکتے۔ ایسے خود کو نہیں بدل سکتے۔“ کارل چلایا۔ ”ہم دونوں بہت وقت ساتھ گزارا ہے۔ میرا حق ہے تم پر۔“

عالیان نے اپنے منہ کو اس سے چھپانے کی کوشش کی۔

”جاؤ کارل۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“  
کئی لمحے اسے دیکھتا رہا پھر وہ چلا گیا۔



عالیان St-Anselm Hall کے کمرے کی کھڑکی سے برف پر گرتے اندھیرے کو دیکھنے لگا۔ ایک گھر جو اسے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک گھر۔ ایک خاندان۔ کارل اور وہ چپکے چپکے اس کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو وہ یہی بتاتے کہ انہیں بڑس ٹائیکون بننا ہے۔ اور ایک دوسرے سے چھپا کر وہ ہوم ڈیکور کے رسالے دیکھتے رہتے۔ کارل جو اتنی لڑکیاں بدل چکا تھا، صرف اس لیے کہ وہ جان چکا تھا کہ وہ گھر نہیں بنا سکتیں اور جب ان لڑکیوں سے اس کا چھکارہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا تو جیسے وہ خود عالیان کو دعوت دیتا کہ خدا کے لیے میرا بریک اپ کروادو۔

ایک گھر۔ ایک خاندان۔ مل کر ایک ہو جانا۔ اس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو ان سے محروم رہا ہو۔ عالیان نے تو پھر بھی چند سال اپنی ماں کے ساتھ گزارے تھے مگر اس نے تو ہوش ہی کدز سینٹر میں سنبھالا تھا۔ اس کے والدین ٹرین کے حادثے میں مر چکے تھے۔ سوتیلے نانا اور نانی نے اسے اس کدز سینٹر کے حوالے کر دیا تھا۔

ایک بار اس نے امرجہ سے پوچھا۔  
”تمہارے وہاں گھر کیسے بنتے ہیں؟“

”مطلب تعمیرات؟“

”نہیں۔۔۔ مطلب کیا خواہش رکھی جاتی ہے ایک گھر کو لے کر کہ وہ ایسا ہو؟“

”اچھا یہ۔۔۔ اگر کوئی الدین کا چراغ پوچھ رہا ہے کہ گھر کیسا ہو تو سعودی شہزادے طلال کے محل جیسا یا پام شی میں میڈوٹنا کے گھر جیسا۔“

وہ ہنسا۔ ”الدین نہیں ایک عام انسان پوچھ رہا ہے۔۔۔ مجھ جیسا عام۔“

”اچھا! اس کامنہ لنک گیا۔ الدین کا خواب چکنا چور ہوا۔ اب اسے شہزادے طلال جیسا محل کون بنا کر دے گا۔ عالیان زیر لب ہنسا۔

”اگر میں بڑس ٹائیکون بن گیا تو اسے ایک محل بنا دوں گا۔ اور میں نے اپنے پیسے کا کرنا ہی کیا ہے لیکن اگر میں اس کے لیے الدین نہ بن سکا تو۔۔۔؟“

”ایک بڑا سا باغ ہو جس میں کئی سو پھول کھلتے ہوں۔۔۔ اس باغ میں گھر کی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں۔۔۔ پیچھے بھی کئی سو پھولوں والا ایک باغ ہو ایک چھوٹی سی آبشار کے ساتھ اور اس میں بھی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں گھر کی۔۔۔ یہ ماسٹر بڈروم ہو اور لا بیری۔۔۔ گھر کی چھت بہت اونچی ہوئی جائے۔ یعنی اتنی کہ چھ فٹ لمبا فانس لگا ہو تو سر اٹھا کر دیکھنے پر وہ دور۔۔۔ بہت دور لگے۔“

”یہ ایک عام آدمی کا گھر ہی ہے نا امرجہ!“ اسے ٹوکنا پڑا۔

وہ رک کر سوچنے لگی اور خاموش ہو گئی۔ یعنی خفا ہو گئی۔ مطلب ایک سیدھا سا جواب اس سے حاصل کرنا مشکل تھا۔ کیسے وہ اتنی ذہین تھی کہ فوراً ”جواب گھڑ لیتی تھی۔“

”نہیں کوئی ایڈو نہیں ہے گیس کا۔۔۔ کس نے کہا۔۔۔ موبائل چھین لیے جاتے ہیں جھوٹ۔۔۔ یہ مغربی اخبارات نا۔۔۔ یہاں تو تم لوگ انکی اٹھاتے ڈرتے ہوتا کہ پولیس کو نہ بلوالے۔ ہم لوگ وہاں سیدھا سیدھا تھپڑا دیتے ہیں۔۔۔ تھپڑا دو کوئی پولیس نہیں آئی۔“ اور کچھ معاملات میں وہ ایسی تھی جیسے اونٹے بونٹے





ڈاکٹر منورہ کمالیہ | MCPS, FCPS  
 کا کراچی ہسپتال | آغا خان ہسپتال، کراچی

Butterfly  
 BREATHABLES



پاکستان میں پہلی بار سب سے زیادہ آرام دہ  
 برقیلائی Breathables نیپکین  
 جسکی اوپری سطح کاشن کی طرح منلائم اور تہہ میں  
 نہ نظر آنے والے باریک سوراخوں کی مدد سے  
 آکسیجن ہا آسانی گزر کر آپکی جلد تک پہنچ  
 کر رہشیر اور ناگوار مئے سے محفوظ رکھتی ہے۔



یہ بخوبی کسی بھی دوسرے نیپکین میں نہیں



لوگ ہوا کرتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر بولتے ہیں اور ہاں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا یہ بولنا پن کسی کو بہت اچھا لگتا ہے اتنا کہ اپنے چھ سات ہوٹل مینجس کے ساتھ گپیں ہانتے، سڑک پر چہل قدمی کرتے۔۔۔ اپنے بڈ کی چادروں کو یونانی طرز پر سم پر باندھے ایک کندھا عیاں رکھے۔۔۔ یونانی ہی تیز میوزک پر کوریڈور میں ٹھکے لگاتے اور اپنے دیگر بندر لنگور کے کتب کرتے کوئی اسے ہی سوچتے، اسی کے لیے زیر لب بیٹھتا ہے کوئی گھنٹہ راتوں میں خلاف پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے، وہ خود کو تلاش کرتا ہے۔

عالیان... ہاں عالیان... کہاں گیا وہ بے چارہ... ساتھ کے کمروں میں جب کوئی یا جامہ پارٹی 'or Die Do (کرو یا مرو) یا شوڈنٹس کا Opera چل رہا ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی اور کو محسوس کر رہا ہوتا... کارل اسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوششیں کرتا۔

عالیان... ہاں عالیان... کہاں گیا وہ بے چارہ... ساتھ کے کمروں میں جب کوئی یا جامہ پارٹی 'or Die Do (کرو یا مرو) یا شوڈنٹس کا Opera چل رہا ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی اور کو محسوس کر رہا ہوتا... کارل اسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوششیں کرتا۔



پیر کو وہ یونیورسٹی آئی تو جو پہلا شخص اس کے پاس آیا، وہ کارل تھا۔ چڑے کی جیکٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے، بنا ٹوپی اور مفلر کے وہ بہت غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم یونیورسٹی سے خود جاؤ گی یا میں تمہیں نکلواؤں؟“ یہ بات کہتے وہ انتہا کا سنجیدہ تھا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھی ہی تھی کہ اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ میں اس نے پین کو اڑس کر اسے بری طرح سے پیچھے کھینچا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“

وہ ابھی بھی خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔

”میں تمہاری شکایت کر دوں گی... دو دن میں یونیورسٹی سے باہر ہو گے۔“

”تمہیں دوسکند بھی نہیں لگیں گے دنیا سے باہر ہونے میں... اگر عالیان واپس نہ آیا تو...“

امرہ نے چونک کر کارل کو غور سے دیکھا۔ ”کیا مطلب...؟“

”میں نے کہا مگر عالیان واپس نہ آیا تو...“ سختی سے وہ اسے دھمکا رہا تھا۔

”عالیان کہاں ہے؟“

لوگ ہوا کرتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر بولتے ہیں اور ہاں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا یہ بولنا پن کسی کو بہت اچھا لگتا ہے اتنا کہ اپنے چھ سات ہوٹل مینجس کے ساتھ گپیں ہانتے، سڑک پر چہل قدمی کرتے۔۔۔ اپنے بڈ کی چادروں کو یونانی طرز پر سم پر باندھے ایک کندھا عیاں رکھے۔۔۔ یونانی ہی تیز میوزک پر کوریڈور میں ٹھکے لگاتے اور اپنے دیگر بندر لنگور کے کتب کرتے کوئی اسے ہی سوچتے، اسی کے لیے زیر لب بیٹھتا ہے کوئی گھنٹہ راتوں میں خلاف پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے، وہ خود کو تلاش کرتا ہے۔

عالیان... ہاں عالیان... کہاں گیا وہ بے چارہ... ساتھ کے کمروں میں جب کوئی یا جامہ پارٹی 'or Die Do (کرو یا مرو) یا شوڈنٹس کا Opera چل رہا ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی اور کو محسوس کر رہا ہوتا... کارل اسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوششیں کرتا۔

”تم میاؤں میاؤں ملی بنتے جا رہے ہو... چلو شیر بنو اور ذرا دھاڑ کر دکھاؤ۔“ وہی فارغ اوقات میں کی جانے والی ان کی کبھی ایکشن، کبھی مسز، کبھی ہار اور کبھی مزاحیہ موویز جیسی حریتیں اور شرارتیں لیکن اب اس سب میں اس کا خاص دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کر تو لیتا تھا لیکن بس خود کو برانا والا عالیان ثابت کرنے کے لیے۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کوئی اس کے دل کا بھید نہ پا جائے۔

بھید جو بھری آنکھوں نے کالی آنکھوں سے کشید کیا تھا۔

بھید جو محبت میں ملفوف دل پر کھلتا ہے۔۔۔ صرف محبت میں ملفوف دل پر۔۔۔

اسے یہ چونکا سادینے والی لڑکی اس قدر اچھی لگی کہ اس کی کوئی بات اسے بری نہیں لگتی۔ اس کی کسی بات پر اسے غصہ نہیں آتا۔ اس کی کسی بات پر وہ بھڑکتا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے وہ پری بھی جو دودھوں والے بندر سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔۔۔ سارا ماچھنڈی اس



بس اتنی سی دیر لگتی ہے اندھا ہونے میں۔ اتنی سی دیر میں روشنیاں نکل ہو جاتی ہیں۔

”وہ سب کیا؟“ وہ بمشکل پوچھ سکی۔

”جو جو تم نے دیر اسے کہا تھا وہ سب۔۔۔ امرجہ۔۔۔ دی مینڈکی۔۔۔ اب عالیان کو ڈھونڈ کر تم لاؤ گی۔۔۔ ورنہ اپنا سامان باندھ کر کھنسا۔ ٹرسٹ می ! ملکہ الزبتھ بھی تمہیں برطانیہ میں نہیں رکھ سکے گی۔“

پٹن سے اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ کو پوری شدت سے کھینچ کر وہ چلا گیا۔۔۔ وہ چلا گیا اور کیا کہہ گیا۔ امرجہ نے نہیں سنا تھا۔۔۔ وہ اسے نہیں سن رہی تھی۔۔۔ وہ اسے کیسے سن سکتی تھی۔۔۔ وہ تو۔۔۔

پھر سے ایک تیز سہیلی کی آواز۔۔۔ چھک چھک جیسے زنگ آلود وزنی آجین کی ریل سزائے موت کے قیدی کا چھپا کرتی اپنے اندر جلا رہا تھا۔ بھاگی چلی جاتی ہو۔۔۔ کتنی جلدی ہے۔۔۔ جلا دو قیدی کا سرتن سے جدا کرنے کی۔۔۔ وہ اس حالت میں آگئی جس میں کسی خونخوار درندے کے لیے لگائے گئے ہڈی توڑ لوہے کے وزنی شتے میں انسانی پیر آ جاتا ہے۔

اف۔۔۔ موت بھی اور تکلیف بھی۔۔۔ آہ۔

وہ ایسا ابابیل تھی۔۔۔ اس پر ”آہ“ فرض نہ تھی، وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگی۔۔۔ عالیان کو ڈھونڈنا چاہا۔۔۔ وہ نہیں ملا۔۔۔ اس کے چند دوستوں سے پوچھا۔۔۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔۔۔ اس کا فون بند تھا۔

وہ تو کہا کرتا تھا وہ خود کو مار ڈالے گا مگلا اس نہیں چھوڑے گا۔۔۔ مرجائے گا پر۔۔۔ تو کیا اس نے خود کو مار ڈالا تھا۔۔۔؟

تو کیا وہ مرجکا تھا۔۔۔ کیا واقعی۔۔۔ عالیان مارگرٹ مر چکا تھا۔۔۔ چند دن پہلے بچوں کے گالوں پر چٹکی بھرنے والا۔۔۔ اس سے بھی پہلے اس کے لیے کراسنگ پر فلا بازیاں لگانے والا۔۔۔ اور۔۔۔ بھوری آنکھوں والا لارڈ میئر۔۔۔ مر چکا تھا۔۔۔ اتنی جلدی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



”تم بتاؤ۔۔۔ عالیان کہاں ہے؟“ الناس نے پوچھا۔ اس انداز میں پوچھا کہ امرجہ ڈر گئی۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔۔۔ عالیان کے مقابلے میں تم ہو کیا۔۔۔ تم جیسی لڑکی جو ایک ڈگری لینا بہاڑ سر کرنے کے برابر سمجھتی ہے وہ آخر خود کو سمجھتی کیا ہے۔۔۔ کس دنیا سے آئی ہو تم، جانتی ہو نا۔۔۔ یا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ امرجہ بری طرح سے ڈر گئی۔

”کہنا نہیں بتانا۔۔۔ عالیان کا کوئی خاندان نہیں ہے۔ وہ ایک تاجا بز پڑے اور وہ تمہاری طرح اچھا مسلمان نہیں ہے۔۔۔ ایک تم ہی ہوا اچھی والی مسلم نن۔۔۔ اس کی ماں ایک بری عورت تھی اور باپ۔۔۔ ہونہ۔۔۔“ امرجہ یکدم سانس لینا بھول گئی۔۔۔ یونیورسٹی کی محراب موم بتی کی لوکی طرح تھر تھرانے لگی۔

”یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟“ امرجہ کی جان مٹھی میں آگئی۔

”بتایا۔۔۔ ہونہ۔۔۔ میں نے خود سنا ہے۔۔۔ ان فیکٹ آدھی یونیورسٹی نے سنا ہے۔۔۔ وہ سب جو تمہاری سوچ ہے۔۔۔ جو حقیقت میں تم ہو۔۔۔ ویسے تم لوگ بہت بڑھے لکھے ہتے ہو۔۔۔ ماچسٹر جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے آتے ہو۔۔۔ خود کو تعلیم یافتہ کہلاتے ہو اور اندر سے وہی گھسی پٹی گھنیا سوچ رکھتے ہو جاہل لوگ۔۔۔ ہونہ۔۔۔“

”مجھے بتاؤ کارل! تم کس سننے کی بات کر رہے ہو۔۔۔“ تھر تھراتی محراب گرنے کو تھی۔۔۔ وہ گر جائے گی۔۔۔ نظر آ رہا تھا وہ گر جائے گی۔

”جو تم نے عالیان کے لیے دیر اسے کہا، وہ سب ریکارڈنگ ہے میرے پاس۔۔۔ سنو گی۔“

محراب دھڑام سے ٹٹن بوس ہوئی۔۔۔ افسوس۔۔۔ اس محراب کے عین نیچے ہی امرجہ کھڑی تھی۔۔۔ امرجہ کو رُشور جھجھنے آلیا۔۔۔ اس کی نظر دھندلا گئی۔۔۔ اسے کارل ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ اسے تو دنیا میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔







صدف رکان گیلانی

## دو ایک دوسرے کی مثالیں

ناولٹ

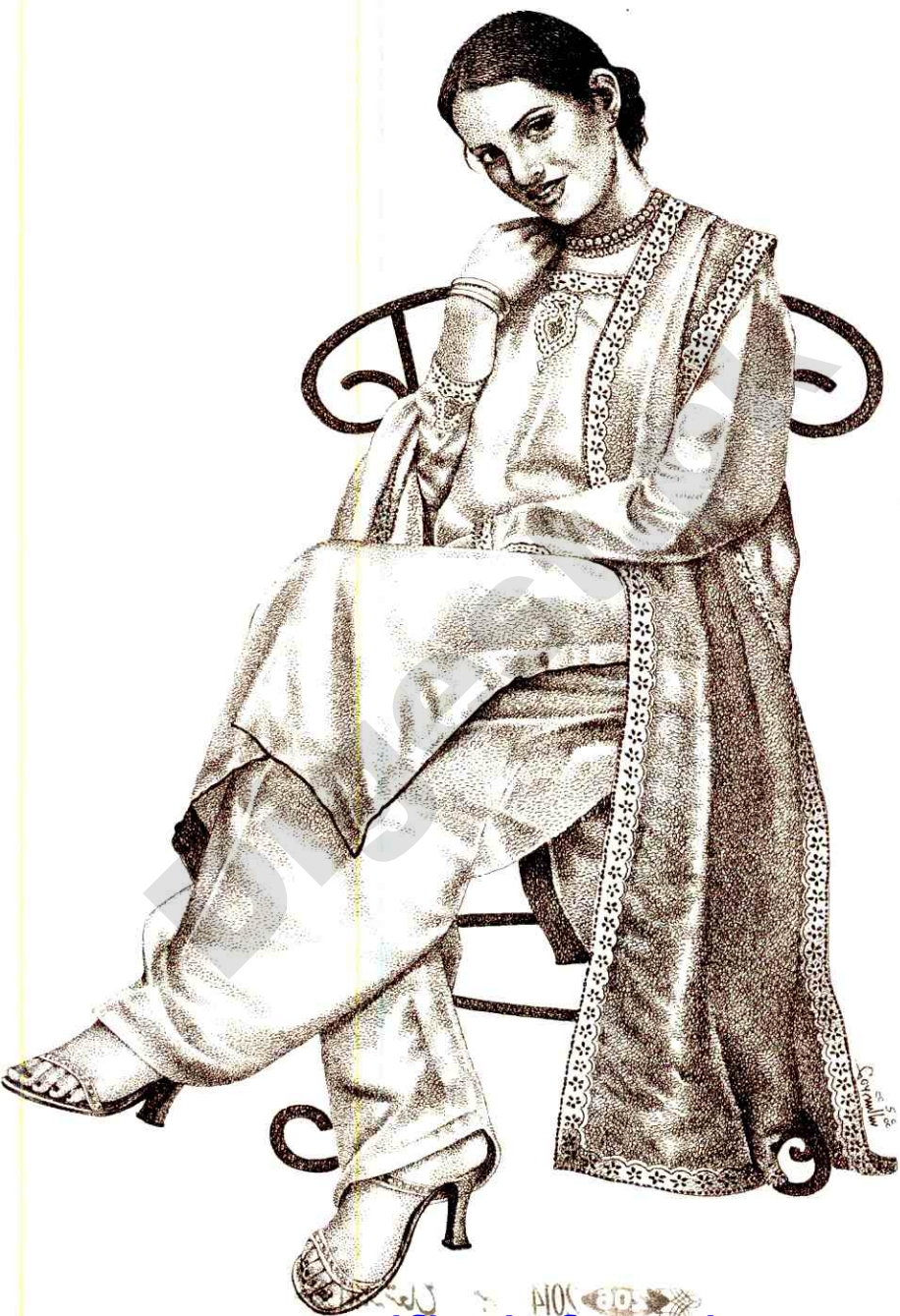
بھرا ہوتا ہے۔ آج کیا ہوا اور وہ خاص اسی وقت یہاں  
کیوں آیا تھا۔ عارب سے بھی ایسا کوئی ضروری کام نہ  
تھا۔

وہ سر جھٹکا کر مسکرا دیا۔ اب دل اتنا بھی نادان نہ تھا  
کہ یہ بات نہ سمجھتا۔

کیا کوئی چہرہ یوں بھی حواسوں پر چھایا جاتا ہے کہ پھر ہر  
منظر پر اسی کی چھاپ محسوس ہونے لگے۔ ہر نظارہ اسی  
کارنگ چرایا ہوا لگے صبح کی سپیدی اور شام کی سرخی  
میں اسی کے پیراہن کی جھلک ہو۔ پہلے اسے یہ سب  
تشبیہات افسانوی لگتی تھیں مگر جب سے صحن دل پر

نظامانی ہاؤس کا گیٹ ویسا ہی سنہرا اور چمکتا دکھاتا تھا۔  
دونوں اطراف اونچے لمبے سرو کے درخت ہوا سے  
دائیں بائیں ہلکورے لیتے اپنی ہی دھن میں تھے۔ ہار  
سنگھار کی بیل اک جانب کو خوب پھیلی ہوئی تھی اور  
اس کے گلانی اور سفید پھول دور تک یوں بکھرے تھے  
جیسے آنے والوں کا استقبال کر رہے ہوں۔ ڈھلتی شام  
جس کے فسوں پر کئی پرندوں کی مسلسل چکار ضرب لگا  
رہی تھی۔ جبکہ گیٹ پار گری چپ چھائی ہوئی تھی اس  
وقت۔ وہ حیران ہوا۔

نظامانی ہاؤس کا لان تو اس وقت خوب آوازوں سے





پر پار کیا اور پھر سے اپنی فٹ بال کی جانب دوڑ گئی اس کی زور دار کک سے گیند اڑتی ہوئی گیٹ کے پار اس کے سر سے کوئی دو انچ کے فاصلے پر سڑک پر جا گری۔ وہ بے اختیار رہی بیچے ہوا اگر جو یہ ذرا ساسی پیچے ہوئی تو اف۔۔۔ اسے جھڑھری سی لگئی۔

اگلے بل وہ اچھلتی پھندتی دوڑ جاتی بال کے پیچھے دوڑ پڑا۔

”تھینک یو سوچ ادا شاہو!“ وہ فٹ بال لے کر واپس آیا تو پرہ گیٹ سے باہر کھڑی تھی۔ جھٹ اپنی گیند چڑی۔ دو سہری پونیوں کے درمیان اس کا گلابی سا چروہ دک رہا تھا۔

”آپ کب آئے۔“

”ابھی۔۔۔ جب آپ نے بال کو کک لگائی۔“ اس نے پرہ کے سر پر پار بھری چپت رسید کی۔ یہ بھی سی گڑیا عارب کے لایا ساسی کی سب سے چھوٹی بیٹی

تھی، جس سے کچھ ہی عرصہ میں اس کی بھی خوب دوستی ہو چکی تھی۔

”شکر ہے آپ نے پکڑ لی ورنہ میری اتنی پیاری بال کا کسی گاڑی کے پیچے چومری نکل جاتا۔ آپ کو پتا ہے بابا جان یہ میرے لیے دینی سے لائے ہیں۔“

”ارے واہ آپ کی تو موج ہو گئی۔ اچھا یہ بتاؤ عارب کہاں ہے اور باقی سب“ آج تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔“ اس کی بے قرار نظروں نے ایک بار پھر لان کا جائزہ لیا تھا۔ جہاں ہر سو خزاں چھائی لگ رہی تھی۔

”سب اندر ہیں ادا عارب بھی۔ آپ آئیں ناں میں آپ کو بابا سے ملواؤں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔

”پرہ۔“ معا“ اس کے بابا کی آواز آئی۔ وہ اسے بلا رہے تھے۔

”آئی بابا۔ میں ادا عارب کو بتاتی ہوں۔“ پرہ نے پہلے آواز کا جواب دیا پھر اس سے کہتی اندر دوڑ گئی۔ اور اندر بابا نے اس سے فٹ بال پکڑ لی تھی۔ اب وہ اسے کک لگا رہے تھے۔ اک پیار بھرا نظارہ اک باپ کی

نئے موسم اترے تھے۔ تب سے ہر استعارہ حقیقت لگنے لگا تھا۔ وہ اسی سرور سی کیفیت میں گھر آیا نیک سے اتر آیا اور اداوی نظر گیٹ کی چوڑی جالی کے پار ڈالی۔

سرخ روش پر چمکتی دکاتی پراڈو کھڑی تھی۔ اس سے آگے عارب کی نشان۔ دائیں طرف نیٹ کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس کی روشن آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ دل یک لخت بجھ سا گیا۔ اکثر وہ یہیں نظر آتی تھی عارب یا مومل کے ساتھ پریکٹس کرتے ہوئے۔

بہترین بیڈ منشن کھیلتی تھی۔ مجال ہے جو کوئی اس سے جیت جائے اور وہ بھی پار گیا تھا بن کھلے ہی، یہ دلوں کا کھیل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے ناں ہارنے والے کو بھی پتا نہیں جیتنے والا بھی بے خبر۔

وہ مایوس سا پلٹنے ہی لگا تھا کہ اندرونی حصے کا داخلی دروازہ کھلا اور خوب نئی ٹکڑ چمچاتی فٹ بال کو کک۔

لگاتی پرہ باہر آئی۔ فٹ بال کھجور کے نوکیلے پتوں سے فلکا کر واپس سبز گھاس پر جا گری۔ پرہ وہاں میں جانب آم کے گھنے درختوں تلے گئی جہاں کین کی کرسیوں میں سے ایک پر سفید بے داغ لباس میں کوئی بیٹھا تھا، پیروں میں قیمتی مروانہ لیدر کے چپل اخبار چرے کے آگے۔

”اوہ۔“ اس نے اب غور کیا تھا۔ وہ شاید عارب کے بابا تھے یا پھر اس کے تایا ساسی۔ اسے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا ”نظامانی باؤس“ آتے جاتے اور وہ تاحال ان دونوں ہستیتوں سے نہیں مل پایا تھا۔ عارب کے بابا تو گٹھ میں اپنی آسانی زمینوں کی دیکھ کر رکھتے تھے اور تایا ساسی کی کراچی میں دو گلاس فیکٹریاں تھیں۔ وہ زیادہ تر وہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھار حیدر آباد آتے سو وہ اندازہ نہ کر پایا۔ پرہ ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ انمول نے بھی اخبار رکھ کر اس کے گرد بازو پھیلا دیے۔ وہ

اس سے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ ان کے سینے میں سر گھسائے جا رہی تھی۔ شاید کوئی فرمائش کر رہی تھی اور اگلے ہی بل دونوں ہنس رہے تھے۔ انمول نے لازمی پرہ کی پیشانی چوم لی۔ جو بابا“ اس نے بھی ان کے چہرے



بے اختیار وہ پریشان ہوئیں۔ اس وقت کی ہنگامہ خیزی سے اسے کتنی جڑ ہے وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

”تم کیوں چلے آئے۔ دس منٹ شہر جاؤ تمہارا ناشتا کمرے میں ہی لے آتی ہوں۔“

”دس منٹ تک تو لیٹ ہو جاؤں گا جو بھی ہے آپ مجھے میس دے دیں۔“ وہ تو بے پروا اٹھا ڈال رہی تھی۔ شاہ داد نے خود ہی اسٹینڈ سے پلیٹ اٹھائی، سانس ڈالا

”ہاٹ پاٹ سے پر اٹھا کھینا اور کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔ ایسی بھی کیا جلدی؟“ فرحین نے چائے گک میں اینڈلی ساتھ تو کا بھی۔ وہ بنا جواب دیے اپنے کام میں مصروف رہا۔

تب ہی مائی اندر آئیں۔ اسے دیکھ کر حیران ہوئیں اور عادت سے مجبور روئے بنا بھی نہ رہ سکیں۔

”ارے تم آج ہڑی جلدی اٹھ گئے خیر تو ہے۔ اور ذرا شہر جاتے۔ بچوں کو تو ناشتا کر لینے دیتے ان کی دین بس آنے ہی والی ہے۔ آپ! جلدی سے دوپراٹھے اور

ڈال دیں، بچوں کو بچ بکس بھی دینے ہیں۔“ وہ ہدایت دے کر بچن سے نکل گئیں۔ شاہ داد نے بیچ جانے والا آؤہار اٹھا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

”پورا کھاؤ اور یہ چائے بھی پو۔“ فرحین نے دیکھا تو گھرک کر بولیں۔ ٹگٹ بھا بھی کی تو عادت تھی بنا سوچے بولنا۔ اب کیا ہر بات دل پر لے لی جائے وہ خود تو بے حس ہو چکی تھیں، پر اسے کیسے کر تیں جسے بے حد نازوں سے پالا تھا اور وہ حساس بھی بہت تھا۔

”میں کھا چکا۔“ شاہ داد کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر صرف ماں کا خیال کرتے ہوئے کپ اٹھا لیا۔

”ماموں آگئے ہیں تمہارے۔ جاتے ہوئے مل لینا۔“ مطمئن ہوتے ہوئے وہ اگلا پر اٹھا بیٹنے لگیں، ساتھ اسے مطلع کیا۔

”اچھا کب۔“ چائے بے حد گرم تھی۔ ایک چسکی لیتے ہی اس نے جھٹ سے مک رکھ دیا پھر دو سرا خالی

محبت۔ وہ بیٹی کے ساتھ بچہ بن گئے۔ اس کی خوشی بس خوش انتہائی باوقار سے اس کے بابا کھیل رہے تھے۔ بس رہے تھے۔ برہ تائیاں پیٹ رہی تھیں۔ وہ اپنی خوشی میں مگن عارب تنگ جانا فراموش کر گئی۔

اسے بھی بھول گیا۔ وہ پرہ کے بابا کو دیکھ رہا تھا۔ شفقت لٹاتے چاہت پھجھار کرتے وہ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ یکدم اس کا دل ہر بات سے اچاٹ ہو گیا ہمیشہ سے ایسا کوئی بھی منظر اس کی روح پر بھاری بوجھ بن کر گرتا تھا۔ ساری حسرتیں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتیں۔ اک کونے میں دبی پڑی تمام محرومیاں پھر سے جاگ اٹھتیں۔ اذیت سی اذیت۔ اس کی پکلیوں پر مڑچیں سی جھپٹے لگیں۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ بائیک کو زوردار لگ لگائی۔ اگلے پل وہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔



صبح سویرے کی مخصوص گہما گہمی ہر گھر کی طرح

یہاں بھی جاگ اٹھی تھی۔ ٹگٹ مائی کی لگا ریں، بچوں کی پکاریں اسے اپنے کمرے تک سنائی دے رہی تھیں اور اسی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ہر روز وہ اپنے کمرے میں ہی ناشتا کر لیا کرتا یا پھر بچوں کے جانے کے بعد چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں۔

آج پہلا لیکچر ہی سطر اطر کا تھا اور وہ وقت کے بے انتہا پابند تھے۔ شاگردوں کی ذرا سی غلطی پر وہ سب ہی کو جھاڑ کر رکھ دیا کرتے۔ سو وہ جی کڑا کر گئے اٹھ آیا۔ فرحین نہایت احسن طریقے سے ناشتا بنانے میں مگن تھیں۔ برسوں گزر گئے تھے انہیں یہ ذمہ داری اپنے سر لیے مجال ہے جو کوئی اپنی منزل پر دیر سے پہنچنے کی شکایت کر جائے۔ لپک جھپک وہ سب کی فرمائش پوری کئے جاتیں۔ چپ چاپ سر جھکائے ہاتھ چلے جاتے اور گرد کیا ہو رہا ہے وہ توچہ نہ دیتیں اب تھی پوری تندہی سے مصروف عمل تھیں۔ اس کی آمد پر چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کف کے بین بند کرتا تیزی سے آ رہا تھا

یعنی کل شام ایک بار پھر جان کنی کا عالم۔ نگہ تماشائی کھلے دروازے سے اندر آئیں۔

”کیا کہہ رہا تھا یہ۔“ اس کے کمرے سے نکلتے ہی ان کی گفتیش شروع ہوئی۔ ماما اخبار میں گم۔ جواب دینا غیر ضروری سمجھا رہی ماما بھی ایک کالیاں تھیں۔

”چھوٹے کی یونیفارم بہت خراب ہو گئی ہے۔ کل بھی اس کی بیچنے لکھوایا ہے کہ بچے کو نئی یونیفارم دلائیں۔ گڑیا کا بیگ کلاس میں کسی بچے نے بلڈ سے کاٹ دیا وہ روتی گئی ہے بمشکل بھیجا ہے اس وعدے کے ساتھ کہ شام کو ہی نیا دلوا دوں گی۔ سب کی فیس بھی جمع کروانی ہے۔ نوٹس آیا رکھا ہے۔ ٹیسٹ بھی ہونے ہیں پیر فیس الگ اور ہاں۔ چاچی سعیدہ کے بیٹے کی شادی ہے اسی ہفتے۔ وہاں کیا دینا دلانا ہے۔ بچوں کے کپڑے بھی چاہیے ہوں گے۔ میں نے شاپنگ پر جانا ہے مجھے کچھ پیسے۔“

”اوسہ خدا کا واسطہ ہے چپ بھی کرباؤ۔ تم ایک دفعہ منہ کھول لیتی ہو تو بند ہی نہیں کرتیں۔ میرے کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں۔ صبح خرچے سناؤ بس۔ حد ہو گئی۔“ انہوں نے اخبار دیوار پر دے مارا۔ بھناتے ہوئے ہاتھ روم چلے گئے۔

”ہونہہ! دوسروں کے خرچے چپ چاپ سن لیتے ہیں۔ میں کچھ کہوں تو آگ لگ جاتی ہے۔ ان کی کمائی تو بس اوروں کے لیے ہے۔ میرا اور میرے بچوں کا تو مانو کوئی حق ہی نہیں۔ سارے جان بچا کر نکل گئے۔ ہم ہی پھنس گئے تو اب کمانے کو۔“

ان کی بڑبڑائیش جاری تھیں۔ بھائی کے لیے ناشتا لے کر آئی فرحین نے سب سنا۔ شاہ داد کو تو تھڑک کر فوراً اس کے دل سے کسی بھی ایسی بات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر لیتی تھیں۔ مگر اپنے دل کا کیا کرتیں۔ ان کی اذیت کون کم کرتا۔ وہ اُلٹے پیروں واپس ہو لیں۔



سرخ روشیر کھڑی ممانے دیوہ سربرمایا۔ قرآنی

مک پکڑا اور چائے ٹھنڈی کرنے لگا۔ جیسے بچپن میں ماں کر کے دیا کرتی تھیں۔

”رات کو تم سو گئے تھے۔ میں نے تو کہا تھا جاگادیتی ہوں۔ پر اس نے منع کر دیا۔ اب تم مل لو اور اپنی فیس کی یاد دہانی بھی کروا دینا۔ ویسے تو میں نے بھی ہفتہ بھر پہلے کہہ دیا تھا اسے لیکن میرے خیال میں بھول گیا ہو گا۔ دودن رہ گئے ہیں پھر تم خود بھی پریشان ہو گے اور اسے بھی کرو گے پتا ہے ناں اتنی رقم نکالنا ایک دم سے کتنا مشکل ہوتا ہے ایک کاروباری آدمی کے لیے۔“ انگوں کا موزو دیکھ کر بات کرتا پڑتی ہے انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سمجھایا۔

”ہوں۔“ اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ کہا کچھ نہیں۔ کچن سے نکل کر وہ ان کے کمرے کی جانب چلا آیا۔

”آجیو! بھئی۔“ دستک کے جواب میں۔ ماما کی آواز آئی تھی۔ شاہ داد دروازہ کھیل کر اندر داخل ہوا۔ وہ بیڈ پر نیم درازا اخبار دیکھ رہے تھے۔

”کیسے ہو بھئی! پڑھائی کیسی جارہی ہے تمہاری؟“ اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

”بہت اچھی اور وہ ماما جی! امی نے آپ سے کہا تھا میری فیس کے لیے۔“ وہ اچھا بھلا با اعتماد انسان اتنی سی بات کہتے ہوئے ہنسا سا گیا۔ رجب ماما نے ابو اچکا کر اسے دیکھا۔ گویا یاد کر رہے ہوں پھر سر ہلایا۔

”ہاں! ہاں یاد آیا۔“ اُبانے کہا تو تھا۔ کب ہے آخری تاریخ؟“ انہوں نے اخبار آگے کر لیا۔

”پرسوں۔“ اس نے بتاتے ہوئے بغور ان کا انداز دیکھا۔ وہ کیسا سرسری سا پوچھ رہے تھے۔

”اوہو! اتنا کم وقت۔“ اُٹھی تو میرا راجی میں ہی اتنا خرچا ہو گیا۔ اچھا چلو پھر کرتا ہوں کچھ کل شام مجھے پھر یاد کروانا میں ادھر ادھر سے کروں گا بندوبست کیا جتاؤں کاروبار میں آئے دن اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔

ایک تو ہمارے یہ ملک کے حالات۔“ وہ اپنے رونے شروع کر چکے تھے۔ وہ اک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔



آیات کا ورد کر کے گیٹ سے نکلتی براڈ پر پھونک ماری۔  
 - مول پلٹ کر کین کی کرسیوں کی جانب چلی گئی۔  
 نیبل پر اس کی کتابیں اور نوٹ بک رکھی تھیں۔ اسے  
 اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنا تھی۔ عنایہ نے ریکٹ  
 سنبھال لیا۔ مقابل سوا تھی۔ اربع اور کالمہ جو صرف بابا  
 جان کو سی آف کرنے کے لیے مارے باندھے کھڑی  
 تھیں، نٹ سے ٹی وی لاؤنچ کی جانب دوڑ گئیں۔ برہ  
 نے سب کو بے فکری سے اپنی اپنی سابقہ مصروفیت کی  
 طرف پلٹتے دیکھا۔ گویا کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر  
 اسے تو بہت زیادہ پڑا تھا۔

اس کے پیارے بابا جاپکے تھے پھر سے بہت  
 سارے دنوں کے لیے۔ اب جانے وہ کب آئیں  
 گے۔ وہ اسی پل اداسی میں گھرنے لگی۔ سب ہی اس  
 سے پیار کرتے تھے۔ وہ سب کی لاڈلی تھی۔ ماما بھی  
 خیال رکھتی تھیں مگر بابا سے اسے بے پناہ محبت تھی۔  
 وہ جب بھی چند ایک روز کے لیے آتے وہ ایک ایک لمحہ  
 ان کے ساتھ بتاتی۔ وہ بھی اسے سینے سے لگا کر رکھتے،  
 یہ کچھ دن اس کے لیے عید بن جاتے۔ ان کے جانے  
 پر وہ بہروں اداس رہتی۔ اب بھی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی  
 تھیں۔ وہ بڑی ست روی سے چلتی آ رہی تھی۔

”پرہ دھی! ادھر آؤ۔“ جینی نے ہاتھ میں پکڑی تیج  
 گود میں رکھ لی اور اسے آواز دی۔ انہوں نے اس کی  
 آنکھیں پونچھیں، ”تھکا چو، سر تھکتیا پایا اور اپنے ساتھ  
 بیٹھالیا۔“

”بابا کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔  
 روتے نہیں۔ آج سے میری بیٹی میرے ساتھ کھانا  
 کھائے گی اور میرے ساتھ سوئے گی، ٹھیک؟“ اسے  
 بلایا۔

”ٹھیک۔“ پرہ نے پہلے تو جوش سے سر ہلادیا پھر  
 یکدم کچھ یاد آنے پر گردن گھما کر کوریڈور کے مشرقی  
 سرے پر لگے جمو لے کو دیکھا۔ جہاں بیٹھی بڑی  
 چھو پھی ایک ہی سمت گھور گھور کر دیکھ جا رہی تھیں۔  
 گول گول تھرتھرتے ڈیلے، تنے نقوش اکڑے اعضا۔

اس نے بے اختیار ان کی نظروں کا مرکز بننا۔ سانولی و  
 صحت مند سی عام سے نقوش والے چہرے پر بے  
 فکری اور خوشحالی کی گہری چھاپ لیے نیلے سوٹ میں  
 لمبوس ماما تھیں۔ اس نے پھر جھولے کی جانب نگاہ کی  
 ۔ وہاں اندازہ کچھ ایسا تھا جیسے کوئی چالاک بلی اپنے شکار پر  
 جھپٹ بڑنے کو تیار ہو۔ وہ کچھ سہم کر چپٹی کے بازو میں  
 گھس گئی۔ بابا جب بھی آتے گوتھ کا ایک چلر بھی  
 ضرور لگاتے زمینوں کے حساب کتاب اور کئی  
 معاملات ان کی توجہ کے منتظر ہوتے تھے اور وہ ہر جگہ  
 ساتھ جانے کو تیار رہتی تھی مگر گوتھ کے نام پر بدک  
 جاتی کیونکہ وہاں اکثر راتوں کو بڑی چھو پھی کی چیخوں  
 سے پوری حویلی گونج رہی ہوتی۔ اسے ان سے بہت ڈر  
 لگتا تھا۔ وہ اس حالت میں کسی بھی سامنے آنے والے  
 کو نورج لیتیں۔

مہینے میں ایک دوبار جینی انہیں چپک اپ کے لیے  
 شہر لے کر آتیں۔ اس بڑھاپے میں انہیں کس عذاب  
 سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر  
 زمانوں کی تھکن ڈرہ ڈال رہی تھی۔  
 ”جینی دوڑی چھو پھی ایسی کیوں ہیں؟“ وہ سہمی سہمی  
 سی سوال کر گئی تھی۔  
 ”بس بچے کچھ نہ پوچھو۔ کبھی کبھار انسان ہوش

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

کھانا کی گھریلو (انسائیڈ کلب) میٹنگ

کانیا ایڈیشن قیمت - /750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا کی گھریلو

قیمت - /225 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - /800 روپے کا مٹی آڈر ارسال فرمائیں۔



سے نظامانی ہاؤس آتے تو عارب اکثر ایسے ہی بہانے گھڑا کرتا۔ تب تایا سائیں نے اسے سب سے علیحدہ یہاں رہنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ مکمل ذہنی آسودگی کے ساتھ اپنی پڑھائی کر سکے۔ اس نے سوچا ذرا عارب کے کمرے کا جائزہ لے۔ ایک بیڈ روم بالکل صاف ستھرا تھا۔ تایا سائیں کے مخصوص کلوں کی محک پر جگہ پھیلی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کرتی دوسرے دروازے کی جانب چلی آئی۔

”اف“ ایک لمحے کو تو وہ چکر اکر رہ گئی۔ کمرہ کیا وہ تو ٹھیک ٹھیک کبار خانا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر طرف افرا تفری کا عالم، کوئی شے اپنی اصل جگہ پر نہ تھی۔ واقعی یہ عارب کا ہی کمرہ ہو سکتا تھا۔ وہ کمرس کر شروع ہو گئی۔ پہلے تو میاں وہاں ٹنگے سارے کپڑے اکٹھے کر کے نوکری میں ڈالے۔ پھر جگہ جگہ بڑی تمام کتابیں رانڈنگ ٹیبل تک پہنچائیں۔ ساری ترتیب درست کی۔ ٹرائی کے پاس کارپٹ پر بے شمار سی ڈیز بکھری پڑی تھیں، انہیں سمیٹ کر دراز میں ڈالا۔ بیڈ شیٹ بھاڑ کر بچھائی۔ صوفوں کے کٹن ٹھیک کیے اور دو زانو بیڈ کر سینٹنل ٹیبل صاف کرنے لگی تھی کہ اس کی نظر نیچے پڑ گئی۔

”اوہ تو یہ کرتوت ہیں صاحب بہادر کے۔ اس لیے الگ جگہ چلے جیے تھی امیں۔“ وہ جی بھر کر کلمسی اور ہاتھ برہا کر سگریٹ کے ادھ جلے ٹوٹوں اور راکھ سے بھری ایش ٹرے اٹھالی۔

”اب یہ ثبوت بابا جان تک پہنچے تو کیا درگت بنے گی جناب کی۔“ اسے سوچ کر ہی مزا آگیا۔

وہ نظامانی خاندان کا کلوتا چیشم و چراغ تھا۔ صرف بابا ہی کیا تایا سائیں کی بھی اسے بھرپور محبت اور توجہ میسر تھی۔ ہر طرف سے مکمل و آسودہ حال تھا وہ اس کے باوجود یہ حرکتیں۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اس نے مقصم ارادہ کیا۔ سگریٹ کی ناگوار بو اسے پورے کمرے میں محسوس ہونے لگی۔ اٹھ کر پردے ہٹائے کھڑکی کھولی۔ ہر ابھر لالان نگاہوں کے سامنے آگیا۔ ام کی ایک شاخ پر انکی ششل کاک اور یہ کھڑکی۔ یہاں یہی

مندى میں بھی وہ کچھ کر جاتا ہے جو آنے والے کل میں اس کے لیے سخت آزار کا باعث بن جاتے ہیں۔ کرنی کا پھل ہے سارا۔“ ان کے کنبے میں ہزاروں دکھ تھے۔ ”کیسی کرنی۔“ وہ الجھی۔ جیجی کی توجہ اس پر نہیں تھی۔ جھوٹے کی زنگ آلود بیکری کی چرچراہٹ۔ ماعتوں کو چہرے دے رہی تھی۔ تیز اور تیز گول گول گھومتے ڈیلے والے کھنے چہرے پر جیسے کسی نے گندھک مل دیا تھا۔ شدید اضطراب سے مغلوب ہو کر وہ اپنا ہی ہاتھ چبا رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر ملازمہ کو آواز سے ڈالی۔ اب ان بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ اکیلے انہیں قابو کرنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ مہمانی متوجہ ہوئیں اور صورت حال بھانپ کر ان کی آنکھوں میں دھیروں تاسف کے ساتھ ملال بھی اتر آیا۔ پھر یکدم خیال آنے پر انہوں نے سب سے پہلے مالی چاچا کو لالان سے چلتا گیا۔ انہیں علم تھا کہ کبھی کبھی جوش جنوں میں وہ اپنے تن کے کپڑے تک پھاڑ ڈالتی تھیں۔ اس کے بعد لڑکیوں کو ڈپٹا۔

”جاؤ سب یہاں سے۔ اندر کوئی کام نہیں ہے تم لوگوں کو۔ سو! جاؤ اپنی کتابیں کھولو۔ پرہ! تم کیا کر رہی ہو وہاں؟“ آنکھیں پھاڑے یکے تک بن جل پھلی کی مانند تڑپتی چلتی پھو پھی کود بیکھتی پرہ پران کی نظر کئی توجہ کر بولیں۔ وہ اس کی حسایت سے بھی خوب واقف تھیں۔ اس نظارے کے بعد اس نے کئی راتوں ڈرتے رہنا تھا۔



شاندار بچے سجائے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی طرز پر بنی یہ انیکسی تایا سائیں کی خوش ذوقی کی اعلیٰ مثال تھی۔ وہ جب بھی آتے زیادہ وقت میاں گزارتے اور عارب تو رہتا ہی ادھر تھا۔ بقول اس کے اسے اپنی نف پڑھائی کے لیے ذہنی سکون اور ایک آرام دہ گوشے کی ضرورت تھی اور یہ جگہ اس لحاظ سے بالکل موزوں تھی۔

جب وہ دونوں بسن بھائی مزید تعلیم کے لیے گوٹھ

کھڑکی تھی۔ ایک لخت ساری کلفت اڑ چھو ہو گئی۔ کھڑکی کیا کھلی کہ اک اور کوڑا بھی کھل گیا۔ عنایہ کے یا تو قیلبوں پر دلا وزیر مسکان بکھر گئی۔ آنکھوں میں اک یاد کے دھبہ جل اٹھے۔



”دیکھ لوں گا تمہیں۔“ وہ گھاس پر گرا لے لے لے سانس لیتا دھمکا رہا تھا وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتی پونہی بیٹے بیٹے منہ اوپر اٹھایا تو یک لخت ہنسی کو بریک لگ گئے۔ سامنے ہی کھڑکی کے فریم میں ابستادہ وہ خوبو چرے والا جس کی پُرشوق نگاہیں جانے کب سے اس پر مکی تھیں۔ وہ بری طرح گڑبڑائی۔ سنا تھا تو وہ بھی گیا تھا اسی لیے تو اس کے سنبھلنے تک وہ بھی پڑے ہٹ گیا۔ کئی دن وہ نگاہیں اسے ڈسٹر ب کرتی رہیں۔

پھر اک دن عقدہ کھلا۔  
”ادا شاہو! کیسے ہیں۔“ مومل نے اسے دیکھتے ہی گر جو شے سے ہاتھ ہلایا۔ وہ اسے دیکھتا پڑے ہو گیا۔  
”یہ ہے کون بد تمیز؟“ عنایہ کو اس کی نگاہ سے الجھن ہوئی۔

”اے“ اے تمیز سے۔ تم نے کسے بد تمیز کہا۔ ادا شاہو کو بہت بری بات۔ اتنے اچھے آؤینٹ ہیں وہ۔ عارب کے سب دوستوں سے مختلف۔ میں تو شکر کرتی ہوں اس نے بھی کسی ڈھنگ کے انسان سے دوستی کی۔ مومل نے اسے گھر کا۔

آہستہ آہستہ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جانے والی نگاہیں اسے اپنا اسیر کرنے لگیں۔ اب عالم یہ تھا کہ اگر چار دن وہ نظر آتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔  
”کیا کر رہی ہیں آبا؟“ پرہ اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ دلفریب رنگوں سے جگمگا رہا تھا۔

”کچھ نہیں صفائی کر رہی تھی۔“  
”میں بھی آپ کے ساتھ کام کروں۔“ وہ آگے بڑھ آئی۔

باتی کی جھاڑ پونچھ دو نوں نے مل کر کی۔  
دونوں واش روم میں گرد سے اے ہاتھ منہ دھو رہی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھلا عارب اپنے ہی

وہ اک بڑی خوب صورت سی شام تھی۔ ہوا خوب جھومتی اودھم مچاتی ہوئی سارے درخت پودے بھی سرشار سے اس کے سنک جھول رہے تھے۔ بیڈ منشن اس کا جنون اسکول کالج کے علاوہ بین الصوبائی سطح پر بھی وہ کئی مرتبہ جیت چکی تھی۔ جتنا فارغ وقت، پختا وہ سب اپنے شوق کی نذر کر دیتی۔ وہ کھیل کھیل کے تھکتی نہ تھی۔ اس دن مومل کا بھی موڈ نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے عارب کے ساتھ اس کی جھڑپ ہوئی تھی مگر کسی بھی طرح منا کر وہ اسے نیٹ تک لے ہی آئی۔

ابھی پہلی سروس کروائی ہی تھی کہ ہوا کے بھرپور جھونکے کی شرارت سے ششل کاک اڑتی سیدھی اندر سے چائے اور لوازمات سے بھری ٹرے لیے نکلتے عارب کے سر سے ٹکرا کر غراب سے ایک کپ میں جا گری۔ چائے اچھلی تو بسکٹ اور پکوڑے بھی نہا گئے۔ یعنی پورے دو گھنٹے کی مشقت سے تیار ہوئی فرمائش ٹرے کا ستیاناس۔ عارب کا تو مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ آج کتنے ترلوں سے وہ شاہ داد کو قابو کر کے لایا تھا۔ کل ان کی پریزنٹیشن تھی اور اس کی تیاری حسب سابق زیرو کہ وہ ٹھرا سدا کا پڑھائی چور۔ ڈاکٹر انجینئر بننا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ شاہ داد سے دوستی کی وجہ یہ تھی کہ وہ حد درجے بیبا اور پڑھا کو بچہ تھا۔ ہر کام آسان۔ نوٹس تیار۔ بنا منشن بس کاپی کر لیتا۔ وہ بھی مومل سے کروا تا پھر ہر ہا تیا سا میں رپورٹ لیتے تو کمر پر تھیلیاں الگ سے ملتیں۔ مو جیں ہی مو جیں سہلے میں وہ ان کی کوئی فرمائش پوری کر دیا کرتا تھا۔ مومل کی فرمائشیں تو اتنا ساتھ دینے کے بعد جیو لری کپڑے سے کم نہ ہوتی تھیں جبکہ بے چارے شاہ داد کی فرمائشیں بس چائے پکوڑے اور کباب تھے اور آج



دھیان میں کسی سے بات کرتا آ رہا تھا۔  
 ”اس۔“ اندر کی حالت دیکھ کر وہ گڑبڑا ہی گیا۔  
 کہیں غلطی سے تایا سائیں کے کمرے میں تو نہیں  
 آ گیا۔ مگر نہیں یہ اس کا ہی کمرہ تھا۔ ہر چیز جانی پہچانی  
 لیکن نکھری نکھری تھی بھی ماسی کو تو وہ کمرے میں ہنسنے  
 نہیں دیتا تھا۔ یہ آج کس نے جرات و ہمت کا مظاہرہ  
 کر ڈالا تھا۔ وہ حیران تھا۔ اسی دوران وہ دونوں واش روم  
 سے نکلیں۔  
 ”ادھر کیا کر رہی ہو تم لوگ؟“ اس کی حیرت دور  
 ہوئی۔  
 ”میری بد قسمتی کہ ادھر آنکلی۔ معاذ اللہ آپ کا کمرہ  
 تھا کہ گھوڑوں کا اصطبل، کس طرح رہ لیتے ہیں اس  
 اسٹور روم میں۔“  
 ”چپ کرو اور نکلیں یہاں سے۔“ اس کی باتوں نے  
 عارب کو پتہ چلا۔  
 ”جاری ہوں۔“ عنایہ نے لپک کر نیمبل پر رکھی  
 ایٹش ٹرے قابو کی اسے بھلا کیسے چھوڑ جاتی۔  
 ”یہ۔ یہ کیوں لے کر جاری ہو۔ رکھو ادھر۔“  
 عارب بری طرح سٹپٹا۔ خود کو کو سائیہ کیسے بھول گیا وہ۔  
 ”یہ کیا ہے پتا ہے آپ کو اور یہ میں جینی اور بابا کی  
 خدمت میں پیش کروں گی۔ پھر پتا لگے گا آپ کو۔“ وہ  
 اسے دھمکا رہی تھی۔ عارب دانت چکچکیا رہا۔  
 ”عنایہ کی بچی! میں جان لے لوں گا تمہاری۔ واپس  
 کرو مجھے۔“  
 ”ارے واہ اتنی آسانی سے۔“ وہ چمک کر کہتی پیچھے  
 ہٹی۔ ”کیسے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگے ہیں۔  
 بالکل ہی بگڑ گئے ہیں۔ اب بابا اور اماں تک رپورٹ  
 جائے گی ناں۔ انیسویں میں آپ کے سارے لفظ  
 دوستوں کی آوت جاوت بھی بند کروا دی ہوں۔“ وہ  
 بولنے پر آئی توجہ منہ میں آیا بولی چلی گئی۔  
 عارب نے بوکھلا کر ایک نظر دروازے پر ڈالی۔  
 ”بار بار کہہ رہا ہوں آہستہ کو مگر سستی ہی نہیں ہو۔  
 کروادی ناں میری انسلٹ لٹنا اچھا دوست ہے وہ میرا

سب سن لیا ہو گا اس نے کیا سوچتا ہو گا وہ۔“ عارب  
 کا بس نہیں چلا اس کی گردن دیوچ لیتا۔  
 ”ارے ادا شاہو آپ! پرہ اپنی ہی دھن میں بہت  
 تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی تھی۔ سامنے اسے  
 دیکھ کر رک گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر مسکرا بھی  
 نہ سکا۔  
 ”کیسے ہیں آپ۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔ شاہ داد نے  
 بڑی دقتوں سے خود کو کمپوز کیا۔ فقط سر ہلایا۔  
 ”یہ دیکھیں! ادا عارب کے کمرے میں سے کیا نکلا  
 ہے۔ وہ سگریٹ پیتے ہیں۔ یہ زہر ہوتا ہے ناں؟“ وہ  
 رازدارانہ انداز میں بولی۔  
 ”کیا آپ بھی سگریٹ پیتے ہیں؟“ پرہ آنکھوں میں  
 استفسار لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر  
 ہلایا۔  
 ”کیا بات ہے، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ اب  
 تک اک لفظ نہیں بولا تھا۔ اس لیے پرہ کو تشویش  
 ہوئی۔ اب بھی شاہ داد نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔  
 تب ہی وہ اندر سے نکلی۔ شاہ داد نے نظر پھیری۔  
 اب اتنی خفگی کا حق تو رکھتا تھا وہ۔  
 ”آہ! ادا شاہو سگریٹ نہیں پیتے۔ آپ نے  
 خواہ مخواہ اتنی باتیں سنا دیں۔“ وہ جویو کھی چپ چاپ  
 کھسنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی اس کی بات پر بے اختیار  
 رک کر صفائی دے گئی۔  
 ”مم میں نے انہیں تو کچھ نہیں کہا۔“  
 ”لیکن ادا ناراض ہو گئے ہیں۔ کوئی بات ہی نہیں  
 کر رہے۔“ پرہ بے شک بچی تھی مگر کم عقل ہرگز  
 نہیں تھی۔  
 ”کس۔۔۔ سوری۔“ جب وہ رک ہی گئی تھی تو پھر  
 معذرت کر لینے میں بھی کوئی عار نہیں تھا۔ کم از کم دل  
 سے بوجھ تو ہٹ جاتا۔ شاہ داد کی ناراض نظریں بے  
 ساختہ اس کی جانب انجمی تھیں۔ انگلیاں مروڑتی،  
 پلکیں جھپکتی، پزل سی وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی  
 اور عنایہ کا یہ مختلف سا روپ اس کا دل بھی بدل گیا تھا  
 ۔ ساری کلفت چھٹ گئی۔ اس کے اک سوری نے

روح پر بڑی ساری گرواڑی۔ سارے منظر کھڑے گئے۔  
 ”آ۔۔۔ آپ ادا عارب کو سمجھاتے کیوں نہیں  
 ۔ آپ خود تو اتنے اچھے ہیں ان پر آپ کی صحبت کا اثر  
 کیوں نہیں آیا۔ پلیز انہیں سمجھایا کریں۔“ مزید اس  
 کے الفاظ اندر تک ٹھنڈ ڈال گئے۔ وہ اس کی تعریف کر  
 رہی تھی۔

”چلو برہ۔“ وہ آگے بڑھی۔ اس نے جھپٹ کر  
 البش ٹرے سمجھ لی۔ ”میں عارب کو سمجھاؤں گا۔  
 ڈونٹ وری۔“ اب ایسا بھی کیا خوشی سے ہونٹ سی  
 لیتا۔ اسے کئی دینے کو وہ آخر کار بول اٹھا۔  
 ”تھینک یو۔“ وہ مطمئن سی برہ بولے جا چکی تھی  
 اور بے اختیار اس کا دل چلایا ”ایا ہو“ کا نعرہ مارنے کو۔ مگر  
 عارب کتاب لے آ رہا تھا سر نہ جھکیے۔ یقیناً ”وہ شرمندہ  
 ہو رہا تھا۔ مگر وہ بہت خوش تھا۔ عارب کو ساتھ بٹھالیا۔  
 البش ٹرے اس کی گود میں پختی اور آئندہ نہ بیٹے کا وعدہ  
 لے کر ہی اٹھا تھا۔



نوٹ بک سمجھاتا وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا آ رہا  
 تھا۔ دفعنا ”نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ رایداری کے اختتام پر  
 گول ستون کے ساتھ ٹیک لگائے تنگ پا جامے، اونچی  
 سی شرٹ دوپٹے کے تانم پر گلے میں ڈوری سی لٹکائے وہ  
 یقیناً ”راحیلہ سومرو تھی۔ لڑکی کی اس جانب پشت  
 ہونے کی وجہ سے وہ اس کی ڈریسنگ سے اندازہ ہی کر پایا  
 جبکہ اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے بڑے موڈیانہ  
 انداز میں کھڑے لڑکے پر اسے گمان ہی نہیں یقین  
 تھا۔ عارب نظامانی۔۔۔ ہر دوسرے روز ایک آدھ کلاس  
 بنک کر کے ان چکروں میں پڑا رہتا ہے۔ پھر اسے ڈبل  
 اسائنمنٹ بنانا پڑی اپنی بھی اور اس لفتکے کی بھی۔  
 ”نہیں سدھرے گل۔“ دانت کچکا تا سر جھٹک کر وہ  
 پارکنگ میں چلا آیا ابھی وہ گاڑی گیٹ کی جانب موڑ رہا  
 تھا کہ عارب کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

”بڑی جلدی میں ہو۔ کیس خاص پہنچنا ہے کیا؟“  
 ”میں نے تو واقعی پہنچنا ہے لیکن مینٹنگ تو تمہاری

بھی بہت خاص لگ رہی تھی۔ میں تو سمجھا اب بچ بھی  
 ہو گا۔“ وہ اس کی حرکتوں پر جلا بھنا کھس کر بولا۔  
 عارب نے بلند تقہر لگایا۔  
 ”جلنے والے کام نہ کلا۔“

”جیتا ہے میرا جوتا۔“ شاہ داد نے پاؤں پٹخا۔ چابی  
 گھما کر کلک لگائی۔ گمریہ کیا۔ بایک نے چوں بھی نہ  
 کی۔ وہ پریشان ہو کر نیچے اتر آیا۔  
 ”کیا ہوا تیری لاڈو پھر دعا دے گی تجھے؟“ او میں تجھے  
 ڈراپ کر دوں۔“

”شکریہ جا کر انہی کو ڈراپ کرو بخیر کے ساتھ  
 وقت برادر کر رہے تھے۔“ وہ بہت غصے میں تھا۔  
 ”یار! میں نے کون سا ڈگری لے کر نوکری ڈھونڈنی  
 ہے۔ اپنی تو موجیں ہی موجیں ہیں۔ بابا سائیں اور تایا  
 سائیں کا تمام کاروبار میرا ہی تو ہے۔“ وہ ہر طرف سے  
 بے فکر تھا۔  
 ”بابا سائیں کے کاروبار کی سمجھ تو آتی ہے مگر یہ تایا  
 سائیں کا کاروبار کیوں۔“ شاہ داد کو اچنبھا ہوا۔  
 ”ارے یار! سمجھا کرو ناں۔ تایا سائیں کی پانچ  
 بیٹیاں ہیں بیٹا تو کوئی ہے نہیں، پھر میں ان کا بڑا داماد  
 بنوں گا تو قانونی اور شرعی طور پر حق دار اور وارث میں  
 ہی ہوا ناں۔“ اسے اپنے مطلب کی ساری باتیں آتی  
 تھیں۔

”اچھا چل چھوڑ آجا۔ میں تجھے ڈراپ کر دیتا  
 ہوں۔“  
 ”مہربانی، میں ٹیکسی کر لیتا ہوں۔ زبیدہ کالج تک جانا  
 ہے مجھے۔“ اس نے بایک کو لاک کر کے چابی نکالی۔  
 ”زبیدہ کالج اور تم اللہ رے سیہ کب سے ہونے  
 لگا۔“ عارب نے چھیڑا۔  
 ”کیواس نہ کر۔ دوں گا ایک الٹے ہاتھ کا۔ بیٹا آتی کو  
 پک کرنا ہے وہاں سے۔“  
 ”اوہ سو سوٹ! ایسا آتی۔۔۔ وہ کب آئیں کراچی سے  
 سچ میں تو حیران ہوتا ہوں تم نے ان سے کوئی ایک بات  
 بھی نہیں لی۔ کم از کم تھوڑا سا مسکرا ہی سیکھ لیتے۔“  
 ”زیادہ باتیں نہ کر۔ چلنا ہے تو ٹھیک، نہیں تو میں



چلا۔

دکھ رہی ہوں۔ کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے؟“ وہ بڑے اطمینان سے بیڈ کی پالتی پر بک گئیں۔ یعنی پوری تفصیل جانے بغیر چھوڑیں گی نہیں۔ وہ خوب واقف تھا ان کے انداز سے۔

”ملا تو نہیں دعا کریں مل جائے۔“ اس نے بھی ریو الونگ چیئر ان کی طرف گھمائی۔

وہ ہمیشہ سے اپنے دل کی ہر بات ان ہی سے شیئر کرتا آیا تھا بچپن سے ہی وہ ان کے قریب رہا تھا۔ ماں کی گود پکی درس گاہ ہوتی ہے۔ اس کی پہلی درس گاہ خالہ کی گود بنی۔ ماں سے اسے بہت بار تھا گھماں کے گپ چپ انداز وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتیں۔ انہیں اکثر اپنا ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس کا کیا خیال رکھتیں۔ اس کی ماں بہت خوب صورت تھیں۔ مگر سادہ کپڑے، پکھڑے الجھے بال، بے رونق چہرہ۔ اسے مینا اتنی زیادہ پیاری لگتیں۔ نت نئے ڈیزائن لیے ان کے لباس، ہر چھ ماہ نیا ہیرا سا نکل، چمکتا دکھتا چہرہ ہر وقت ہنسی مسکراتی۔ وہ بچہ تھا ماں اور آتی میں موازنہ کرتا۔

جب وہ آٹھویں میں تھا تو ان کی شادی ہو گئی۔ وہ خوب رویا۔ مگر وہ چلی گئیں۔ میجر اللہ یار بلوچ کے ہمراہ۔

اور ان پر یہ بھید ایک ہفتے ہی میں کھل گیا تھا کہ میجر صاحب پہلے بھی خیر سے شادی شدہ اور تین بچوں کے والد محترم ہیں۔

نانا اور نانی تک یہ خبر کسی کے توسط سے چھ ماہ بعد پہنچی۔ نانا نے تولی ہی پکڑ لیا۔ نانی سر پر ہاتھ مار مار کر رو رہی تھیں۔

وہ بے چاری چپ چاپ سہ گئیں کہ فرحین کا دکھ ہی کیا کم ہے کہ میں بھی بھاری سل بن جاؤں۔

میجر صاحب جیسے بھی تھے ان کے حق میں اتنے ہی تھے۔ قدرت نے اولاد کی نعمت سے نوازا دیا تو وہ ہر دکھ بھول گئیں۔ ان کا لاڈلایا راہمدان اس سے ان کی ہر خوشی وابستہ تھی۔ سوز زندگی اب بہت سہل گزر رہی تھی اور یہی زندگی کسی کے لیے کس طرح تنگ تھی اس کا بھی انہیں خوب احساس تھا۔ ماں باپ کے بعد

”ہاں ہاں چل اسی بہانے آتی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اتفاق سے میں بھی کالج تک ہی جا رہا تھا۔ عارب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔

”میں اسے دل نہیں بھرتا کہ اب وہاں بھی جا رہے ہو۔“ شاہ داد نے چوٹ کی۔ وہ ہنس دیا۔



اور کس قدر حیران کن اور خوش کن ہوتے ہیں وہ لمحات جب اچانک ہی دل کی کوئی مراد بر آئے تب سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے حیران ہوا جائے یا خوش۔ اور ایسی کیفیت آپ کے چہرے پر کیسے رنگ اور ہونق پن بکھیر دیتی ہے ضرور علم ہو جائے اگر آئینہ دیکھ لیا جائے تب سوائے ہنسی کے اور کچھ نہ سوجھے وہ بھی ہنس رہا تھا مگر یہ کی آڑ لے کر جو اسے جانے کیا کیا جھپٹے سنانے میں لگن تھی۔ باقی اس سمت سب مینا آتی سے یوں خوش گہو یوں میں مگن تھیں گویا ان سے برائی جان پہچان ہو۔ وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی اور شاید وہ جانتی تھی کہ ہنسنے ہوئے وہ کس قدر دلکش لگتی ہے۔ سفید یونیفارم میں سرمئی اسکارف کے بالے میں مقید اس کا سرخ پڑتا چہرہ نہایت دلاویز لگ رہا تھا۔ مگر بایں افسوس کہ وہ چندیل ہی دیکھ سکا۔ وہ عارب کی بہن تھی اور اتنا احترام لحاظ تو اس میں تھا ہی اور پھر وہ چندیل ہی تمام دن اس کے حواسوں پر چھائے رہے۔

”شاہ داد! ذرا اپنا سیل دینا، ہم ان سے بات کر رہی تھی کہ میرے فون کی بیٹری ختم ہو گئی۔“ مینا آتی بولتی ہوئی آئیں وہ ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے اپنے ہی خیال میں کھویا چونک کر سیدھا ہوا۔

”خیر تو بے لڑکے کدھر ہو تم؟“ انہوں نے جاچتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ہنس پڑا۔

”کیس نہیں۔ آپ کیس کیا کہہ رہی تھیں۔“  
”کیس نہ کہیں تو تھے صاحبزادے! اب بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے۔ تمہارے چہرے پر یہ رنگ میں پہلی بار

”تم تو بہت سمجھ دار ہو گئے ہو۔ واقعی تمہاری ماں کا بہت حق ہے تم پر۔ تمہیں تو علم بھی نہ ہو گا کیسے کیسے دکھ اٹھائے ہیں تمہارے سنہرے مستقبل کی خاطر اس نے چپ چاپ اس گھر کی خادمہ بننا بھی منظور کر لیا۔ اب تمہارے اولین فرائض میں شامل ہے کہ تم پوری توجہ سے اپنا سی ایم اے مکمل کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شاندار کامیابی عطا کرے پھر اچھی جاب کوئی مسئلہ نہیں ان شاء اللہ۔“ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا دیا۔ وہ اپنے ہی کسی دھیان میں تھا مگر صدمہ کھو یا کھویا۔

اول تو اس کے باپ کا تذکرہ کوئی کرتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی کہیں ذکر چھڑتی جاتا تو اس کے لیے بھی اچھے الفاظ استعمال نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے باپ دیکھے تھے اس نے۔ سب ہی بے حد اچھے تھے۔ اپنے بچوں سے پیار کرنے والے مرنے والے کے لاڈ اٹھانے والے۔ تو کیا صرف اس کا باپ کیوں اچھا انسان نہیں نکلا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک یہ سونٹی اس کے سینے میں گڑی تھی اور اکثر بے اندازہ درد دیتی تھی۔ اب بھی یہ تکلیف بہت شدت سے پورے جسم میں پھیلی تھی۔

”آئی! کیا واقعی میرے بابا بہت بُرے تھے؟“

”بہتر ہو گا تم پر سوال اپنی ماں سے کرو۔ سارا سچ تو وہی تمہیں بتا سکے گی۔“ زمرین نے ہمیشہ کی طرح گریز کی راہ اختیار کی۔

”ان سے تو پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں میں۔ ایک لفظ نہیں کہتیں۔ نہ اچھا نہ بُرا۔ میں اب بچہ نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہوں۔ میرا حق ہے کہ میں اپنے باپ کے متعلق جان سکوں۔“ وہ جیسے بھٹ پڑا۔

”تو یہ تمہاری ماں کی اعلیٰ ظرفی ہے بیٹا! اگر وہ ہزاروں زخم کھا کر بھی اس شخص کی اولاد کو اس کی بابت سچ نہ بتا سکے تو پھر وہ یہی چاہتی ہے کہ تمہاری نظروں میں تمہارے باپ کا تراشا ہوا پیکر ویسے ہی چمکتا دکھتا رہے جیسا تم نے اسے پالش کیا ہے۔ مت پوچھا کرو۔ کیوں آزماتے ہو اس بے چاری کا ضبط۔ خود کو بھی فضول سوچوں میں مت الجھاؤ اپنی اسٹڈیز پر پوری توجہ

فرمیں اور شاہ داد کے بے ضرر سے وجود بھائی کس دل سے برداشت کر رہا ہے؟ انہیں اچھی طرح علم تھا، سو خود ہی بن گئے ان کے کئی بوجھ بانٹ رکھے تھے۔

شاہ داد کو وہ اپنا پہلا بیٹا نہیں ہی نہیں مانتی بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے اس کے بن گئے دل کا حال جانتی آئی تھیں۔ اب بھی جان گئیں۔ مسکرا کر کہنے لگیں۔ ہاں ہاں ضرور دعا کروں گی۔ لیکن اس خزانے کا نام تو بتاؤ۔“ اور اک پل کو تو شاہ داد کا منہ ہلکا پھرو جی جان سے نہیں دیا۔

”آپ بھی ماں خوب کمال ہیں آئی۔ آپ کو کیسے خبر ہوئی؟“

”ارے بھئی میں تو اتنی چیزیاں کے پر گن لوں۔ آخر فوجی کی بیوی ہوں۔ کوئی مذاق ہے بھلا۔

چلو اب سیدھی طرح بتاؤ کیا نام ہے۔ کہاں رہتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ؟“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور پھر وہ ان سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ تمام حکایت دل کھتا چلا گیا۔

”ہوں تو یہ ہے۔ معاملہ بہت پیاری لڑکی ہے۔ ویری انوسنٹ اینڈ سپیل۔ اچھی لگتی مجھے۔ تمہاری پسند تو لا جواب ہے۔“

”سچ آئی!“ وہ بے انتہا خوش ہو گیا۔

”ہاں بھئی اس میں کوئی شک نہیں۔ تم تو بہت تیز نکلے۔ ماں کی جوتیاں بچائیں۔ اسے تو بیٹھے بیٹھائے ہو مل جائے گی۔ مہروز اسے بھی خوشخبری سنائی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگیں۔ شاہ داد نے جھٹ کندھوں سے تمام کر دوبارہ بٹھایا۔

”افہ آئی! آپ بھی ماں ہمیشہ بہت فاسٹ رہتی ہیں تھوڑا دم تو لیں۔ آپ کو پتا ہے ابھی میرے بہت سے پلان زیر تکمیل ہیں۔ شادی کا تو ابھی دو دور تک نام و نشان نہیں، پہلے میں امی کے خواب پورے کروں گا پھر اپنے بارے میں سوچوں گا۔“ اس کا پُر عزم چہرہ عجب لودے رہا تھا۔

زمرین نے بے اختیار اس کی روشن پیشانی چوم لی۔



اصول کو مان جائے۔ اس وقت سیل فون کا ہونا اسے بہت بڑی نعمت لگا۔ وہ تیزی سے کوئی نمبر لارہا تھا۔

عرب اس کی طرف گھوما۔  
”رات تایا سائیں کافون آیا تھا۔ تائی اماں کو انمول نے بتایا تھا آج وہ اسلام آباد جائیں گے اور ابھی پتا چلا ہے کہ کچھ دیر پہلے کراچی ٹو اسلام آباد پلین کرکیش ہو گیا ہے۔“

”اوہ ماہی گاؤ!“ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

”کک کیا تایا سائیں اس فلاٹ میں تھے۔“ وہ بولتے ہوئے لڑکھڑایا۔ عرب نفی میں سر ہلارہا تھا۔  
”یہ ابھی صرف خدشہ ہے۔ مول کو فلاٹ نمبر ۱۰ نہیں۔ تائی اماں کو معلوم ہے اور گھر کا نمبر مل نہیں رہا۔“

”تم پھر بھڑائی کرو۔ فلاٹ نمبر پوچھو۔ رجب ملا کے دوست نیو آجیسی میں ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں۔ اللہ کرے تایا سائیں اس فلاٹ میں نہ ہوں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔“ شاہ داد دل سے دعا گو ہوا۔ گو کہ وہ بھی ان سے نہیں مل پاتا تھا۔ مگر عرب کی باتوں میں ان کا اتنا تذکرہ ہوتا تھا کہ وہ بھی انہیں تایا سائیں ہی کہنے لگا تھا۔

”اللہ کرے۔“ عرب اس کے الفاظ کی تائید کرتا ہے تائی سے دوبارہ نمبر لارہا تھا مگر کیا ہوتا ہے کہ بعض دعا میں اکثر کہیں راہ میں رہ جاتی ہیں دور آسمانوں کے درمیان معلق۔۔۔ سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ قدرت اپنا فیصلہ کر چکی ہوتی ہے۔ پھر وہ دعا شاید کسی اور وقت کے لیے اٹھادی جاتی ہے۔ شاید اس وقت کے لیے جب ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی نیکی کام آ گئی۔



عرب کی مخدوش حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ سوہ پورے چار دن سے اس کے ساتھ تھا۔ چوتھے دن وہ اک تابوت میں تایا سائیں کی سریریدہ

دو اور اب چلو اچھے بچوں کی طرح پردھو۔ لولائٹ بھی آ گئی۔ میں سیل چار جنک یہ لگاؤں۔ جانے ہد ان کے کتنے ٹیکٹ آچکے ہوں گے۔ میجر صاحب کو الگ چین نہ ہو گا۔ وہ گھر سے نکل گئیں۔ وہ یونہی سر نیسوارائے بیٹھا رہا۔



ریکٹیکل کے لیے ان کا گروپ اکثر کیفیئیرا کارخ کرتا تھا۔ چونکہ آج موسم بہت زبردست ہو رہا تھا۔ دوسرے ڈھلنے کو تھی۔ وہ سب باہم مشورے سے انسٹیٹیوٹ کی کھلی چھت پر چلے آئے۔ سب اپنی اپنی فائل کھولے پڑھ رہے تھے۔ شاہ داد بھی اک طرف کھڑا پورے دھیان سے پڑھ رہا تھا جبکہ عرب دیوار پر جھکا دھڑا دھڑا دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس نے تیزی سے چلتی مول کو دیکھا۔

”کیا ہوا ہے۔ اس کا یہ انداز۔“ عرب کا دل گھبرا گیا۔ کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ وہ فوراً پلٹا۔  
”پار! یہ میری فائل سنبھال، میں ابھی آیا۔“ اس نے فائل شاہ داد کی طرف اچھالی۔ جو پکڑتے پکڑتے بھی نیچے گر پڑی۔

عرب کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر شاہ داد نے دیوار سے نیچے جھانکا۔ مول لان میں ایک ایک کو پکڑ کر کچھ پوچھ رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی حواس باختہ۔ لگتا تھا گر پڑے گی۔ چند لمحوں میں عرب اس تک پہنچا تھا اور اس کا بازو پکڑ کر کچھ پوچھا۔ وہ روتے ہوئے کچھ بتانے لگی۔

”یا اللہ خیر وہ بھی پوری رفتار سے سیڑھیاں اتر گیا۔“ کیا ہوا ہے سب خیر تو ہے۔“ مول کا ترچہ چہرہ۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے وہ اپنی سسکیاں روک رہی تھی۔

”سب ٹھیک ہو گا۔ پلہ کنٹرول یور سیلف میں ابھی پتا کرتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔“ عرب اسے تسلی دے کر چند قدم دور ہٹ گیا۔ تمام اسٹوڈنٹس پر سیل فون رکھنے پر پابندی تھی مگر وہ عرب ہی کیا جو کسی

”بھی کمال ہو گیا۔ جوانی ہم پر بھی آئی۔ دوستیاں ہم نے بھی پائیں مگر ایسے سودا لی نہ ہوئے۔ تم نے تو وحد ہی کر دی۔“ آیا اس کا چلا گیا اور تم تمنا رہے ہو۔ کتنے دن ہو گئے کچھ اپنی پردھانی کی فکر بھی ہے کہ نہیں۔ کتنا نقصان ہو گیا ہو گا اتنے دنوں میں۔ اسی مہنگی تعلیم تمہیں یونہی نہیں دلا رہا۔ میرے پلے کچھ نہ بھی ہو مگر کہیں سے بھی کر کے تمہاری بھاری فیسیں بھرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ تم جو جی میں آئے کرتے پھر وہی۔ تم سے باز پرس کا پورا حق رکھتا ہوں میں۔ کچھ خبر بھی ہے کتنے دنوں بعد گھر آئے ہو تم۔“ سر شام ملگے چلیے میں بڑھی شیوہ بزمروہ چرے ساتھ ندھال سے وہ گھر میں داخل ہوا تھا کہ رجب مانے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ وہ چپ چاپ سنے گیا۔ انہیں کوئی بھی وضاحت دینا بے کار تھا۔

”تو اور کیا۔ ہم جانے کیسے اپنے بچوں کے منہ سے نوالے چھین چھین کر تم پر پیسہ لگا رہے ہیں کہ چلو تمہارا مستقبل بہتر ہو جائے۔ سال کا آسرا ہی بن جاؤ۔ مگر تمہیں تو کوئی فکر ہی نہیں۔ خواہ مخواہ کی یاریاں لگا رکھی ہیں۔“

نکلت مای مسالانہ چھڑکیں ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ فرحین آوازیں سن کر باہر آئیں۔

”تم کب آئے؟“ ممتا بھی بے تابی سے چہرے کو چھوتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ نہ گلہ نہ غصہ ماں تمہیں ناں۔ اس کا گرد آلود چہرہ تمام کمالی سنا تو رہا تھا۔ وہ اس سے اور کیا پوچھتیں۔

”ابھی۔“ شاہ داد نے نیک لفظی جواب دیا۔

”تم نہالو۔ میں کھانا لے کر آئی ہوں۔“

وہ سہلا کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”سنبھالو آپا اس لڑکے کو مجھے تو اس کی صحبت ٹھیک نہیں لگتی۔ کل کلاں کو تمہارے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ اسے اپنی پردھانی کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ میری کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں اس کے

کئی پھٹی، کئی حصوں میں بٹی لاش، ٹوٹی عینک اک مسخ شدہ بلیف کیس لے کر ان کے آگے گونچے ہوئے۔  
اف! قیامت سی قیامت تھی۔ کرام پیا ہو گیا۔ وسیع و عریض شاندار حویلی میں مل دھرنے کو جگہ نہ تھی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ صرف عورتیں ہی نہیں شاہ داد نے دیکھا اپنے ہر دلہیز سائیں کی اس قدر اذیت ناک موت پر مرد بھی دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ علاقے کا بچہ بچہ حویلی والوں کے دکھ میں برابر کا شریک تھا۔

نماز جنازہ میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے۔ انہیں آخری آرام گاہ تک پہنچانے والوں میں وہ بھی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔

عرب دل سے ممنون تھا۔ ہر لمحہ وہ اس کے ساتھ رہا تھا کاندھے سے کاندھا ملائے مضبوط سہارے جیسا اور وہ خود جتنا تھک چکا تھا۔ اتنے ہی آرام کی ضرورت اسے بھی تھی۔ اسی لیے وہ اسے اوطاق یا حویلی کے مہمان خانے میں بٹھانے کے بجائے سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ عرب کے کپڑے لے کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ دونوں ہی ایک بھرپور فینڈ کے طلبگار تھے۔ نہادھو کر کھانا کھاتے ہی جو بستر پر لیٹے تو کب آنکھ لگی، خبر ہی نہ ہوئی۔

جانے رات کا کون سا پھر تھا جب کہیں شور و غل مچ گیا۔ کچھ آوازیں تھیں کوئی چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ شاہ داد ہڑوا کر اٹھ بیٹھا۔ عرب بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ لپک کر اندر آنے والی عنایہ تھی۔ شدت گریہ سے سوچی آنکھیں، بکھرے بال، بنا دوپٹے کے۔ وہ بے دھیانی میں اسے ہی عرب سمجھی۔ وہ اس کا سوٹ پہنے کھڑا تھا اور اس کے کمرے میں بھی۔ وہ جلدی جلدی بو لے گئی۔ اس نے فوراً ”عرب کو جگا دیا۔ عنایہ منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی۔ کبھی اسے دیکھتی کبھی غائب کو۔

بچی کو باورٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ذرا سی بھی دیر کیے بنا انہیں لیے شہر ہاگے۔



سامنے سے آئے شاہ داد کو دیکھ کر رک گیا۔

”جیجی! کیسی ہیں؟“ وہ بوجھ رہا تھا۔

”پہلے سے بہتر ہیں۔“ اس نے دیکھا۔ شاہ داد کے

عقب میں سیاہ چادر لیے یقیناً ”فرحین تھیں اور وہ جانتا تھا وہ گھر سے بہت کم نکلتی ہیں۔ اب اگر وہ ان کا دکھ بانٹنے آئی تھیں تو بڑی بات تھی۔ اس نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔

فرحین نے دونوں کو مٹکے لگا کر بہار کیا۔

”جیجی! یکہیں تو آپ سے ملنے کون آیا ہے۔“ وہ

یونہی گم صم لپٹی تھیں۔ عارب کے پکارنے پر آنکھیں واکیں۔ تب تک فرحین بھی انہیں دیکھ چکی تھیں وہ خدا۔

گویا ساتوں آسمان گھوم گئے۔ زمین واقعی گول ہے اور کبھی تو اتنی چھوٹی ہو جاتی ہے کہ فقط ایک نقطے میں سا جائے۔ یہاں آتے ہوئے ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ جن کی عبادت کے لیے جاری ہیں وہ ہستی کون ہو گی۔ وہ لوکھڑا کر گرنے کو تھیں۔ اگر شاہ داد بروقت انہیں تھام نہ لیتا۔ ان سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا۔

”فرحین۔“ جیجی کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

بے اختیار انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ عارب نے لپک کر سہارا دیا۔ ان کا ناتواں جسم رعشہ زدہ تھا وہ ایک ٹنگ دیکھے جاری تھیں۔ اس کے پیچھے ہی وہ کھڑا تھا۔ وہی شہر رنگ بال، چوڑی پیشانی، دُبی ہی دل موہ لینے والی آنکھیں، وہی پر غور کھڑی ناک ویسے ہی کٹاؤ والے ہونٹ۔ وہ بے قراری سے پکاریں۔

”کرم داد۔ کرم داد! میرے بچے، میرے شہزادے، ادھر آؤ میرے پاس۔“

”کیا ہو گیا ہے جیجی! ہوش کریں۔ یہ میرا دوست ہے شاہو۔“ عارب کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ مولیٰ اور عنابہ بھی پریشان سی دیکھ رہی تھیں۔

”نہیں، نہیں یہ کرم داد ہے۔ دیکھو اسے پہچانو۔ غور سے دیکھو۔ یہ تو بنانا یا میرا کرم داد ہے۔ اس کی

پاس میں۔ حد ہو گئی اتنی اکڑ ہے اس لڑکے میں۔ آخر ہے ناں ایک بد قماش باپ کا بیٹا۔ خون کا اثر تو آئے گا ہی۔“

وہ جانے کس بات پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ فرحین نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ وہ آدمی دوسروں کی نظر میں چاہے کتنا بھی برا سہی مگر ایسا طعنہ کبھی بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کبھی اسے قصور وار جانا ہی نہیں تھا۔ ان کی بین تو ان کی تقدیر ہی تھی۔ سارے جرم تو نصیبوں کے نکتے تھے پھر دفعہ اس پر کیوں لگتی تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی وہ کبھی کسی کو سمجھا نہیں سکتی تھیں۔ وہ خاموشی سے بچن کی جانب چل دیں۔

”یہ لیں۔ آپ یونہی اپنا خون جلاتے رہتے ہیں۔ ان ماں بیٹے پر تو کوئی اثر ہی نہیں۔ اگلے کو پاگل ہی سمجھتے ہیں اللہ جانے کس مٹی سے بنے ہیں۔“ فرحین نے سب سنا اور چولے کی آبی تیز کر دی۔ ایسی ہی آبیج ان کے دل کو بھی گھیر رہی تھی۔ چپکے سے دو آنسو دوپٹے میں جذب ہو گئے۔



جیجی کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ ہوش میں تو تھیں مگر بے ہوشوں جیسی۔ چند دنوں میں ہی ان کا چہرہ برسوں کا بیمار دھنسنے لگا تھا۔

بے حد لاڈلے اور پیارے بیٹے کی اچانک موت نے انہیں آدھا مار دیا تھا۔ ان کا زخم خوردہ دل اس بوجھ تلے بمشکل سانس لے رہا تھا ان کی حالت کے پیش نظر عارب نے گوٹھ سے مولیٰ اور عنابہ کو بلوایا۔ وہ دونوں بڑی پوتیاں جیجی کی لاڈلی اور ان سے زیادہ قریب تھیں اس وقت انہیں بے حد بھونکی ضرورت تھی۔ اتنے دنوں سے اسپتال میں عارب ہی تھا ان کے آنے سے کچھ بے فکری ہوئی تو اپنی شدید تھکن کا احساس بھی جاگا۔ مسلسل بیداری اور پریشانی سے آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا کہ

وچولن کے توسط سے جائیداد گھرانے سے رشتہ آیا تھا۔ یکم رحیم داد بھی ان کی طرح اپنے خاندان سے آکنائی ہوئی خاتون تھیں۔ جبکہ انہیں خاندان کے کئی لوگ اپنی بیٹی دینے کو تیار تھے۔ وہ ایک بہت سمجھ دار اور دور اندیش خاتون تھیں۔ ان کے اپنے کچھ تحفظات تھے۔ کرم داد پانچ بیٹیوں کے بعد بے تحاشا منتوں مردوں سے پیدا ہونے والا وہ لڑلا بیٹا تھا جس سے انہیں عام ماؤں کی طرح صرف پیار نہیں بلکہ عشق کی حدوں کو چھوٹی محبت تھی۔ یہی وہ محبت تھی جس نے انہیں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے پر مجبور کیا اور وہ من پسند بہو کی تلاش میں جوتیاں چٹکانے لگیں۔

ان کی ڈیما نڈ مل کلاس گھرانے کی ایک سپدھی سادہ لڑکی تھی فرحین کی صورت میں وہ لڑکی انہیں با آسانی مل گئی تھی۔ البتہ اس کی بے تحاشا خوب صورتی اس کا پس پوائنٹ تھی۔ بس پھر انہوں نے کچھ نہ سوچا، پہلے ہی پچھرے میں رشتہ پکا کر آئیں۔ اماں بیٹی کی بلا میں لیتے نہ تھک رہی تھیں۔ تین ماہ کی منتی کے بعد شادی ہوئی تھی اور تین مہینوں میں اس نے کرم داد کو اپنا سوچا تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی اسے پہچان سکتی تھی اور کاش کہ آنکھیں بند ہی رہتیں کیونکہ کھلی آنکھوں سے پھر جو منظر نظر آئے سوہ بے حد اذیت رساں تھے۔ اس کے نصیب اوچی و شاندار حویلی میں لکھے گئے تھے۔

اس کی خوش نصیبی پر کسی کو شک نہ رہا تھا۔ وہ بھی ہزار ہا خوش گمانیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی مگر پہلی ہی رات اس کے سپنوں کے سہرے کا بچ سے محل کو پہلی نہیں لگی جب۔۔۔

اس پر بہت روپ آیا تھا۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے اسے بتایا تھا لیکن وہ صرف اس آنکھ میں اپنا عکس دیکھنے کی خواہاں تھی جس کے لیے اسے پور پور سجایا گیا تھا۔ وہ ارمانوں بھری دلن تھی۔ ڈھیروں آرزوئیں تھیں۔ صحنِ دل میں غل جمانی دھڑکنوں کا اتنا شور تھا کہ

تصور۔۔۔ اس کا بیٹا۔۔۔ ان کے کیے گئے انکشاف نے جہاں ان تینوں کو لنگ کر دیا وہیں شاہ داد کے بہروں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ تو جیسے زلزلے کے جھٹکوں میں تھا۔

”فرحین۔۔۔ فرحین! دیکھو میرا بیٹا چلا گیا۔ اسے اپنے بیٹے کو دیکھنے کی بڑی آس تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کو ترستا چلا گیا۔ وہ کسی سے اپنا دکھ نہیں کہتا تھا مگر میں جانتی ہوں اسے چھوڑے اندر ہی اندر مار دیا تھا۔ ہم نے تمہارا دل دکھایا۔ بڑی سزا کالی ہے، ہم نے۔ میری ذمہ کئی سالوں سے بھگت رہی ہے۔ فرحین! ہمیں معاف کرو، میری بیٹی کو معاف کرو۔ میرے کرم داد کو معاف کرو، ہمیں معاف کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑے زار و قطار رو رہی تھیں۔

”سب نے اپنے اپنے جرم کی سزا پائی۔ مجھے کس جرم کی سزا ملی؟ خسارہ کس کے حصے میں زیادہ آیا۔ فیصلہ کون کرے گا؟“ حلق سے نکلتی چیخوں کو منہ پر ہاتھ رکھے روکتی فرحین تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ شاہ داد میں ملنے کی سکت نہ تھی۔ چیخی ہوش و خرد سے بے گانہ عارب کے بازوؤں میں جھول گئیں۔



وہ اماں بابا کی بڑی نازوں ملی بیٹی تھیں۔ قدرت نے فیاضی سے حسن عطا کیا تھا۔ خاندان بھر میں کئی طلبگار ہو گئے۔

”ہونہ! یہ خاندان والے فقط سارے کے سارے۔ چند ہزار کی نوکریاں کرنے والے۔ میں تو اپنی بیٹی کو بہت اونچے گھرانے میں بیاہوں گی۔“ اماں ہر رشتے سے انکار کر دیتی۔ ساتھ یہ اعلان بھی۔

بابا بے چارے سدا کے سدھ سے سادے شروع سے ہی اماں کی ذہانت اور ان کے فیصلوں پر لپک کتے آئے تھے۔ اب بھی ان کے ہمنوا تھے۔ حالانکہ ان کا خاندان اب ایسا بھی فقشٹان تھا۔

اور آخر کار اماں کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔ ایک





اور کوئی آواز سنائی نہ پڑتی تھی۔ وہ قیمتی ساز و سامان سے بچے کمرے میں تنہا تھی۔

اس کے پر شوق جذبے۔ وہ سراپا انتظار تھی۔ بلکہ بھی نہ بچسکی اور پھر یہ انتظار طویل ہو کر سپیدی تنک پھیل گیا۔ بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی۔ جب دروازے پر کھٹکا ہوا وہ فوراً ”سنجھلی“ کھلے دروازے سے چار ہاتھوں نے ایک لڑکھڑاتے وجود کو اندر دھکیلا تھا اور ٹھا سے دروازہ بند۔

وہ حیران سی منہ اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر لکرایا لڑکھڑایا ڈکڑایا اور آخر کار بید تنک پہنچ کر اس کے پاس ڈھیر ہو گیا۔

وہ دراز قامت انتہائی شفاف رنگت، قیمتی سوٹ میں ملبوس شہزادوں کی سی آن بان والا بے حد خوب صورت مرد اور اس کی یہ حالت۔۔۔ اس کی حیرانی حد درجے کی پریشانی میں ڈھل گئی۔ اس سے چند انچ کے فاصلے پر پڑے مدھوش وجود میں جنبش ہوئی۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے قریب بڑی سرخ گٹھڑی سے غافل نہ تھا۔ یہ رنگوں بھری پوٹلی صرف اس کی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچ چکا تھا اور اس کے منہ سے آتی وہ غلیظ بو۔۔۔ فرحین کا نمناؤں بھرا دل نوحہ کر کسی نے تیزاب کی منہ بند بوتل میں ڈال دیا۔ اتنی جلن ممتی اذیت کہ وہ اک پل میں بے حال ہو گئی۔ نہ میٹھی نظریں نہ اس کے بچے سنورے روپ کی مدح سرائی۔ بس اک جنون بھرا استحقاق۔ پہلی رات اور ایسا سواگت۔۔۔ کیا واقعی وہ خوش نصیب بھی؟



ایک وقت تھا رحیم واد نظامانی کی حکومت تھی۔ وہ اپنی جاگیر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایک خالص وڈیرے والی تمام خصوصیات تھیں ان میں بڑا جاہ و جلال تھا کس کی مجال کہ اس کے آگے رہ بھی مار سکے۔ جیجی جیسی خاتون کی بھی ہمت نہ پڑی تھی کہ چوں بھی کر سکیں۔ پھر کیے بعد دیگرے بیٹیوں کی پیدائش نے انہیں اپنے ہی گھر میں کمزور کر ڈالا تھا۔ سسرال اور

شوہر کے آگے سر جھکا کر رہتیں۔ دل میں حسرت ہی رہتی کہ اپنی مرضی سے سانس لے سکیں۔ حسرتیں ناسور بننے لگیں۔ قدرت نے ترس کھایا کرم وادان کی گود میں آگیا۔ پھر لدا۔۔۔ بولہ وہ سر اٹھانے جوگی ہوئیں۔ مگر جو کچھ سمجھ چکی تھیں وہ بھلائے نہ بھولتا۔

بیٹوں پر انہوں نے تمام توجہ اور محبت پھنسا کر دی۔ کوئی خواہش نہ تمام نہ رہنے دی جاتی۔ جو کہتے لمحے کے ہزارویں حصے میں پورا کیا جاتا۔ ہر نعمت ہر آسائش۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ باب کا رتو بننے لگے۔

کرم داد تو بچپن سے ہی حویلی کے تمام ملازموں پر یوں رعب ڈالتا کہ وہ سب زر خرید غلام ہوں۔ ذرا کسی بات پر موڈ بگڑتا تو اگلے کو اٹھا کر حویلی سے باہر پھینکنے سے بھی دریغ نہ کرتا پانچویں بڑی بہنوں پر بھی وہ حکم چلاتا۔ وہ بس اک جیجی تھیں جن کی وہ عزت کر لیتا۔ ماں کا ہر لفظ حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا آخر کو ان کی مظلومیت کے قصے اپنی پیدائش کے دن سے سن رہا تھا۔

قدرت کی کرنی چند سال پہلے فالج کے شدید حملے نے رحیم واد نظامانی کو معذور و مجبور کر کے ان کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ نجی تو پہلے ہی ظلم سے سہ کر پتھروں ہو چکی تھیں۔ اب دو جوان بازوان کے ساتھ تھے۔ باقی کی کیا پروا کرم داد کو تو یوں بھی باپ سے کوئی خاص الفت نہ تھی۔ اب کسی کا دل چاہتا تو ان کا حال احوال لے لیتا ورنہ انہیں سنبھالنے کے لیے حویلی کے پرانے خادم چل چاٹو تھے ہی۔ اتنی بڑے جاگیردار حویلی کے سب انتظام آپ و آپ کرم داد کی ذمہ داری بن گئے۔ مگر درون خانہ جیجی کی ناتمام خواہشیں مکمل ہونے لگیں۔ سب معاملات ان کی مرضی و منشا سے طے ہوتے۔ کرم داد کے سر پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا۔ ماں تھی سب سنبھالنے کے لیے۔ اسے بے فکری ہی بے فکری تھی اور یہی بے فکری رنگ لانے لگی۔ باپ معذور ماں محبت میں ڈوبی۔ آئے دن اوطاق میں محفلیں بجنے لگیں۔ دوست آتے کھاتے پیتے مونج

اڑاتے۔

آپا سب سے بڑی تھیں اور دوسری بہنوں کی طرح کرم داد کے رعب میں بھی نہ تھیں۔ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں اندھلتی رہتیں۔ ”سجھاگی سے شادی کرلو بڑے فائدے میں رہو گے اچھی لڑکی ہے پھر اتنی بنیاں (زمینیں) ہیں اس کے نام۔ بڑا کچھ لے کر آئے گی حولی بھر جائے گی۔“

اتنی تفصیل سن کر کرم داد کا بھی اک دن دل لگا گیا۔ بوٹے سے قد گندی رنگت، چھولی آنکھوں اور پھٹی ناک کے ساتھ وہ کوئی اتنی ہی بھی نہ لگتی تھیں۔ بیشہ بڑے اچھے طریقے سے ملتی تھی۔ آپا کے ہی بے پناہ اصرار پر وہ اک دن چنبی سے بات کر بیٹھا۔

”چریا ہو گیا ہے کیا؟“ انہوں نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی بوٹ کر بولیں۔

”زیب انسا کا تو داغ چل گیا ہے۔ چری ہو گئی ہے بالکل وہ تیرے نہیں اپنے فائدے کا سوچ رہی ہے۔ تو کس لالچ میں آ رہا ہے۔ اللہ سائیں کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ مرد مجبور ہو جائے تو سمجھو تا مرد برابر ہو جاتا ہے۔ ونے کی شادی گلے کا پھنڈا بن جاتی ہے زیب انسا کے اولاد نہیں ہے۔ اس جھٹی کو ڈور ہے احمد سراج اس پر سوتن نہ لے آئے۔ سجھاگی کو تیرے پلے باندھ کہ وہ اپنا کلا مضبوط رکھنا چاہتی ہے۔ ارے احمد اسے اولاد نہیں دے سکا۔ سجھاگی اسی کی بہن ہے کل کلاں کو وہ بھی اولاد پیدا نہ کر سکی تو پھر ہم تو پھنس گئے تال۔ نہ تو اسے چھوڑ سکے نہ دوسری شادی کر سکے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لوں۔ میں سنبھائی نہیں ابھی۔ تو دیکھتا رہ میں تیرے لیے پڑھی لکھی کیسی خوب صورت کنوار لے کے آتی ہوں۔ سارا زمانہ دیکھے گا۔“ اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا مگر ساتھ ہی اس سے بھی اک وعدہ لیا۔

”دیکھ کرم داد! میں نے اپنی بات پوری کی۔ اب یہ نہ ہو کہ تجھے اب صرف گھر والی ہی نظر آئے۔ جانتا ہے ناں تیری ماں نے کیسی زندگی گزار دی ہے۔ تیرے باپ کا کیسا رویہ تھا میرے ساتھ۔ اپنی بات کا وزن

برہانے کو آسو بھی نکال لے“ اور دیکھ لے میں نے پھر بھی نبھائی ہے کبھی جو کوئی شکوہ کیا ہو۔ اچھی عورتوں کے یہی گن ہوتے ہیں۔ جوتے کھا کر بھی کبھی اف نہ کریں اور جب اوپر والے نے ہی عورت کو مرد کے ماتحت پیدا کیا ہے تو وہ اس کی برابری کیسے کرے میری بات یاد رکھنا اپنی زال کو سر نہ چڑھانا اسے اسی جگہ رکھنا جس کے لائق وہ ہے مرد مرد ہی اچھا لگتا ہے۔“

اسے اپنے پرہانے گئے تمام اسباق اچھی طرح ازبہ تھے۔

فرحین کو نہیں یاد پڑتا کبھی کرم داد نے اس سے ہنس کر بات کی ہو۔ بھی نظر بھر کر دیکھا ہو۔ کاش کبھی وہ اس کی آنکھوں میں جھانک لیتا تو اس کے دل میں چھپے بے تحاشا محبتوں کے خزانے کا راستہ پالیتا۔

اور وہ بے چاری عورت۔ وفادار چاہتوں کی ماری اس کے آگے بچھ بچھ جاتی۔ بھاگ بھاگ کر اس کی خدمت کرتی۔ جہاں وہ پاؤں رکھتا تھیں وہاں بچھ پڑتی۔ چپکے چپکے اپنے ہی مال کو چوروں کی طرح دیکھا کرتی کہ اگر کبھی دن کے اجالے میں کرم داد حولی میں ہوتا تو اسے اس کے قریب بھی نہ چھٹنے دیا جاتا۔

چنبی خود کیا کم تھیں کہ آئے دن ایک آدھ نند بھی آتی رہتی۔ آنے بھانے اسے گھر کے مختلف کاموں میں مصروف رکھتیں اور فرحین بے چاری کی مجال کہ انکار کر جائے۔ یوں اس کا دن بچن کی نذر ہو جاتا۔

رات کو تھکن سے بے حال وہ کرم داد کو بُری لگتی۔ وہ اپنے کاغذی تھا اور جب اپنے حواسوں میں نہ ہوتا تو انتہائی بے رحم ہو جاتا اور فرحین کو اسے جھیلنا محال۔ ایک بار ہمت کر کے اسے گناہ و ثواب بتانے کی غلطی کر ڈالی اور بس طوفان اُٹ گیا۔

لمحوں میں وہ دو ٹکے کی ہو کر رہ گئی اور اسی پر بس نہیں۔ کرم داد نے سزا بردھادی عو طلاق پھر سے آباد ہونے لگی۔

رات کے شرے سنائے میں گھٹکھروں کی کھنک



تھی کہ جب کرم داد کو یہ خبر ملی گی تو کتنا خوش ہو گا۔ ویسا نہ ہو سکا۔ اس کی زندگی کی دوسری بڑی خوشی بھی اس کی توقع کے خلاف ہی ہوئی۔

”بیٹیاں بہت ہمارے خاندان میں حویلی کو وارث چاہیے۔“ اٹھتے بیٹھتے اب جینی کا ایک ہی لہو ہوتا۔ انہوں نے کرم داد کو بھی خوب سبق پڑھا دیا وہ بھی اکثر ماں کی زبان بول دیتا گو کہ اس کے روپے میں وہ پہلی سی سختی نہ ہوتی تھی۔ اپنے بچے کی وجہ سے ہی سہی وہ کچھ تو اس سے نرمی پر تنے پر آمادہ ہوا۔ فرحین کے لیے یہی بہت بڑی خوشی تھی۔

نوماہ اس نے آس و نراس کی سولی پر ہنگے گزارے اور جب ننھا منا پیار سا گول کو تنہا سا بچہ گود میں آیا تو اسے لگا تھا کہ کسی طولیل قید سے رہائی مل گئی ہو۔ سات روز تک حویلی میں جشن کا سماں رہا۔ خوب جی کھول کر صدقہ خیرات کیا گیا۔ کرم داد بے انتہا مسرور تھا۔ بچے کا نام اس نے ہی شاہ داد تجویز کیا تھا۔ بیٹے کی محبت میں کھوکھو اپنے دیرینہ شغفے بھولا ہوا تھا۔ حویلی سے باہر کا راستہ تو جیسے اسے یاد ہی نہ تھا۔



شاہ داد دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ سب کا لاڈلا سب کا راج دلار۔ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک۔ جینی کو بھی اپنے پوتے سے بے پناہ پیار تھا۔ سارا دن وہ انہی کے کمرے میں ہوتا۔ بس صرف دودھ پینے کے لیے اس کے پاس آتا۔ ان کا پوتے سے یہ پیار بھی اسے اذیت دینے کا ایک انداز تھا۔ اسے تو یہی لگتا وہ سارا دن بچے کے لیے ترستی۔ ہاں رات کو وہ اس کے بغیر نہیں سو سکتی تھی۔ نہ ہی کرم داد کو نیند آتی۔ وہ کرم داد جس کا ذرا ذرا سی بات پر مزاج برہم ہو جاتا تھا اب چاہے بیٹا ساری رات شور مچے رکھتا وہ ذرا ماتھے پر ہل نہ لانا۔ بچے کا رونا، مسکراتا ہوا تھپاؤں ہلاتا، قلقاریاں مارتا اک اک ادا پر شمار ہوتا۔ دن میں تو اسے باہر کے کاموں سے فرصت نہ ہوتی۔ رات کو سارا وقت بیٹے کے ساتھ گزرتا۔ ان لحوں میں فرحین کو لگتا صحرا کا سفر کٹ گیا ہے اب ہر

نہیں ہو سکا۔ مرد تو اڑیل گھوڑا ہوتا ہے اسے سدھانا پڑتا ہے پیار سے محبت سے۔ تم کیسی زال ہو، اس کی بری عادتیں ہی نہیں چھڑا سکیں؟“

آپا زنب آئیں تو انہوں نے اس کے زخموں پر خوب نمک پاشی کی۔

جینی بھی بڑے اطمینان سے سارا الزام اس کے سر تھوپ دیتیں۔ اگر وہ کچھ کہتی اپنی صفائی میں تو وہ آگے ایک کی چار لگا کر کرم داد کو بتاتیں۔

اس کی حالت کچھ دنوں سے خراب تھی۔ جینی کو بیٹیوں کے چاؤ چوٹیلوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی اس کی بدلی رنگت کیا خاک پچانتیں۔

اسی دوران چاول کی فصل کی کٹائی مکمل ہو گئی۔ اسے سکھانا، چھٹانا، پھر سنبھالنا بڑا محنت طلب کام ہوتا تھا۔ جسے جینی گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر کیا کرتی تھیں۔ اس بار یہ ذمہ داری اس کے سر ڈالی گئی۔

حویلی کی بڑی ساری چھت پر صبح سویرے کپڑے بچھا کر ان پر یوریاں الٹ دی جاتیں۔ شام ڈھلنے سے پہلے انہیں سینٹنا۔ اچھے بھلے آوی کی کمر تختہ ہو جائے وہ تو پھر دوسرے حال سے تھی۔ اماں نصیبین اس سے صرف نگرانی کرواتیں۔ اسے کرسی بچھا کر دیتیں۔ سرمائی نرم گرم دھوپ۔ اس روز بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ شامت اعمال جینی اور آپا زنب النساء وھر آنکلیں اور یوں دن دھاڑے کمی عورتوں کے سامنے اسے سوئے دیکھ کر انہوں نے وہ لٹے لیے کہ خدا کی پناہ۔ کام چور ہڈ حرام، لا پروا جانے کیا کیا خطبات سے نوازا۔ اماں نصیبین بے چاری وضاحتیں دیتی رہیں اور آخر کار انہیں بتانا ہی پڑا اور وہ اچھل پڑیں۔

”واہ اتنی بڑی اور اہم خبر ہم سے چھپائی تم نے اور دو کئے کی ملازمہ کو بتا دیا۔ ہم اس قابل بھی نہیں دیکھو اس لڑکی کی جرات۔“ وہ سینہ کوئی کرتیں نیچے اتریں۔ کرم داد ابھی حویلی سے ہی تھا۔ جینی اور آپا نے رورو کر تماشا لگایا۔

پھر کرم داد نے اسے خوب ذلیل کیا اور وہ جو سوچتی

”اچھا اب زیادہ ڈراما مت کرو میرے سامنے اور کان کھول کر سن لو۔ اسے ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا مت چھوڑنا، میں ڈاکٹر سے دوا لے کر مراد کے ہاتھ بیج دیتا ہوں۔“ شاہ داد کو اسے پکڑاتے وہ ڈرائنگ ٹیبل کی طرف گیا اور برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔ فرحین نے اب غور کیا وہ نمایاں دھویا نئے غور کپڑے پہنے تیار ہوا کھڑا تھا۔

”کک، کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ وہ پوچھتے بنانہ رہ سکی۔

”اوطاق پر عشر سے کچھ دوست آئے ہیں۔“ وہ پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کرنے لگا۔ کتنی دیر وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ہمت کیجا کی۔

”شاہ داد کی طبیعت خراب ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے آپ نہ جائیں۔“

آجاول گالیک ڈیڑھ گھنٹے میں تم اسے لٹاؤ اور ہاں جا کر دیکھو ذرا اماں نصیبی نے اوطاق پر کھانا بھجوا دیا ہے کہ نہیں اور تم نے کھانا کھایا؟“ اسے خیال آیا تھا۔ فرحین کو اب کسی بات کا ہوش نہ تھا بس ایک ہی فکر، ایک ہی خیال کہ وہ کہیں نہ جائے۔ پہلی بار پیش قدمی کرتے ہوئے تمام حیا بلالے طلاق رکھتی وہ اس کے چوڑے سینے سے جا لگی۔

”سائیں! اللہ کے واسطے! آج میری بات مان لیں۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ ڈر لگ رہا ہے۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے۔“ کرم داد نے اک جھٹکے سے خود سے علیحدہ کیا۔ مگر جب نگاہ کھیلے گلانی چہرے اور جل تھل آنکھوں پر بڑی تودل آپ آپ موم ہو گیا۔

”پگلی۔“ اک نرم سی مسکان اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

”تم تو بہت ڈر پوک ہو۔ میں تو سمجھتا رہا میری بیوی بہت بہادر ہے۔ پر تم نے تو آج میرے خیال کو جھٹلادیا۔ فکر نہ کرو میں دوا بیج دیتا ہوں ایک آدھ گھنٹے میں بخار اتر جائے گا تم کھانا بھی کھا لیتا۔“ کرم داد اسے بازو کے گھیرے میں لیے بیڈ تک لے آیا۔ اسے بٹھا کر بچے کو پیار کیا۔ وہ ابھی اس کے نرم لہجے پر ہی حیران سی

طرف نگلستان ہی نگلستان ہے۔

اس روز کرم داد صبح سویرے کالیا شام ڈھلے حویلی آیا تھا اور آتے ہی بیٹے کو دیکھنے کی فرمائش کی تھی جو حسب معمول چیچی کے پاس تھا۔

فرحین ان کے کمرے میں گئی تو وہ آنا زیب النساء کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔ شاہ داد کو گھنٹہ بھر پہلے انہوں نے ہنگھوڑے میں لٹایا تھا۔ فرحین نے جب اسے اٹھایا تو احساس ہوا کہ اسے تو بخار ہے۔ وہ بے اختیار گھبرا گئی۔

”ارے خیر سے کچھ نہیں ہوا۔ بچے بیمار بھی ہو جاتے ہیں۔ تم تو خوا مخواہ پریشان ہوئے جا رہی ہو۔ لے جاؤ اسے اپنے کمرے میں۔ آج تو بہت ہی تنگ کیا ہے اس نے۔“ انہوں نے ہاتھ لگاتا بھی گوارا نہ کیا۔ زیب انسا بھی گپ چپ سی بغور اسے دیکھتی اس فرحین کو کبھی کبھی ان کی نظروں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ سخت ریشان سی کمرے سے نکل گئی۔ آپا کی حسرت بھری نظریں پیچھے ٹک گئیں۔

فرحین بہت تیزی سے کمرے میں آئی تھی۔ کف کے بٹن بند کرتے کرم داد نے اسے آتے دیکھا تو بے تاب سے بیٹے کو لینے کے لیے بڑھا۔

”سائیں دیکھیں اسے کتنا بخار ہے۔“ فرحین نے بچے کو اس کے ہاتھوں میں دیتے نہایت پریشانی سے بتایا۔ کرم داد نے بیٹے کے ماتھے پر ہونٹ رکھے تو اسے بھی اندازہ ہوا۔

”کیسے ہوا اسے بخار۔ اتنا سا بچہ تم سے سنبھالا نہیں جاتا۔ کتنی دفعہ کہا ہے لعنت بھیج جو سب کاموں پر بس اس کا خیال کرو۔“ وہ اناس پر چڑھ دوڑا۔

”مم، مجھے کیا پتا، صبح سے چیچی کے پاس تھا۔“ وہ رو دینے کو کھٹی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے کیا میری ماں نے اسے کچھ کھلا پلا دیا۔“ وہ مزید سخت ہوا۔

”نہیں سائیں! میرا یہ مطلب نہیں میں تو۔۔۔“

ایک توجہ کو بخار اس پر کرم داد کا غصہ۔ وہ بے اختیار رو پڑی۔



دیکھ رہی تھی کہ کرم داد نے اس کی پیشانی بھی چوم لی۔  
افسوسہ جیسے کسی ٹھنڈے چٹے میں نہائی۔ وہ تو  
اس کا خصوصی التفات ہی خاص خزانے کی طرح دامن  
میں سمیٹا کر لی تھی۔ یہ آج کیا ہوا تھا۔ عمومی طور پر  
ایسی عنایت؟

وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔  
بیکدم وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ اسی لمحے کے  
حصار میں تھی۔ فرط مسرت سے اس نے بچے کو ہی  
بیتنے میں پہنچ لیا۔ جو اتنی شدت پر چیخ کر رو پڑا۔ وہ  
ہنستی چلی گئی۔ وہ کہاں گیا ہے یہ فکر بھی نہ رہی اور بچے  
کو جھٹلاتے جھٹلاتے جانے کب وہ بھی نیند کی وادی میں  
اتر گئی۔

اک انگارہ سا پہلو کو چھو گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ شاہ  
داد کسمسماتا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گلابی چہرہ انتہائی  
سرخ اس نے بے اختیار پیشانی پر ہاتھ رکھا۔  
”یا اللہ“ گویا جلتے تو بے ہاتھ پڑ گیا۔ وہ جھٹکے سے  
اٹھی۔ اماں نصیبین کو جگایا۔

”اماں! دیکھیں کیسے بخار میں تپ رہا ہے۔ سائیں  
نہیں آئے ابھی تک۔ وہ تو کہہ رہے تھے ایک ڈیڑھ  
گھنٹے میں آجائیں گے اور نہ دوا بھجوائی انہوں نے۔“  
ہمارے پریشانی کے روبانسی ہو گئی۔  
”اللہ سائیں سے خیر مانگ۔ وہ سب ٹھیک کرے گا۔  
میں جا کر مراد سے پوچھتی ہوں۔“

وہ باہر کو لپکیں۔ کچھ دیر بعد باپتی کانپتی واپس  
آئیں۔

”مراد کتنا ہے ڈاکٹر رات کو اگلے گھنٹہ گیا ہوا تھا دوا  
نہیں ملی۔ وہ پوچھ رہا ہے اگر خدا خواستہ زیادہ پریشانی کی  
بات ہے تو ڈاکٹر کو ادھر لے آئے۔“

”ہاں ہاں۔ اسے کہیں جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لائے  
۔ اسے اب صرف اپنے بچے کی فکر تھی۔“

آپا زیب انسا انسا سر مینھا کا شکار تھیں اکثر اتوں کو  
اٹھ اٹھ کر شلا کرتیں۔ اب ان کی نیند رو بھی ہوئی  
تھی۔ کمرے میں دل گھبرا ہوا وہ چھت پر جانے کے  
ارادے سے نکلی تھیں کہ رات کے اس پیر خاموش

حویلی میں انہوں نے اک اجنبی کو آئے دیکھا۔ بچے  
مراد تھا جس کے ہاتھ میں تھے چھوٹے سے بیگ کو دیکھ  
کر وہ سمجھ گئیں کہ آنے والا کون ہے۔ پھر انہیں یہ  
بھی یاد آ گیا کہ کل شام فرحین بچے کو لینے آئی تو اسے  
بخار تھا۔

شومی قسمت کہ اسی وقت کرم داد کی جیب بھی  
حویلی کے داخلی گیٹ سے اندر آئی۔ انہوں نے ہارن  
سن لیا اور بس جھٹ پٹ ان کے شاطر ذہن نے ایک  
پلان ترتیب دے ڈالا۔

اماں نصیبین کو انہوں نے پگن میں جاتے دیکھا  
تھا۔ مراد بھی واپس جا چکا تھا اور اندر آنا کرم داد حسب  
سابق، نشے میں جھومتا جھومتا بمشکل خود کو سنبھالے  
چل رہا تھا۔ زیب انسا کی چیخوں نے حویلی کے در و دیوار  
ہلا ڈالے۔

”ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔ ارے یہ دن دیکھنے  
سے پہلے مر کیوں نہ گئی میں۔ آنکھیں کیوں نہ اندھی  
ہو گئیں میری۔ ہائے! ہمارے برکھوں کی اونچی پگ رل  
گئی“ ہائے۔۔۔ حویلی کے ماتھے پر کالک مل دی اس  
ڈائن نے۔ ارے اتنی بے غمٹی۔ ایسی ذلالت۔۔۔ دیکھ  
کرم داد! تیرے پیچھے کیا رنگ رلیاں مناتی ہے تیری  
زال۔“ وہ سر پٹتی اس تک پہنچیں۔

”ہائے“ ہائے سائیں! کچھ تو خدا کا خوف کرو۔“  
اماں نصیبین کے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا پیالہ گر کر  
چمکانا چور ہو گیا۔

”چپ کر بڑھیا اہلی ہوئی ہے اس کے ساتھ تو ہی  
سے ہماری دشمن۔“ وہ چیل کی طرح چھٹیں اور انہیں  
دھکیل کر بچن میں بند کر دیا۔ وہ دروازہ پینے لگیں۔ مراد  
بھی بھاگا آیا تھا۔ فرحین کو اس باختم سی باہر آئی اور  
پچھے ہی وہ ڈاکٹر اور بس۔ جو منظر وہ بھائی کو دکھانا چاہ رہی  
تھیں وہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر جلتی پر تیل  
ڈال رہی تھیں۔ مراد نے گواہی دینا چاہی۔ انہوں نے  
اسے بھی مار مار کر گھگھایا۔ کرم داد پھرے شیر کی طرح  
ڈاکٹر پر جھونامرہ باہوش نوجوان تھا۔ جلد ہی اسے پتھاڑ  
کر حویلی سے نکل گیا۔ آپا زیب انسا کو یقین تھا وہ سویر

ہوتے ہی گاؤں سے بھی نکل جائے گا اور پیچھے تمام غائب سنے کو فرحین بچی بھی جسے کرم داد نے لاتوں اور گھونسلوں پر رکھ لیا۔ وہ لاکھ چینی چلائی مگر وہ حواسوں میں ہوتا تو سنتا۔ جب تک بیچی آکر صورت حال متجھتیں زب انسا کے دل کی مراد پوری ہو چکی تھی۔

”میں نے تمہیں طلاق دی۔“ ہرے بھرے چمن پر چنگاری آگری۔ کرم داد نے تین مرتبہ یہ لفظ دہرایا۔ ”نہیں، نہیں سائیں! اللہ کا واسطہ چپ کر جائیں۔ میری بات سنیں۔“ نیم جان سی فرحین قدموں میں آگری۔ مگر وہ فریاد پر کیسے کان دھرتا۔ شیطان مکمل رقص میں تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سب جل کر خاکستر ہو گیا۔

وہ اتنی سخت جان تھی کہ اس سب کے بعد بھی زندہ تھی۔

تین دن سے اماں بابا اس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی لاڈلی ٹانگوں پٹی جسے انہوں نے بڑے ارمانوں بڑے چاؤ کے ساتھ بنایا تھا، وہ اجڑ کر لگی تھی۔ خالی دامن خالی ہاتھ، کچھ بھی تو نہ بچا تھا، ظالموں نے سب چھین کر صرف انگارے بھری دیے تھے۔ اماں دامن پھیلا پھیلا کر کونے دے رہی تھیں۔ بابا کے ہونٹوں پر بھاری قفل لگ گئے تھے۔ اس غم نے تو انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”میرا بچہ کہاں! میرا بچہ کہاں ہے۔ اماں وہ بھوکا ہے۔ اماں وہ بیمار ہے کہاں ہے وہ؟ مجھے دوا سے مجھے دوا۔ میں اپنا بچہ نہیں دوں گی تم لوگوں کو۔“ وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتی پہلو خالی ملتا تو پھر وہی دلہوز چیتیں ان بے رحموں نے اس سے ننھا سا داد بھی چھین لیا تھا۔

اور جب کرم داد کا نشہ اترا حواس ٹھکانے آئے تو علم ہوا کہ وہ مدھوشی میں کیا کر چکا تھا۔ اماں نصیبین اور آنا زب انسا ہر مقام پر جیت گئی تھیں۔ اسے حویلی سے نکلوا کر بھاگی کو اس کی جگہ لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان کا گھر بچ گیا تھا۔ ان کے مہرے ختم ہو گئے تھے اب آگے تقدیر کے مہرے تھے جو ختم نہیں ہوتے اور بیٹے بھی نہیں۔



ایک بچی جھولی میں ڈال کر وہ خالق حقیقی سے جا ملی۔  
سبھاگی اور چیچی کی تدبیر بھی ناکام رہ گئی۔



وہ آنکھیں موندے آرام کر سی پر نیم دراز تھا سپاس  
ہی ٹیبل پر رکھا فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ زمین  
بچھیں سو رہا ہے مگر ان کی آہٹ پر جب اس نے  
آنکھیں کھولیں تو وہ حیران ہوئیں۔

”فون اٹھا کیوں نہیں رہے۔ کس بے چارے کا  
ضبط آزار ہے ہو۔“ چائے کا کپ انہوں نے ٹیبل پر  
رکھ دیا۔ شاہ داداؤں سمیٹ کر سیدھا ہو بیٹھا۔  
”ممانے کچھ کھایا؟“ سوال کا جواب دیے بغیر الٹا وہ  
پوچھ رہا تھا۔

”ہاں کھانا کھالیا ہے کچھ دیر تک دودھ اور دوادے  
دول گی۔ تم بے فکر رہو۔ اب میں ہوں ناں۔“ انہوں  
نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ان چند دنوں میں۔ پے  
در پے ہونے والے دکھ بھرے اعشافات نے اسے

اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

دفعہ ”پھر اس کا سبیل بول اٹھا۔ کپ لبوں تک لے  
جاتے اس نے بھنوس اچکا کر روشن اسکرین پر نظر ڈالی  
پھر اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے پیچھے ہو گیا۔ زمین  
کے دل میں جانے کیا آئی انہوں نے کل ریسیو کر لی۔

”اواسائیں۔۔۔ اواسائیں ایلیزا ایک بار آجائیں۔  
چیچی کی طبیعت بے حد خراب ہے وہ آپ کو بہت یاد  
کرتی ہیں۔ میری ماما چلی گئیں۔ میرے بابا بھی چلے  
گئے۔ اب چیچی کو کچھ ہوا تو میں بھی ماماؤں کی ادا  
سائیں! آپ کو لائڈ کا واسطہ پلایا اواسائیں پلینز۔“

”اوہ گاڈ!“ زمین جھرجھری لے کر رہ گئیں۔ بے  
ساختہ انہوں نے اسپیکر آن کر دیا۔

پڑہ۔۔۔ روتی ہوئی اس کی منتیں کر رہی تھی۔ اس  
نے اپنا سب آف کر دیا۔ چہرے پر پتھروں کی سی ویرانی  
تھی۔

”یہ سب کیا ہے شاہ دادا! اتم اور یہ روئے آئی کائنات ملیو  
اٹ تمہاری ماں نے یہ تربیت تو نہیں کی۔ وہ بوڑھی

بھائی نے کرم داد کو چار بیٹیوں کا تحفہ دیا۔ وہ حویلی کو  
دارت نہیں دے سکی تھی۔ کرم داد کا نام لیا کون ہو گا  
یہ دکھ چیچی کو اندر ہی اندر کھائے جاتا اور تب انہیں  
شدت سے اپنی پہلی بیوی اور پوتا یاد آتے۔ جن کا ذکر  
بھی انہوں نے اپنی زندگیوں میں ممنوع قرار دے رکھا  
تھا۔ جبکہ کرم داد کی آنکھوں سے اس کی شبیہ بہتی ہی  
نہ تھی۔ بظاہر وہ اپنی زندگی میں بہت ملن و مسرور نظر آتا  
تھا۔ وہ سارے زمانے سے چھپ سکتا تھا بیوی کو دھوکا  
دے لیتا لیکن ماں کی آنکھیں کیسے دھوکا کھاتیں وہ  
جانتی تھیں فرحین سے جدائی اور بیٹے سے دوری کا دکھ  
اسے گھن کی طرح لگا ہوا ہے۔ چیچی نے نئی بار کہا بیٹے  
کو واپس لے آؤ اور جواباً ”کرم داد کے لبوں پر زخم  
خوردہ مسکان مٹ جاتی۔“

سبھاگی اسے بیٹھانے دے سکی تھی اور کرم داد نے  
کبھی اس سے اس حکمی کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی  
ذات کا طفلانہ غور و اکر سب کے سب فرحین کے  
ساتھ ہی رخصت ہو چکے تھے۔

سبھاگی بھی ایک عورت تھی۔ وہ بھی اور اک رکھتی  
تھی کہ اس کا مرد اس پہلی عورت کو بالکل نہیں بھولا  
اور وہ خود بھی اسے خوشی نہ دے سکی تھی۔ اسی لیے تو  
اس نے کرم داد کو دو سری شادی کی اجازت۔ خوشی دے  
دی۔ کرم داد کو کسی طور راضی نہ تھا مگر چیچی۔۔۔

سبھاگی پر سو گن آگئی۔ احمد سراج اور اس کی ماں  
نے اٹک طوفان اٹھا دیا۔ زیب النسا کو بدلے میں میکے  
بھجوا دیا گیا۔

اگر بیٹے کی چاہ میں کرم داد شادی کر سکتا تھا تو احمد  
سراج کو بھی پورا حق تھا کہ وہ اولاد کے لیے دو سری  
شادی کر سکے۔ زیب النسا کی اپنی راجدھانی بچانے کی  
ساری کوششیں اکارت گئیں۔ اس کی حاکمانہ اور  
حاسدانہ فطرت اپنے گھر کو دو حصوں میں بٹانہ دیکھ سکی  
اور سال بھر میں ہی بے پناہ ذہنی دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ  
پاگل ہو گئی۔

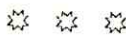
کرم داد کی دو سری بیوی بھی اسے بیٹھانے دے سکی۔

عورت تمہاری دادی ہے۔“ زمین کو حقیقتاً ”شاک لگا تھا۔ شاہ داد کے اس رویے پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آئی ڈونٹ کیئر میرے لیے صرف میری ماں اہم ہے اور کوئی دوسرا رشتہ نہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔“ وہ شدید اضطراب میں تھا۔ آنکھوں میں تشویر بھرا تھا۔

”تمہارے لیے اپنی ماں اہم ہے۔ ٹھیک ہے لیکن یہ تو سوچو کہ تمہارے باپ کی ماں ہے۔ وہ زندگی اور موت کے دورا ہے پرے میں تمہارا دکھ بھی سمجھتی ہوں لیکن کیا ضروری ہے کہ تم اس وقت ان سے اپنا رشتہ یاد رکھو۔ اور وہ چھوٹی سی لڑکیا پرہ۔ جس بے چاری نے ماں نہیں دیکھی۔ اب باپ بھی نہیں رہا اور اگر اس کی دادی بھی انف۔۔۔ شاہ داد! بے رحم مت بنو بیٹا!۔۔۔ حتیٰ سے سمجھاتے سمجھاتے زمین کے لہجے میں لجا بٹ اتر آئی وہ بالکل ہنس ہوا بیٹھا تھا۔

زمین نے اسے بھیج کر ہی دم لیا۔



نظامانی ہاؤس کا گیٹ ویسائی سنہرا اور چمکتا دکھتا ہوا تھا۔ وہی جھومتے سرو کے درخت وہی بارنگھار کے دور تک بکھرے خوش آمدید کتے پھول، فکسی ہی لٹش ہنس سرخ روش جس پر کھڑی براؤڈ پر ڈالے گئے پیرا شوٹ کو پر جی دھول بتاتی تھی کہ اس کے مالک نے کئی روز سے اسے استعمال نہیں کیا۔

یہی لان تھا جہاں اس نے گیٹ کے پار سے انہیں پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ وہ پرہ کے بابا تھے۔ اس کے ساتھ کھیلنے بے حد باوقار بہت پیارے۔ اس کی خوشی میں خوش۔ اس پر محبت لٹاتے۔ اسے کیا تا تھا وہ اس کے بھی بابا تھے۔ وہ تب ہی ان کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اپنے اندر مچلتے اووہم مچاتے سوالوں کے جواب لے لیتا۔ ساری روشنی منا لیتا۔ تمام حسرتوں کو قرار دے لیتا۔ وہ کیسا بد نصیب تھا۔ وہ کئی بار یہاں آیا مگر کبھی ان سے مل ہی نہ سکا۔ نہ ہی وہ اسے دیکھ سکے۔ وہ اسے

دیکھتے تو ضرور پہچان لیتے۔ یہ گھر اس کے باپ کا تھا اور وہ مہمانوں کی طرح یہاں آتا رہا۔ وہ منصوبے ہی بناتا رہا سوچتا رہا اور اجل انہیں اپنے پروں میں چھپا کر لے گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔ ان ہاتھوں سے اس نے ان کے تابوت پر مٹی ڈالی تھی۔ وہ بابا کی گود میں سر رکھ کر سارے دکھ سنانے کا آرزو مند انہیں کہاں چھوڑ آیا تھا۔ وحشت سی وحشت۔ وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور بہت دور مگر قدموں میں پلنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ وہ پتھر بنا کھڑا تھا۔ پرہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ نہ چمکے پاؤں بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔

”اواسا میں، اواسا میں!“ کی تکرار کرتی وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی۔ وہ ویسائی بٹ کابت۔ وہ اسے کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔ نیچے اسے دیکھتے ہی پھر سے جی اٹھی تھیں۔ آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ وہ اس کے اک اک نقش کو چوم رہی تھیں۔ بار بار بازوؤں میں بھینچ لیتیں۔ ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر دیکھنے لگیں۔ اور

اتنی نرم گرم سی پرجوش محبت بھی اس کے اندر پلچل نہ چاسکی۔ اک گہری دھند احساسات پر ہم چمک تھی۔ پرہ بازو سے چٹھی ہوئی تھی۔ بابا کی لاڈلی بیٹی اس کا دکھ سب سے سوا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی ہے۔ بابا اسے بتایا کرتے تھے اور یہ کہ وہ ایک دن ضرور آئے گا اور وہ کب آیا جب بابا چلے گئے۔ وہ اس کے وجود میں پایا کو ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے اندر گہری نیند اتری تھی۔ ہر جذبہ سو رہا تھا۔

عرب اس سے یوں ملا جیسے کسی اجنبی سے ملا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کو ایک دم قبول کرنے میں شاید وہ متاثر تھا اور امداد نظامانی جو اس کے سگے چچا تھے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی کوئی گرم خوشی کوئی خوشی کی رقم نہ جاگی، روٹھے سے انداز میں اسے گلے لگا کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ چچی بغور دیکھ رہی تھیں۔

”جب ایک شیر جنگل میں اکیلا ہو اور سمجھ رہا ہو کہ اب ہر طرف اس کا راج ہو گا اور تب اچانک کہیں



سے دوسرا تو ان شیر جنگل میں نکل آئے تو پہلے شیر کو بے چینی تو ہوگی۔ ”ان کے جانے کے بعد وہ اس کا گندھا سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ مہرہ لب انہیں دیکھ رہا تھا۔

”مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ کرم داد کی ماں، اس کے بچوں کی وارث۔ میں تمہاری حق تلفی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری ماں بہت نیک عورت ہے۔ اللہ اسے اجر دے بہت خوب تربیت کی ہے اس نے تمہاری۔ بس ہم ہی بد قسمت تھے۔ جو قدر نہ کر سکے۔ اللہ پاک ہمیں معاف کرے۔ بچے اتم بھی اپنا دل صاف کرلو۔ ہمیں معاف کر دو۔ اپنے بابا کی بھی ہر خطا بھلا دو۔ وہ تمہارے لیے ہزاروں حسرتیں لے کر گیا ہے اور اپنی بیٹیوں کے متعلق بھی اس کے بہت سے خواب تھے۔ اب تم ہی ان کے بڑے بھائی ہو اور بڑا بھائی باپ برابر ہوتا ہے۔ میں چاہوں گی تم ان کے سر پر ہاتھ رکھو۔ اس طرح ان نمائیوں کا دکھ بھی کم ہو گا اور تمہارے باپ کی روح بھی راضی ہوگی اس کے بوجھ کم ہوں گے، کرم داد کا سب کچھ اب تمہارا ہے اور اس پر

اندھیا رے سے وہ کیسے نکلے گا کچھ بتانہ تھا وہ واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا جب کو ریڈور کے پہلے قدم پر بیٹھی عنایہ کا سوال راہ میں حائل ہوا۔

”جار ہے ہیں۔“ وہ جا ہی رہا تھا۔ انتہائی بے سکتے سوال کا کیا جواب ہوتا۔ وہ جی پی رہا۔

”پھر کب آئیں گے؟“ انہیں اس سوال کا جواب ضرور تھا مگر وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کتنا قریبی لعلق تھا ان کا آپس میں اور وہ کتنے انجان رہے۔

”جی آپ کے آنے سے کتنی خوش ہوئی ہیں اور پر اسے تو جیسے پھر سے تایا سانس مل گئے ہیں۔ وہ ان سے بہت قریب بھی اور ان کے بعد صرف وہ ہی کیا، ہم سب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور ایسے موقع پر آپ کا ملنا بالکل ایسا ہے کہ ہمارے زخم سل گئے ہیں بے شک ہمیں یہ دکھ بھی ہے کہ تایا سانس آپ سے نہ مل سکے اور نہ آپ ان سے۔ اس بات کی آپ کو یقیناً“ بے حد تکلیف ہوگی مگر۔“

”میں چلتا ہوں۔“ وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی کہ وہ بول اٹھا۔

”پھر کب آئیں گے۔“ اس کا سوال ہنوز تھا۔ شاہ

تمہارے جتنے قرض تھے میں اب سب اتاروں گی تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میں ہوں تمہارے ساتھ۔“

شاہ داد کا ایک ہاتھ جیچی کے کپکپاتے ہاتھوں میں تھا اور دوسرا پردہ دبوچے بیٹھی تھی۔

مول اور سوہا زلی جاکر لے آئیں اور ہر چیز اصرار سے پیش کرنے لگیں۔

ان کے انداز میں۔۔۔ پیار بھری اپنائیت تھی۔ ان کے رویے سے یوں محسوس ہو رہا تھا برسوں دیا ر غیر میں رہنے والا بھائی لوٹ آیا ہو۔ وہ اس کی خدمت میں کچھ کچھ جاری تھیں۔ جیچی نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ان سے روز ملنے آئے گا اور اس نے ہامی نہیں بھری تھی تو انہیں انکار بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ دوبارہ یہاں آئے گا بھی یا نہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا یہ جگہ جہاں قدم قدم پر بابا کی پرچھائیاں تھیں وہ کن انگوٹھوں سے دیکھے گا اس دکھ کے گہرے سیاہ

اور اس رات جب اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھلی کتب سانس نہ دیکھ کہیں اور رہی تھی اور جب جیچی نے پانی مانگا تو وہ بونستی ہونق سی ادھر ادھر ناویدہ شے تلاش کرنے لگی۔ ٹیبل

”کہاں سے آرہے ہو؟“ وہ جھک کر جو گرز کے تھے کھول رہا تھا۔ جب فرحین کمرے میں داخل ہوئیں اور ابھی وہ کوئی ہمانہ گھرنے ہی لگا تھا کہ ان کے پیچھے ہی اندر آئی زمین بول اٹھیں۔

”نظامانی ہاؤس گیا ہو گا اور کہاں جاتا ہے اس نے۔“  
 ”کک، کیوں۔۔۔ وہاں کیوں گئے تھے۔“  
 فرحین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”بیجی، بہت بیمار ہیں نا۔ ان ہی کی عیادت کو گیا ہو گا۔ میرے خیال میں تو بڑی نیکی کی بات ہے۔ پھر اس کا خون کا رشتہ بھی ہے ان سے۔“ زمین یوں بتا رہی تھیں گویا نظامانی ہاؤس کے مکینوں سے خوب مثالی تعلقات ہوں۔

”یہ گیا ہے وہاں، تمہیں علم تھا اور مجھے بتایا تک

پر رکھا جگ اور گلاس اسے دکھائی نہ پڑ رہے تھے وہ تو ان کی بہت حاضر دماغ اور خوش اطوار بونٹی تھی، یہ آج اسے کیا ہوا تھا اس کے بدلے اندازاً انہیں چوٹ کا رہے تھے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

”عناہ! کیا بات ہے بچے کیوں پریشان ہو مجھے بھی نہیں بتاؤ؟“ ان کے پونچھے کی دیر تھی اس کے نین کوڑے تیزی سے بھرتے چلے گئے اور جب جیجی نے سینے سے لگایا تو وہ زار و قطار رو رہی تھی اور روتے روتے بے خودی میں وہ ان سے راز دل کہہ گئی تھی اور اب رگوں سے جان کھینچتا خدشہ جس نے اسے شام سے اس لمحے تک ادھ مو اکڑا لیا تھا۔

”نہیں آئیں گے جیجی وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔“ روتے روتے ایک ہی تکرار جیجی نے راز داں

سہیلی کی طرح اشک پونچھے۔ تسلی دی۔

”آئے گا ضرور آئے گا اگر نہ آیا تو میرا تم سے وعدہ ہے اسے لے کر آؤں گی میں۔ تم دل چھو نہا مت کرو، جیسے ہم سب غم سے نڈھال ہیں ویسے وہ بھی بکھر گیا ہے۔ اسے تھوڑا وقت دو، خود کو سمیٹ لینے دو۔ اس دکھ پر صبر آئے گا تو وہ ہمارے پاس ہی آئے گا۔ وہ ہمارا ہے۔ ہم سے دور نہیں جائے گا۔ فرحین کا بیٹا ہے۔

کبھی بے وفائی نہیں کرے گا بس یہ بات یاد رکھنا۔“ ان کے لبوں پر آسودہ مکان بکھری تھی۔ آج عارب اور امداد نظامانی کے انداز دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی تھیں۔ وہ عارب جو ہر وقت شاہو، شاہو کرتا رہتا تھا اس سے کتنا کھنچا کھنچا سا تھا۔ واقعی سب مایا ہے اور آج کے مادی دور میں کیسے اس مایا کے پیچھے خونی رشتے بھی ایک دوسرے سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ عناہ یہ کہ آنسو انہیں ہی راہ دکھا گئے تھے۔

دل ہلکا ہوا تو اس بھی جاگے۔ وہ جھنبھی جھنبھی سی دوپٹے سے چہرہ پونچھ رہی تھی۔ جیجی سے شرم آنے لگی۔ وہ کبھی بے جا بن کر سب کچھ کہہ گئی تھی وہ کیا سوچتی ہوں گی ان کی فکر دا من گیر ہوئی۔



نہیں اور، اور تم کیا جانتے نہیں ہو کیا سلوک رہا ہے ان لوگوں کا میرے ساتھ۔ پروں میں سمیٹ کر پالا ہے تمہیں۔ کیا صرف اس دن کے لیے کہ تم پھر ان لوگوں سے جاملو۔“ وہ زمین پر برس کر اس پر الٹ پڑیں۔  
 ”ظالم، بے حس لوگ ہیں۔ چھین لیں گے تمہیں، مجھ سے دور کر دیں گے۔“ خوابیدہ خوف پھر سے جاگ اٹھے۔

”ارے جانے بھی دو، یہ کوئی دودھ پیتا بچہ ہے کہ چھین لیں گے۔ ماشاء اللہ سے عاقل و بالغ ہے۔ اپنا اچھا تراسب جانتا ہے پھر جس سے ڈر تھا وہ تو دنیا میں رہا نہیں۔ وہ بے چارہ جیتے جی نہ لینے آیا تو اب کس بات کی فکر۔ ایک نہ ایک دن تو انہوں سے ملنا ہی تھا اس نے تو یوں مل لیا بس۔ بھلا جڑ کے بغیر بھی کوئی پودا ہوا ہے کبھی۔“ زمین حد درجے لا پرواہ تھیں۔ جبکہ فرحین کا دم حلق میں آن اٹکا۔ انہوں نے انتہائی پریشان کن نظروں سے اسے دیکھا وہ بھلا کر نگاہ پھیر گیا۔

”افوہ آپ۔ اس میں برشتانی کی کیا بات ہے۔ اس کا اپنا خاندان ہے، وہ سب لوگ اس کے اپنے ہیں۔ تو پھر اس کے وہاں جانے میں کیا قیاحت ہے۔“



زندگی میں اور بھی بہت سی باتیں دیکھنی پڑ سکتی ہیں۔ یہ نہ ہوا نکلنے میں خود اپنے ہاتھوں کسی خوشی کا گھاگھونٹ دو۔“ لگتا تھا، ”ان ج زمین سارے پر دے اٹھا کر رہیں گی شاہ داو نے ملجائی نہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ فرحین نا سبھی سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں۔ وہ ”ایکسکو زنی“ گستاخاں روم میں جاگھسا کہ فی الحال اس سے بہتر چھپنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔



اس کی پہلے بھی کسی سے خاص دوستی نہیں تھی اب تو بالکل ہی سب سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ عارب سے کلاس میں آتے جاتے پہلو ہائے ہو جاتی۔ دونوں کے بیچ اک ان دیکھی دیوار حائل ہو گئی تھی تکلف کی گریز کی۔ وہ تو جان بوجھ کر اس سے بچتا پھر تا مگر عارب کیوں بدل گیا تھا اس بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلک کتابوں میں سر دیے رہتا۔ کلاس کے بعد فارغ ٹائم ملتا تو لا بریری میں جاگھتا۔ اس وقت بھی وہ پورے انتہاک سے آڈٹ کے اسرار و رموز سمجھنے میں لگ تھا جب کوئی آستنی سے براہروی کر سی پر آبیٹھا۔ شاہ داو نے چونک کر نظر اٹھائی۔ اپنے مخصوص سیاہ گاؤں میں مچھپی گرے اسکارف سیلف سے ماتھے تک لیے وہ مومل تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حزن و ملال کی آئینہ شے لیے۔ چہرے پر غم کی پرچھائیاں۔ وہ باپ کے سائے میں نہیں رہا تھا اس کا دکھ اپنی جگہ، مگر وہ باپ کی گود میں پبی بھی اس کا دکھ اس سے بھی سوا تھا۔ اس نے پھر کتاب پر نظر نکالی چند ثانے دیر خاموشی کی تہ میں دبتے چلے گئے۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر جانا بھی نہیں چاہ رہا تھا اور اس کے متوقع سوالوں سے خائف تھا۔

”آپ ہم سے خفا کیوں ہیں؟“ آخر کار مومل نے لب کشا کیے تھے۔ وہ کیا کتا کوئی جواب نہیں تھا اس

کے پاس۔ وہ اس سے تو خفا نہ تھا جس سے خفا ہونے کا حق رکھتا تھا وہ تو منائے بغیر ہی ملک عدم سدھار گیا۔

”قباحت؟ کیا خاندان، کیسے اپنے ان لوگوں نے جو کچھ کیا پھر اس کے بعد کبھی مڑ کر اسے پوچھا اس کی خبر لی کیسے جی رہا ہے۔“ فرحین اپنی جگہ ج رہیں۔

”کیسے لیتے خبر؟ جب ہاتھ ہی بندھ گئے تھے۔ کس منہ سے آتے پوچھنے پھر جب کرم داو ہی اسے آپ کو سونپ گیا تھا تو وہ کیا کرتے۔ اب وہ خود بھی نہیں رہا مگر یہ تو نہیں نال کہ اس کا باپ سے اور ان لوگوں سے رشتہ ختم ہو گیا۔ وہ تو قیامت برقرار رہے گا اور اس کے باپ کا اور کون سا بیٹا ہے، یہی اکلوتا وارث ہے اس کا۔ اپنے خاندان سے ملنا اس کے اسے حق میں بھی اچھا ہے۔ ساری زندگی ترس ترس کر گزاری۔ اب بھی جن حائلوں سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ بھی سب آپ کے سامنے ہے پھر ڈگری ملے ہی یہ بھی نہیں کہ جھٹ سے کوئی ٹاپ کلاس جاب مل جائے گی

اسے کیا کرے گایہ بے چارہ ساری زندگی محنت۔ اپنے اور آپ کے خوابوں میں رنگ بھرتے بھرتے بل ختم ہو جائیں گے اس کے۔ کیا چاہتی ہیں آپ گھٹ گھٹ کر بیجے۔ یہ۔“ زمین نے انہیں قائل کرنے کو بے دردی سے سفاک حقیقت کا پردہ بھی چاک کر ڈالا وہ اور پھر گئیں۔

”تو کیا چاہتی ہو اس کے باپ کی دولت کے پیچھے اسے ان لوگوں میں دھکیل دوں۔ ہرگز نہیں۔ کیا ملا ہے مجھے اس دولت سے اور کیا مل گیا ہمیں۔ دولت خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی۔ سب کچھ جانتے ہو جیسے اسے سبق پڑھا رہی ہو۔ اور تم؟“ وہ اس کی طرف گھومیں۔

”ہمیں پتا ہے ناپ تم کیا ہو میرے لیے۔ میری کل کائنات۔ میری قیمتی متاع۔ میری کل زندگی کا سرمایہ۔ میں یو نیو ہمیں کسی کے حوالے کر دوں۔ ہاں تمہارا باپ زندہ ہو تا تو اور بات تھی۔ مگر اب نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے، تم نہیں ملو گے ان لوگوں سے۔ سنا تم نے۔“

”بے شک دولت خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی مگر

اب کیسے گلے اور کہاں کے شکوے سب منوں مٹی تلے دفن ہو گئے تھے۔

”جیجی کی آنکھیں ہر وقت دہلیز پر لگی رہتی ہیں۔ آپ کا ذکر آپ کا انتظار بس یہی کام ہے انہیں، جھولی تسلیاں دے دے کر انہیں غذا اور دوا کھلانا پڑتی ہے پھر مزید بے شمار جھوٹ بول کر بھلانا پڑتا ہے کہ آپ مصروف ہیں اس لیے نہیں آسکے۔ آپ کا نیسٹ ہے۔ آج پر یکینکل ہے، اگلے دن پھر نئے بہانے ستائیں مجھے ان سے اور کتنے جھوٹ بولوں میں یہ الگ رورور کر بلکان ہوتی ہے ہم کیا کریں کہ ہمارے دلوں میں آپ کے لیے محبت بہت بچپن میں ہی ڈال دی گئی تھی۔ ایک بڑا بھائی ہے۔ شہزادوں جیسا اور اک دن وہ ضرور آئے گا۔ ہر روز صبح اٹھتے میرا سوال آپ کے بارے میں ہوتا کہ آپ کب آئیں گے۔

اب سوچتی ہوں میرے ان سوالوں سے بابا کو کتنی اذیت ہوتی ہوگی۔ میں ہر روز ان کے زخم آویڑ ڈالتی تھی۔ آپ مائیں یا نہ مائیں وہ آپ سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی آپ سے محبت کے وہ سارے ثبوت انیکسی میں ان کے بیڈ روم کی ایک الماری میں موجود ہیں۔ اس الماری کو ان کی زندگی میں کسی کو کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ تو اب ان کے جانے کے بعد ہم پر بھید کھلا جب میں نے اس کا تالا توڑا۔ آپ کو پتا ہے اس الماری میں کیا تھا۔“ وہ اسے دیکھتی پل بھر کو رکی۔ شاہ داد بے دھیانی سے سنتا بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اس الماری سے مجھے جگمگ کرتے شیشوں جڑی ایک ننھی سی ٹوپی ملی۔ ننھے منے کڑھائیوں والے کرتے اوئی موزے دوپھوٹے تکیے چھوٹی چھوٹی رلیاں، جھنجھنے، چند چالی والے کھلونے، اور کچھ تصویریں اور جاتے ہیں وہ چیزیں اور تصویریں کس کی تھیں۔۔۔ سب آپ کی تھیں، بنہیں بابا نے اپنی جان سے بڑھ کر سنبھال رکھا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتے اپنا زیادہ وقت انیکسی میں ہی گزارتے تھے۔ کیوں یہ راز تو اب

کھلا انہوں نے آپ سے دوری اختیار کیے رکھی تو ضرور اس کے پیچھے کوئی سولڈ ریزن ہو گا۔ وہ آپ تک پہنچ سکتے تھے مگر انہوں نے کیوں خود پر اٹنے پہرے بٹھائے رکھے؟ میں نہیں جانتی لیکن اٹنا مجھے علم ہے وہ آپ کو بے اندازہ چاہتے تھے۔ اگر آپ کے دل میں ہمارے لیے ذرا سی بھی گنجائش ہو تو پلیز ایسے کھوڑ نہ بنیں۔ ہمارے بیوں کی غلطیوں کی سزا خود کو اور ہمیں نہ دیں۔ اور جانے والوں کی خطا میں تو یوں بھی یاد نہیں رکھتے۔ کیا آپ ان کی خطا کو معاف نہیں کر سکتے کیا آپ ہمیں معاف نہیں کر سکتے۔ آپ کو نہ سہی لیکن ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہم آپ میں اپنے بابا کو دیکھ لیا کریں گے۔ پلیز ہر روز ہمیں تو کبھی کبھار اپنے قیمتی وقت میں سے چند منے ہی ہمیں خیرات کر دیا کریں ادا سائیں۔“

وہ اس کی منت کر رہی تھی اس کا دل بھی رورہا تھا۔ اس کے تو سوگ ہی کم نہ ہو رہے تھے وہ کس کس غم پر نوحہ کرتا بابا تو چلے گئے تھے یہ اس کے بابا کی پیاری بیٹی تھی اس کی بہن جس سے اپنے رشتے کو وہ چند دن پہلے ہی جان پایا تھا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ موٹل کے سر پہ ٹپک گیا۔

”بڑا بھائی“ وہ ایک دم سے کتنے خوب صورت احساس سے دوچار ہوا تھا۔ موٹل روتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ داد نے مسکرا کر سر ہلادیا۔

”تھنک یو ادا سائیں، تھنک یو سو مجھ کو خوش ہو گئی اور اس کے چہرے پر کھلتے رنگوں کو دیکھ کر۔ وہ ماں کی تاکید بھی بھول گیا۔“

موٹل بڑی دیر اس سے ادھر ادھر کی کہتی رہی۔ وہ بھی پوری دلچسپی سے سنے گیا پھر یک لخت وہ جانے کے لیے اٹھی۔

”اب میں چلتی ہوں۔ اگر آنے کا وقت نہ ملے تو پلیز جیجی کو فون کال ہی کر لیجئے گا۔ خوش ہو جائیں گی، چاہے کوئی جھوٹا داسا ہی سہی۔ کم از کم مجھے تو انہیں



یہ رکی رکی سہمی آواز مول کی تو ہرگز نہیں تھی جبکہ نمبر اسی کا تھا۔ شاہ داد نے سیل آنکھوں کے سامنے کیا پھر کلن سے لگایا۔

”مول!“ جانے کیوں تصدیق چاہی حالانکہ پہچان تو آگیا تھا۔

”وہ نماز پڑھ رہی ہے۔ میں عنایہ۔“ ادھر سے گمان پر یقین کی مہر لگی تو تہتے ہوئے اعصاب یکدم پرسکون سے ہو گئے۔ گہری سانس بھرتے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

”کیسی ہیں۔“ مختصر سوال مگر تفکرات سے بھر۔  
”ٹھیک ہوں۔“ ادھر بھی اختصار مگر سرشاریت سے مزین جواب۔

”یادوں کا درد کیسا ہے۔“ تصور کی آنکھ سے اسے چلتے دیکھا تو از حد تکلیف محسوس کی۔  
”پہلے سے قدرے بہتر۔۔۔۔۔ آپ کو کس نے بتایا۔“ وہ یک لخت چوکی۔

”مول نے بتایا تھا“ آئندہ ایسی بد احتیاطی مت کرنا پلیز۔“ وہ التجا کر رہا تھا اور عنایہ کا دل میٹھی سی مائل پر ہلکورے لینے لگا۔ شاہ داد پھر یوں چپ ہوا جیسے کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہ گئی ہو اور بعض باتیں ہوتی ہی ایسی ہیں جو نہ بھی کمودہ پھر بھی دل میں اترتی ہیں اور اثر کرتی ہیں۔

”آپ آئے کیوں نہیں جنہی روز انتظار کرتی ہیں۔“ ہنسیں مجتمع کرتی وہ پوچھ رہی تھی شاہ داد کا جی چاہا پوچھے اور تم؟ مگر کہا تو اتنا۔  
”وقت نہیں ملتا۔ کوشش کروں گا۔“

پھر شاہ داد نے الوداعیہ کلمات کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ تادیر بے خیالی میں سیل ہونٹوں پر رکھے گزشتہ لمحوں کے فسون میں گم رہی۔ اس کا ایک ایک لفظ ذہن کی ٹیپ میں بار بار گونجتا رہا اور ہر بار خوشی اور سرشاری کا ایک نیا سکھ دامن میں آگرتا۔

”وہ فرحین کا بیٹا ہے۔ بے وفائی نہیں کرے گا۔“  
جنہی نے کہا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا وہ یونہی بد گمان

کھانے اور دوا کے لیے منانے کے جتن نہیں کرنا پڑیں گے۔ پہلے تو عنایہ۔ میرا ساتھ دیتی تھی۔ اب مجھ اکہلی کو گھینا پڑتا ہے، چار دن ہوئے وہ تو خود بستر نشین ہو کر رہ گئی ہے۔“

”عنایہ! کیوں کیا ہوا اسے۔“ وہ پوچھے بنانا رہ سکا جب سے ماں کے توروں دیکھے تھے۔ وہ تب سے دل کو سمجھا رہا تھا مگر دل جیسا ڈھیٹ بھی دنیا میں دوسرا کوئی ہوا ہے۔

”جانے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا صبح صبح ننگے پاؤں گھاس پر چلنے کا۔ بس کسی زہریلے کیڑے نے ٹکٹ لیا ہے۔ اس دن سے پیر پکڑے بیٹھی ہے۔ پڑھائیاں، تکمیل سب بند، جیجی کی فکر کیا کم تھی کہ اوپر سے وہ بھی میری تو اچھی خاصی پریڈ ہو جاتی ہے سچ میں۔“ مول پریشان تھی۔

”اوہ گاؤ! ڈاکٹر کو دکھایا؟“ وہ حد درجے پریشان ہوا تھا۔

”ہوں روز بینڈیج بھی کروا رہے ہیں دعا کریں جلدی سے ٹھیک ہو جائے، کم از کم وقت بے وقت اسے سہارا دینے سے تو میری جان بچے۔ اچھا ادا سائیں بھولیے گامت اوکے ٹیک کی۔“ وہ چاچلی تھی اسے ایک نئی فکر میں غلط کر کے پھر اس کا دل کتابوں میں کیسے لگا وہ جلد ہی گھر آیا سوچا تھا تھکے اعصاب کو کچھ ریسٹ ملے گا ایسی قسمت کہاں۔“

مائی گمت اپنی کسی سہیلی کے ہاں جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر رجب ماما ان کی ”شو فری“ کا فزہ اس کے سر ڈال گئے، جسے ناچاہتے ہوئے بھی اسے انجام دینا پڑا۔

رات جب تھکے ماندے جسم و جاں کو گھنٹیاں بیڈ پر آیا تو نظر سائڈ ٹیبل پر رکھے سیل فون پر پڑی۔ بے اختیار اٹھا کر آن کیا اور اسی بے اختیاری میں انگلیاں ایک نمبر پر پریس کر گئیں۔ دوسری طرف سے آتی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔

”جنہی تو سو گئی ہیں۔ آپ نے بہت لیٹ کال کی۔“

”دیکھو فرحین۔ دیکھو! ہماری حالت یہ سب اس کرنی کا پھل ہے جس نے تمہیں آجاڑ دیا مگر پھر خود بھی نہ بس سکی۔ سب تدبیریں الٹ گئیں۔ اپنے ہی گلے کا

پھندا بن گئیں۔ دیکھ لو قدرت کا فیصلہ۔ کیا اب بھی ہمیں معاف نہ کر دی۔“

وہ اپنی جگہ ساکت و صامت تھیں۔ ایسی دل دہلا دینے والی حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ ابھی دکھ کے بیکراں بوجھ تلے دب کر کراتی ہوئی روح نے چاہا ضرور ہو گا مگر ایسا انتقام یہ تو تکرار کے ہزاروں حصے میں بھی نہ تھا۔ واقعی کسی انسان کی کیا مجال کہ درست میزان رکھ سکے وہ خود تو اس قابل تھیں ہی نہیں کہ اپنے ساتھ کی گئی برائی کا بدلہ لے سکیں مگر وہ جو مالک کون و مکان ہے۔ وہ تو سب جانتا ہے ناں ظالم اور ظلم سے بے خبر نہیں اور وہی سب سے بہتر منتقم ہے۔

”تم چاہو تو نظامی ہاؤس جا سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تمہارے اپنے ہیں پھر تم سے

ہوتی رہی۔“ کس کی کال تھی۔“ مول چرے کے گرد بندھا دھپا کھولتی پاس آ بیٹھی۔ عنائہ کو اپنی آنکھوں سے جگر

جگر پھونٹتے ان رنگوں کو چھپانے کا موقع بھی نہ ملا۔ جو کچے چور کی طرح سارے بھید کھولنے پر تیار تھے۔ ہنا لب کھولے فون اس کی جانب بڑھا دیا اور چادر سر تک تان لی۔ مبادا وہ کوئی سوال ہی نہ کر دے۔ مول نے حیرانی سے اس کا اندازہ لکھا پھر موبائل کی اسکرین کو۔

ادا سائیں کی کال۔“ اور عنائہ کی جھنجھکی جھنجھکی سی مسکن۔ راز کیا ہے۔“ بغور چادر کو کتنی مول نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور پھر جو انکشاف ہوا تو بے اختیار اس نے چادر جھپٹ لی۔ عنائہ سنبھل بھی نہ سکی۔ دونوں رات تک راز و نیاز کرتی رہیں۔



انہوں نے اسے نظامی ہاؤس جانے سے منع کیا تھا اور وہ نہیں گیا تھا۔ ہر رشتے ہر جذبے سے افضل و مقدم اس کے لیے اپنی ماں تھی۔ چاہے اس کو شش میں اسے اپنے ہی دل پر پتھر کھنا پڑے تھے اس نے پروا نہیں کی۔ مگر تب کیا کر تاکہ جب جینبی خود ہی چلی آئیں۔ فرحین اب ایسی بھی بدل لٹاؤ بے مروت نہ تھیں کہ گھر آئے مہمان کو نکال باہر کرتیں۔ پھر مہمان بھی کون جن سے ان کا کوئی رشتہ نہ سہی مگر بیٹے کا نو خون کا رشتہ تھا انہوں نے اسے ملنے سے نہیں روکا۔ یہی ان کی اعلا ظنی تھی۔ جینبی تو دل سے ممنون و قدیر دان تھیں گو کہ انہوں نے جینبی سے زیادہ بات نہ کی فرحین نے زیب النساء کو دیکھا۔

وہ حسن، وہ کدو فر، وہ نخوت، یہ وہ زیب النساء تو نہ تھیں۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں جن پر سلوٹ زدہ کھال کا مہین برہ، ان کے برہمیت چرے پر دہشت زدہ کرتی دو آنکھیں۔ فرحین حق دق سی ان کا احاطہ وجود دیکھ رہی تھیں۔ فرحین کو دیکھتے ہی جینبی کے آنسوؤں میں روائی آگئی۔

بیوٹی بکس کا فیڈر کردہ

**Herbal**

**سوہنی شیمپو**

**SOHNI SHAMPOO**

✽ اس کے استعمال سے چند روز میں نئی قسم ✽  
 ✽ گرمے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ✽  
 ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے ✽

قیمت 90/- روپے

رجسٹرڈ سے منگوانے پر اور جی آر سے منگوانے والے

دو بوتلیں 250/- روپے تین بوتلیں 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

بڑے ریمانڈ سے منگوانے کا پتہ

بیوٹی بکس 53، انگریز پور، رگیت، المار، جناح روڈ، کراچی۔

دفتری خریدنے کے لیے:

کتبہ برہان، نمبر 37، ایم اے ڈاک گراؤنڈ، فون نمبر 32216361



وامنی خوشیوں کے لیے ہزار ہا دعائیں کر رہا تھا۔ ان کے بچے ان کی دولت سے جنہیں آج وہ ایک ہی لڑی میں موتیوں کی طرح پروئے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ عارب اور مولیٰ کی زندگی کا فیصلہ تو وہ ان کے بچپن میں ہی کر چکی تھیں۔

اب شاہ داد اور عنایہ کا نصیب ایک ہو جائے۔ ان کے لب دن رات اپنے رب کے حضور گڑ گڑاتے رہے تھے اور بے شک وہ سننے والا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی بے حد شکر گزار تھیں جس نے ان کی چاہت کو حقیقی روپ دیا تھا۔ کرم داد کے بعد یہ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی۔ بے حد قیمتی خوشی۔ ایک ہی جیسے میون کمر کے برائیل ڈریس میں دونوں دلنہیں انتہائی حسین لگ رہی تھیں۔ بھاری زیورات خوشنما میک اپ اور اندرونی احساسات نے انہیں اسیر بنا ڈالا تھا۔ تو بیک ٹوپس میں دولہا بھی شہزادوں سے کسی طور کم نہ دکھ رہے تھے۔ جیتی کی نظریں بار بار اپنے بچوں کی بلاتیں لے رہی تھیں۔

عارب کی انگلیاں تیزی سے موبائل کے بٹن ہٹھیں کر رہی تھیں ایسی دلربا ساعتوں میں بھی اس کی سوتی کہیں اور ان کی تھی۔ ساتھ ہی بیٹھی مولیٰ کے خوب صورت چہرے پر شرم و حیا کے بجائے جھلاہٹ چھا رہی تھی۔ بس نہ چٹا تھا کوئی چیز اٹھا کر اسے دے ماری۔

”نہیں سدھرو گے۔ شرافت سے خود ہی یک دو۔ کیا عروج کیا جائے تمہارا۔“ شاہ داد کو بھی تاؤ آ گیا پاس ہی تو بیٹھا تھا سوبے لہجے میں غرایا۔

”اس امیں نے کیا کیا ہے؟“ عارب نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ پہلے دائیں دیکھا پھر بائیں۔ چار آنکھوں سے اس کے لیے شرارے نکل رہے تھے۔ وچ اس کے ہاتھ میں تھی۔

”اوہو! خود ہی دیکھ لو! ارعدیل سے بات کر رہا ہوں وہ گدھا ابھی تک نہیں پہنچا۔ اسے گالیاں سینڈ کی ہیں ایمان سے۔“ اس نے بوکھلا کر اپنی صفائی پیش کی

چاہت بھی رکھتے ہیں۔ سچ کہتی ہے زمین بھلا جڑ کے بغیر بھی کوئی پودا ہوا ہے کبھی اور میں اتنی ظالم بھی نہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی خوشی کا گلا گھونٹ دوں۔ تمہاری خوشی میں ہی تو میری خوشی ہے۔“ فرحین نے ان کے جانے کے بعد شاہ داد سے کہا تھا۔ وہ حیران سا دیکھ رہا تھا۔

”اچھی لڑکی ہے عنایہ۔ زمین بتا رہی تھی مجھے۔ سچ کہوں اس دن میں نے غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ تم پہلے بتا دیتے میں ذرا دھیان سے دیکھ لیتی۔“

”تو اب دیکھ لیں۔“ حیرت پر خوشی نے غلب پایا تو وہ فٹ بولا پھرماں کی کھلی آنکھوں پر نظر گئی تو اپنی تیزی کھنٹی۔

”وہ۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے کہ۔“ مارے بوکھلاہٹ کے بات بھی نہ بنائی گئی۔ فرحین ہنسنے لگیں اور جانے کتنے عرصے بعد ماں کے ہونٹوں پر کھلی ہنسی نے شاہ داد کی روح تک کو شادمان کر دیا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر وہ بھی ہنس رہا تھا۔



نظامی ہاؤس کا گیٹ ویسا ہی چمکتا دکھتا تھا۔ سوتی

جھومتے سرو کے درخت، وہی بار سنگھار کی ٹیل، جو گھالی سفید پھولوں سے الٹی پڑی تھی۔ مگر یہ کیا آج تو آئے والوں کا استقبال کرنے کے لیے صرف یہ پھول ہی نہیں بلکہ سرخ روش پر سرخ ہی خوشبودار پتیاں دور تک بھری تھیں۔ بواؤ گلش نظر آ رہا تھا! معطر فضا سرسبز لان میں خوب گھما گھمی اور رونق تھی۔

نیروزی ٹھیکر وار فراق میں سنہرے بالوں کو خوب صورت سی پونی ٹیل بنائے خوش باش چہرے والی پرہ ادھر سے ادھر اڑتی پھیر رہی تھی۔ آج کا دل اس کے لیے تو عید جیسا تھا۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس، جیتی کے چہرے پر بھی آج سکون آمیز کیفیت ثبت تھی۔ ان کے دایں ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اور ہر دانے کے ساتھ دل اپنے بچوں کی

حیران ہوا اور اس کی حیرت زدہ صورت دیکھ کر وہ اس سے کہیں بڑھ کر حواس باختہ۔ بمشکل حلق سے آواز نکلی۔

”کیا مطلب؟“

”قرب آؤ، پھر مطلب سمجھاتا ہوں۔“ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دھڑلے سے جھانکنا کہہ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتی مسکراہٹ چھپانے نہ چھپی۔ عنایت اسی حواس باختگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی شاہ داد تھا جو ہمیشہ سنجیدگی کا متبوتانے رکھتا تھا۔ اب یہ انداز اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اب کیا مجھے نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ وہ سہم رہا تھا

”میری نظر نہیں لگے گی۔“

”کیوں آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں؟“ وہ انتہائی معصومیت سے استفسار کر رہا تھا۔

”اف!“ عنایت نے بوکھلا کر سر جھکا لیا۔

شاہ داد خوش دلی سے ہنس رہا تھا اور اس کے چمکتے چہرے پر بارش کی طرح اتاری خوشیاں فرحین کو بھی سرشار کر رہی تھیں۔ نہایت مطمئن ہو کر انہوں نے گلے میں بائیں ڈالے کھڑی پرہ کو سینے سے لگا لیا۔

”آپ اداسائیں کی مما میں تو میں آپ کی بیٹی ہوئی ناں۔“

اس نے خود ہی ان سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور انہیں

اس پیارے رشتے پر کیا اعتراض ہوتا۔ وفا کے سارے وعدے نبھانے پر وہ تو انہیں اک انعام کی صورت لگی تھی۔ باقی کی زندگی بہت سہل اور خوب صورت ہوگی۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہیں پختہ یقین تھا۔



ساتھ ہی ثبوت کو شاہ داد کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مگر تمہارے حق میں بہتر ہو گا کہ آج کے دن اپنی ساری خرمیتیں کسی ڈسٹ بن میں ڈال دو، تمہاری بونگیوں کی وجہ سے مول کی آنکھ میں کبھی ایک آنسو بھی آیا تو پھر اپنا انجام سوچ لیتا۔“

شاہ داد کے لمحے کی غراہٹ پہلے سے بھی بڑھ کر تھی۔ عارب نے ڈنکے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔ مول کے لیے بھائی کی طرف سے ملنے والا اتنا سامان ہی بہت تھا۔ دل ہی دل میں اس کی درگت پر مسرور ہوئی وہ خود بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ عارب نے انتہائی مسکینیت کا مظاہرہ کرتے سیل اس کی گود میں ڈال دیا جسے اک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہ جھپٹ کر اسے ہینڈ بیگ میں ڈال گئی۔ وہ بے اختیار گہری سانس لیتا بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شاہ داد نے اپنی بے ساختہ اُٹنے والی مسکراہٹ کو اس سے چھپانے کے لیے دوسری جانب رخ پھیر لیا۔

شرمائی لبائی سی عنایت کا دل فریب روپ ہوش اڑا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی گھبراہٹ کا شکار تھی۔ اس پر شاہ داد کی مخمور نگاہیں۔ وہ مزید خود میں سمٹنے لگی۔ اس کی نظروں کی لو بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ صورت جمع گھلتی

ہوئی۔

”پلیز ایسے مت دیکھیں مجھے۔“ بری طرح پرل ہوتی آخر کار وہ کہہ ہی گئی مگر اگلے ہی لمحے سخت کچھناتی۔

”کیوں میری نظر لگ جائے گی۔“ شاہ داد نے خاصا برا مانا۔ ساتھ پرل بڑ گئے۔ عنایت کی توجان پر بن گئی۔ اپنے سابقہ الفاظ کا اثر زائل کرنے کو بروی متانت اور جذب سے بولی۔

”جو پیار کرتے ہیں۔ ان کی نظر نہیں لگتی۔“

”یعنی میں آپ سے پیار کرتا ہوں؟“ وہ حد درجہ



# نبیلہ عزیز



ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سیلیبوں سے زیادہ ملنا جلتا ہے۔ نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

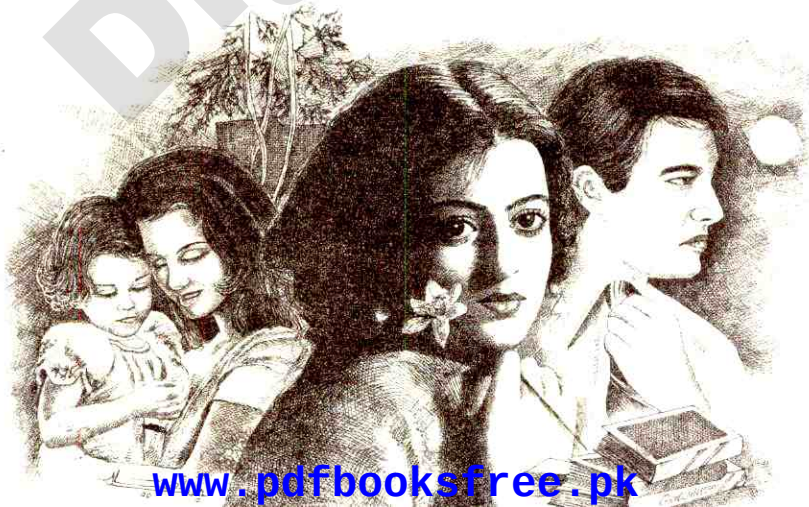
فارہ اپنی خیمہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منورہ رحیم اپنی بہن ثمنہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً ”ساشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منورہ، ثمنہ اور نیوہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرستانہی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیشن حائل نہیں ہے۔ نیوہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے خواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمنہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمنہ کی طبیعت گہڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت، تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس







کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کی بعد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا، غانیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کر دیتی ہے۔ ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر، ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا خد اور کھد درا رویہ ہر بار اسے ناکام کر دیتا۔ تیمور، ماورا سے رضا حیدر کو ملوانا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کہ وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات خیا م مرزا کے بیٹے مولس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مولس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدھی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایئر چٹنی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور، فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکیج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کالی جیل جت کرنے کے بعد قبول کر لیتی ہے۔

## —۱۲— چوہوہوینے قسط

”کس لڑکی کو۔۔۔؟“

وہ ان کے اس قدر اچانک حملے اور اتنے غصے کی وجہ سے فوری طور پر سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کس کی بات کر رہے ہیں۔

”اس لڑکی کو۔۔۔“ انہوں نے یکدم پلٹ کر گلاس وال سے پار نظر آتے اس کیمین کی طرف اشارہ کیا تھا، جہاں ماورا مرتضیٰ نیہل پہ جھکی اپنے کام میں مصروف نظر آ رہی تھی۔ تیمور ان کا اشارہ ماورا کی سمت دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔

”آپ ماورا کی بات کر رہے ہیں۔۔۔؟“ تیمور کو اک عجیب سا دھچکا محسوس ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمارے اس آفس میں کوئی اور ایسی لڑکی نہیں ہے جسے فیصل آباد سے یہاں لایا گیا ہو؟“ انہوں نے طنزیہ جواب دیا۔

”لیکن بابا! اسے یہاں اس سیٹ پہ اس کے ٹیلنٹ کی ٹیس پہ بلایا گیا ہے۔ وہ یہاں کام کر رہی ہے، جھک نہیں مار رہی۔“

تیمور نے بے ساختہ اس کا دفاع کیا تھا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اپنے شہر سے ٹیلنٹ ختم ہو چکا ہے۔۔۔؟“ رضا حیدر کا جواب طنز اور تمسخر لیے ہوئے تھا اور تیمور کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔

”اگر ہم نے دوسرے شہر سے کسی لڑکی کو اپائنٹ کر لیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟“ وہ ابھی بھی حیرت اور الجھن کا شکار تھا۔

”قباحت دوسرے شہر سے کسی لڑکی کو اپائنٹ کرنے میں نہیں ہے۔ بلکہ قباحت۔۔۔“

رضا حیدر اچانک ماورا کا نام لیتے لیتے رگ گئے تھے۔ یوں کھلے عام اس لڑکی کے خلاف بولنا انہیں خود ہی اپنی

غلطی کا احساس دلا گیا تھا۔ وہ فوراً ہی چپ ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا۔ کیا کتنا چاہ رہے ہیں آپ۔؟“  
قباحت کہاں ہے؟“ تیموران کا بولنے بولنے یوں اچانک رک جانا نوٹ کر چکا تھا، مگر ان کی مخالفت کا مقصد نہیں سمجھ سکا تھا۔

اور رضاحیدر اس کے سوال پہ ٹھنک کر رہ گئے۔

”بابا۔! کبھی نہ کیا قباحت ہے اس میں؟“ تیمور انہیں بولنے پہ اُکسارہا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں۔ بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال ہم گھر جا رہے ہیں۔“ رضاحیدر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہیں سے پلٹے اور تیزی سے دروازہ عبور کر گئے اور تیمور اپنی جگہ پہ کھڑا جوں کا توں ان کو دور تک دیکھتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی سوچ کھل رہی تھی۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ بابا کو ماورائے کوئی اختلاف ہے۔ یا پھر وہ انہیں پسند نہیں آئی۔ مگر کیوں؟ کیا کسی ہے اس میں۔۔۔ شی ازرفیکٹ کرل۔“ وہ خود ہی اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا اور خود ہی سوال جواب کر رہا تھا۔  
”مے آئی کم ان سرا“ ذرا سے توقف کے بعد دروازے پہ دستک ہوئی اور ساتھ ہی ماورائے کی آواز ابھری۔ تیمور چونک کر متوجہ ہوا۔

”مے آئی کم ان سرا۔! اس نے تیمور کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ استفسار کیا تھا۔

”بیس کم ان سرا۔! اس نے جواب دیا۔

ماورائے اندر آتے ہی اس پہ ایک تنقیدی سی نگاہ ڈالی تھی اور وہ اسے اسی کیفیت میں نظر آیا تھا جس کی اسے

توقع تھی۔

ماورائے خاتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 ناولیں

ساری بھول  
ہماری تھی



راحت جبین  
قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز  
قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی  
قیمت - 350 روپے

میرے خواب  
لوٹا دو



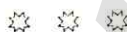
نگہت عبداللہ  
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:  
32735021

منتوانے  
ماکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی



”میری فائل تیار ہے۔“ اس نے اسے اطلاع دی۔  
 ”ہوں! ہاں۔۔۔ اؤکے۔۔۔ میں تھوڑی دیر میں چیک کر لیتا ہوں۔“  
 تیمور ذہنی طور پر غیر حاضر تھا اور ماورا اس چیز کو اچھی طرح محسوس کر چکی تھی۔  
 ”پلیز زرا جلدی چیک کر دیجئے گا، کیونکہ مجھے پھر فیکسٹ فائل پہ کام کرنا ہے۔“  
 ”اؤکے۔۔۔ کر لوں گا۔۔۔ لیکن فی الحال نہیں۔۔۔“ تیمور نے کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”اپنی پرابلم سر۔۔۔! ماورا نے جان بوجھ کر اس کی غائب دماغی میں دلچسپی لی تھی اور نہ اسے اندازہ تو تھا کہ دونوں باپ بیٹے میں کوئی بات ضرور ہوئی ہے کیونکہ رضا حیدر اسے دیکھتے ہی بھڑک سے گئے تھے۔  
 اور پھر اس بھڑک کا نشانہ یقیناً ”انہوں نے تیمور حیدر کو ہی بنایا ہوگا۔  
 ”نفس۔۔۔ نفس آل رائٹ۔۔۔“ تیمور نے فوراً ”نفی میں گردن ہلائی۔ ماورا نے لاپرواہی سے کندھے اچکا دیے۔  
 ”اؤکے! اے اتنی گونا گؤ؟“ اس نے اجازت طلب کی۔  
 ”ہوں۔۔۔ لیس۔۔۔! وہ آہستگی سے کہہ کر اپنی سیٹ پہ جا بیٹھا۔  
 کوئی اور وقت ہوتا تو اس کی یہی کوشش ہوتی کہ ماورا کچھ دیر اور ٹھہر جاتی۔ مگر اس وقت اس نے یہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔



مونٹس مرزا کی گاڑی سڑکوں پہ بہت سبک رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔  
 یوں جیسے وہ لوگ گھر سے لائٹ ڈرائیو کے لیے نکلے ہوں اور واپسی کی فی الحال کوئی جلدی نہ ہو۔ کیونکہ گاڑی کے اندر کے ماحول میں بھی بہت خاموشی اور بہت سکون تھا۔ لیکن عزت حیدر یہ خاموشی اور یہ سکون زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے اس خاموشی کا حصار اس نے خود ہی توڑ ڈالا۔  
 ”کوئی خاص بات۔۔۔؟“ اس نے گردن موڑ کر مونٹس مرزا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
 ”شاید ہاں۔۔۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔  
 ”تو بات کریں۔ انتظار کس چیز کا ہے۔۔۔؟“ اس نے کندھے اچکا دیے۔  
 ”میں آپ کے گھر پر پوزل بھیجنا چاہتا ہوں۔“ مونٹس مرزا بات کو زیادہ دیر ڈھکا چھپا نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت نہیں تھی۔

”میں آپ کو اس بات کا جواب پہلے ہی دے چکی ہوں۔“ عزت نے بھی کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی تھی۔  
 ”وہ ایک سرسری سی بات تھی اور اس وقت ہم راستے میں کھڑے تھے، نہ میں ٹھیک سے بات کر سکا اور نہ آپ۔۔۔“ آج وہ پہلے سے کچھ سنجیدہ نظر آ رہا تھا مگر عزت کو کیا فرق پڑتا تھا بھلا۔۔۔!  
 ”یہ بھی ایک سرسری سی بات ہے، کیونکہ اس وقت بھی ہم راستے میں ہی ہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ آپ بے شک ٹھیک سے بات نہ کر سکیں، لیکن میں ضرور ٹھیک سے بات کر سکتی ہوں۔“ وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔  
 اسے مونٹس مرزا کے ساتھ تماشفر کرتے ہوئے بھی کوئی ڈر خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔  
 ”عزت۔۔۔! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور نہ ہی یہ بات مذاق ہے کہ آپ اتنی غیر سنجیدگی سے لے رہی ہیں۔“ مونٹس مرزا کی سنجیدگی تیار ہی تھی کہ وہ کتنا سنجیدہ ہے۔

”میں آپ کے ساتھ آگئی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی باتوں میں بھی آجاؤں گی۔“ اس کی لاپرواہی کا وہی عالم تھا اور مولس مرزا نے زچ ہو کر گاڑی اک طرف روک دی تھی۔

”دیکھیے مس عزت حیدر۔۔۔ آپ ٹھنڈے دل سے میری پیشکش پر غور کریں۔ آپ میں کچھ ایسی بات ہے کہ میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے، ورنہ میں شادی کے جتنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی آج کل شادی کے جتنجھٹ میں پڑنے کی سوچنا کون ہے۔“

مولس مرزا نے دلش بورڈ سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹس اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر بہت مزے سے ایک سگریٹ سگایا تھا جبکہ عزت اس کی بات سن کر اندر سے کھول اٹھی تھی۔

”اوہ تو یہ اصلیت ہے آپ کی۔۔۔؟“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو چکا تھا مولس مرزا اس کی بات پہ مسکرا دیا۔

”کہتے ہیں کہ سب سے اپنی اصلیت چھپا لو مگر اس سے اپنا آپ مت چھپاؤ جس سے تم محبت کرتے ہو۔“ اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہتے ہوئے دھواں گاڑی کی فضا میں ہی چھوڑ دیا تھا ”البتہ اب کی بار عزت اس کی بات پہ مسکرا دی تھی۔“

”ہو نہ محبت۔۔۔ جانتے ہیں محبت کسے کہتے ہیں؟“ عزت نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

”فی الحال میری نظر میں تو عزت کو ہی محبت کہتے ہیں۔“ اس نے عزت سے بھی زیادہ دلچسپ انداز میں کہتے ہوئے براہ راست عزت کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”جو بات فی الحال ہوتی ہے، وہ عارضی ہوتی ہے، یعنی وقتی ہوتی ہے۔۔۔ اور وقتی چیزیں کبھی پائیدار نہیں ہوتیں۔“ اس لیے آپ کا یہ فی الحال میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔“ عزت کی لاپرواہی اور انداز میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

”مائی ڈیر! آپ نے غور نہیں کیا۔۔۔ میں اس فی الحال کو ہی تو پائیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ اپنے اور آپ کے چچرشتہ استوار کرنا چاہ رہا ہوں۔ ایک پائیدار رشتہ۔۔۔ اور میری اس چاہ پہ تو آپ کو فخر کرنا چاہیے کہ میں نے یہ رشتہ آپ سے استوار کرنا چاہا ہے، ورنہ ہزاروں ایسی لڑکیاں پڑی ہیں جو میری صرف اک نظر کی منتظر ہیں۔۔۔ اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ میں آپ کی اک نظر کا منتظر ہوں۔“

مولس مرزا کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ وہ بڑے دلیرانہ انداز میں آچکا تھا۔

”اور میں کسی اور کی نظر کی منتظر ہوں۔“ عزت کا لہجہ بھی دو ٹوک نتیجے میں بدل گیا تھا۔

”ہا ہا ہا۔۔۔ جو دنیا کی نظروں سے ڈرتا ہے۔“ مولس مرزا نے مذاق اڑایا تھا اور عزت اس کے مذاق پہ بری طرح چونک گئی تھی۔

”کیا مطلب۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ اس نے فوراً استفسار کیا۔

”یہ آپ کو بتاتا ہوں کہ دنیا کی نظروں سے کون ڈرتا ہے؟“ اب وہ لاپرواہی دکھا رہا تھا۔

”آپ سیدھی طرح بات کریں۔۔۔ پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہیں؟“ وہ جھنجھلائی۔

”سیدھی طرح ہی تو بات کر رہا ہوں، مگر آپ سمجھ ہی نہیں رہیں۔ آپ کو اب بھی ولید رحمان کے ہی پروپوزل کا انتظار ہے، حالانکہ وہ یہ پروپوزل کبھی بھی نہیں بھیجے گا۔“ مولس مرزا نے بالآخر اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی تھی۔

عزت اس کی اس قدر جاسوسی پہ دانت کچکا کے رہ گئی تھی۔ اسے اس کی بات ذرا اچھی نہیں لگی تھی۔

”وہ پروپوزل بھیجے گا یا نہیں۔ یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔ آپ کو اس کے لیے پریشان نہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ عزت نے اس کو اپنی حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا۔



”آپ کا اور اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میرا اور آپ کا بھی مسئلہ ہے اس قصے میں، میں بھی انوالو ہوں۔ اس لیے میری پریشانی ایک لازمی امر ہے۔“

مولس مرزا بھی ڈھیٹ ابن ڈھیٹ تھا۔ اس کی سوئی بھی بس آج کل عزت کے نام پر ہی انکی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ عزت کی ذات میں اسے اپنے لیے انکار کی جھلک نظر آئی تھی اور انکار کو آخر میں بدل دینے کی ضد تو مرد کی فطرت میں ازل سے ہی چلی آ رہی تھی۔ مولس مرزا کی یہ ضد کوئی نیا انوکھی ضد تو نہیں تھی۔

”لیکن میں آپ میں انٹرنسٹڈ نہیں ہوں۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”جس میں آپ انٹرنسٹڈ ہیں، وہ آپ میں انٹرنسٹڈ نہیں۔“ وہ ہنسا۔

”میں نے کہا تھا یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔“ عزت نے پھر زور دے کر کہا۔

”تو آپ اپنے اس مسئلے میں مجھے کیوں بھول رہی ہیں۔ میں صبر اور تحمل سے کام لے رہا ہوں، ورنہ میں آپ سے زیادہ جہنی اور جذباتی ہوں۔“ مولس مرزا نے یکدم تیر بدل کر بات کی تھی۔

”آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے؟“ عزت نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔

”یہی سمجھ لیں۔ اور یاد رکھیں! دھمکی وہی لوگ دیتے ہیں جو کچھ کر جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔“

وہ اسے ایک بار پھر باتوں باتوں میں بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

”ہوں۔ تھینک یو۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟“ عزت نے کہتے ہوئے

دروازے کے ہنڈل پر ہاتھ رکھ کے دروازہ کھولنا چاہا۔

”ابھی تو آپ کو صرف اندازہ ہوا ہے۔ اگر سچ کچھ ہو گیا تو۔۔۔؟“

مولس مرزا کی اگلی بات پر عزت دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی تھی۔

”تو حاصل آپ کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔“ عزت کا لہجہ سرو تھا۔

”جنون میں نفع و نقصان کا احساس پس پشت چلا جاتا ہے۔“ وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر کے سگریٹ کا ٹکڑا باہر

اچھال چکا تھا۔

”ہوں۔ اچھی بات ہے۔“ عزت کہہ کر دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی۔

”رہے مس عزت حیدر۔“ انچ تو آپ نے کیا ہی نہیں۔“ مولس مرزا بھی گاڑی سے اتر آیا۔

”انچ واپس درجنان کے ساتھ نہیں کر سکتی تو آپ کے ساتھ بھی نہیں کر سکتی گی۔ میں آپ کے ساتھ لچ کرنے کی

نیت سے نہیں آئی تھی۔“

عزت نے استہزائیے سے لہجے میں کہا اور ٹیکسی کو اشارہ کیا۔

”مگر میں اپنا پروپوزل ضرور بھیجوں گا۔“ اس نے پیچھے سے آواز دی مگر عزت سنی ان سنی کرتے ہوئے، ٹیکسی

میں بیٹھی اور ہوا ہو گئی۔



شام ڈھل رہی تھی اور فضا میں اک جمود سا طاری تھا۔

قیام مرزا ماحول کی بیزاریت سے خائف ہو کر رضا حیدر کو لے کر گالف کلب چلے آئے تھے لیکن وہاں آکر

انہیں پتا چلا کہ ویسی ہی بیزاری رضا حیدر کے مزاج پر بھی طاری ہے۔ ان کا مود بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جس پر

انہیں خاصی تشویش ہوئی تھی کیونکہ رضا حیدر مسلسل چپ تھے۔ اور اندازہ درجہ پُر سوچ ہو رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے رضا! کہ میں نے تمہیں ساتھ لاکر غلطی کی ہے۔“

قیام مرزا نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے بہت ٹھہرے ہوئے لمبے میں۔ اظہار خیال کیا تھا اور صد افسوس کہ رضا حیدر ان کا یہ اظہار خیال بھی نہیں سن سکے تھے بلکہ ان کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا، جس پہ قیام مرزا نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”رضا حیدر! اب کی بار انہوں نے ان کے کندھے کو ہاتھ سے تھپکا تھا۔“

”ہوں۔! کہو وہ چونک کر متوجہ ہوئے۔“

”میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں بلا کر غلطی کی ہے۔“ انہوں نے اپنی بات دہرائی۔

”ہاں۔ کہہ سکتے ہو۔“ رضا حیدر نے ان کی بات کی تردید کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

”کوئی مینشن ہے کیا؟“ قیام مرزا نے ایک دوست ہونے کے ناتے ان کی اس کیفیت اور۔ پریشانی کی وجہ جاننا چاہی تھی۔

”مینشن۔ بس اچانک ہی بن گئی ہے اور بنانے والا میرا بیٹا ہے۔“ رضا حیدر بہت ہی مضبوط سے کام لے رہے تھے۔

”کیوں کیا ہو گیا ہے۔ بیٹے نے ایسا کیا کر دیا ہے۔؟“ قیام مرزا بڑے سکون میں تھے۔

”ایک مل کلاس لڑکی سے دل لگانے کا شوشا چھوڑ رکھا ہے اس نے۔؟“ رضا حیدر کی تملہاٹ عود کر آئی تھی۔

”ارے۔! تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں ایسے شوشے تو ہر کوئی چھوڑتا ہے، کبھی تم نے بھی چھوڑا ہو گا۔“ قیام مرزا نے مذاق اڑایا۔

”صرف شوشا چھوڑتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی مگر یہاں یہ مسئلہ ہے کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے پہ تل گیا ہے۔ اور اسے اپنے آفس میں سیٹ بھی دے دی ہے۔ وہ اس کے پاس اس کی نظروں کے سامنے جاب کر رہی ہے۔ جبکہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ تیمور میری عمر بھر کی جمع پونجی ہے اور میں اپنی عمر بھر کی جمع پونجی کسی ایسی غیر لڑکی کے دامن میں نہیں ڈال سکتا۔ میں اس کی دلن اس کے شایان شان لانا چاہتا ہوں۔“

رضا حیدر کتے کتے حد درجہ جذباتی ہو گئے تھے اور قیام مرزا نے ان کے جذبات سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہوں۔! کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، مگر اسے اس کی چاہت سے کیسے ہٹاؤ گے؟ وہ اگر اسے اتنا پسند کرتا ہے تو پھر آسانی سے اسے چھوڑے گا بھی نہیں۔“ قیام مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ کچھ گبیر ہے۔

”یہی چیز تو مجھے سوچنے پہ مجبور کر رہی ہے کہ میں نے اب اس کا حل کیا نکالنا ہے۔؟“ رضا حیدر چلتے چلتے رک گئے تھے اور ایک گرمی اور طویل سانس خارج کی تھی۔

”اس کا آسان حل یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک اور لڑکی کا آپشن رکھ دو۔ اس کی شادی کا یکمیرا ڈال دو۔“

”لیکن اس کام کے لیے کوئی لڑکی بھی تو ہونا۔؟“ رضا حیدر کو یہ خیال یہی آیا تھا۔

”رضا حیدر! مجھے لگتا ہے کہ پریشانی اور مینشن نے تمہارے دماغ کا خانہ خالی کر دیا ہے۔ تیمور حیدر کو لڑکیوں کی کمی ہے کیا۔ میں نے یہاں آکر دیکھا ہے تمہارے بیٹے کا نام کئی محفلوں میں بڑی حسرت سے لیا جاتا ہے۔“

قیام مرزا نے جوابات نوٹ کی تھی وہ کہہ دی تھی۔

”مجھے پتا ہے۔ اور بہت اچھی طرح پتا ہے کہ ہائی سوسائٹی میں میرے بیٹے کی کیا ویلیو ہے۔ لیکن سوچ یہ رہا ہوں کہ لڑکی کون ہو۔ کیسی ہو۔ اور کس کی بیٹی ہو۔ کیونکہ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک چروہ ہے۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک فیملی ہے۔ اس کام کے لیے جیسی ذرا سوچ بچار سے کام لیا ہوتا ہو گا۔“ رضا حیدر اپنی اگلی سوچ کا



ظہار کر رہے تھے۔

”ہاں! یہ تو ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہارے حلقہ احباب میں تمام ہی فیملیز بہت اچھی ہیں۔ کسی بھی ایک فیملی کا انتخاب کر لو۔“ ان کا مشورہ بڑا لاپرواہ تھا۔

”قیام! تم میری سوچ کو سمجھ نہیں سکو گے۔ میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ لڑکی اس کے لڑکی ہو۔ جیسی وہ چاہتا ہے، تاکہ اسے وہ پہلی والی یاد نہ رہے۔ وہ اس کا خیال بھی دل سے نکال دے۔“

رضاحیدر ماورا مرتضیٰ سے مل بھی چکے تھے۔ اسے دکھ بھی چکے تھے اور اس سے بات بھی کر چکے تھے، اس لیے انہیں اندازہ تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ اس لیے اس کی شخصیت کا اثر زائل کرنے کے لیے انہیں اس سے بھی بہترین لڑکی چاہیے تھی۔

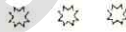
”تو پھر میرا کمانا نوکھ جاؤ۔ اور اپنے بیڈ روم میں سکون سے بیٹھ کر اس کے لیے کوئی ایسی لڑکی سوچو جو پہلی والی سے بہتر ہو۔ اگر پھر بھی سوچ میں نہ آئے تو کل صبح مجھے کال کرو۔ پھر مل کر یہ مسئلہ حل کریں گے۔“ قیام مرزا نے ان کے کندھے پر ہلکی دیتے ہوئے مشورے سے نوازا۔

جس پر رضاحیدر محض سر ہلا کر رہ گئے تھے۔

”اور یاں۔۔۔ بیور حیدر کی زندگی سے اس پہلی والی کو ایک دم سے نکال دینے کی کوشش مت کرنا، ورنہ تمہارا اپنا بیٹا ہی تم سے بدظن اور متفرق ہو جائے گا اور تم اپنی جمع پونجی اپنے ہاتھوں لٹا بیٹھو گے۔“ جاتے جاتے انہوں نے ایک اور بات سمجھا دلی تھی۔

”ہوں۔۔۔! جانتا ہوں۔۔۔ اسی لیے تو آفس سے چپ چاپ واپس چلا آیا۔ ورنہ اس لڑکی کو وہاں سے نکال کر ہی دم لیتا۔“ رضاحیدر دانت پس کر بولے تھے۔

”ہوں! ایسے معاملوں میں اسی طرح سیاست اور فہانت سے کام لینا چاہیے۔“ قیام مرزا نے انہیں سراہا تھا اور دونوں نے ایک ساتھ واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔



ولید بڑے شکستہ انداز میں گھر پہنچا تھا اور کسی سے بھی بات کیے بغیر چھت پر آکر لیٹ گیا تھا۔ زبیدہ بیگم، وحید اور کککو کو خاصی تشویش ہوئی تھی کہ اسے آخر کیا ہوا ہے کہ وہ آج خلاف معمول ان سب سے بات کیے بغیر ہی چھت پہ چلا گیا ہے، یہاں تک کہ کپڑے بھی چنچن نہیں کیے۔

”امی! سب خیر تو ہے نا؟“ کککو برآمدے سے اٹھ کر ماں کے پاس صحن میں آ بیٹھی تھی۔

”خیر ہوتی تو کیا اس طرح ہوتا۔۔۔؟“ زبیدہ بیگم بھی دل ہی دل میں پریشان ہو رہی تھیں۔

”تو آپ پوچھیں یاں۔۔۔؟“ کککو ان سب سے چھوٹی تھی لیکن بھائی کو اس کیفیت میں دیکھ کر ان سب سے زیادہ فکر مند ہو رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔ فوری پوچھنا اور کریدنا ٹھیک نہیں ہوتا، فی الحال اسے تھوڑا ریلیکس ہونے دو۔“ انہوں نے بیٹی کو سمجھایا۔

”امی! ریلیکس ہونے کے لیے آدھا گھنٹہ کافی ہوتا ہے۔۔۔ اور انہیں چھت پہ گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔“ وہ لٹا انہیں سمجھا رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔ یہ تو ہے۔ خیر، تم ایسا کرو چھت پہ جاؤ اور اس سے پوچھو کہ کھانا کھائے گا یا چائے چاہیے۔؟ اور یہ بھی کہو کہ شادر لے کر فریش ہو جائے۔ پھر بجلی چلی گئی تو تازہ پانی بھی نہیں ملے گا۔“ وہ اسے ولید کے پاس جانے

زبیدہ آپا واسٹنگ سوپ  
استعمال کرو  
اور چھا جاؤ





اور بات کرنے کے بہانے سمجھا رہی تھیں۔

”لیکن امی! سب کرنے سے اور کہنے سے کیا ہو گا؟“ ککو نے سوال اٹھایا۔

”اف ککو! مجھے مزید تنگ مت کرو۔ یہ سب کہنے اور کرنے سے یہ ہو گا کہ اس کے موڈ کا پتہ چل جائے گا۔ کم از کم یہ اندازہ تو ہو گا تاں کہ وہ غصے میں ہے۔ او اس ہے یا ویسے ہی پریشان ہے؟“  
زبیدہ بیگم نے ککو کے سوال سے عاجز آ کر جیسے سر پیٹ لیا تھا اور ککو ان کے موڈ سے گھبرا کے بے ساختہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”اگر بھائی نے مجھے ڈانٹا تاں تو اچھا نہیں ہو گا۔ میں جا رہی ہوں اوپر۔“

وہ خفگی سے ماں کو دھکی دیتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی حالانکہ جانتی بھی تھی کہ ولید نے اسے آج تک نہیں ڈانٹا تھا۔

ولید سامنے چارپائی پہ چاروں شانے چت لیٹا آنکھوں پہ بازو رکھے نجانے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہر حال ککو پھر بھی اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”بھائی! اس نے قریب آ کر آہستگی سے پکارا۔

لیکن اپنی شگفتگی کے شبنم میں جکڑا ولید اس کی یہ آواز نہیں سن سکا تھا۔

”بھائی! اب کی بار اس نے ولید کا پاؤں ہلایا تھا اور ولید نے یکدم چونکتے ہوئے چرے سے بازو ہٹا دیا۔

”کیا بات ہے؟“ ولید کا لہجہ بہت دھیمہ اور بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔

”بات تو کچھ نہیں ہے۔ بس آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ کھانا کھائیں گے یا چائے لیں گے؟“ اس نے بڑی معصومیت سے بڑا سیدھا سوال کیا تھا۔

”کچھ نہیں لوں گا۔ کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تو جس چیز کو دل چاہ رہا ہے وہ بتا دیں۔“ ککو نے بنا سوچے سمجھے ہی اتنا بڑا سوال کر دیا تھا۔

”میرا خود کو کوئی مار دینے کو دل چاہ رہا ہے۔ تو ایسی کیفیت میں کیا کروں؟“ ولید انتہائی تنہی سے بولا۔ اور ککو نے یکدم تڑپ کر اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔

”ہائے اللہ نہ کرے! آپ ایسا کیوں بول رہے ہیں؟ اللہ آپ کو ہماری بھی زندگی دے دے۔ آپ کے سوا ہمارا کون ہے بھلا؟“ کتے ہوئے ککو کا لہجہ روہا ساسا ہو گیا تھا اور ولید اس کی بھرائی ہوئی آواز اور بھری ہوئی آنکھیں دیکھ کر کچھل گیا تھا اور اسے بھی فوراً ہی اپنے الفاظ کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔  
”سوری۔ میری گڑبیا!“

وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا تھا۔

”دھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے ککو کو چارپائی پہ اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔

”میں نہیں آؤں گی۔“ آپ نے اتنی دل دکھانے والی بات کیوں کہی ہے۔ آپ کو پتا ہے ناں اگر امی نے سن لیا تو سن کر ہی مرجائیں گی۔“ ککو کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”اف ککو! کیا کہہ رہا ہوں میں؟“ دھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔“ ولید نے جان بوجھ کر مصنوعی خفگی کا

اظہار کیا اور ککو اس کی خفگی سے خائف ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”پہلی بات تو یہ کہ تم سے کتنی بار کہا ہے کہ پاؤں پکڑ کر مت جگا کر لو۔ اس طرح اچھا نہیں لگتا۔ بازو یا

کندہ ہلا دیا کرو۔“ ولید کو ککو کی اس عادت پہ ہمیشہ یہی خفگی ہوتی تھی وہ جب بھی جگمگانے کے لیے آتی

تھی اس کا پاؤں ہلا کر ہی جگاتی تھی اور ولید اس کی اس حرکت پہ ہمیشہ ہی اسے ٹوکے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا

تھا کہ اس کی چھوٹی بہن اس کے پیروں کو ہاتھ لگائے۔  
 ”سوری۔۔۔ عادت ہو گئی ہے۔“ اس نے معصومیت سے منہ پھلایا کر معذرت کی۔  
 ”عادت کنٹرول کرنے کے لیے ہی تو آتا ہوں۔۔۔“ اس نے ککھو کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اس کے سر کو جان بوجھ کر جھنجھوڑنے والے انداز میں ہلایا تھا۔

”تو آپ بھی تو اپنی عادت کو کنٹرول کریں ناں۔۔۔؟ کیوں اس طرح چرے پہ بازو رکھ کر پریشان سے انداز میں لیٹ جاتے ہیں۔۔۔؟ آپ کو دیکھ کر ہم تینوں کی طرح کی فکریں ستانے لگتی ہیں۔“ اس نے برملا شکوہ داغا۔  
 ”کوئی وجہ ہوتی ہے تب ہی ایسا کرتا ہوں ناں۔۔۔؟ بے وجہ پریشان ہونے اور بے وجہ چرے پہ بازو رکھ کے لیٹنے کو تو کسی کا بھی دل نہیں چاہتا ناں۔۔۔؟ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔ اچھی سی چائے پلاؤ، سر میں درد ہو رہا ہے۔“  
 ”آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔؟ میں پہلے ہی چائے لے آئی۔“ ککھو کہہ کر فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”تم کون سا پہلے پوچھنے کے لیے آئی ہو۔“ ولید بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔۔۔ وہ تو امی نے مجھے بہانے سے بھیجا ہے۔“ وہ کہتے کہتے آخر چرچ بھی کہہ ہی گئی تھی اور ولید ایک زبردستی کی مسکراہٹ مسکراتا ہوا اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی وجہ سے اپنی ماں۔۔۔ اور اپنے بہن بھائیوں کو پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر اس قصے میں ان کا کیا قصور تھا بھلا؟  
 جو بھی ہوا تھا بس دل کی غلطی تھی۔

اپنی اوقات سے برہہ کے پاؤں پھیلا بیٹھا تھا۔  
 بڑے لوگ تھے۔ بڑی باتیں تھیں اور برتاؤ غصہ تھا۔  
 ذرا سی بے رخی ہے کایا ہی پلٹ کے رکھ دیتے تھے۔ ایسے لوگوں سے دل لگانا تو اوکھلی میں سر دینے کے برابر تھا۔  
 لیکن افسوس کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس اوکھلی میں سر دے چکا تھا۔



”ہاں“ اب بتاؤ، کیا ارادہ ہے تمہارا؟ آج تو سنڈے ہی ہے ناں۔۔۔؟“ ماورا ابھی سو کر اٹھی بھی نہیں تھی کہ فارہ نے صبح صبح ہی فون کھڑا دیا تھا۔

”اف فارہ۔۔۔ تم ہوش میں تو ہونا۔۔۔؟ ابھی تو میں بستر سے بھی نہیں اٹھی۔“ ماورا نے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جمائی کروڑ کا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ امیں ہوش میں ہوں۔۔۔ کیونکہ میں بستر سے کافی دیر ہوئی اٹھ چکی ہوں۔ اس لیے بستر ہے کہ اب تم بھی ہوش و حواس میں آ جاؤ اور بستر سے اٹھ جاؤ۔“ فارہ تنک کر چمک کر بولی تھی۔

”اوہ۔۔۔ آج تو بڑی سینہ زوری کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ کوئی اچھا خواب دیکھا ہے یا کسی خواب کی تعبیر اچھی دیکھی ہے؟“ ماورا اپنی کہنیوں پہ زور ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی تھی۔  
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں رات بھر سوئی ہی نہ ہوں۔۔۔؟“

”اچھا چھوڑو، بتاؤ کہ کیا پروگرام ہے تمہارا۔۔۔؟“ ماورا نے ٹانگہ ہی بدل دیا تھا۔  
 ”میرا پروگرام تو یہی ہے کہ تم اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ آج کے دن کالج اور ڈنر میرے گھر پہ ہی کرو۔ لیکن اس پروگرام کے حوالے سے تمہاری کیا رائے ہے اس کے لیے منتظر ہوں۔“  
 فارہ اس کی پوری فیملی کو انوائٹ کر رہی تھی جو کہ محض تین افراد پہ مشتمل تھی اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ دو



افراد کے حصے کی اسے معذرت ہی موصول ہوگی۔ لیکن پھر بھی ایک موہوم سی امید کے تحت کہہ ہی دیا تھا۔  
 ”اس پروگرام کے والے سے میری کپارائے ہوگی کہ تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لیے تمہیں  
 مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں آؤں تو پھر صرف مجھے ہی انوائٹ کرو۔ لی گل اور  
 امی والا پروگرام کسی اچھے وقت کی امید پہ رہنے دو۔“ ماورا نے کہا تھا اور فارہ پہلے سے ہی جانتی تھی اس لیے چپ  
 ہو گئی تھی۔

”اوکے۔۔۔ تو پھر تم کب آ رہی ہو؟“

”تقریباً بارہ بجے تک۔!“ ماورا نے وال کلاک دیکھا جہاں آٹھ بج رہے تھے۔

”بارہ بجے نہیں۔ دس بجے۔“ فارہ نے دس بجے کا ٹائم دیا۔

”دس بجے کیوں؟ اتنی جلدی کیا ہے آخر؟“ اسے تعجب ہوا تھا۔

”میں شمس محض کھانا کھانے کے لیے نہیں بلاری۔ بلکہ کچھ دیر اپنے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کے لیے  
 بلاری ہوں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم گھر سے ذرا جلدی نکلو۔“

فارہ لفظ چبا کر بولی تھی اور ماورا اس کے اس اصرار پہ سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔

”اف! ایشادی کے بعد بھی اس لڑکی کی بے وقوفی اور بیچنے میں کوئی چھیچ نہیں آیا۔“ ماورا نے تاسف سے کہتے

ہوئے فون بند کر دیا تھا اور چادر ہٹا کر بستر سے اتر آئی تھی۔



ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ لی گل اور عافیہ بیگم کے صبر اور برداشت کا امتحان لیتی ٹھیک دس بجے گھر سے نکل آئی  
 تھی جیلا نلکہ اسے اندازہ تھا کہ دس بجے تو مارکیٹیں بمشکل کھلتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے چالس لے لینا ہی بہتر لگا  
 تھا۔

تب ہی اپنے سیل فون پر ہونے والی وابٹریشن کی طرف دیکھا۔ جہاں ابھی ابھی فارہ کا میسج موصول ہوا تھا۔

”کہاں ہو؟“ میسج بھی مختصر ہی تھا۔

”راستے میں۔!“ اس نے بھی میسج ٹائپ کیا۔

”گنڈ۔ ویری گنڈ۔ جیتی رہو۔“ اگلا میسج موصول ہوا۔

”تھینکس۔!“ ماورا لکھتے ہوئے مسکرائی۔

اور پھر مارکیٹ پہنچنے تک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ پونی کھیلتی رہی تھی۔

وہ دل میں یہی سوچ رہی تھی کہ شاپنگ مال میں پہلا کسٹروبی ہوگی۔ لیکن نہیں۔ وہاں تو خاصی گھما گھمی نظر  
 آ رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس جیسے سر پہرے اور بھی تھے۔ جن کو دیکھ کر وہ قدرے ہنس مکھ ہو گئی تھی۔  
 بڑے اطمینان سے فارہ اور آفاق کے لیے گفٹس دیکھنے لگی۔ ابھی وہ اسٹینڈ پر ہنگ کی ہوئی شرٹس میں سے ایک  
 گرے کلر کی مردانہ قمیص نکال کر دیکھ رہی تھی کہ اچانک اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز سن کر چونک گئی  
 تھی۔

”ہوں۔! نائس۔۔۔ کلر اور آپ کی چوائس آؤٹ کلاس ہیں۔“ تیمور حیدر کے لہجے اور انداز سے ہی لگ رہا تھا۔

اسے وہ شرٹ کتنی پسند آئی ہے۔ اور ماورا اس کی اتنی پسندیدگی دیکھ کر اک نظر دوبارہ شرٹ کی طرف دیکھنے پہ مجبور  
 ہو گئی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہیں؟ دیکھیں مت۔ بس خرید لیں۔“ تیمور نے بڑے دل سے اسے مشورہ دیا تھا۔ لیکن ماورا کو

اس کے مشورے پہ عمل کرنے سے پہلے سوچنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔  
 ”میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ جس کے لیے میں یہ شرٹ لے رہی ہوں اس پہ یہ کھراوریہ ڈیزائن سوٹ کرے گا یا نہیں؟“ اس نے وجہ بتائی۔

”ہوں۔! واقعی یہ سوچنے کی بات ہے۔ اپنی دے آپ اس کی پرسنالٹی کو ”سامنے“ رکھ کے خریدیں گی تو آسانی رہے گی۔“ تیمور نے معنی تیزی سے کہا۔

”سامنے رکھ کے؟“ ماورا نے بھی اس کے جملے کے زور کو فوراً ”نوٹ کیا تھا۔  
 ”سوری۔! نہ نظر رکھ کے؟“ تیمور فوراً ”بات بدل گیا تھا اور دل ہی دل میں مسکرایا تھا جبکہ ماورا اس کے چہرے پہ نظر ڈالتے ہوئے چونکی تھی۔

وہ اسے دیکھنے میں کچھ بدلا ہوا سا لگا تھا۔  
 ”کیا ”نظر“ اس طرح رکھتے ہیں؟“ تیمور اس کے نظر بھر کے دیکھنے پہ بولا اور ماورا سر جھٹک کر سرخی موڑ گئی تھی۔ اسے اپنے آپ پہ خفگی ہوئی تھی۔  
 ”پلیز! یہ تمہی ٹیک کر دیں۔“ اس نے وہی شرٹ سیزمین کی طرف بڑھادی تھی۔ اور خود ایک اور شرٹ چیک کرنے لگی۔

”کیا میری کچھ ہیلپ کر سکتی ہیں آپ؟“ تیمور بھی اپنے لیے شرٹس پسند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان ماورا کی طرف تھا اس لیے وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔  
 ”سوری۔! میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”گھر پہ کچھ کام ہے؟“ اس نے جان بوجھ کر گھر کا پوچھا۔  
 ”نہیں۔! افارہ کے گھر سے۔“ وہ بھی اپنی بے دھیانی میں بے ساختہ ہی کہہ گئی تھی۔ اور اپنی اس بے دھیانی اور بے ساختگی کا احساس اسے فوراً ”ہو گیا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا جھلا؟

”وہ! تو آج آپ اپنی دوست کے گھر جا رہی ہیں؟ ہا! کتنی خوش قسمتی ہے ان کی؟“ اس نے بڑے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا۔  
 ”کوئی اتنے شوق اور اتنی محبت سے انوائٹ کرے تو جانا تو پڑتا ہے نا؟“ ماورا نے کاؤنٹر پہ رکھے اپنے تمام ہینگوں اٹھا لیے تھے۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ تیمور نے دہرا کے پوچھا اور ماورا اس کے دہرا کے پوچھنے کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔  
 ”جی ہاں۔! وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

”دیش گریٹ۔! ایسے یہ ہینگوں میں اٹھالیتا ہوں۔ آپ نے بے شک میری ہیلپ نہیں کی۔ مگر میں آپ کی ہیلپ ضرور کروں گا۔“ تیمور نے اس کے ہاتھ سے خود ہی تمام ہینگوں ختم لیے تھے۔ اور ماورا اس کی بات نظر انداز کرتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

”میں آپ کو ڈراپ کروں؟“ پارکنگ میں آکر تیمور کو نئی بات سوچھی۔

”آپ۔! ماورا پہلے رکی، ٹھکی۔! اور پھر بے ساختہ ہی اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”اوکے۔! اس نے کہتے ہوئے قدم تیمور کی گاڑی کی طرف بڑھادیے تھے۔ اور وہ بے یقین سا اس کے پیچھے آتے ہوئے گاڑی کلاک کھولنے لگا۔

اور آج پہلی بار اس کے ساتھ اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے ماورا کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ حالانکہ وہ پہلے بھی ایک دو بار اس کے ساتھ فیکٹری آئی اور کئی تھی لیکن اس طرح تنہا نہیں۔ تب ڈرائیور یا فاروقی صاحب



ساتھ ہوتے تھے۔ جبکہ آج تو صرف وہ دونوں ہی تھے۔

”فارہ نے کیوں انوائٹ کیا؟ کہیں اس کا برتھ ڈے وغیرہ تو نہیں ہے؟“ تیمور کا اشارہ اس کے خریدے گئے کفشوں کی طرف تھا۔

”نہیں۔! وہ دراصل میں جب سے کراچی آئی ہوں۔ آج پہلی بار اس کے گھر جا رہی ہوں۔ اس لیے یہ سب۔“  
ماورا نے آخری جملہ ادھر اچھوڑ دیا تھا۔

”اوہ۔! یعنی جب پہلی بار کسی کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ یہ سب لے کر جانا پڑتا ہے۔“ اس کا اشارہ پچھلی سیٹ پر رکھے شاپنگ بیگز کی طرف تھا۔

”نہیں۔! ایسا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب صرف دو چیزوں پہ ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ایک آپ کے تعلقات پر اور دوسرے آپ کے طبقے۔“ ماورا نے اس کی بات کی نفی کی۔  
”میں سمجھا نہیں۔؟“ وہ گاڑی روڑ پہ ڈالتے ہوئے بولا۔

”میرا مطلب ہے کہ یہ سب آپ اسی کے لیے لے کر جاتے ہیں جس کے ساتھ آپ کے اچھے تعلقات ہوتے ہیں جس کے ساتھ آپ کلوز ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سب مل کلاس کے چوتھے ہیں۔ اپر کلاس میں یہ سب تکلفات نہیں پائے جاتے۔ اس لیے یہ سب صرف دو چیزوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے آپ کے تعلق اور طبقے تک۔“ ماورا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہوں۔! تو یہ سب لے کر جانے کے لیے کسی کے ساتھ کلوز ہونا یا مل کلاس ہونا ضروری ہے؟“ اس نے گردن موڑ کر ماورا کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔! کہہ سکتے ہیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”تو پھر یہ بتائیے کہ میں بھی کسی کے لیے یہ سب لے کر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کسی کے ساتھ کلوز ہونا چاہیے یا کسی کے لیے مل کلاس ہو جانا چاہیے؟“ اس نے ماورا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کسی کے ساتھ کلوز ہونا اور اپنی کلاس بدلنا دونوں ہی انسان کے اختیار میں نہیں۔“

”کیسے بھلا۔؟“ تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ضروری نہیں۔ آپ جس سے قریب ہونا چاہیں وہ آپ کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دے اور جس کلاس میں آپ پیدا ہوئے ہیں پرورش و تربیت ہوئی ہے۔ آپ انہیں بھی چلے جائیں۔ آپ وہی رہیں گے۔“

تیمور نے کندھے اچکاتے ہوئے سامنے ونڈا سکرین پر نظرسنجمادس۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ ماورا نے اسے چند منٹس متواتر خاموش دیکھ کر استفسار کیا۔

”میری کہ مل کلاس میں کیسے شامل ہوا جائے؟“ وہ اپنے لہجے کی شرارت دبا نہیں سکا تھا۔ اور اس کے اس شرارت بھرے لہجے پہ ماورا نے بے اختیار اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ اور اسے اب کی بار بھی وہ کچھ بدلا ہوا سا نظر آیا تھا۔

جبکہ تیمور ونڈا سکرین کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس کی نظروں کی محویت نوٹ کر چکا تھا۔

”میری لک چیچنگ لگ رہی ہے نا؟“ اس نے ماورا کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔ اور ماورا اس کے سوال پر گڑبڑا گئی تھی۔

”اور کچھ نہیں کیا۔ بس کنگ کر دے آیا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ تیمور اس کی نظروں کی محویت اور پھر اس کے یکدم گڑبڑا کر نکلنے ہوئے پہ اچھا خاصا لطف اندوز ہوا تھا۔ اسی لیے اس کا موڈ شرارت پہ آدھ ہو رہا تھا۔

”یہ کیسا لگ رہا ہوں؟“ اس نے اپنے چہرے کا رخ ماورائی سمت موڑا۔  
 ”آئینہ نہیں دیکھا؟“

”نہیں! جلدی میں تھا۔“ وہ مزے سے بولا۔

”لیکن ہیرسلون کی تو ہر دیوار پر نکس آئینے ہوتے ہیں۔ جلدی میں بھی دیکھ لیے جاتے ہیں۔“  
 ”لیکن جو آئینہ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔“ اس کا لہجہ نرمی ہوا۔

”تو اب گھر جا کر دیکھ لیجئے گا۔“ ماورائے لاپرواہی دکھائی۔

”اب گھر جا کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ آئینہ میں نے راستے میں ہی دیکھ لیا ہے اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ میں اچھا لگ رہا ہوں۔“ آخر میں وہ مسکرا اٹھا تھا۔

”اور کتنی دیر سے فارہ کے گھر پہنچے ہیں؟“ وہ بات ہی بدل گئی تھی۔

”لیجئے۔۔۔ پانچ گئے فارہ کے گھر۔“ اس کے چند سیکنڈ میں تیمور نے اسپید کم کرتے ہوئے گاڑی سیدھی آفاق بردانی

کے گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی تھی۔

”تھینک یو!“ ماورا مزید کچھ کہے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔ تیمور بھی تیزی سے نیچے اتر آیا تھا اور

پچھلا دروازہ کھول کر اس کے شاٹنگ بیک نکال کر اس کو تھمائے تھے۔

”تھینک یو!“ تیمور نے بھی شکریہ ادا کیا۔

”فارواٹ!“ وہ ٹھہری۔

”یہ نہیں بتا سکتا۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ اور ماورا اس کے جواب پہ سی ہو گئی۔

”اوکے! میں چلتا ہوں۔“ کل آفس میں ملاقات ہوگی۔“ وہ کہہ کر پلٹ گیا تھا۔ دوسری سائیڈ سے جا کر

ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا اور ابھی گاڑی اشارت کر رہی رہا تھا کہ ماورا پھر گاڑی کے قریب آگئی تھی۔ تیمور نے تیزی

سے فرٹ سیٹ کا شیشہ نیچے کیا۔

”یہ آپ کے لیے!“ اس نے ایک بیگ سیٹ پہ رکھ دیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ تیمور کو خیال ہی نہ رہا۔

”گفٹ!“ اس کا جواب یک لفظی تھا۔

”مگر کس لیے؟“ تیمور نا سمجھی سے بولا۔

”یہ نہیں بتا سکتی۔“ اس نے تیمور کے الفاظ اسے لوٹا دیے تھے۔

”یعنی مجھے خود ہی سمجھ جانا چاہیے۔“ وہ بے انتہا خوش ہوا تھا۔

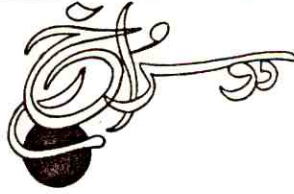
”خدا حافظ!“ وہ کہہ کر پلٹ گئی تھی۔

اور تیمور نے وہی گرے شرٹ اپنے لیے دیکھتے ہوئے بے اختیار بڑی سرشاری سے گاڑی اشارت کرتے

ہوئے آگے بڑھادی تھی آج اس کا اتوار بہت خوب صورت ثابت ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





گلاس بھر کر لائی اور ثریا بیگم کی جانب بڑھایا۔  
 ”لے پانی پی! اور بتا سب خبر تو ہے۔“ ردا سے  
 گلاس لے کر انہوں نے بیٹی کے لبوں سے لگایا جس  
 نے ایک گھونٹ لے کر گلاس برے کیا اور اپنی جانب  
 دیکھتی سوالیہ نظروں کو محسوس کرتے ہوئے وہ پھٹ  
 پڑی تھی۔

”میں۔۔۔ میں اب اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گی،  
 جینا دو بھر کر دیا ہے میرا ان لوگوں نے دم گھٹتا ہے میرا“

جب تک سولہ مجھے الگ گھر لے کر نہیں دیں گے میں  
 نہیں جاؤں گی۔“ اس کے ان جملوں سے گھروالوں کی  
 پریشانی اور بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”بات کیا ہے؟ اپنی بہن کی آنکھوں میں کسی کے  
 بھی دیے گئے آنسو میں ہرگز برداشت نہیں کروں  
 گا۔“ معاذ غصے سے آگے بڑھ کر بولا۔

”صرف ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے شادی کو، لیکن ہر کوئی  
 مجھے یوں ٹریٹ کرتا ہے جسے شادی کو دس سال ہو گئے  
 ہوں۔ شادی کے تیسرے دن ہی بچکن میں تین ٹائم کا  
 کھانا پکانے پر لگا دیا ساس صاحبہ نے یہ کہہ کر کہ وہ گھیا  
 کی مریضہ ہیں اور اب اس گھر کی مالکن میں ہوں، لہذا  
 اب گھر میرے حوالے، سر صاحب کو صبح ہی صبح ناشتا  
 چاہیے کیونکہ وہ شوگر کے مریض ہیں۔ بھوک  
 برداشت نہیں کر سکتے۔ گھر کی مالکن نہیں میں تو گھر کی  
 نوکرائی بن گئی ہوں وہ بڑی دوندیں ہیں تو بیاہی مگر میری  
 بد قسمتی کہ دو گلیاں چھوڑ کر ان کا سرسرا ہے جب  
 دیکھو منہ اٹھا کر اپنے بچوں کے ساتھ آجانی ہیں یہی

صبح کے وقت ہر کوئی اپنی مصروفیت میں گم تھا جب  
 کوئی بیرونی گیٹ کے چھوٹے داخلی دروازے سے اندر  
 داخل ہوا دودھ والا ابھی دودھ دے کر گیا تھا لہذا گیٹ  
 کھلا ہوا تھا داخل ہونے والے وجود پر نظر پڑنے پر  
 ہر کوئی اپنی جگہ ٹھم سا گیا تھا بالکل ایسے جیسے چلتی فلم کو  
 ریموٹ کے ذریعے اسٹاپ کا بٹن دبا کر روک دیا  
 جائے۔ چھوٹی انیم، ثریا بیگم اور بچکن کی کھڑکی میں سے  
 دیکھتی ردا ہر کوئی اپنی جگہ ٹھنک کر رہ گیا۔ ابھی ڈیڑھ  
 مہینہ قبل ہی دھوم دھام سے رخصت کی جانے والی  
 زارا آج زرد چہرہ گرید زاری سے سوچی آنکھیں، لہجے  
 بالید، نگاہ جالیہ، انداز میں شکستی لیے یہ وہ نوبیا تھا تو ہرگز  
 نہ تھی۔

”اماں!!“ لڑکھڑاتی چال کے ساتھ وہ برآمدے میں  
 تخت پوش پر بیٹھی اماں کی جانب بڑھی اور ان کے گلے  
 لگ کر ہبھک ہبھک کر رونے لگی، یہ صورت  
 حال گھروالوں کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن گئی۔  
 معاذ اور بچکن میں سے ردا اس کے پاس آن کھڑے  
 ہوئے۔ سب کی آنکھیں سوالیہ تاثرات لیے ہوئے  
 تھیں۔

”یا اللہ خیر! کیا ہوا اسعد ٹھیک ہے؟“ ثریا بیگم نے  
 یوں روتی ہوئی بیٹی سے گہرائے ہوئے انداز میں  
 پوچھا۔ ظفر صاحب بھی اٹھ کر پاس چلے آئے تھے۔  
 ”ارے کچھ بتا تو، میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے، ارے  
 کوئی پانی پلائے اسے بھی اور مجھے بھی، رانا جلدی بول  
 ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“ انہوں نے بلکتی رانو  
 کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا، ردا جلدی سے پانی کا

نہیں اپنی سسرال میں سے کسی نہ کسی مہمان کو بھی ساتھ لے کر آتی ہیں کہ بھابھی سے ملنے کا شوق تھا ان کی خاطر مدارت بھی کرو اور مسکرا مسکرا کر ان کے مہمانوں کا بھی خود سے ملنے کا شوق پورا کرو۔ ایسے میں اگر ہمارا کہیں باہر جانے کا موڈ ہو تو کوئی نہ کوئی بھانجا بھانجی لاڈ لے اٹھتے ماموں کے ساتھ دم چھلان کر ساتھ ہو لیتے ہیں۔ شاپنگ کروں تو مندوں کی تنقید بھابھی یہ کیا اٹھالا میں اس کی توقیت دکان دار نے زیادہ وصول کی ہے مجھے شاپنگ کا سلیقہ نہیں اچلی دفعہ جب شاپنگ پر جاؤں تو سعاد کے بجائے کسی مند کے ساتھ جاؤں۔ یہ میری ساس کا فرمان ہے۔ ہر کام میں کیڑے نکالے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ دوغلا جملہ کہا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس گھر کے اطوار سیکھ جائے گی اور اب تو حد ہی ہو گئی ہے میں اور سعاد ہنی مون کے لیے تین دن کے لیے مری جانا چاہتے ہیں میں نے اپنی ساری سلامی اس کے لیے بچا کر رکھی ہے جب یہ بتا چلا تو میری مند اور چھوٹا دیور بھی تیار ہو گئے کہ ہم بھی

ساتھ جائیں گے، مجال ہے جو سعاد نے منع کیا ہوا لٹا وہ میری دونوں بیابانی مندوں کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ رات اسی بات پر جھگڑا ہوا اور صبح دیکھتے سر کے ساتھ میں نے چھوٹی مند صاحبہ کو کہا کہ وہ آج ناشتا بنادے میرے سر میں درد ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ جی آج تو میرا بہت اہم میٹ ہے لہذا مجھے کالج جلدی جانا ہے، سعاد کو بتایا تو وہ الٹا مجھے یہ خفا ہونے لگے کہ میں ان کے گھر والوں کو اپنا نہیں سمجھتی، اپنی ذمہ داریاں نہیں سمجھتی بس ہر وقت شکایتوں کا دفتر کھولے بیٹھی رہتی ہوں وغیرہ وغیرہ اور جو میں نے غصہ میں کہہ دیا کہ بس اب مجھے اس گھر نہیں رہنا تو اسی وقت گاڑی میں بٹھا کر یوں میاں دہلیز پر اتار کر چلے گئے۔ ”زارا عرف رانو نے روتے بلکتے اپنا دکھڑا سنایا۔ معاذ اور ظفر صاحب کا تو غصہ سے برا حال ہو گیا تھا یہ سب سن کر، اس گھر کی پہلی لاڈلی اور چمیتی بیٹی کی اتنی نا قدری۔ انہیں رانو اپنی جگہ درست لگی۔

”کوئی ضرورت نہیں تمہیں وہاں جانے کی، مجھے اپنی بیٹی بھاری نہیں ہے جب تک وہ لوگ ناک رگڑتے اس در پر آکر تمہیں منا کر نہ لے کر جائیں تم یہیں رہو گی بیٹی دی ہے ہاتھ کاٹ کر نہیں کب یہ معاملہ ہمارے طریقے سے ہی بننے کا سعاد تمہیں جب تک الگ گھر لے کر نہیں دے گا تم یہیں رہو گی۔ انور ڈ کر سکتا ہے وہ دوسرا گھر ورنہ دو وقت کی روٹی بھاری نہیں مجھے اپنی بیٹی کی۔“ ظفر صاحب نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ اور زارا کے چہرے پر باپ کی طرف سے پائی جانے والی شہ پر سرخی چھلکی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے زارا یہیں رہے گی سعاد کو اب جو بات کرنی ہے ہم سے کرے اس کی ہمت کیسے ہوئی



زارا کو یوں --- چھوڑ کر جانے کی اب ہم اس سے بات کریں گے۔ ”معاز نے بھی جذباتی ہوتے ہوئے ظفر صاحب کے فیصلے کی تائید کی تھی اور زارا کے شکست خوردہ وجود میں گھر والوں کا حوصلہ دوڑنے لگا تھا۔

مند کا اگلے روز بھی ضروری میسٹ تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو بڑھ لے گی، ”آج یقیناً“ اس کی مجبوری ہوگی جو اس نے ناشتا بنانے سے انکار کیا اور یہ بھانجا بھانجی کا کیا لگہ وہ تو اپنے ناموں کے ساتھ ویسے ہی آتے جاتے ہیں جیسے ان کے ناموں نے شروع سے انہیں رکھا ہے اور یہ بنی مون کا کیا تماشا ہے، ”کوا چلا“ بس کی چال اپنی بھی بھول گیا، یہ مونے انگریزوں کی لعل کرنے کا یہی انجام ہے وہ تو شتر بے مہار ہوتے ہیں نہ گھر میں ماں باپ بہن بھائی بس منہ اٹھا کر بنی مون منانے چل بڑو بلکہ اس سے زیادہ اچھا تو یہی ہے کہ پوری فیملی مل جل کر کہیں گھوم آئے ایکلے دو منہ اٹھائے جنگلوں میں کھومتے پھو کیا اپنی روا اور معاز گئے ہیں؟ جو تم رات بھر شوہر سے بے بنیاد بات پر لڑتی رہی ہو اگر معاز اور روا جارہے ہوتے بنی مون پر اور تم سب بھی جانا چاہتے تو کیا معاز بھی دو ٹوک انکار کر کے اپنی بیوی کی باتوں میں بائیں ڈالے چل پڑتا، برداشت کرتے تم سب یہ؟ تم نے ہماری تربیت کی خوب لاج رکھی، عورت گھر بساتی ہے صبر سے، حوصلے اور برداشت سے، آج قربانی دو گی کل پھل پاؤ گی۔“

ثریا بیگم نے بارعب آواز میں ظفر صاحب اور معاز کو ٹوکتے ہوئے زارا کے لئے لیے۔ ”ثریا بیگم کی باتیں سن کر ہر کوئی چپ چاپ کھڑا رہ گیا تھا زارا تو حیران پریشان مال کاغصے بھرا لپچر سن رہی تھی۔

”معاز گاڑی نکالو ابھی اسی وقت میں اسے گھر چھوڑ کر آؤں اور آئندہ اگر تم شوہر سے لڑ کر آئیں تو گھر میں گھسنے نہیں دوں گی اور خبردار جو اپنے سسرال کی برائیاں آکر یہاں لیں۔“ ظفر صاحب کا غصہ تو ثریا بیگم کی سچی کھری باتیں سن کر جھگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”معاز سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے۔“ ثریا بیگم نے سختی سے معاز کی بات کاٹی۔

”جلدی کرو تمہیں بھی آفس جانا اور سعاد کے آفس جانے سے پہلے اسے وہاں ہونا چاہیے۔“

”بس! اب ایک لفظ اور نہیں، یہ اب اس گھر کی بیٹی نہیں ہے بلکہ اس کا اصل گھر وہی ہے جسے یہ اپنی بچکانہ اور بے وقوفانہ باتوں سے چھوڑ کر آئی ہے اور حیرت تو مجھے آپ کی عقل پر ہو رہی ہے بچہ اگر نادانی اور نا سمجھی میں دھمکتا کو نہ پکڑنا چاہے تو اسے پکڑنے دیا جاتا ہے؟ یہ بھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے، دل میں بغض رکھنے کی تو ان لوگوں کی ہر بات الٹی ہی نظر آئے گی۔ کب دی تھی میں نے اسے بدگمانی کی عینک جینز میں جسے لگا کر یہ ان کے ساتھ میرا بندھ رہی ہے ٹھیک ہی تو کیا اس کی ساس نے یہ گھر کی مالکن ہے اور عورت کے گھر میں اس کی حکمرانی پرنے سے ہی شروع ہوتی ہے سیاہ سفید کی مالک ہے یہ وہاں پر جو چاہے پکائے جو چاہے کھائے، حکمران تو بنادیا اس کی ساس نے اپنی گھر کی، جس کی ایک ایک اینٹ اس نے کتنی محنت سے لگائی ہوگی اب اگر اس گھر کے طور طریقے وہ سکھاتی ہے تو اسی کا بھلا ہے اور رہی بات نندوں کی تو شادی کے شروع کے دن ہیں نئی بھانجی ہے ان کا شوق ہے چاہ ہے ان کی محبت ہے جو اپنا گھر بار پھوڑے اس کی مدد کو چل آتی ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب نارمل ہوتا جائے گا اور جتنا رونا کھو کھو تیری ندیں کام میں تیرا ہاتھ نہیں بٹاتیں؟ اس روز جب میں تم سے ملنے گئی تھی تو تمہاری بڑی نند کپڑے دھونے والی مشین لگا کر تمہارے ہی خیال کے کپڑے دھو رہی تھی اور دونوں نندیں کچن میں تمہارے ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ سعاد نے اس روز اپنے دوستوں کی اچانک دعوت کی تھی تمہاری ساس نے اپنی دونوں بیابا بی بیٹیوں کو فون کر کے تمہاری مدد کے لیے بلوایا تھا۔ تمہاری جیسی ہوتیں تو نکا سا جواب دے دیتیں۔ اپنا گھر بار اور کام کاج چھوڑ کر بھانجی کی مدد کو کیوں آئیں، اور تمہاری چھوٹی



بدگمانی کے رہے سے بابل بھی چھٹ گئے اس نے اعتراف کرنے اور معافی مانگنے میں تامل نہ کیا اور سر جھکاتے ہوئے سعادت سے بھی سوری کی۔

”آئی ایم سوری تو مجھے بھی ایک دم اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سوری آئی اور معاذ ہمارے وجہ سے

آپ لوگوں کو پریشانی ہوئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

سعادت نے بھی کھلے دل سے معذرت کی اور معاذ نے ہڈھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر پرسکون ہو چکا تھا اور خوش تھا۔ زارا جھٹ سے کچن

کی جانب بڑھ گئی۔

اور ثریا بیگم سب کو پرسکون اور مسرور دیکھ کر سوچ رہی تھیں کہ آج اگر وہ بروقت درست فیصلہ نہ کرتیں

تو تو ازل بڑا جاتا زارا کی حالت اس کے رونے پر وقتی طور پر انہیں بھی بے حد غصہ آیا تھا مگر جیسے ہی ان کی نظر معاذ

کے پیچھے خاموش کھڑی ردا پر پڑی انہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آیا۔ زارا اور معاذ کی انکھی شادی

ہوئی تھی انہوں نے بھی شادی کے تیسرے روز ہی ردا کو کچن سنبھالنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اب گھر کے کام

ان سے نہیں ہو پاتے تھے وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور آج صبح ہی روانے بھی انعم کو ناشتا بنانے کا کام تھا کہ

اس کے سر میں درد ہے مگر انعم نے کالج جلدی جانے کی وجہ سے منع کر دیا تھا جس پر وہ خاموشی سے کچن کی

جانب بڑھ گئی تھی۔ ایسے ہی چھوٹے موٹے گھٹے شاید ردا کو بھی ان سے ہوں گے اور اگر آج وہ زارا کا ساتھ

دے دیتیں اس وقت سختی سے پیش نہ آتیں تو ردا کی آنکھوں میں نمودار ہوتی شکایت وہ کبھی نہ دور کر

پاتیں۔

وہ مطمئن انداز میں معاذ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اپنے گھر کی جانب جارہی تھیں جہاں ردا ان سب کے

لیے مزے دار ناشتا بنا کر ان کی منتظر تھی اس وقت ایک پرسکون مسکراہٹ زارا کے لبوں پر تھی اور ویسی

ہی مسکراہٹ ردا کے لبوں پر تھی اور دونوں کی مسکراہٹ کا تصور ثریا بیگم کے لبوں پر بھی دھیمی سی

پرسکون مسکان لے آیا تھا۔

ماں کا سخت انداز دیکھ کر زارا پھر سے رونے لگی تھی اسے امد نہ تھی کہ اماں اس کے ساتھ یوں پیش

آئیں گی لیکن دل ہی دل میں وہ اماں کی باتوں کو سوچ کر شرمندہ بھی ہو رہی تھی پائی دونوں ہاتھوں سے بچتی

ہے اس بات کی وہ قائل تھی اور رات بھر وہ جس طرح سعادت کے ساتھ لڑتی رہی اور صبح بھی وہ کتنی بدتمیزی

سے بولی تھی وہ سب اب یاد کر کے اسے شرمندگی ہو رہی تھی واقعی اسے محل کے ساتھ کچھ وقت دینا

چاہیے، خود کو بھی اور اپنے سرال کو بھی۔

”اے آئی آپ! ہم لوگ تو بس زارا کو لینے ہی آ رہے تھے۔“ جب وہ لوگ زارا کے سرال پہنچے تو

بڑی ننگیٹ پر ہی مل گئی بہت تپاک سے وہ انہیں لاؤنج میں لے کر آئی جہاں اپنے والدین کے پاس سعادت

سر جھکائے بیٹھا تھا، زارا کی ساس نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے زارا کو اپنے قریب بٹھا کر پکار کیا۔

”کان کھینچے ہیں میں نے اس احمق کے اور اب یہ بین کے ساتھ تمہیں لینے آتا ہی والا تھا اگر تم کسی

بات پر ناراض ہو گئی تھیں تو نہ ماننے کے بجائے تمہیں یوں میٹھے کے باہر چھوڑ کر چلا آیا، حد ہوتی ہے بے وقوفی

کی، بین کو فون کر کے میں نے ہی بلایا ہے۔ تم تو جانتی ہو یہ موٹھنیا کا مرض، ورنہ میں خود آتی اپنی پری کو لینے

صبح سے پورا گھر بے رونق ہوا، اے۔“ زارا کی ساس نے بے حد پیار سے بات کرتے ہوئے اپنی بڑی بیٹی کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بین سب کے لیے چائے بناؤ۔“

”آئی ایم سوری مجھے بھی یوں آپ کو بتائے بغیر نہیں جانا چاہیے تھا۔ غلطی صرف ان کی نہیں میری

بھی ہے چھوٹی سی بات بس میں نے ہی برصاوی میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ آپ سب کو مجھ سے شکایت

نہیں ہوگی، کوشش کروں گی کہ ایسی غلطی دوبارہ نہ ہو آپ نے انہیں ڈانٹا ہے اور مجھے امی نے بہت ڈانٹا ہے

ہم دونوں کو تو صبح صبح ڈانٹ کا ناشتا مل گیا ہے اب میں سب کے لیے مزے دار ناشتا بنا کر لاتی ہوں آئی ایم

سوری سعادت۔“ ساس کی بات سن کر زارا کے دل سے



”بارہ من کی دھون بن جاؤ گی“ کہہ کر ڈراتی جو تھیں اور لمبے سارے کاسارا گول پکوں پر آن گرا۔

”اف گول گئے۔“ اس نے آہ بھری۔ گول پکوں سے شروع ہونے والے لیکچر کا سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ وہ تین بجوں کی ماں بن گئی مگر مجال ہے جو ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری میں رتی بھر فرق آیا ہو۔ سب سے پہلے چنورے پن کو الوداع کہا پھر کھٹی میٹھی چیزیں چھوڑیں۔ پھر ہلکے پھلکے کھانوں پر آئی اب تو وہ آدھی ڈاکٹر نہ

سہی نرس تو بن ہی چکی تھی۔۔۔ دو سالہ بیٹے کو ہلکا سا نمبر پچھڑا ہوا فائنٹ نکلا دیتی۔۔۔ کیل پول کا پتچ دیتی۔ کھانسی ہوتی تو دوس سینے پر ملتی۔۔۔ کوئی نہ کوئی کف سیرپ بھی اٹھا کر ملا دیتی۔۔۔ چوٹ لگ جاتی تو آئیوڈینس کا مساج کرتی۔۔۔ بی پی آپریٹس کے استعمال سے انجکشن لگانے اور فرسٹ ایڈ کے سارے کام اسے ”منہ زبانی“ آتے تھے۔ اس کی نو سالہ بیٹی ناملہ کو۔

خوب چھینکیں آرہی تھیں علیحدہ کادل چاہا کرارا پھٹر لگائے، غصے سے اس کو بلایا۔

”بے وقوف سارا دن کھٹے لائے کھائے ہیں نزلہ تو ہونا ہی تھا کیسے چھینکیں۔ چھینکیں مارے جارہی ہو۔ میں قہوہ بنا کر دیتی ہوں اور ساتھ میں اینٹی الرجک بھی۔۔۔ یہ لو۔“ علیحدہ نے سفید گولی اس کے ہاتھ پر رکھی۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں، وہ آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔

”اماں! ہماری نیچر تو کہتی ہیں کہ مائٹوں میں وٹامن سی ہوتا ہے کیا وٹامن سی سے نزلہ ہو جاتا ہے؟ اور یہ

”ڈاکٹر سے شادی کیا ہوئی ہر چیز ہی اینٹی کی پلیٹ میں آگئی۔ ہر وقت ادویات، پریزیر، احتیاط“ علیحدہ نے سوچا۔

شادی سے پہلے گول پکوں، ذہی بھلے پاپڑی چاٹ کے ارد گرد زندگی گھومتی تھی۔ شادی کے بعد میاں سے پہلی فرمائش کی بھی تو یہ کہ ”سنا ہے آپ کے ہاں کے گول گئے بہت مشہور ہیں۔“ یہ تو علیحدہ ہی جانتی تھی کہ گول گئے کتے ہوئے صرف منہ ہی گول نہیں ہوا بلکہ آنکھوں میں اہلی کے پانی کا تصور کرتے ہی شرارے سے پھونٹنے لگے۔ منہ سے رال نکلنے لگی۔

واہ۔۔۔ گول گئے۔۔۔ خوب کھٹے پانی کے ساتھ۔۔۔ وہ تصور میں گول گئے دیکھ رہی تھی۔

”کیا کہا؟ گول گئے۔۔۔ واٹ ٹان سینس، جانتی ہو بازار کی گندی اور مکھیوں والی اشیاء کھانے سے کتنی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

وہ خشمگین انداز میں دیکھتے ہوئے بولے۔

”کوئی نہیں، میں نے تو ہفتے میں دو دو سو روپے کے گول گئے کھائے ہیں۔ مجھے تو کبھی کچھ نہیں ہوا، بلکہ ہاضمے کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں۔“ اب ڈاکٹر میاں کا ٹاکرا وکیل کی بیٹی سے تھا۔

”جہیں کبھی کچھ نہیں ہوا؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ علیحدہ خواجوا شرا گئی۔ ”دیکھو تو کتنی کمزور ہو۔ وزن کیا ہے کبھی؟“

”اف“ علیحدہ نے سر پیٹا (اینا) شادی سے پہلے دو ہزار مینے کے دے کر جم جوائن کیا ڈانٹنگ کی ہر چینی اور مرغن چیز سے منہ موڑا کہ باجی سارا وقت





انتقال ہو گیا ہے وہاں گئی ہیں ابائے کمرے سے نکل کر اسے بتا دیا وہ اپنے ابائی شکل دیکھتی رہی۔  
 ”ابا کس کا؟“ اس نے دوبارہ سوال کیا۔  
 ”آپ کی آنٹی مہرین جو کل ہمارے گھر آئی تھیں۔“ ابائی آواز میں بھی سوگ اور دکھ تھا۔  
 ”بابا انتقال فوت ہوئے کو کتنے ہیں ناں؟“ اس نے سہم کر پوچھا۔

ابنٹی الرجب کیا ہوتا ہے؟“  
 ”زیادہ باتیں نہ کرو اور گرم لحاف میں لیٹ جاؤ۔“  
 علیہ نے اسے گھر کا صبح نائلہ اٹھی تو اس کا جسم بخار میں جھنک رہا تھا۔ نائلہ نے ہاتھ لگایا تو گویا آگ کی بجھتی میں جل رہی تھی۔  
 ”اف تمہیں بخار ہو گیا ناں۔!“ علیہ نے حسب عادت ڈانٹا۔

”لیکن میں نے تو رات ابنٹی الرجب لی تھی ماں نائلہ منمنالی، علیہ نے تھرا میٹر سے بخار چیک کیا۔  
 ”اوہ میرے خدایا ایک سو دو۔“ علیہ نے فوراً چائے پائے دیے اور ساتھ ہی بڑا سا کیپول بھی۔

کیپول دیکھ کر نائلہ گھبرا گئی۔  
 ”اماں یہ کیا ہے!“  
 ”بیٹے یہ ابنٹی بایونک ہے۔ انفیکشن کنٹرول کرنے کے لیے۔“

”جی بیٹے“ ایک لمحے کے لیے ابائے کما ”زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تو موت ہے جس کا ہم اپنی اولاد کو بتانا اس کے لیے تیار کرنا تو دور کی بات مہرین لیتا بھی پسند نہیں کرتے۔“ ابائے خود کلامی کی۔  
 ”بابا آنٹی مہرین تو بالکل ٹھیک تھیں۔ ابھی کل تو انہوں نے ہمارے گھر میں اتنے سارے ہی بھلے اور فروٹ چاٹ کھائی تھی۔ وہ تو بیمار نہیں تھیں وہ کیسے فوت ہو گئیں۔؟“ اس کا چھوٹا سا دل بری طرح سہا ہوا تھا۔ ایک جیتا جاگتا، ٹھیکٹا کھانا انسان موت کے منہ میں کیسے جا سکتا ہے، یہ تو اس نو سالہ بچی نے سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن خبر بہت بڑی تھی اس نے پھر باپ سے سوال کیا۔

”ابا ان کو کیا ہوا تھا، وہ آپ سے کون سی دوا لینے آئی تھیں!“  
 ”بیٹے انہیں ذہنی بیماری تھی اور وہ مجھ سے ابنٹی ڈپریشن لینے آئی تھیں۔“  
 ”ابنٹی ڈپریشن؟“ وہ کیا ہوتا ہے ابائے؟“

”بندہ جب بہت زیادہ سوچتا یا پریشان رہتا ہے تو جو دوا دیتے ہیں اسے ابنٹی ڈپریشن کہتے ہیں۔ انہوں نے وضاحت کی۔  
 ”ابا! ڈاکٹر پر بیماری کی دوا ابنٹی سے شروع کرتے ہیں۔ تو آپ نے ان کو ایک گولی ابنٹی ڈنٹھ کی بھی دے دیتا تھی۔ کیا دوا آپ کے پاس نہیں ہے؟“  
 اس کے اس سوال پر ایک آنسو ابائی آنکھ سے نکلا۔

دوائے کرنا نائلہ لحاف میں لیٹ گئی ابھی تین چار دن پہلے ہما کھیتے کھیتے میڈیٹھوں سے گرمی پا رہی سڑک کی طرف سیڑھیاں نکلتی تھیں۔ اس کے کھنڈے پر خوب رگڑ لگی تھی۔ اس وقت بھی اماں نے ابائے سے پوچھے بغیر کوئی دوا دی تھی اور ٹیکا لگوا دیا تھا۔ پتا نہیں کیا نام تھا اس کا؟ ابنٹی امینٹی سپیشک ہاں اماں نے کہا تھا ابنٹی سپیشک لے لو، ورنہ زخم خراب ہو جاتا ہے اور کمپاؤنڈ کو بھیج کر ایک انجکشن بھی لگوا دیتا، عجیب سا ہی نام تھا۔ سپیشنس۔ نہیں نہیں ٹینشنس کا ٹیکا پتا نہیں کب دوائے اثر کیا اور وہ فینڈ کی گود میں جا چکی۔  
 آنکھ کھلی تو طبیعت عجیب سی تھی۔ ہما اور مہران کی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر صحن میں آئی۔ اماں بھی غائب تھیں۔ اس نے گھبرا کر آواز دی، پسینے اور بخار اترنے سے وہ بہت نقاہت محسوس کر رہی تھی۔

”اماں۔۔۔ اماں آپ کہاں ہیں؟“  
 ”آپ کی اماں کی دوست تھیں ناں مہرین آنٹی ان کا“  
 ”نہیں بس یہی ایک بیماری ہے جس کا علاج یا دوا کسی کے پاس نہیں ہے۔“





آس،

اک صحر

جس کے ذرے پھٹتے پھٹتے

میری انگلیاں شل ہو جائیں گی

ایک سمندر

جس کے جُرعے پیٹتے پیٹتے

میری سانس اُکھڑ جائے گی

شکِیبِ جلالی

کس کارن اتنے رنگوں سے یاری کس کارن یہ دھنگ  
بٹنے رنگ بھی چاہو زینت میں بھرو موت کا ایک رنگ

نام و نمود سے اتنی دُوری ٹھیک ہے لیکن آخر کیوں  
سارے جہاں سے قوسِ قزح کا رشتہ اپنے آپ سے جنگ

ہل میں دھجی دھجی بکھرنے والی ایسی ہے یہ زینت  
اک سے زیادہ پتھوں کے ہاتھوں میں جیسے کئی پتنگ

عمر بتادی اپنوں اور عزیزوں کے نقش بنانے میں  
جب اپنی تصویر بنانا چاہی پھیکے پڑ گئے رنگ

میں اک کھٹنے والا مجھ کو بنانا، یاد احمد پرویز  
لوح و قلم سے آگے بھی ہے کیا، یہ دُنیا اتنی تنگ

صابر ظفر



کچھ حقیقت تو ہوا کرتی تھی انسانوں میں  
وہ بھی باقی نہیں اس دور کے انسانوں میں

وقت کا میل بہا لے گیا سب کچھ ورنہ  
پیار کے ڈھیر لگے تھے مرے کھلیاؤں میں

شاخ سے کٹنے کا غم ان کو بہت تھا لیکن  
پھول مجبور تھے، ہنستے رہے گل دانوں میں

ان کی پہچان کی قیمت تو ادا کرنی تھی  
جانتا ہے کوئی اپنوں میں نہ بے گانوں میں

سر ہی ہم پھوڑے جائیں تو کہاں جائیں گے  
کھو کھلے کا بیج کے بُت ہیں ترے بُت خانوں میں

سعید احمد اختر

بے اختیار رہنا، بے اختیار رکھنا  
عشق و جنوں کو یوں نہیں سر پر سوار رکھنا

تم سے بچھڑنے جاؤں اس غم کے شب کسے میں  
تم دل کے آئینے میں مجھ کو اتار رکھنا

ہم ایک ہوں گے ایک دن پختہ یقین ہے مجھ کو  
تم میری چاہتوں کے گیسو سنوار رکھنا

تیری نظر سے پی کر جو بے خبر پڑے ہیں  
آنکھوں میں ان کی اپنا قائم خمار رکھنا

جتنے ہیں درد دل میں کاغذ پر تم اتارو  
منظر نہیں مناسب دل میں غبار رکھنا

شعیب منظر



### شکایت

گئے اور کافی دیر اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔  
کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا  
پھر شطرنج کی بسات چھ گئی۔ کئی گھنٹوں بعد جب پروفیسر  
صاحب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رما  
پوچھا۔

”کھرب تو سب خیریت ہے نا؟“

پروفیسر صاحب چونکا اٹھے۔

”خوب یاد دلایا تم نے۔۔۔ اصل میں میں تمہیں  
لینے آیا تھا۔ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔“  
نوشاہ فضل۔ کھاریاں

### قابلیت

ایک دن شریف کا بڑی اس کے پاس آیا اور بولا۔  
”ڈراما نگدہا کچھ دیر کے لیے دے دیں۔“  
”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو گدھا نہیں مل سکتا،  
کیونکہ آج صبح ہی ایک صاحب گدھا مانگ کر لے  
گئے ہیں۔“ شریف نے معذرت کی۔

جس وقت شریف یہ بات کہہ رہا تھا عین اسی وقت،  
اصطبل سے گدھے کی آواز آئی۔ بڑی جان گیا کہ  
شریف اسے لے لے رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال  
ہے کہ گدھا اندر ہے۔“

شریف نے شرمندگی ظاہر کیے بغیر بڑے وقار سے  
جواب دیا۔ ”جو شخص انسان کے مقابلے میں گدھے  
کی بات کا یقین کرے تو اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد  
کیا جائے اور اسے کوئی چیز دی جائے۔“

حراقہ شہسوار

### خاوند

نفسیات کے ایک پروفیسر انسانی رویے پر لیکچر دے

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے  
کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔  
”آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟“  
”یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کتوں اتنے  
ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔“ بیوی نے شکایت  
کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

”کون کم بخت اس بد ذات، کمینہ اور گھٹیا عورت  
کو گالیاں دیتا ہے۔ کیواس کرتی ہے اور سارے پیسے  
اس کو دیتا ہوں۔ خواہ جیب میں پھولی کوڑی بھی نہ ہو۔“

حمیرا نوشین۔ منڈی بہاؤ الدین

### اس نے کہا، میں نے کہا

اس نے کہا۔ ”میں ہمیشہ اپنے دلی جذبات، کا اظہار  
پھولوں سے کرتا ہوں۔“  
میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے تو مجھے صرف ایک  
پھول بھیجا ہے۔“  
اس نے کہا۔ ”در اصل میں بہت کم گواقع ہوا  
ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”تمہارا کہا ہوا صرف ایک لفظ مجھے  
کائنات کا سب سے خوش نصیب شخص بنا سکتا ہے۔  
کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“  
میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

اس نے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ۔ یہی وہ لفظ تھا۔“  
ماہم اختر۔ راولپنڈی

### پروفیسر صاحب

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر

رہے تھے۔

”وہ آدمی جو غلطی پر ہوا اور بارمان لے، وہ عقل مند ہوتا ہے۔ اور وہ آدمی جو درست موقف رکھنے کے باوجود بارمان لے۔ وہ کون ہوتا ہے۔“

”سر! وہ خاوند ہوتا ہے۔“ ایک طالب علم نے فوراً جواب دیا۔

بیوی نے کچھ پریشانی سے کہا۔

”اوہ۔۔۔ میں استری کاسوئج آف کرتا بھول گئی تھی۔۔۔ کہیں آگ نہ لگ جائے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ آگ نہیں لگے گی۔“ شوہر نے اطمینان سے کہا۔ ”میں ہاتھ روم کاتل کھلا چھوڑ آیا ہوں۔“

رشیدہ بتول۔۔۔ کراچی

کول عدنان۔۔۔ کراچی

## بد قسمتی

ایک صاحب دیہی علاقے کی سیر کو گئے اور ایک مقامی دیہاتی کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ لے لیا۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے صاحب نے تجھوس کیا کہ دیہاتی اپنے خراب حالات اور مالی تنگی کا مسلسل رونا رو رہا ہے۔ وہ صاحب قدرے جھنجھلا گئے۔

”تمہارے حالات اتنے خراب ہونے تو نہیں چاہئیں۔“ انہی کو فٹ پر قابو پا کر انہوں نے کچھ نرمی سے کہا۔ ”تم بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس تھوڑی بہت زمین بھی ہے۔“

دیہاتی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”جی جناب! ہے۔“

”تو تم اس پر کوئی فصل وغیرہ کیوں نہیں اگاتے؟“

## سیاست دان

ایک طویل آپریشن کے بعد سیاست دان کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وارڈ کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا۔

”یہ پردے کیوں گرا دیے ہیں ڈاکٹر؟“

”بات یہ ہے جناب!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”سڑک کے دوسری طرف بلڈنگ میں زبردست آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ ہوش میں آنے کے بعد پتہ سمجھیں کہ آپریشن ناکام ہو گیا اور آپ جنم میں پہنچ چکے ہیں۔“

حورین زیب۔۔۔ کمرہ ٹپکا

## نسخہ

”ڈاکٹر صاحب! میری زبان دیکھیے۔ میں پانچ منٹ سے ہار نکالے بیٹھی ہوں۔“ مریضہ چلائی۔

ڈاکٹر بولا۔ ”بس محترمہ! زبان اب اندر کر لیں۔ مجھے آپ کے لیے نسخہ لکھنا تھا۔ وہ میں نے سکون سے لکھ لیا ہے۔“

ماہ سرفراز۔۔۔ لاہور

”بس جی! کیا بتاؤں۔۔۔ قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔“ دیہاتی نے اپنی پگڑی اتاری اور روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔

”اگلی پھوڑا رو دکھی بیوی ہے میری۔ کیتی باڑی میں ہاتھ ہی نہیں بیٹاتی۔ زمین بے کار ہوئی جاتی ہے۔“

الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ

## سدا بآب

”زویا آنٹی! ممانے چینی منگوائی ہے۔“ ننھے عاطف نے کہا۔

زویا نے عاطف کو چینی دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تمہاری مامی نے اور کیا کہا ہے؟“

”آنٹی! مامی کہہ رہی تھیں۔ اگر وہ چنیل چینی نہ

پسند کی شادی کر کے کرائے کے مکان میں رہنے والا جوڑا شادی کے ابتدائی ایام میں تفریح کی غرض سے باہر نکلا۔ کافی دور نکل جانے کے بعد دفعتاً ”نویا ہوتا





# شہداء اولیٰ و صالحین

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت سنان بن سہ اسمعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کھانے والے شکر گزار کے لیے صبر کرنے والے روزہ دار جتنا ثواب ہے۔ (مسند احمد)

فوائد و مسائل :-

1۔ صبر اور شکر دونوں اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں اہم مقام رکھتے ہیں مسلمان کو نعمت پر شکر مصیبت پر کبیرا دینی پر ثبات قدمی اختیار کرنی چاہیے۔

2۔ کھانا کھا کر شکر ادا کرنا بھی ایک نیکی ہے جب کہ کھانا حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور وہ چیز خود بھی حلال ہو۔

3۔ جس طرح مردار اور خون پر کراگوشت حرام ہے اسی طرح چوری، دکے، دھوکے اور جھوٹ کے ذریعے سے یا تصویر سازی، شراب نوشی اور سودی کاروبار وغیرہ سے کمایا ہوا رزق بھی حرام ہے، ایسا رزق کھا کر زبان سے شکر کا لفظ کہہ لینے سے شکر ادا نہیں ہوتا۔

4۔ روزے کی فضیلت اس لیے ہے کہ وہ صبر پر مشتمل ہے۔ اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں سے اجتناب کرنا بھی صبر ہے۔ اور نیکی کی راہ پر قائم رہنا بھی صبر ہے۔

5۔ شکر اور روزہ دونوں کے الگ الگ روحانی اور قلبی فوائد ہیں اس لیے مومن کو دونوں طرح کے اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجذوم عورت کو طواف

کرتے دیکھا تو فرمایا۔

”اے اللہ کی بندی! اپنے گھر بیٹھا اور لوگوں کو

تکلیف مت دے“ وہ طوعاً و کرہاً چلی گئی۔ چند سال کے بعد دیکھا پھر

آ رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو

چکا تھا مگر اس کو خبر نہ تھی۔ ایک شخص نے اس سے کہا۔

”اب دل کھول کر طواف کر لے کیونکہ عمرؓ (جنہوں

نے منع کیا تھا) وفات پا چکے ہیں“

اس نے بہت تاسف کیا اور اناللہ پر ظاہر اور کہا۔

”میں اب آئندہ طواف نہ کروں گی۔ اگر عمرؓ زندہ

ہوتے تو طواف کرتی۔ میں ان کو مردہ سمجھ کر نہیں آئی تھی۔

بلکہ زندہ سمجھ کر آئی تھی۔ طواف کے شوق نے مجھے مجبور

کیا اور میں نے جی میں کہا طواف کروں گی بہت سے

بہت یہ سزا ہو جائے گی، عمرؓ ایسا شخص نہ تھا کہ زندگی

میں تو اس کا حکم مانا جائے اور مرنے کے بعد نہ مانا جائے“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

دنیا سے بے رغبتی،

بحیثیت خلیفہ مدینا علی کی دنیا سے بے رغبتی کے

بے شمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ

آپ کی خدمت میں شربت (فلاوہ) پیش کیا گیا۔

آپ نے اس شربت کو محض طلب کر کے فرمایا۔

”تیری خوشبو اچھی ہے، رنگ حسین ہے۔ مزہ لذیذ

ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ نفس کو ایسی چیز کا عادی بنا لوں

جس کا وہ اب تک عادی نہیں ہے“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بہت المال کی امانت و حفاظت

کی بھی قابلِ تعظیم مثال قائم کی۔ ایک بار خطبہ دیا اور

فرمایا۔

”لوگو! اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں

نے تمہارے مال سے نہ حقوڑا لیا ہے نہ بہت، سوائے

اسے کیا کرنا چاہیے تھا جسے ایسا خوف لاحق ہو گیا تھا۔  
جب مجھے اپنی بے عزتی کا یقین ہو چلا تو میں نے  
اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔

”یا رب! اغثنی!“

ترجمہ: ”اے میرے رب! میری مدد کر“  
اتنے میں جیل کا ہمارے اوپر سے دوبارہ گزر

اس منظر کے“ اور جب سے ایک چھوٹی سی شیشی  
نکال کر دکھائی جس میں عطر یا کوئی خوشبو محض، سیدنا علیؑ  
نے کہا۔

”مجھے ایک دہقان نے یہ ہدیہ دیا ہے“

پھر وہ بیت المال تشریف لائے اور کہا ”یہ لو وہ  
شیشی بیت المال میں جمع کراؤ“

### عجیب و غریب،

ہوا اور اس نے ہمارے پاس پھینک دیا۔ پھر وہ  
لوگ بہت نادم ہوئے اور کہا۔

”ہم نے بے چاری پر ظلم کیا اور مجھ سے معذرت  
کرنے لگے۔

چنانچہ جب بھی میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی  
ہوں تو اسے یاد کرتی ہوں۔ اور راحت کی امید کرتی  
ہوں۔ بخاری شریف میں یہ فقرہ مختصر الفاظ میں مذکور  
ہے۔ اس کے آخر میں جب اس عورت کو اللہ تعالیٰ  
نے نجات دلائی تو اس نے کہا۔

”اسی کے لیے تم لوگ مجھ پر تہمت لگا رہے  
تھے۔ حالانکہ میں اس سے بری تھی“

### حضرت عمرؓ نے فرمایا،

”ہمیں کسی شخص کی نماز اور روزہ دھوکے میں نہ  
ڈال دے جو چاہے روزہ رکھے، چاہے نماز پڑھے  
مگر اس کا کوئی دین نہیں جو امانت دار نہیں“

### تین صفات،

جس انسان میں تین صفات ہوں گی وہ کبھی شرمندہ  
نہیں ہوگا۔

- 1- صبر و تحمل۔
- 2- صلاح و مشورے کی عادت۔
- 3- اللہ تعالیٰ پر بھروسہ۔

### دل آزادی،

کفر کے بعد رب سے بڑا گناہ دل آزادی ہے۔  
چاہے دل مومن کا ہو یا کافر کا۔

میں نے قسم اٹھائی اور معذرت کی لیکن انہوں  
نے میری قسم اور عذر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔  
اور مردوں کو بلوایا تو وہ آئے اور خوب جھان بین کی۔  
مگر انہیں کچھ نہ ملا۔  
تو بعض نے کہا: ”اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا  
ہوگا“

چنانچہ انہوں نے میرے کپڑے اتارنے چاہے۔  
اب ایسی عورت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ

## حلال اور حرام گوشت میں فرق،

امام جعفر صادق سے پوچھا گیا۔

”ذبح کیسے ہوئے جانور اور مردار جانور کے گوشت میں فرق کیسے کیا جائے؟“  
فرمایا: ”اگر گوشت آگ کی پیش سے سکنڈا ہے تو ذبح کا ہے۔ اگر چھیلتا ہے تو مردار کا ہے۔“

## ایمان کی پہچان،

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

”دل کی تین رگیں ہوتی ہیں۔ اگر اپنے ایمان کو پرکھنا ہے کہ تمہارا دل زندہ ہے یا مر گیا ہے تو ۱۔ قرآن کھول کے پڑھو، دیکھو دل لگ رہا ہے یا نہیں۔

۲۔ اس محفل میں بیٹھو جہاں اللہ کا ذکر ہو رہا ہو، دیکھو دل لگتا ہے یا نہیں۔

۳۔ تنہائی میں بیٹھ کر دیکھو کیا تمہاری تنہائی پاک صاف ہے۔ اللہ بھی یاد آتا ہے کہ نہیں۔ اگر جواب ”نہیں“ میں ہے تو ذرا اللہ سے دُعا کرو کہ تم پر رحم فرمائے۔“

## زبان پر قابو،

بہرام گور ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ ایک پرندہ چمکنے لگا۔ اس نے فوراً تیر کمان اٹھایا اور پرندے کو گرا لیا۔ ادھر سے ایک فلسفی گزر رہا تھا۔ وہ بول اٹھا۔

”اگر یہ پرندہ ”زبان“ کو قابو میں رکھتا تو یہ انجام نہ ہوتا۔“ (دانش عرب و عجم)

حراقریشی۔ ملتان

## ہمدردی اور غم خواری،

حضرت محمد بن سیرینؒ نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیسے ہو؟

اُس نے جواب دیا۔  
”کیا حال ہو سکتا ہے اس شخص کا جو پانچ سو

درہم کا قرض دار ہو اور عیال کثیر رکھتا ہو اور ایک پیسہ اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔“

یہ بات سن کر ابن سیرینؒ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور ایک ہزار درہم لاکر اس کے حوالے کیے کہ پانچ سو درہم قرضہ میں دے دو اور پانچ سو درہم اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔  
اُس نے فرمایا۔

”دربافت حال کے بعد علی طور پر غم خواری نہ کرتا منافقت ہے۔“

مخدوم کا اپنے خادم کے حالات سے آگاہ ہوتا اور موقع و حالات کے مطابق تسلی، ہمدردی و ایثار کا اظہار کرنا اندوئے شریعت بے حد ضروری ہے۔

## دونقص،

امیر المؤمنین مہدیؑ نے ایک نیا محل تعمیر کروایا۔ خلیفہ نے فرمایا۔

”کسی شخص کو اس محل کے نظارے سے منع نہ کیا جائے۔ ناظرین یا تو دوست ہوں گے یا دشمن۔ اگر دوست ہیں تو خوش و خرم ہوں گے اور میں دوستوں کی خوش دلی مطلوب ہے۔ اور اگر دشمن ہیں تو رنج اٹھائیں گے اور دل کوفتہ ہوں گے اور ہر شخص کی یہی مراد ہوتی ہے کہ دشمن کو رنج پہنچے، نیز شاید وہ کوئی عیب ڈھونڈیں اور کوئی نقص یا غرابی بتائیں تو۔ اس نقص کو دور کر دیا جائے۔“

ایک فقیر نے کہا: ”اس محل میں دونقص ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس میں ہمیشہ نہ رہیں گے، دوسرا یہ کہ یہ محل ہمیشہ نہ رہے گا۔“

خلیفہ اس کلام سے اس قدر خوش ہوا کہ وہ محل غریبہ اور فقراء کے لیے وقف کر دیا۔





خواتین اور وہ شہزادوں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

# خواتین ڈائجسٹ



ستمبر 2014ء

کے شمارے کی ایک جہلک

نمرہ احمد کا مکمل ناول ”نمل“،

تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ”عہد الست“

عائشہ نصیر احمد، عتیقہ ایوب اور راؤ سمیرا یاز کے ناولٹ،

سمیرا حمید، عدنان شاہ، محصودہ اقبال اور آسیہ مقصود

کے افسانے

پیارے افضل کے ڈرامہ نگار ”خلیل الرحمن قمر“ سے ملاقات،

ٹی وی فنکارہ ”عاصمہ جہانگیر“ سے باتیں،

کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر 2014 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

# کھلتا کچھ کوئی سیر کی گام گام

ثناء اُجالا \_\_\_\_\_ ہارون آباد  
عرض کے واسطے جیتی ہے فطر تا دینا  
بہار پھول کھلاتی نہیں خزاں کے لیے  
درخشاں نور \_\_\_\_\_ فیصل آباد  
جن پہ بے لوث محبت بھی بجا ناز کرے  
ایسے نایاب ہی کردار نظر آتے ہیں  
عالیہ جمیل \_\_\_\_\_ کراچی  
مایوسیوں نے دل کا سفینہ ڈبو کے آج  
افسوں ایک موج کو طوفان بنا دیا

سردار خان \_\_\_\_\_ کراچی  
ہم عجیب طرز کے لوگ تھے کہ ہمارے اور ہی روگ تھے  
میں خزاں میں اس کا تھا منظر اسے انتظار بہار تھا  
فارحہ رضا \_\_\_\_\_ حیدر آباد  
لے گیا وہ ساتھ اپنے دل کی ساری روئیں  
کس قدم پر شہر تھا گنجبان، خالی کر دیا  
آسیہ جاوید \_\_\_\_\_ علی پور جیٹھ  
غم زندگی آتری راہ میں شب آرزو تری چاہتی  
جو اُجڑ گیا وہ بسا نہیں، جو پھٹ گیا وہ ملا نہیں  
حنا فرقان \_\_\_\_\_ گجرات  
مرا مسافر جو عجیب سے تو عجیب تر ہوں میں اک بھی  
مجھے منزلوں کی خبر نہیں، اسے راستوں کا پتا نہیں  
عاصمہ لقمان \_\_\_\_\_ گوچرہ

ڈھونڈتے کیا ہوا ان نکھوں میں کہانی میری  
خود میں گم رہنا تو عادت ہے پرانی میری  
بھینٹ میں بھی نہیں مل جاؤں گا آسانی سے  
کھویا کھویا ہوا رہنا ہے نشانی میری

البشہ رفیق \_\_\_\_\_ وہ حسید گر ہیں جو مجبوریاں تلاش کریں  
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے ہوتے ہوئے  
اقرا ملک \_\_\_\_\_ گوچر آباد  
سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن  
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں  
پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہے  
وہ بستیوں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں  
ردمی انصاری \_\_\_\_\_ لاہور

اب نہ وہ منظر نہ وہ چہرے نظر آتے ہیں  
مجھ کو معلوم نہ تھا، خواب بھی مر جاتے ہیں  
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے ب  
ایک پل کے لیے دکھتے ہیں گزر جاتے ہیں  
سعیدہ \_\_\_\_\_ ڈہری  
ہم کو تو عمر کھا گئی خمیر ہمیں گولہ نہیں  
دکھ تو کیا سے کیا ہوئے یاد کے خدو خال بھی  
عروہ خان \_\_\_\_\_ کراچی

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی  
جو لوگ دشمن جاں تھے، وہ غم گسار ہوئے  
عائشہ جمیل \_\_\_\_\_ لاہور  
مجھ سے پہلے رخ سادہ کی حقیقت کیا تھی  
منہ نہ کھلاؤ مری بات گراں گزرے گی  
تحریریم \_\_\_\_\_ گوچرہ

مسماں ہو سکے نہ گھر وندے وفاؤں کے  
آتے رہے پیار کی بستی میں زلزلے  
ندا، فضیہ یوسف \_\_\_\_\_ کراچی  
ایشاد کے دیار سے نفرت کے شہر تک  
ہیں کس قدر طویل محبت کے سلسلے



خط بھجوانے کے لیے پتا  
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com  
shuaamonthly@yahoo.com

نام نہاد بڑھا۔ آدمی اور انیسٹنس کی گفتگو کمائی کی نیت میں نت نئے رنگ بھرتی اس کے لطف کو دیکھ کر گنتی گئی۔ ارے ہاں یاد آیا! ”یارم“ کی دوسری قسط کا اختتام یہ فقرہ زبردست تھا۔ گریٹ سکس! گویا ایک ہی وقت میں آفریدی نے ہالی وڈ کی سینیما کی بنائی ہوئی۔

حمد کا پانچواں شعر کئی دفعہ پڑھا کہ اس میں اپنی دلی دلی آرزویت سے مقیم ہے۔ عید سروے میں پیاری قارئین کی گفتگو حقیقت کے خیمے میں مستور حقیقت سے قریب تر تھی۔

ج: پیاری حرا! میں بے حد افسوس ہے کہ عید سروے میں آپ شامل نہ ہو سکیں۔ آپ کا سروے موصول ہوا تو پرچا پریس جا چکا تھا۔ اس لیے آپ کا سروے شامل نہ کر سکے۔ معذرت خواہ ہیں۔ اس ماہ بقرعید کے لیے جو سروے دیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب جلد بھجوا دیجئے گا تاکہ شامل ہو سکیں۔

تبصرہ حسب معمول، حسب روایت بہت خوب ہے۔

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں  
اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں اللہ تعالیٰ ہم آپ کو، ہم سب کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین  
پس خط بلال کا کوئی ملتان سے حرا قریبی کا ہے، لکھتی ہیں

”سروے“ میں ہم نہیں کیا یہ ”ظلم“ نہیں؟  
اچھی بھلی ہنسی مسکراتی عید مزہ ی لکھنے لگی جب سروے میں اپنا اسم خاص نہ پایا۔ ارے یہ کیا حیرت صد حیرت! ساڑھ رخصا کا پہلا خط۔

”ایسے لکھا جاتا ہے خط؟ ایسے لکھتے ہیں خط؟“ قلب کے گم گشتہ برا سرار کو نے سے صدا ابھری۔ تو رفیقہ من ساڑھ جی! ابھی ہم نے اپنا خط بھی اتنے ذوق و شوق سے نہیں پڑھا بار بار جتنا اس کو ایک دفعہ ”عائشہ فیاض“ کا خط پڑھا تھا تو ان حروف باکمال کی محاسن اور صداقت پر فوراً دل نے کہا تھا کہ یہ عام قاری نہیں اور بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ تو مصنف ہیں۔ خط وہ بھی کمال تھا اور یہ بھی یاد شاہو! محفل کا میلہ تے سناں لٹ لیتا! الغرض ان کے جملوں میں عیاں کار گر بے ساختگی، لطافت اور زندگی سے بھرپور جملوں پر ”واہ واہ“ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ پر تپج باریک بین

براثر تحاریر کی مالکہ ”سمیرا حمید“ کی جانب بڑھتے ہیں۔ ”یارم“ ایک خوب صورت شاہکار کی طرح بہت نیچے سے بہت اوپر جاتی دکھائی دے رہی ہے۔

لگی رہیں سمیرا جی! ہماری پریغلوں تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ”زہر“ قرۃ العین کی تحریر کا موضوع تو پچھلے سے پرانا تھا، لیکن ایک اچھا نوا انداز لیے ہوئے تھا۔ ”شکریہ“ عینقہ جی ایک اچھا سبق منظر عام پر لانے کے لیے شکریہ! ”ہم سے ہے زمانہ“ بل (میری اسٹوڈنٹ) نے شکایت کی کہ ”بس چار ہی ورق لکھے تمہو بخاری نے؟“ (منہ بسورتے ہوئے) ہم میں بولتے آپ سے! ”بہر کیف ہمیں تو از حد خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنے نادر و نایاب وقت سے کچھ لمحے ہمارے لیے مختص کیے (سدا ہماروں کے سنگ سے بے ہنسی مسکراتی!)۔ بحثوں میں ان کی بات نہیں چلتی“

بھی اچھی کاوش رہی۔ دماغ میں پرست سوچوں کی نشوونما کرنی آبیہ رزائی کی تحریر نے عید سعید کی خوشیوں کو اپنی نایاب تحریر سے مزین نایاب کر دیا۔ ”سنیعد عمر“ کو فرسٹ



آپ کی تعریف و تحقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

یو کے سے صائمہ اسد قریشی نے شرکت کی ہے۔  
لکھتی ہیں

میں شعلہ کی چوٹیں سال سے خاموش قاری ہوں اور  
میں نے اسے بوجھ بہت معیاری اور بہت ہی اچھا پایا۔  
خصوصاً ”مذہب کے حوالے سے اتنی اچھی تحریریں پڑھنے  
کو ملتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں۔ بہت سیلے پھٹکے انداز  
سے اسلامی معلومات مل جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم  
سب کو آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔

آج جس چیز نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے وہ ہے  
”ایک بھی مثال“ بے شک رخسانہ نگار نے بہت اچھے  
انداز میں لکھا ہے۔ رخسانہ نگار ہماری بہت سینئر اسٹریپر ہیں  
لیکن میں ان کو کمنا چاہتی ہوں کہ مثال اور واقعہ کا کردار  
بہت آپ سے منگے اور ڈپریشن لکھا ہے۔ بے شک یہ  
ہمارے معاشرے کی ہی کمنا ہیں ان میں بہت سچائی  
ہے لیکن آج کے دور میں ہر انسان پہلے ہی اتنا پریشانیوں کا  
سامنا کر رہا ہے اور بہت سی یواؤں کو بالکل ایسے ہی حالات  
کا سامنا ہے لیکن قاری اپنے حالات میں سے وقت نکال کر  
ان ڈائجسٹ کو پڑھتا ہے تو وہ حق دار ہے کہ پڑھنے کے لیے

اتنی ہلکی پھلکی تحریریں ہوں جو کہ اپنی پریشانیوں سے ہٹ  
کر کچھ دیر کے لیے موزا اچھا کر دے تاکہ اپنی پریشانیوں کے  
ساتھ ساتھ ان کرداروں کی پریشانیوں بھی اعصاب پر سوار  
ہو جائیں۔ میری رخسانہ صاحبہ سے گزارش ہے کہ پلیز  
کمنا کو آگے جا کر ہلکا پھلکا لکھنے کی کوشش کریں تاکہ  
پڑھنے والا اپنے حالات کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کے  
لیے بھی ڈپریشن نہ ہو۔

باقی سب تحریریں بے حد دلچسپ اور اچھی تھیں۔  
ج : پیاری صاحبہ! بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں  
اپنی دور جا کر بھی یاد رکھا ہے اور خط لکھ کر اپنی رائے کا  
اظہار کیا۔

زندگی اتنی آسان چیز نہیں ہے۔ یہاں ایک قدم غلط  
اٹھ جائے تو بعض اوقات بہت دور تک اور بہت دیر تک  
اس کا خیاں نہ بھگتا پڑتا ہے۔ رخسانہ نے اس ناول میں یہی  
بتایا ہے۔ جذبات اور غصہ میں آکر ہی ایک غلطی نے

نہ صرف ایک گھر توڑ بلکہ ایک لڑکی کا بچپن چھین کر اس کی  
زندگی کو محرومیوں کی نذر کر دیا۔ یہ کمنا آئینہ ہے ان لوگوں  
کے لیے جو طلاق کو بچوں کا ٹھیل سمجھتے ہیں۔ اس میں شک  
نہیں کہ اس مسئلہ اور مینش کے دور میں اس طرح کی  
دکھ بھری کمنا یاں پڑھ دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں اس  
کا احساس بھی ہے اسی لیے ہم زیادہ تر خوش گوار کمنا یاں  
دیتے ہیں آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ باقی سب تحریریں  
ایسی نہیں تھیں۔ تو ایک کمنا ایسی بھی سہی۔  
آپ کے اطمینان کے لیے بتا دیں کہ آگے کمنا ایک  
خوش گوار موڑ لے رہی ہے۔

سمیعہ انعم ضلع چنیوٹ سے لکھتی ہیں

پچھلے ہی میرا خط شائع تو ہو گیا مگر ادھا دھورا نام بھی غلط  
چھپ گیا میرا انتم جبکہ میرا نام ہے سمیعہ انعم اور ناول کا  
نام تھا۔ ”بیٹے بل کا سپا“ آپ نے لکھ دیا بل بیٹے کا سپا۔  
بازار میرے گھر سے کافی دور ہے اور پھر میرا روزہ اوپر سے  
اتنی سخت گرمی میں سب کچھ بھلا کر محض اس لیے رسالہ  
لینے چلی گئی کہ اس میں میرا خط شامل ہے مگر خط دیکھ کر  
بہت دکھ ہوا اور میں رو باہی ہو گئی۔ فریڈز کے درمیان سبکی  
ہوئی وہ الگ۔

ج : پیاری سمیعہ! معذرت خواہ ہیں، آپ کا نام غلط  
شائع ہو گیا۔ آپ اپنے گاؤں کے بارے میں لکھیں، ہم  
ضرور شائع کر دیں گے۔

اقراء ملک نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

پانچ سالہ خاموشی ”صنم سے صدمہ“ کے لیے توڑنی  
پڑی۔ منتظر کو حیا کی قدر نہ ہو سکی اور ماہم جیسی خود غرض  
اس کی بیوی بنی۔ ”رقص بھل“ میری فوٹو کمنا ہے۔  
”ایک بھی مثال“ رخسانہ جی آپ مثال کے ساتھ  
بہت برا کر رہی ہیں۔

ج : پیاری اقراء! اب خاموشی ٹوٹ گئی ہے تو یہ سلسلہ  
جاری رکھیے گا اور ہمیں خط لکھ کر ہمیں اپنی رائے سے  
آگاہ کرتی رہیں گے۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مدیحہ عارف نے لکھا ہے

میری کمی کسی کو محسوس نہ ہوئی ہوگی پر پھر بھی مجھے تو  
تمام مصنفین اور قارئین کے حد عزیز ہیں۔ اس بار خط

رافیہ کنول دیر و دن پناہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

مجھے بڑھنے اور سیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ مگر میرے آس پاس کے کچھ لوگ اسے میرا باگلی بن سمجھتے ہیں اور جب بھی ان کو موقع ملتا ہے وہ میرے گھر والوں کو میرے خلاف اکساتے ہیں۔ میرا دل دکھتا ہے۔ نا سٹل بہت خوب صورت تھا نیلی جی کا ناول رقص بکسل بہت شاندار جا رہا ہے۔ خاص کر عزت کی اس قدر بے نیازی پلیرز آپنی تیور حیدر کے ساتھ کچھ غلط مت بیچے گا۔ اس کے بعد سمیرا حمید کا ناول یارم یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آسہ رزاقی کا ”نایاب ہیں ہم“ تو بیہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے بالکل اچھی نہیں لگی سنیعہ عمیر کی بازگشت ایک منفرد کہانی تھی۔ ماہم کی معصومیت دل کو پسند آئی پلیرز نبیلہ عزیز کا انٹرویو شامل کریں، میں انہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔

ج : رافیہ! کوئی بلاوجہ برائی کرے یا تنقید کرے تو واقعی بہت دکھ ہوتا ہے لیکن اگر آپ اپنی جگہ درست ہیں اور خود کو حق بجانب سمجھتی ہیں تو بالکل توجہ نہ دیں۔ ایک بار دل میں یہ سوچ لیں کہ مجھے بلاوجہ کی باتوں پر دھیان نہیں دینا تو پھر آپ کو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ بڑھنے اور کچھ سیکھنے کا شوق بہت اچھی بات ہے لیکن ایک بات کا دھیان رکھیں کہ کوئی بھی شوق جنون نہیں بنانا چاہیے۔ اعتدال سے ہٹ کر حد سے بڑھا ہوا کوئی بھی عمل خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ اچھا نہیں رہتا۔

سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔ طوبی سلیم نے سمیعہ آبادملتان سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

نا سٹل بہت خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے ”رقص بکسل“ پڑھی۔ اچھی لگی۔ اس کے بعد سمیرا جی کا ”یارم“ کیا خوب لکھا ہے۔ تمہ بخاری نے بہت انتظار کروایا لیکن اس بار ”ہم سے ہے زمانہ“ دیکھ کر سارے انتظار کی کوفت دور ہو گئی۔ میں ”میری کزنز اور بھائی بہت شوق سے پڑھتے ہیں تمہ جی پلیرز دوبارہ جلدی جلدی آئیے گا آسہ رزاقی کا ”نایاب ہیں ہم“ عید کے لحاظ سے کچھ نٹ کھٹ سے رنگ

آپ کے میں موسٹ فیورٹ ساڑھ رضا کا خط پڑھ کر دل جھوم اٹھا۔

سچی بات ہے میں تو سب سے پہلے سمیرا جی کے ناول ”یارم“ کی طرف گئی اور ایک ہی نشست میں پڑھ کر مرزہ لیا۔ لیڈی مہر کا کیا کردار تخلیق کیا ہے، واہ اور عالیان اور امرجہ اوسم۔ امرجہ کی فائل گم ہونا عالیان کا اسے واپس لانا زبردست رہا۔ اس کے بعد آسہ رزاقی کا نایاب ہیں ہم خوب عمدہ رہا۔ اس میں تو بیہ کا کردار دل کو بھلایا اور میرے خیال میں تو آج کے دور کی ہی ضرورت ہے کہ لڑکی باہمت اور بہادر ہو، اور چکن بھی خوب سنبھالے میری طرح نہیں جو چکن کا نام سنتے ہی دوڑ لگا دیتی ہے۔

”بازگشت“ نے مرزہ بیا۔ خوب انجوائے کر کے پڑھا۔ پر آدی کا یوں یاہم کے لیے لاپرواہ ہونا اچھا نہیں لگا۔ آپ رقص بکسل کے راز سے بڑھ اٹھ جانا چاہیے۔ ایک بھی مثال پتا نہیں اور کتنے دکھ لکھنے ہیں رخسانہ نگار عدنان نے مثال کی زندگی میں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے، پر ”شکر“ بازی لے گیا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد قوتہ العین کا ڈیڑھ اچھا رہا ایک عام سی گھر گھر کی کہانی اچھے الفاظ میں بیان کی انہوں نے اور اب محبتوں میں انا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے اس کا ذکر آخر میں کیوں تو وہ اس لیے کہ یہ مجھے بہت ہی زیادہ اچھا لگا۔ آؤ کہ ہم اپنی اپنی رنجشوں کو بھلا دیں اس نظم نے تو مجھے اپنا فین بنالیا۔

ایک ریکویسٹ تھی پلیرز دستک میں فواد خان کو لائیے نا اور تاریخ کے جھوکے میں شیر شاہ سوری کو لکھیے۔

ج : مدد! آپ کی فرمائشیں نوٹ کر لی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ چکن کا نام سنتے ہی آپ دوڑ لگا دیتی ہیں تو بیہ راز بھی بتا دیں کہ آپ کے گھر والے آپ کو بخش کیسے دیتے ہیں ورنہ تو س کام کر لیں اور ایک کام نہ کریں تو فوراً کام چوری کا طعنہ مل جاتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔ متعلقہ مصنفین تک تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے اور ایک ضروری بات نوٹ کر لیں کہ آپ کی کئی کوئی محسوس کرے یا نہ کرے ہمیں بے حد محسوس ہوئی ہے۔ ہمیں ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھا کریں۔



لیے اچھا لگا۔ سنیہ عمیر کا ”پازگشت“ بھی بہت خوب تھا، خصوصاً اس ناول کی شروعات خاموشی کے ذکر سے جو شروع ہوئی۔ ان الفاظ نے کئی بار روکا۔ غور سے پڑھنے پر مجبور کیا۔ مصور کیا۔ خطوط میں سائرہ رضا کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سائرہ جی بہت بڑی فین ہوں میں آپ کی۔ ج : پیاری طوبی آپ، آپ کی کزنز اور بھائی ہی نہیں تمہو بخاری کو ہم بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ جتنا اچھا مزاح لکھتی ہیں ان کی سنجیدہ کمائیاں بھی اتنی ہی عمدہ ہوتی ہیں۔ جب سے لی دی کو پیاری ہوئی ہیں لکھنا کم کر دیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم اور ہمارے قارئین ان کی کی بے حد محسوس کرتے ہیں، تمہو آپ ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ پلیر لکھنا چھوڑیں۔

سنیہ عمرنی مصنفہ ہیں لیکن انداز کی پختگی، کمائی پر گرفت اور سب سے بڑی بات کمائی کے اختتام کا سلیقہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ آگے چل کر بہت اچھا لکھیں گی۔ سمیرا حمید اور سائرہ رضا خود کو منوا چکی ہیں۔ ہماری دعا ہے وہ ہمیشہ اسی طرح لکھتی رہیں۔ آمین

رابعہ المسلمو کو نچانے رحیم یار خان سے خط لکھا ہے اگست کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ بہت دیر سے ملا۔ عید سرموے خوب رہا۔ رضیہ ممدی کی تحریر بہت اچھی لگی۔

تمہو بخاری اپنے مخصوص اسٹائل کے ساتھ دلچسپ تحریر لے کر آئیں۔ ملکی پچھلی سی۔ وادی کا کردار تو بڑا دلچسپ لگا۔ رمشہ خالد نے اچھے ٹاپک پر لکھا اور واقعی ہر شوق اعتدال میں اچھا لگتا ہے اور جناب عنیقہ محمد بیگ کی ”شکریہ“ تو بڑی دلچسپ لگی۔ بس اس کا نام حوریہ ہی رہنے دیتیں ناں۔۔۔

قرۃ العین کی ”زہر“ سبق آموز تحریر تھی۔ اب بات ہو جائے ”یارم“ کی تو جناب کیا ہی بات ہے۔ میں تو سمیرا حمید کی بہت بڑی (FAN) چٹھی بن گئی ہوں۔ واہ بہت اعلیٰ۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

ج : پیاری رابعہ! شعلہ کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچانی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ج : پیاری عید کی حالت بڑھ کے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں ان سب میں سارا قصور عدل کا ہے۔ کیونکہ مرد کو اگر اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حق دیا ہے۔ تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر یہ حق استعمال کرے۔ یارم بہت ہی زبردست جا رہا ہے۔ عالیان کا امرحہ کو سا لنگرہوش کرنے کا جملہ ”کہ وقت تھیں زندہ رکھے“ بہت ہی اچھا بلکہ منفرد لگا۔ ”رقص نکل“ شروع کیا۔ لیکن یہ کیا۔ ساتویں صفحہ پر ہی بالی آئندہ دیکھ کے کوفت کا شکار ہوئی۔ پلیر پڑھو تو صفحات بڑھا دیں ”خط آپ کے“ میں سائرہ رضا کا خط بہت ہی زبردست تھا۔

دیسے اس دفعہ عید پر تمہ جی نے کافی نگری عیدی دی ہے۔ تیلی اور جوادی کی صورت میں۔ اب آتے ہیں۔ ہمارے پیارے شہر ٹوبی کی طرف۔ جو کہ کافی شہرت رکھتا ہے۔ کے ٹی کے کے چیلے گورنر رضا جزاہ عبد القیوم خان کا تعلق اسی شہر سے ہے اور ان کی آخری آرام گاہ بھی یہی پر ہے۔ غلام اسحاق خان انٹینیوٹ بھی یہیں واقع ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پرائیویٹ اور گورنمنٹ اسکولوں کی بھی بہتات ہے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ہائی اسکول بھی ہیں۔ یہاں کے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ تربیلا ڈیم بھی ٹوبی کے نزدیک ہی واقع ہے۔

ج : پیاری بیٹا! آپ کے پیارے شہر ٹوبی کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا، ہمارا خیال تھا۔ چھوٹا سا شہر ہو گا۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ بڑا شہر ہے اور وہاں تمام سہولیات بھی مہیا ہیں۔



ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان انہیں ملتا بھی ہے تو اتنا جتنا کوشش کرنے والوں سے بچ جاتا ہے۔  
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

الیشہ رفیق ہارون آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے  
اس بار سارا شعلہ ہی لاجواب تھا جولاہی میں ختم ہونے  
والے کینز نبوی کے ناول ”صنم سے صمد تک“ میں حیا کے  
ساتھ ہونے والا سلوک پڑھ کر بہت روٹی۔ اصل میں  
جولاہی میں میرے تایا ابو کینڈا آئے۔ انہوں نے وعدہ  
کیا تھا میرے لیے لیپ ٹاپ لانے کا وہ تو آگے مگر لیپ  
ٹاپ نہ آیا کیونکہ وہ کزن نے کر کے لگا۔ اگست میں تو چھ  
جاکا دکھ اور پچھ اسے لیپ ٹاپ کا میں نے آپ سے ایک  
ریکویسٹ کرنی ہے پتہ کوئی ایک آدھ سنواری ایسی بھی لکھ  
دیں جس میں ہیرو آرمی میں ہو پیلینز۔ مجھے آرمی میں جانے  
کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ آپ سب اور پڑھنے والے  
قارئین دعا کیجئے گا۔ مجھے کمیشن مل جائے اور خواب بھی۔  
ج : الیشہ! ایشلی وزیرستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا  
ہمیں بھی سے حد دکھ ہے شمالی وزیرستان آرمی سے 20  
لاکھ افراد بے گھر بے سرو سامان در بدر ہو گئے ہیں۔ ڈرون  
حملوں میں بے گناہ افراد شہید ہو رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے  
کہ حق کی فتح ہو جو بے گناہ افراد شہید ہو رہے ہیں۔ ان  
بے گناہ لوگوں کا پورا ریکٹا نہ جائے اور ان بے گھر مظلوم  
افراد کے دھکی دلوں سے نکلتی دعا میں قبول ہوں۔ اللہ تعالیٰ  
پاکستان کے حق میں ہمت کرے۔ آپ کا آرمی میں جانے کا  
شوق ضرور پورا ہو گا اگر شوق و لگن ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو  
جاتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ  
مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچائی جا رہی ہے۔

ہوتی ہے کیونکہ پہلے کے کی کے سے بہت کم ہمیں خط  
لکھتی تھیں۔ پاکستان میں ایک خوش آئند تبدیلی آ رہی  
ہے۔

ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو  
سلامتی کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین  
امتہ السلام نے شیخوپورہ سے شرکت کی ہے، لکھتی  
ہیں

ٹائٹل نے خوشگوار اثر ڈالا۔ ماڈل کو پہنایا گیا زیور  
خاص پسند نہیں آیا۔ رخسانہ نگار عدنان کے ”ایک تھی  
مثال“ کی طرف سب سے پہلے بھاگی۔ صمد شکر کہ زیادہ  
نقصان نہیں ہوا۔ رخسانہ نگار عدنان کافی عرصے بعد آئی  
ہیں اور اپنے حرم میں باندھ چکی ہیں۔ رخسانہ نگار وہ راسخ  
ہیں جن کا ذکر میں نے پہلی مرتبہ اپنی امی سے سنا۔ میری  
زی زی ان کی تعریفیں کرتی پائی گئیں جب انہیں پڑھا تو  
قابل ہو گئی وہ اکثر انیس۔ سلیم کا ذکر بھی کرتی ہیں آخر وہ  
کہاں ہیں؟ رقص سکل ابھی تک مجھے کوئی خاص متاثر  
نہیں کر سکا بنیلہ عزیز اس سے بہت بہتر لکھ سکتی ہیں۔

ساتھ رضائے بالکل ٹھیک کہا۔ میرا حمید کا نام بڑھتے  
ہوئے ان کی لکھی کمانی کو چوکنی ملی بن کر نہ پڑھوں، ایسا  
ممکن نہیں۔ میرا حمید کا افسانہ ”بوند بوند تاشا“ میرے  
ذہن میں نقش ہوا رہا ہے ورنہ افسانے مجھے خاص یاد نہیں  
رہتے۔ میرا حمید کا ”یام“ پڑھنے کے بعد میرے  
احساسات ایسے تھے کہ میرا دل کر رہا تھا کہ میں بھی کچھ  
کروں، نایاب ہیں ہم اور بازشت دونوں کچھ خاص تاثر  
قائم نہ کر سکے۔ یہ بشری جی ”سفال گر“ کے بعد کہاں گئیں  
میں تو انتظار میں اسے فیورٹ بک + ناول کی ہیروئن بنی  
ٹیجی ہوں بس امید ہے کہ فاطمہ کی طرح جو

انیلہ بتول ”الوین فاطمہ“ سائہ زاہد ”افغان اشفاق ملتان  
سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ماڈل کا ڈریس بہت زیروست تھا لیکن ماڈل پسند نہیں  
آئی۔ پچھلے ماہ سب سے زیادہ جونا دل پسند آیا وہ ”صنم سے  
صمد تک“ تھا۔ ویسے کینز نبوی جی! آپ کے ناول کا ہر ہیرو اتنا  
ظالم کیوں ہوتا ہے۔ آپ اتنا بڑی تھی لکھتی ہیں لیکن اتنا کم  
کیوں لکھتی ہیں ہماری خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات  
کریں۔ ایک بھی مثال اور رقص سکل اچھے جارہے ہیں۔

ج : پیاری امتہ السلام! کچھ کرنے کو دل چاہا، یہ ہی بڑی  
بات ہے۔ وہ کہانیاں جو بے عملی کی ترغیب دیں۔ ہمیں  
نخت ناپسند ہیں۔ صحیح سمت میں کوشش ہر انسان کا فرض  
ہے۔ کوشش کا نتیجہ انسان کی تقدیر ہے۔ بغیر کچھ کیے کچھ  
پانے کی توقع، انتظار میں بیٹھنے والے اکثر ناکام ہی رہتے

رمضہ خالد کا صحبتوں میں ان کی بات بہت پسند آیا۔ عنیقہ کا افسانہ شکر بہت زبردست تھا۔ باقی افسانے بھی ایسے تھے۔ سمیرا حمید کا یارم اچھا چارہ ہے لیکن سمیرا کا افسانہ دمڑی مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ پلیز کرکٹر احمد شہزاد کا انٹرویو شائع کر دیں۔ عفت ححرکاناول بن مائی دعا بہت پسند ہے۔

ہم اپنے گاؤں کے بارے میں بتانا چاہیں گے کہ ہمارے گاؤں کی سڑکیں کئی اور کشادہ ہیں۔ گاؤں میں صحت اور تعلیم کی سہولت موجود ہے۔ حال ہی میں ہمارے گاؤں کے قریب ڈگری کالج کا اجرا ہوا ہے جس کی وجہ سے اب ہر لڑکی آزادی سے تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ اگر گاؤں سے باہر جائیں تو سرپرہیزت آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ ضرورت کی ہر شے یہاں پر دستیاب ہے ہمارے گھر میں شعل اور خواتین باقاعدگی سے آتا ہے اور ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے میں پڑھوں اور قرعہ فال سب سے پہلے بھابھی سائرہ کے نام نکلتا ہے۔ پلیز فرحت اشتیاق اور عمیرہ احمد سے کچھ لکھو امیں۔

ج : انیلہ بھول (الوین فاطمہ سائرہ زہد اور افغان افغان! سائرہ زہد کا تو ہمیں آپ نے بتایا وہ آپ کی بھابھی ہیں جو سب سے پہلے شعل اور خواتین پڑھتی ہیں۔ باقی آپ لوگ ہمیں ہیں یا کنزرنز؟ آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ پاکستان کا وہی علاقہ ترقی اور تعلیم کی طرف بڑھ رہا ہے وہاں لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ امر ہمارے لیے بے حد خوشی کا باعث ہے۔ آپ سب لوگوں کا شکریہ۔ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیجئے گا۔

فوزیہ صادق کو سوال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے کافی عرصے بعد لکھنے بیٹھی ہوں۔ کچھ عرصے سے ایسی

صوفیت نے زندگی کو گھیر لیا کہ بہت بار چاہنے کے باوجود لیٹر نہ لکھ سکی۔ شعل اور سمیرا ساتھ چودہ سال پرانا ہے۔ آج میں کسی خاص تحریر پر تبصرہ نہیں کروں گی۔ آج تو آپ سے اور سب قارئین سے ملاقات کرنے آئی ہوں قارئین کے لیٹر بڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ بہت سی تحریریں جو نہیں پڑھی جاتیں ان کی تعریف یا تنقید بڑھ کر پھر ضرور میں وہ تحریر پڑھتی ہوں۔ کچھ عرصے سے بہت سی نئی رائے

کا اضافہ ہوا جن میں امیہ خان قابل ذکر ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے قسط وار ناولز بہت شائع ہونے لگے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ پلیز ناول کو اتنی اقساط میں نہ کر کے گزایا کریں۔ آج کے جدید دور میں قارئین کے لیے اتنا انتظار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے دوسری بات یہ کہ بے شک کہانیاں معاشرے سے ہی جنم لیتی ہیں رائے سے گزارش ہے کہ تکلیف دہ موضوع کے بجائے ہلکے پھلکے موضوعات کو شائع کریں۔

غم زدہ، دکھی تحریریں پڑھ کر یقیناً ہماری سوچ بھی ویسی ہی ہوجاتی ہے۔ اور کوئی بھی ہلکی پھلکی مزاح کا اثر لیے ہوئے تحریر پڑھ کر ہم خود کو بھی بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔

”ایک تھی مثال“ شروع سے اب تک میرا فوٹ رہا ہے۔ ”رقص بزل“ بہت ست رقاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ماوراکا کردار کچھ زیادہ ہی انپرسنٹ سا ہے۔ سمیرا حمید کا ”یارم“ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جتنی مسکرائی تحریر ”ہم سے ہے زمانہ“ میں جواد کی اور شبلی کی شرارتیں اس بار پھر مزادے لگیں لیکن ان دونوں کی دادی اور ماموں کی کمی محسوس ہوئی۔

”خط آپ کے“ میں سائرہ رضا سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ سائرہ جی آپ کی تحریر جتنی بھی لمبی ہو مجھے تو ہمیشہ بہت پسند آتی ہے۔

ج : پیاری فوزیہ! طویل عرصہ بعد آپ کی آمد پر ایک خوشگوار سا احساس دل کو چھو گیا جیسے کسی پرانے دوست سے اچانک ملاقات ہو جائے۔

امیہ خان بلاشبہ ایک قابل قدر اضافہ ہیں، پچھلے ماہ سنیعہ عمیرہ کا ناول شائع ہوا تھا، ہمیں ان سے بھی بہت توقعات ہیں، مینو صدف نور عین بھی اچھا لکھ

رہی ہیں اور سائرہ رضا تو واقعی کچھ بھی لکھیں، کمال لکھتی ہیں۔

قسط وار کہانیاں ہمیں بھی بالکل پسند نہیں لیکن مصنفین اگر طویل کہانیاں لکھیں تو آپ ہی بتائیں کہ کیا کیا جائے؟



عمرانہ جمیل نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے،  
لکھتی ہیں

”ایک تھی مثال“ میں رخسانہ نگار نے بہت اچھی طرح مثال کی ماں کی دکھاوے کی محبت کو واضح کیا۔ بہت گریٹ ہیں آپ۔

”یارم“ سیرامید آپ نے کوئی کئی نہیں چھوڑی۔

ج : عمرانہ ! مثال کی ماں کی محبت دکھاوے کی محبت نہیں ہے، رخسانہ نگار نے ایک ماں کی مجبوری دکھائی ہے جو ایسے حالات کا شکار ہو گئی ہے کہ اپنی اولاد کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

رخسانہ عبدالغفار نے شاہنکدر چک نمبر 155 سے لکھا ہے

غالباً ”سات آٹھ سال بعد آج ایک دفعہ پھر بزم شعاع میں حاضر ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شعاع پڑھنا چھوڑ دیا۔ بس گردشِ دوران میں کچھ یوں اچھے کہ۔۔۔

ٹائٹل تو اس بار بہت اچھا لگا۔ پچھلے ماہ کنیزبوی کا ناول پڑھا۔ آغاز سے انتہام تک ناول نے اپنے بحر میں جکڑے رکھا۔ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر ”کنیزبوی“ میرے پاس حریف کے لیے الفاظ نہیں۔

سلسلے وار ناول ”ایک تھی مثال“ میری موسٹ فیورٹ رائٹر رخسانہ نگار کا ناول بھی زبردست جا رہا ہے رخسانہ جی مثال پڑھتے ذرا ہولارہیں۔ ”رقصِ بکسل“ بھی اچھا مگر بہت سلو جا رہا ہے۔ یارم پڑھ کر تبصرہ ادھار رہا۔ باقی تمام مستقل سلسلے بھی زبردست تھے۔

ج : پیاری رخسانہ ! گردشِ دوران تو کسی کو بھی چین نہیں لینے دیتی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوستوں سے ملاقات ترک کر دی جائے۔ خط آدھی ملاقات ہوتی ہے۔ سات آٹھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اب اتنا طویل وقفہ نہ دیجیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

یاسمین حنفی نے کراچی سے لکھا ہے

ٹائٹل پہ اور نچ کلر بہت پیارا لگ رہا تھا۔ (ماڈل پہ اچھا نہیں لگ رہا تھا) ”ایک تھی مثال“ رخسانہ جی آپ سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے کہ بس کر دیتے بہت ہو گیا یار۔۔۔ 20 قسطوں میں مثال کی درد بھری زندگی دکھائیں گی۔۔۔ اور

جب مثال خوش ہوگی تو وہ لاسٹ قسط کر دیں گی۔۔۔ (یہ بھی کوئی گل ہوئی) ”رقصِ بکسل“ یہ تو دوسرا ”در دل“ اسٹارٹ ہونے جا رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ (در دل) کی طرح 30 قسطوں سے پہلے ماوراکا ماضی نہیں کھولنے والی رائٹر صاحبہ ”نایاب ہیں ہم“ سیرو پیروئن تو نہیں پڑاں ہم قارئین ضرور نایاب ہیں جو ایسی تحریریں برواشت کرتے ہیں ”یارم“ اس ناول کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ”بازگشت“ پڑھ کر رویت مزید سوا ہو گئی۔۔۔ اب ناول اور افسانوں پر کیا تبصرہ کروں۔ بس یہ کہ اس بار بالکل مزہ نہیں آیا حالانکہ عید کے حاسے شان دار ہونا چاہیے تھا فاسٹ بار محمد عامر کا ناولیو شائع کریں پلیز پلیز یار۔۔۔ 3 مہینوں سے ریکویسٹ کر رہی ہوں لو جی لائٹ چلی گئی اب اندھیرے میں کیا لکھوں۔

ج : پیاری یاسمین ! مزید کچھ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں، اتنا ہی کافی ہے اب افسوس ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کو یارم کے سوا کچھ بھی پسند نہیں آیا۔

تمینہ رؤف نے ہنوں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

”یارم“ سیراجی آپ کیوں ہماری دل کی دھڑکنوں کے ساتھ تھکتی ہیں۔ جم کر قدم رکھنا اور اپنے حوصلوں کو بلند کیے رکھنا ہے، یارم، ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ آپ کی ہر تحریر ساڑھ رضا کی تحریروں کی طرح دل پہ اترتے ساتھ ہی اپنے نقش چھوڑ جاتی ہے ”ایک تھی مثال“ رخسانہ نگار عدنان صاحبہ میں نے آج تک حقیقت کے اتنے قریب اتنی پیاری اسٹوری کبھی نہیں پڑھی ”رقصِ بکسل“ بھی خوب جا رہی ہے اور نمبر جی ”ہم سے زمانہ“ بس اتنی سی؟ کیا ہمارے سال بھر انتظار کا صرف اتنا ساصلہ ساڑھ جی آپ رہا ڈائجسٹ کو پڑھتی ہیں مطلب اگر میرا یہ خط شائع ہوا تو آپ اس کو بھی پڑھیں گی، میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہوگی یہ کہ میری تحریر آپ کی نظر سے گزرے گی۔ سینہ عمیر کی بہت اچھی کاوش تھی اگر یہ آپ کی پہلی تحریر تھی تو ”ویری ویل ڈن“

ج : پیاری تمینہ ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سنینہ عمیر کی یہ پہلی ہی کہانی سمجھ لیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک مختصر سا افسانہ نیلا گلاب شائع ہوا تھا۔ نمرو بخاری سے تو ہمیں بھی شکایت ہے کہ اتنے عرصہ بعد لکھا اور اتنا مختصر۔



مس آنسہ شیر (ڈوگر) آپ وہی ہیں نا جو مکیانہ میں نیچنگ کر چکی ہیں۔ ہمارے کیوال والوں کو بھی شعاع پسند ہے لیکن ابھی خط نہیں لکھا۔ میں ہی فری ارمان ہوں اور فرخ ناز بھی۔

ج : فرخ ناز، ربیعہ، نینا اور گلشن گل! خط تاخیر سے ملا، اس لیے پچھلے ماہ شامل نہ ہو سکا۔ اپنی امی کو آپ شعاع کے سلسلے پڑھ کر سنائیں، پیارے نبی کی پیاری باتیں اور باتوں سے خوشبو آئے، ہمیں یقین ہے کہ پھر وہ آپ کو شعاع پڑھنے سے منع نہیں کر سکی۔

عائشہ جمیل بلدیہ ٹاؤن کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس مرتبہ نائل گرل دوپٹہ کے بالے میں بہت پیاری لگی۔ ”رفص نسل“ نبلہ عزیز کا ناول دھیرے دھیرے آگے کھسک رہا ہے۔ ”یارم“ سمیرا حمید کے ناول نے طبیعت ایک دم خوش کر دی۔ کافی عرصہ بعد ایسا کچھ پڑھنے کو ملا بہت مزا آیا۔ اعلیٰ قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ”صنم سے صد تک“ نینا نبوی کے ناول کا اینڈ حسب توقع تھا۔ ماہم کا راور شروع میں جتنا اچھا لگا آخر میں اتنا ہی برا محسوس ہوا۔

”ڈھل گیا ہجر کا دن“ صدف آصف کا ناول معذرت کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ ”کوئی نہ جانے بات“ عائشہ نصیر احمد کے ناولٹ نے دل موہ لیا۔ ویل ڈن عائشہ جی۔ افسانے سب ہی اچھے لگے لیکن ”لیلا القدر“ قانتہ رابعہ کا افسانہ بہت ہی اعلیٰ لگا۔ ”ایک تیز“ رشک حبیبہ کا افسانہ بہت پسند آیا۔

ج : پیاری عائشہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تہنیت متعلقہ مصنفین تک پہنچانی جاری ہے۔ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں ہیں اس لیے کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

عظمیٰ مشتاق جہلم سے لکھتی ہیں

نائل گرل بہت پیاری لگی۔ سمیرا حمید کا ناول ”یارم“ بہت دلچسپ ہے۔ سنیہ عمیر کا ناول بازگشت بھی بہت خوب صورت ناول تھا۔ آپ کے ان پرچوں نے بچ میں

مجھے زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا ہے۔ میری فرینڈ حرا بھی شعاع کی دیوانی ہے۔ آپی راحت نہیں کہاں غائب ہیں

ساترہ رضا واقعی پرچے کا ایک ایک حرف پڑھتی ہیں اور اپنی رائے سے بھی نوازانی ہیں۔

مریم اور ماہم، سنہ 41 گ ب جلد سے تحصیل سمندری سے لکھا ہے

میں اور میری کزن شعاع اور خواتین بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے کبھی خریدی بھی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بڑی آپی ہو کہ فیصل آباد میں رہتی ہیں، پڑھنے کے بعد ہم تک پہنچانی دیتی ہیں۔ (دو مہینے بعد) لیٹ پڑھنے کی مجبوری یہ ہے کہ ہم گاؤں میں رہتے ہیں لیکن گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ہم اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں (مریم) ایم اے اسلامیات کر رہی ہوں پرائیویٹ اور میری کزن ماہم جو کہ حال میں بی بی رائٹر بننے جا رہی ہے۔ اس نے ”بدلہ“ کے نام سے افسانہ لکھا ہے۔

ماہم ایف ایس سی (میڈیکل) کر رہی ہے۔ ہم دونوں کزنز ہمیشہ اے پلس لیتی ہیں۔ ساترہ رضا، عمرو احمد، بشری سعید، فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار کا شمار ہماری پسندیدہ ترین رائٹرز میں ہوتا ہے۔ اور مزے کی بات بتائیں ہم نے عمرو احمد کا ناول ”جنت کے پتے“ کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے ہی گھر میں ہی کتابی شکل ڈے لی تھی۔ وہ ایسے کہ ہر دفعہ ڈائجسٹ میں سے کہانی الگ کر کے رکھ لیتے اور جب مکمل ہو گئی تو ہم نے اس کی بانڈنگ کروالی۔ (واہ کیا بات ہے ہماری)

مریم اور ماہم! آپ کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ آمین۔

ایک بات کی داد ضرور دیں گے کہ رسالہ آپ نے کبھی نہیں خریدا پھر بھی اتنی باقاعدگی سے آپ تک پہنچتا ہے کہ جنت کے پتے کی ایک بھی قسط آپ سے مس نہیں ہوئی اور آپ نے مفت میں مکمل کتاب حاصل کر لی۔

فرخ ناز، ربیعہ، نینا اور گلشن گل! گاؤں مسکینہ تحصیل و ضلع ہجرات سے لکھتی ہیں

”ایک تھی مثال“ میں اب اصل کمانڈ شروع ہو گئی۔

اب بتائیں کون سا قہر ٹوٹا باقی ہے مثال پر۔ آپ جی! امیری ماما کو سمجھائیں کہ ڈائجسٹ پڑھنا گناہ نہیں ہے۔ میں حرم خان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں اور

انہیں کہیں نہ کوئی ناول لکھیں۔  
ج : پیاری عظمیٰ اشعار کی بزم میں خوش آمدید، راحت  
جیں آج کل ٹی وی پر مصروف ہیں اس لیے لکھ نہیں پا  
ری ہیں انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد شعاع کے لیے  
لکھیں گی۔ اپنی دوست حرا کا ہماری جانب سے شکریہ ادا کر  
دیں۔

نورینہ حنیف نے سرگودھا سے لکھا ہے  
آپ کیا حال ہیں؟ ہمارا تو گرمی سے بہت برا حال ہے،  
سرگودھا میں تو بارش ہو ہی نہیں رہی۔ ٹائٹل بہت پیارا  
لگا۔ مکمل ناول سب بیسٹ تھے افسانوں میں جوادی اور  
شبلی کو پڑھ کر اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے سارے آپ  
آپ کا خط اچھا لگا۔  
ج : الحمد للہ ہمارا حال بالکل ٹھیک ہے، بارش تو کراچی  
میں بھی نہیں ہوئی لیکن گرمی زیادہ نہیں ہے۔ شعاع کی  
پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



عائشہ خان منڈو محمد خان سے لکھتی ہیں

خط آپ کے میں سارے رضا کا خط پڑھ کر بہت خوشی  
ہوئی۔ سارے جی کی کیا بات ہے۔ اس بار نمبر بخاری کا نام  
پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی، اتنی افسانہ پڑھ کر نہیں ہوئی۔  
آئیہ رزاقی کو پڑھا خلاف توقع انہوں نے بھی مایوس کیا۔  
اس بار عنیقہ، میک کا افسانہ بہت پسند آیا۔  
ج : عائشہ اشعار پر تبصرے کے لیے شکریہ۔

نمروہ رحمان نے جہانیاں منڈی سے لکھا ہے

”ایک تھی مثال“ بظاہر کہانی آگے بڑھ چکی ہے لیکن  
پھر بھی وہیں رکی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ  
زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو آشکار کرتی ہوئی تحریر ہے،  
لیکن پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اتنے سارے  
رشتوں میں اتنے سارے سالوں میں کوئی بھی اس کا خیر  
خواہ نہیں.... کچھ تو مثبت پہلو دکھا دیا ہو گا۔ خواہ سہیلی کی  
شکل میں ہی سہی.... لیکن ناں جی! مسلسل تکلیف میں

### قارئین متوجہ ہوں!

- 1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی افسانے  
میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ  
کاغذ استعمال کریں۔
- 2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال  
کر سکتے ہیں۔
- 3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت  
پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں  
اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور  
لکھیں۔
- 5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔  
ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں  
ہوگی۔
- 6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو  
اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں  
کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری  
کروائیں۔
- ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے  
حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، زبانائی، تقوید  
اور سلسلہ وار قسط کے کسی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



## درفش کاویانی

درفش کاویانی، ایرانیوں کا وہ امتیازی نشان تھا جسے اڑھائی سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران بنایا گیا تھا۔ ان دنوں ایران پر ضحاک نامی ایک حامی النسل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ حقیقتاً "یمن کا رننے والا تھا" لیکن ایران کو اس نے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ روایت ہے کہ اس نے ایک ہزار سال حکومت کی اور یہ عرصہ 1970 قبل مسیح سے 2970 قبل مسیح کے لگ بھگ بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ طبری کے مطابق ضحاک نہایت ظالم شخص تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کو قتل کیا۔ تازیانے مارنا اور لوگوں کو دار پر لٹکانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس نے ایک ہزار سالہ حکومت میں لوگوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔ لوگ اس سے سخت ہراساں اور خوف زدہ رہتے تھے۔ حکومت کے آٹھ سو سال گزرنے کے بعد اس کے کندھوں کے ابھرے ہوئے گوشت پر زخم آ گئے جن کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں رہتا تھا۔ طرح طرح کے علاج کرائے گئے۔ لیکن زخم اچھے نہ ہوئے۔

آخر ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ ان زخموں کا علاج انسانوں کے مغز سے کرو۔ دوسرے دن، ایک انسان کا مغز نکال کر زخموں پر لگایا گیا تو درد میں افاقہ ہو گیا۔ اس روز سے یہ معمول ہو گیا کہ کئی کوچوں سے دو آدمی پکڑ کر لائے جاتے اور انہیں مار کر ان کے مغز ضحاک کے زخموں پر لگائے جاتے۔ روایات کے مطابق یہ سلسلہ دو سو برس تک جاری رہا۔

ضحاک کی حکومت کے ہزارویں سال حاکم اصفہان

نے ایک لوہار کاوہ کے دو بیٹوں کو پکڑ کر ضحاک کے پاس بھیج دیا، تاکہ انہیں قتل کر کے ان کے مغز اس کے زخموں پر لگائے جاسکیں۔ کچھ ہی دنوں میں ان کے قتل کی خبر آگئی۔ بیٹوں کے قتل کا سن کر کاوہ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ وہ شہر آیا اور عوام کو ضحاک کے ظلم و ستم

کے خلاف ابھارنے لگا۔ وہ اپنی دھونکنی کو ایک لکڑی سے باندھ کر فضا میں بلند کرتا اور کہتا۔ "یہ آزادی کا علم ہے جو لوگ ضحاک کے خونیں پنہلوں سے رہائی چاہتے ہیں وہ اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔"

جھنڈے کو اس نے موتیوں سے آراستہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام درفش کاویانی ہوا۔

کاوہ نے نہ صرف ایرانی لوگوں کو جمع کیا، بلکہ ایرانی لشکر کا سالار بن کر ضحاک کو شکست دی اور اپنی قوم کو آزادی دلائی۔ آزادی کے بعد فریدون (1670 قبل مسیح سے 1970 قبل مسیح) ایران کا بادشاہ ہوا تو اس نے کاوہ کو سپہ سالار اعلیٰ بنادیا۔ کاوہ جہاں بھی لشکر کشی کرتا، درفش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا اور اسے فتح حاصل ہوتی۔

بیس سال کے عرصے میں کاوہ نے ایران کو دشمنوں سے پاک کر دیا۔ جس کے صلے میں فریدون نے اسے حاکم اصفہان بنادیا۔

کاوہ نے دس سال اصفہان پر حکومت کی۔ اس کے مرنے کے بعد حکومت و جاگیر تو اس کے خاندان میں ہی رہی، لیکن درفش کاویانی شاہی خزانے میں جمع کر دیا گیا اور فریدون نے کاوہ اور اس کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر ایرانی پرچم کا نام ہی درفش کاویانی رکھ دیا۔



کی طرف روانہ کر دیا اور سب نے فتح کے لیے دعا کی۔  
اسلامی فوج کے یہ جاں نثار ابھی راستے میں ہی تھے  
کہ شاہ حمص سے مذبح پھرنے لگے، شاہ حمص بارہ  
ہزار تازہ دم فوج لیے اجنادین کی طرف جا رہا تھا۔  
ضرار نے اسلامی لشکر کو حکم دیا ”بہادرو! عقاب بن  
کردشمن پر ٹوٹ پڑو اور اس سے پہلے کہ یہ اجنادین  
پہنچیں یہیں ان کا کام تمام کر دو۔“  
اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔

حضرت ضرار اپنی جان سے بے نیاز بڑھ کر حملے  
کر رہے تھے اور اپنے جوانوں کی ہمت بڑھا رہے تھے  
کہ اس دوران شاہ حمص دردان کے بیٹے ہمدان نے  
موقع پا کر حضرت ضرار پر نیزے سے وار کیا، نیزہ بازو

میں لگا۔ حضرت ضرار زخمی ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے  
زخمی شیر ہارڈا اور پلٹ کر نیزہ ہمدان کے سینے میں اتار  
دیا۔ نیزہ سینے اور پشت کی ہڈیاں توڑنا ہوا پار ہو گیا۔  
حضرت ضرار اپنا نیزہ نکال رہے تھے جو کسی ہڈی میں  
پھنس کر رہ گیا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر حضرت ضرار  
کو گرفتار کر لیا۔

اسلامی فوج امیر لشکر کی گرفتاری کے باوجود ہدی بے  
جگری سے لڑتی رہی تھی اور دشمنوں کا صفیا کرتی رہی۔  
ادھر کسی تیز رفتار سوار نے حضرت خالد کو ضرار کی  
گرفتاری کی اطلاع پہنچا دی۔

حضرت خالد بے چین ہو گئے اسی وقت امیر کے  
خیمے میں پہنچے اور اجازت لے کر ایک ہزار جاں بازوں کو  
لے کر محاذ کی طرف علی گھوڑے دوڑا دیے۔

گھوڑے طوفان بن کر دوڑ رہے تھے کہ حضرت خالد  
کو اپنے گھوڑے کے آگے گرداؤنی نظر آئی، آپ نے  
گھوڑے کو ایڑ لگائی گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا مگر  
آگے جانے والے شہسوار کا گھوڑا طوفان سے زیادہ تیز  
تھا۔ حضرت خالد نے غور سے دیکھا، سیاہ لباس پہنے،  
لبا نیزہ ہاتھ میں لیے، کوئی جاں باز آندھی اور طوفان کو  
ٹکست دے رہا تھا۔

فوج آگے دوڑنے والے شہسوار سے کچھ قریب تو

فریدون جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا، درفش  
کلابانی اس کے ساتھ ہوتا۔ یہ علم تمام ایرانی  
تاجداروں کے خزانوں کی زینت رہا۔ اس پر پیش ہوا  
جو اہرات ٹانگے گئے، یہاں تک کہ اس کا چہرہ نظر نہ آتا  
تھا۔ یہ جھنڈا جب کھولا جاتا تو جو اہرات کی چکا چوند سے  
آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ ایک عرب شاعر بختری نے  
اپنے ایک مشہور قصیدے میں درفش کلابانی کی  
تعریف کی ہے۔

”نوشیرواں، درفش کلابانی کے نیچے سپاہوں کی  
صفیں لے کر چل رہا ہے اور عورتیں گھڑی دیکھ رہی  
ہیں۔“

### بہمن کی محبت

ہجرت کا بیسواں سال تھا اسلامی فوجوں نے دمشق  
کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اسلامی فوج کا ایک ایک جان  
باز اپنی جان نثار کرنے کے لیے بے تاب تھا، اسی  
دوران میں یہ خبر آئی کہ دشمن کی فوجیں ہزاروں کی  
تعداد میں اجنادین کے مقام پر جمع ہو رہی ہیں۔

امیر لشکر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ نے سارے  
کمانڈروں کو اکٹھا کر کے ان سے اس نازک صورت  
حال کے متعلق مشورہ کیا۔

”امیر! ہم جاں نثاری کے لیے تیار ہیں، فکری کوئی  
بات نہیں، اس سے بڑی اور کیا سعادت ہوگی کہ ہماری  
جانیں اللہ کی راہ میں کام آجائیں۔“ حضرت خالد بن  
ولید نے جو شبلی آواز میں کہا۔

”ہاں! مگر یہ بتاؤ کہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے  
کس جو ان عزم کو بھیجا جائے؟“ ابو عبیدہ الجراح نے  
دریافت کیا۔

”امیر! میرے خیال میں اس مہم کے لیے ضرار بن  
الازور بہت موزوں ہیں۔ اس شیر دل کو بے شک  
روانہ کر دیجئے۔“ حضرت خالد نے ضرار کی طرف  
اشارہ کرتے ہوئے کہا اور حضرت ابو عبیدہ نے ضرار بن  
الازور کو پانچ ہزار شیر دل جوانوں کا کمانڈر بنا کر اجنادین

ہو گئی لیکن اس کو پکڑ نہ سکی۔

غضب کی رفتار تھی۔ حضرت خالد نے دیکھا، شہسوار نے منہ پر ڈھانٹا باندھ رکھا ہے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ امیر لشکر نے پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی گھوڑا اڑنے لگا مگر وہ شہسوار ان سے پہلے ہی میدان میں کود پڑا تھا۔ وہ بجلی کی طرح دور تک رومیوں کی فوج میں گھستا چلا جاتا پھر اس تیزی سے دشمنوں کو کاٹتا ہوا واپس آ جاتا۔ اس کا لمبا نیزہ دشمنوں کے تازہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اللہ کا غضب بن کر وہ اپنی جانب جھپٹتا، کبھی قہرائی بن کر بائیں جانب جھپٹتا، کبھی سامنے کی فوج پر بجلی بن کر گرنا اور جدھر جانا عتقاب کی طرح شکار پر اس طرح ٹوٹا کہ شکار خاک و خون میں تیرتا نظر آتا۔

دوپہر کے بعد رومی فوج کی ہمت ٹوٹ گئی، ان کے حوصلے پست ہو گئے اور آخر کار وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، وہ شہسوار ایک جانب خون میں نہایا ہوا کھڑا تھا۔ حضرت خالد اس بہادر جوان سے ملنے کو بے چین تھے، انہوں نے ایک سپاہی کو معلومات کے لیے بھیجا مگر وہ خاموش رہا۔ پھر حضرت خالد خود اٹھے اور شہسوار کے پاس جا کر سلام کیا اور پوچھا!

”اللہ تمہاری ہمت اور برہانے تم کوں ہو؟“

امیر لشکر کو دیکھ کر شہسوار نے بڑے ادب سے سلام کا جواب دیا اور نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ ”اے امیر میں ایک بہن ہوں۔“

”تم ایک خاتون ہو؟“ حضرت خالد نے حیرت اور قدر کے لیے جملے جذبات کے ساتھ کہا۔

”جی ہاں! میں انور کی بیٹی اور ضرار کی بہن خولہ ہوں۔“

”خولہ! تمہارے درد کو میں جانتا ہوں، خدا ضرار کی حفاظت فرمائے۔“ امیر لشکر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور خاموش ہو گئے۔

”امیر! میرا سکون غارت ہو گیا ہے، جب تک میں اپنے بھائی کو دشمن سے چھڑانے لوں، چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مجھے تباہ چل جائے تو بازی کی طرح جھپٹ کر

اسے ظالم بنوں سے چھڑا لوں۔“

میرے بھیا! کیا میں اب تجھے کبھی نہ دیکھ سکوں گی؟ کیا تو بھی اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا ہے؟ تیرے باپ انور نے تو خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جام شہادت نوش کیا تھا۔ میرے بھیا اگر تو باپ کے پاس پہنچ گیا ہے تو میری طرف سے تجھ پر ہزاروں سلام۔“

بھائی کی یاد میں بہن کا یہ درد بھرا مریضہ بن کر سب ہی کا دل بھرا آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑی کے دامن سے رومی فوج کا ایک مختصر دستہ برہنہ چلا آ رہا ہے، جنوں ہی وہ دستہ قریب آیا، مسلمان فوج نے دیوانہ وار اس پر حملہ کر دیا۔

رومی دستہ لڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور امان طلب کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور انہیں امان دے دی گئی، پھر امیر لشکر نے ان سے پوچھا۔

”تم لوگ کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جانے کا قصد ہے؟“

”ہم لوگ حمص کے باشندے ہیں اور شاہ حمص کی مدد کے لیے آئے تھے۔“

”پھر تم نے امان طلب کیوں کی؟“ امیر لشکر نے پوچھا۔

”ہم لڑائی کا ارادہ ترک کر کے حمص لوٹنا چاہتے ہیں!“ رومی سردار نے کہا۔

”کیوں؟ ارادہ ترک کرنے کی کیا وجہ ہے؟“ امیر لشکر نے پوچھا۔

”ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ شاہ حمص آپ جیسے جاں بازوں کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا۔ لہذا اس کی حمایت میں لڑنا بے سود ہے۔“

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ امیر لشکر نے خولہ کی بے تابی کو بھانپ لیا اور رومی سردار سے کہا۔

میں بیٹھ گیا۔ انتظار کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا اور دشمن فوج کا کچھ پتا نہ چلا تو سب بے چین ہو گئے۔ حضرت خولہ کا بھی برا حال تھا، وہ چاہتی تھیں کہ دم بھر میں حمص پہنچ جائیں اور اپنے بھائی کی صورت دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر مالوسی اور بے تابی کی کیفیت سے دوچار تھا کہ دور سے گرد آؤی ہوئی نظر آئی۔ سب کی نگاہیں وہیں جم گئیں۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کچھ سوار پوری قوت سے گھوڑے دوڑاتے ان کی طرف آ رہے ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ یہ وہی دستہ ہے جو حضرت ضرار کو حمص لے جا رہا ہے تو حضرت خولہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی سوہ چوکس ہو گئیں اور عزم کے ساتھ اپنا نیزہ سنبھال لیا۔ ادھر اسلامی لشکر کے جوش و خروش کا عجیب عالم تھا، ہر ایک کے حوصلے کا یہ حال تھا کہ وہ اکیلا ہی پورے دستے سے سننے کے لیے تیار تھا۔

جونہی رومی دستہ مسلمانوں کے سامنے آیا، ساری مسلمان فوج اللہ اکبر کا نعروں لگا کر ان پر ٹوٹ پڑے۔

رومیوں کے ہوش اڑ گئے۔ کچھ مارے گئے، کچھ ادھر ادھر بھاگ گئے۔

حضرت خولہ کی نظر جب اپنے بھائی پر پڑی تو ان کی عجیب کیفیت ہو گئی، اپنے بھائی کو زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر فرط مسرت سے ان کے آنسو نکل آئے۔

مسلمان فوج بھی اس منظر کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئی۔

حضرت ضرار رہا ہو چکے تھے اور اسلامی فوج خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی کہ انہیں کامیاب و کامران کیا، اب وہ اپنے امیر کے سامنے سرخرو میں گئے۔

(تسلیم جعفری)



”میں تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ تم صحیح بتاؤ گے۔“

”ضرور ضرور اگر میرے علم میں ہو گا تو میں آپ کو دھوکا نہیں دوں گا۔“ رومی سردار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”یہ بتاؤ ہمارے کمانڈر ضرار کہاں ہیں؟“ حضرت خالد نے پوچھا۔

”ضرار کو سوجنگی سواروں کی نگرانی میں حمص کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے اور وہاں سے ان کو شاہ ہرقل کے حضور پیش کیا جائے گا۔“ رومی سردار نے صحیح بتا دیا۔

یہ خبر سنتے ہی سب سیاہی بے چین ہو گئے، خولہ بھی بھائی کے لیے بے تاب تھیں۔ حضرت خالد نے اسی وقت حضرت رافع کو سوجنگی سواروں کے ساتھ حمص کی جانب روانہ کر دیا اور انہیں ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”میرے جاں باز شیرو! نشانات قدم سے دشمن کی کھوج لیتے ہوئے دشمن کو جا پکڑو اور اپنے محبوب سردار ضرار کو چھڑا کر ہی دم لینا۔“ حضرت رافع سو ناؤہ دم سواروں کو لے کر جوش و خروش کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ حضرت خولہ بھی اس دستے کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ حضرت خالد نے انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا۔

اسلامی فوج بے پناہ جوش کے ساتھ گھوڑے دوڑاتی اور نشانات کا کھوج لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن کئی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی رومی دستے کا کہیں پتا نہ چلا تو سردار کو فکر ہوئی۔ انہوں نے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا!

”جس برق رفتاری سے تم لوگ چل رہے تھے، میرا خیال ہے کہ دشمن ضرور پیچھے رہ گیا ہے۔ لہذا ہمیں یہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔“ یہ ان کی فراست تھی۔

اسلامی لشکر اپنے امیر کا حکم سنتے ہی دشمن کی گھات





## حب الوطنی

آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ رشتے کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے چینلز چند ایک مقصدی قسم کے بیانات کو نمایاں کر کے دکھاتے ہیں۔ کوئی قوم مظلومیت کا رونا روئے تو اس کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ لگتا ہے کہ ظلم کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔

خالعتان تحریک میں بھارتی حکومت نے سیکھوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ان کی مذہبی عبادت گاہ گولڈن ٹمپل میں فوج گھس گئی، لیکن میڈیا نے انہیں اپنی مظلومیت کا رونا روئے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

جبکہ ہمارے ڈراموں میں پاکستان کا نام لینا قدامت پرستی میں شمار ہوتا ہے۔ ماڈرن ازم کا مطلب ہے مذہب اور ملک کی برائیاں کرنا، جبکہ بھارت اس کے برعکس دکھاتا ہے۔ کاش لوگ اس چیز کو سمجھ لیں تو اپنے ڈراموں کے ذریعے لوگوں کی سوچ بدل سکیں۔

## باادب

بدر خلیل سینئر ترین آرٹسٹ ہیں اور ان کے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب ڈرامے ہیں۔ آج کل وہ ”قدوسی صاحب کی بیوہ“ میں عقیلہ بھابھی کا کردار نبھاتی اور کر رہی ہیں۔ لیکن اب سننے میں آ رہا ہے کہ وہ پاکستان چھوڑ کر اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا جا رہی ہیں اور اب وہیں رہیں گی۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ آج کل زیادہ تر ڈرامے کراچی میں بن رہے ہیں، لیکن بدر خلیل جیسی پنجابی ہوئی اور اکاہرہ کو اس میں نہیں لیا جا رہا، بلکہ باہر سے آرٹسٹوں کو بلا کر کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ جو بہر حال زیادتی ہے۔ (جی اسی لیے ایک دو مخصوص چہرے ہی ہر چینل پر ماں کے کردار میں نظر آ رہے

ہمارے عوام انڈیا سے بہت متاثر ہیں۔ ہمیں ان کی فلمیں، ڈرامے، ان کے ڈانس، ان کی بے باکی، حد تو یہ ہے کہ ہم ان کی فاشی، بے ہودگی اور عریانیت تک سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آج کل ہونے والے ایوارڈ شوز اور شوہر کی ہونے والی تقریبات دیکھ لیں۔ ہماری اداکارائیں جس طرح کا لباس پہنتی ہیں اور ڈراموں میں جو ماحول ہم دکھاتے ہیں وہ پاکستانی معاشرے کی اصل تصویر تو نہیں۔

ہم نے انڈین ڈراموں سے بے ہودگی اور کم لباسی سیکھ لی ہے، لیکن ان سے حب الوطنی کا سبق نہیں لیا۔ جس طرح وہ اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ سوپ ہو تو ہر قسط میں روزانہ ایک سین پوچا پٹ کا ضرور ہوتا ہے۔ ان کے ہر ڈرامے میں ماڈرن سے ماڈرن لوکا، لڑکی اپنے مذہبی تہوار پوری شان و شوکت اور اہتمام سے مناتے ہیں۔ بلکہ بیچ پوچھیں تو کہانی تو برائے نام ہوتی ہے، زیادہ تر ہولی، دیوالی، نورانی، راکھی اور گن بٹی کے تہوار ہی دکھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر ڈرامے میں بھارت ماتا سے محبت اور ایلنا کا چرچا کرتے ہیں۔ (صرف چرچا ہی نہیں کرتے دراصل محبت کرتے بھی ہیں۔) سوا ارب کی آبادی والے اس ملک میں بے شمار قومیں آباد ہیں۔ مختلف ذاتیں ہیں۔ ذات پات کے جھگڑے بھی ہیں۔ زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ڈراموں میں ملک سے محبت کے کن گاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے چینلز تعصب کو ہوا نہیں دیتے۔ وہ ایک جتنی اور اتحاد کا سبق دیتے ہیں۔ وطن سے محبت کا پرچار کرتے ہیں۔

جبکہ ہمارے یہاں تعصب بہت کم ہے۔ لوگ

در حقیقت تی وی کے لیے اچھا لکھنے والوں میں اکثر خواتین رائٹرز کی ہے۔ پاکستانی ڈراموں کو ہندوستانی چینل پر نشر کیے جانے سے پاکستان کے بارے میں غلط تصورات کو قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ ”مگر بول“ اور ”خدا کے لیے“ جیسی فلمیں بنا کر کہیں کہ پاکستان میں حالات ہمیشہ خراب رہتے ہیں اور ہم خوش باش زندگی نہیں گزار سکتے۔ ان ڈراموں کے ذریعے لوگ (انڈیا کے) جاننے لگیں گے کہ ہم ان سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

## عمل

اردن سے تعلق رکھنے والے گلوکار اور موسیقار ”عمر عبداللہ“ نے گلوکاری ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اعلان کیا ہے کہ وہ فلسطینی عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے اپنے تمام پیشہ ورانہ معاملات سے دستبردار ہوتے ہیں۔ (اسے کہتے ہیں صرف باتیں نہیں، عمل بھی) انہوں نے میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے فلسطینی ساتھی نسل کشی جیسی خوف ناک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے مصر میں ہونے والا اپنا کنسرٹ اور دورہ امریکا بھی ملتوی کر دیا ہے اور ایک کمپنی سے ہونے والا ایلاہم کا معاہدہ بھی اب ختم کیا جا چکا ہے۔

عمر نے اپنے تمام گانے اور اپنی تمام نیک



ہیں۔) دوسرے ”ہم تی وی“ ایوارڈ کی تقریب میں سلطانہ صدیقی بدر خلیل کے ساتھ بیٹھی تھیں کہ فواد خان (ہم سفر نیم) اپنی جگہ سے اٹھ آئے اور انہوں نے سلطانہ صدیقی سے براہ راست آکر کہا کہ وہ ان کے ساتھ آکر بیٹھیں، ورنہ وہ تقریب سے چلا جائے گا۔ (فواد! فرائش کرنا غلط نہیں، لیکن آکر ادب ادب کا خیال کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا یا ادب یا نصیب بے ادب؟) فواد خان کے اس رویے کو بدر خلیل نے بہت محسوس کیا۔ ان ہی رویوں کی وجہ سے وہ اب باہر جا رہی ہیں۔ (بدوئی! آپ کے پرستار آپ کی بہت قدر اور عزت کرتے ہیں۔ چند لوگوں کی وجہ سے

آپ انہیں نہ چھوڑ کر جائیں۔)

## نقطہ نظر

معروف ڈراما نگار عمیرہ احمد کا کہنا ہے کہ ”پاکستانی میڈیا میں خواتین چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (عمیرہ! ذرا نظر دوڑائیں تو ہر جگہ ہی نظر آئیں گی)۔ ہمارے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ یہ ایک قد امت پسند ملک ہے جہاں خواتین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ مگر ہمارے پاس خواتین فنکاروں کی کمی نہیں ہے۔





کیا مطلب ہے بھی؟) ”افرا تفریح“ رکھا گیا ہے۔  
(کیس فلم بھی افرا تفریح ہی کا شکار نہ ہو جائے) جو بعد  
میں تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ (کیس کاسٹ ہی تبدیل  
نہ ہو جائے) اس کا اسکرپٹ واسع چوہدری نے لکھا  
ہے اور اس فلم کی ہیروئن کے لیے صبا فخر کا انتخاب کیا  
جا چکا ہے۔ ہدایت کار ندیم بیگ ہیں۔ (اور ہیرو یقیناً  
ہمایوں خود ہی ہوں گے؟)

### ذہنیت

پاکستانی گلوکارہ زبیب نے بھارتی فلم ”ہائی وے“  
کے لیے گانا ”سونا سونا“ گایا تھا۔ مگر جب بھارتی  
میوزک کمپنی نے سوشل ویب سائٹ پر گانا اپ لوڈ کیا  
تو اس میں پاکستانی گلوکارہ کا نام ہٹا دیا۔ (ان کی ذہنیت کا  
اندازہ کریں ذرا) اس گیت میں جہاں فلم کے ڈائریکٹر  
امتیاز علی اور میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمان کو کریڈٹ  
دیا گیا ہے۔ وہیں بطور گلوکارہ صرف عالیہ بھٹ کا نام  
شامل کیا گیا ہے۔ پاکستانی گلوکارہ کے ساتھ اس نا انصافی  
پر سوشل میڈیا پر ان کے پرستاروں نے احتجاج کیا ہے۔



خواہشات فلسطینی عوام کے نام کرتے ہوئے کہا کہ  
میں فلسطینی عوام کو بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میرا کام اور  
میرے سارے گانے خاص طور پر ان کے نام ہیں۔

### اعزاز

پاکستان کی پہلی خاتون کوہ پیما ثمنینہ بیگ جنہوں نے  
2013ء میں دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ  
ایورسٹ سر کی تھی۔ اب انہوں نے ایک اور اعزاز  
حاصل کر لیا ہے کہ حال ہی میں سات براعظموں کی  
بلند ترین چوٹیاں کامیابی سے سر کی ہیں۔ اس طرح وہ  
پہلی مسلمان اور پاکستانی خاتون بن گئی ہیں جنہوں نے  
یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ (بہت خوب ثمنینہ! آپ نے  
مسلمان اور پاکستانی خواتین کا سر بلند کر دیا۔) ثمنینہ نے  
یہ اعزاز سال 2014ء میں حاصل کیا۔

### ترقی

معروف اداکار احمد بٹ یوں تو بی وی پر ڈرامے اور  
لائو شوز کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اب وہ بی وی  
اسکرین سے فلم اسکرین پر جا پہنچے ہیں اور معروف  
اداکار و فلم ساز ہمایوں سعید کی کامیڈی فلم میں عنقریب  
نظر آئیں گے۔ اس فلم کا نام فی الحال (یہ فی الحال سے





(حالانکہ ہماری کلواکارہ کے ساتھ یہ ناانصافی نئی نہیں۔ ہم راحت فتح علی خان کے ساتھ ناانصافی کو بھی ابھی بھولے نہیں ہیں) اور بھارتی میوزک کمپنی سے زینب کا نام شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

### ادھر ادھر سے

☆ طاہر القادری کا اس قدر زور و شور سے میدان میں نکل آنا اس بات کی دلیل ہے کہ تبدیلی کے فیصلے کو امریکہ سے گرین سگنل مل چکا ہے۔ جس طرح 2001ء میں جنرل مشرف نے ایک فون کال پر ملک کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اب 2014ء میں امریکی افواج کی افغانستان سے واپسی سے قبل امریکہ کو ایک اور جنرل مشرف درکار ہے۔ سوال یہ ہے کیا پاکستان ایک اور جنرل مشرف کا تحمل ہو سکے گا؟

(سید وجہہ حسن۔ جسارت)

☆ ہمارے ہاں نریندر مودی جیسے متعصب شخص کا وزیر اعظم کیا کونسلر بننا بھی مشکل ہے، جبکہ بھارت میں نریندر مودی ایک عام بھارتی لیڈر کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ لیڈر میں لوگ اپنا برتو دیکھتے ہیں۔ بھارتی عوام کو مودی میں اپنا آپ نظر آیا تو اس کی وجہ یہی تھی۔ بھارت کا متوسط طبقہ بھی مودی ہی کی طرح متعصب ہے۔

(یا سر پیر زادہ۔ ذرا ہٹ کے)

☆ امریکی لاڈلوں نے ہم پر ”ہماری جنگ“ مسلط کر دی اور لی وی چیمنلز کو افیون گھول کر پلانے کے کام پر لگا دیا۔ آپ یہ چمیل دیکھئے اور خاص طور پر — ڈان نیوز، جس نے مرنے والے فلسطینیوں کے لیے ایک بار بھی شہید کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی خبر دی ان الفاظ میں دی کہ اسرائیلی کارروائی میں اتنے فلسطینی ہلاک ہو گئے۔ ”ہماری جنگ“ کی پاس داری کا حق ادا کر دیا۔ نغیمت ہے کہ اس نے مرنے والے 13 یہودیوں کے لیے ”شہید“ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ نئی بات)

☆ عوامی مقبولیت رکھنے والی قیادت بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو مشرف نے جب تک چاہا ملک میں داخل نہیں ہونے دیا۔ جب وہ واپس آئے تو سیاسی سودے بازی کے بعد واپس آئے۔ مسلم لیگ ن سادہ اکثریت اور عوامی مقبولیت کے باوجود حکومت قائم کرنے کے لیے اصل طاقت ور فیصلہ سازوں کے محتاج ہیں۔

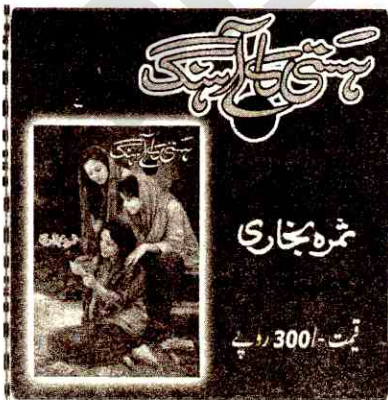
(روزنامہ جسارت)

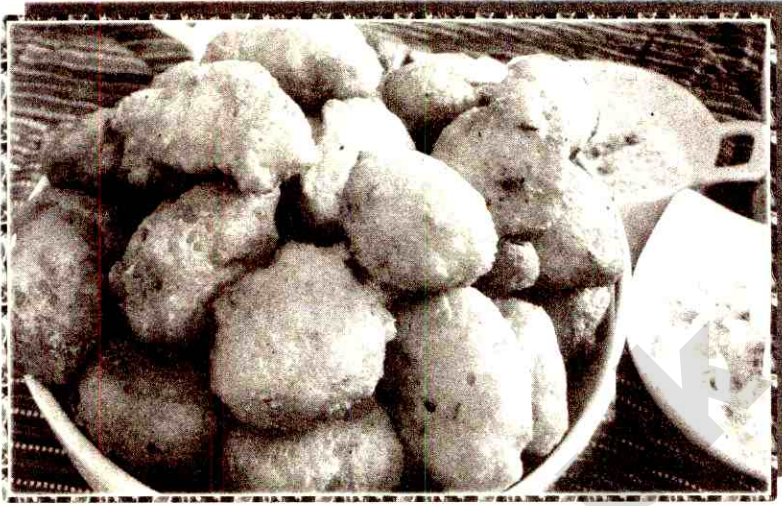
☆ سینئر صحافی رازدرون خانہ سے باخبر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بھری بزم میں راز کی بات کہہ جاتے ہیں۔ صحافی کہتے ہیں میاں نواز شریف اور راجیل شریف میں اختلافات کی وجوہات یہ ہیں کہ مشرف کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ بھارت کے ساتھ دوستی نہ کی جائے۔

(یفینینٹ کرمل (ر) عادل اختر)

☆ نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ جنرل راجیل شریف، نواز شریف سے ناراض ہیں اور یہ ناراضی مشرف کو پاکستان سے نہ جانے دینے پر ہے۔

(مظفر اعجاز۔ قلم رو)





## ہنی چکن

اجزا :  
چکن  
شہد  
کیچپ

آدھا کلو  
دو کھانے کے چمچے  
چار کھانے کے چمچے  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

سرخ مرچ  
لسن اور ک پیٹ  
نمک  
تیل

ترکیب :

چکن میں نمک، سرخ مرچ، لسن اور ک پیٹ،  
شہد اور کیچپ اچھی طرح مل کر رکھ دیں۔  
آدھے گھنٹے بعد تھوڑے تیل میں ہلکی آنچ پر چکن کل  
جانے تک پکائیں۔ روغن اوپر آجائے تو بھون کر پانچ  
منٹ کے لیے دم پر رکھیں، پھر چپاتی کے ساتھ گرم  
گرم پیش کریں۔

شملہ مرچ کا اچار

اجزا :

## سوم کے پکوان

خالہ جیلانی

لڈو میٹھی

اجزا :

چنے کی دال  
سفید زیرہ  
اجوائن  
ہیکنگ پاؤڈر  
نمک  
تیل

ایک پاؤ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چوتھائی چائے کا چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

ترکیب :

چنے کی دال کو رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح اس  
کا پانی نکال کر سفید زیرہ، اجوائن اور نمک کے ساتھ  
بلینڈ کر لیں۔ آمیزہ یکجان ہو جائے تو ہیکنگ پاؤڈر  
دال کرا چھی طرح پھینٹ لیں، پھر کھانے کے چمچے کی  
مدد سے پکوڑوں کی طرح گرم تیل میں قل لیں اور اعلیٰ  
کی کھسی میٹھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

میدہ  
پیکنگ پاؤڈر  
لکھن  
انڈے  
چینی  
ترکیب :  
چھ کھانے کے چمچے  
ایک چائے کا چمچ  
ایک ٹمبلہ  
تین عدد  
چھ کھانے کے چمچے

شملہ مرچ  
زیرہ دھنیا  
ہلدی  
سرخ مرچ  
اٹلی کا پیسٹ  
گڑ  
نمک  
تیل  
ترکیب :  
ایک عدد  
ایک ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چوتھائی چائے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچے  
ایک چوتھائی کپ  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

انڈوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھر اس میں چینی اور مکھن ملائیں۔ مکھن نہ ہو تو تیل بھی استعمال کر سکتی ہیں اور مزید پھینٹ لیں۔ میڈہ، پیکنگ پاؤڈر اور کو کو پاؤڈر ملا کر مزید مکس کریں۔ آمیزہ جتنا اچھا کیجاں کریں گی۔ اتنی ہی براؤنی نرم بنے گی۔ ساٹھے میں آمیزہ ڈالیں۔ پھر پہلے سے خوب گرم توتے پر سانچہ رکھ کر بیس منٹ تک، ہلکی آگ پر بیک کریں۔ سوئی کی مدد سے چیک کریں۔ عموماً بیس منٹ میں براؤنیز تیار ہو جائے گی، لیکن اگر ضرورت محسوس کریں تو پانچ منٹ کے لیے مزید توتے پر رہنے دیں۔

چکن میٹ اسٹک

شملہ مرچ کاٹ لیں۔ فرانک پان میں تیل گرم کر کے شملہ مرچ تمام مسالوں کے ساتھ دو منٹ تک فرائی کریں۔ اٹلی کے گودے کو چھان کر گڑ میں ملائیں، پھر اس پیسٹ کو شملہ مرچ میں ملا کر اتنا پکائیں کہ گاڑھا ہو جائے۔ مزے دار اچار تیار ہے۔

چکن چلی رائس

اجزا :  
چکن بون لیس  
میدہ  
بریڈ کریمبز  
لکھن  
لہسن اور ک  
نمک  
تیل  
ترکیب :  
آدھا کلو  
آدھا کپ  
آدھا کپ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

اجزا :  
بغیر ہڈی کا چکن  
اے اے چاول  
شملہ مرچ  
ٹماٹو پیسٹ  
سرخ مرچ پیسٹ  
نمک  
تیل  
ترکیب :  
آدھا کلو  
چار کپ  
دو عدد  
آدھا کپ  
تین کھانے کے چمچے  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

چکن قے میں گوشت یا آلو بھی لیے جاسکتے ہیں) نمک، سرخ مرچ، میڈہ، مکھن، بریڈ کریمبز، لہسن پیسٹ اور چار ہری مرچیں پیس کر مکس کریں اور آکس کریم اسٹک یا شاشنک اسٹک پر حسب پسند شیبہ دے کر لگائیں۔ آدھا گھنٹہ رکھ کر ٹیکہ تیل میں سنہرے ہونے تک تلیں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

گرم تیل میں چکن فرائی کریں۔ پھر ٹماٹو پیسٹ، سرخ مرچ پیسٹ، سیاہ پیسی مرچ اور نمک ڈال کر بھونیں، اس کے بعد چکن اور شملہ شامل کر کے پانچ منٹ تک پکائیں، پھر گرم ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

براؤنیز

چھ کھانے کے چمچے

و پاؤڈر



بھاپ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر آپ چاہیں تو گرم پانی میں تولیہ بھگو کر پنجویں اور تین سے چار مرتبہ چہرے پر رکھ کر ہلکے ہلکے ہاتھ سے دبا میں پھر کم از کم دو منٹ کے لیے چہرہ اسی گرم تولیہ سے دھانب لیں۔ انڈے کا ماسک لگائیں۔ دس منٹ بعد منہ دھوئیں اور ٹونک کے طور پر عرق گلاب کا اسپرے کر لیں یا روئی کی مدد سے لگائیں۔

مر جھانی ہوئی، کلماتی ہوئی جلد کی حامل خواتین وائنڈنگ فیشل کریں۔ رات کو چار بجے دودھ میں آدھا لیموں نچوڑ کر رکھ دیں۔ صبح اسی پھٹے ہوئے دودھ سے چہرے پر مساج کریں۔ بھاپ کے لیے کھولتے پانی میں چند قطرے زیتون کے تیل کے شامل کریں اور دو منٹ تک تولیہ ڈھک کر بھاپ لیں پھر برف کے ٹکڑے لے کر چہرے پر رکھ لیں۔ نمائز کو بالائی میں پچل کر ماسک کے طور پر لگائیں۔ چند منٹ بعد چہرہ دھو کر تھیرے یا پودینے یا پتھندر کے عرق سے ٹونک کریں۔

بڑھتی عمر کے اثرات کو روکنے کے لیے ایٹنی ایجننگ فیشل کریں۔ زیتون کے تیل میں برابر کا پانی ملا کر پینٹ لیں، پھر ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ یا جو کے دیے میں دودھ ملا کر گڑھا سا پیٹ بنا کر مساج کریں۔ خشک ہونے پر اتار لیں۔ بھاپ لیں۔ بھاپ والے پانی میں بھی زیتون کا تیل ملا لیں۔ بھاپ لینے کے بعد کم از کم دو برف کے ٹکڑوں سے غور کریں۔ انڈے کی سفیدی میں شد ملا کر ماسک لگائیں۔ خوبانی پچل کر بھی بطور ماسک لگا سکتی ہیں۔ ٹونک کے لیے لیموں کا عرق لگائیں۔

کیل ماسوں سے نجات کے لیے ایکسٹری فیشل کریں۔ تھوڑی سی چینی کو تھوڑے سے پانی میں اتنا گھول لیں کہ کچھ دانے باقی رہیں۔ پھر ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں۔ (یہ مساج آپ برف سے بھیجے۔ پھر فیشل کے بھی کر سکتی ہیں) کیل ماسوں والی جلد بھاپ کی متحمل نہیں ہوتی۔ مسور کی وال دودھ میں بھگو کر پس لیں۔ یہ آمیزہ بطور ماسک لگائیں۔ پیتا پچل کر بھی لگا سکتی ہیں۔ کلماتی مٹی کا بھی ماسک لگا سکتی ہیں اور نیم کے پتوں کا پیٹ بنا کر بھی بطور ماسک لگا سکتی ہیں۔ ٹونک کے طور پر عرق گلاب لگائیے۔

یاد رکھیے! کوئی بھی فیشل مہینے میں زیادہ سے زیادہ دو بار اور کم سے کم ایک بار کریں اور فیشل کے بعد کم از کم آدھا گھنٹہ چولہے کے نزدیک جانے سے گریز کریں۔



ادگار



اگرچہ خوب صورتی عمر کی محتاج نہیں ہوتی اور خواتین ہر عمر میں خوب صورت نظر آ سکتی ہیں۔ تاہم پچیس سال کی عمر کے بعد جلد کی تازگی، شادابی اور صحت برقرار رکھنے کے لیے مہینے میں ایک بار فیشل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فیشل اور خوب صورتی سے متعلق تمام مسائل کے لیے مہینے کی بار بار گزارش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ گھر میں ہی ایک عمدہ فیشل کر سکتی ہیں۔

فیشل کی چار اقسام ہیں۔ نارمل فیشل، وائنڈنگ فیشل، ایٹنی ایجننگ فیشل اور ایکسٹری فیشل۔ اگر خوش قسمتی سے آپ کی جلد ہر قسم کے مسائل سے پاک ہے تو آپ مندرجہ ذیل طریقوں سے نارمل فیشل کریں۔ منہ دھو کر ساوہ دودھ سے روئی کی مدد سے چہرے کا مساج کریں۔ پانچ منٹ تک کلینزنگ کرنے کے بعد ساوہ روئی سے چہرہ صاف کر لیں، نارمل جلد میں